محمد نقوش

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

میں نے انگریزی لٹریچر بھی پڑھا ہے، ہندی بھی پڑھی ہے، فارسی بھی پڑھی ہے، عربی سے بھی واقف ہوں، اُردو کو بھی کھنگالا ہے، اس لیے اعتماد سے کہتا ہوں کہ دُنیا میں اور نہ میرے تصوّر میں کوئی ایسا مدیر، صحافی اور نقّاد آیا، جس نے طفیل صاحب جتنی مشقّت اختیار کی ہو۔

حفیظ جالندھری

طفیل صاحب کا ہر پرچہ ایک خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر، خاص خاص موقعوں پر شائع ہوتے ہیں!

پطرس بخاری

مجھے محمّد طفیل اور محمّد نقوش میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ہم دونوں کے ممنونِ احسان ہیں۔ اگلی نسلیں بھی اس احسان کا بار محسوس کریں گی اور یہ دونوں نقش جو باہم ایک دُوسرے کا عکس بن گئے ہیں ہمیشہ قائم رہیں گے۔

سیّد وقار عظیم

محمّد طفیل جو اپنے آپ کو "محمّد نقوش" بھی لکھتے ہیں اُن اوصاف سے مُزیّن ہیں جو مرزا غالب کے نزدیک حسینوں سے مختص تھے یعنی سادگی اور پُرکاری —— ان وصفوں میں اُنھوں نے بظاہر کسی مشق کے بغیر ایسا کمال بہم پہنچا لیا ہے جو حسینوں کو فطری بخششوں اور عطیوں کے بعد عمر بھر کی ریاضت سے بھی شاید ہی حاصل ہوا ہو۔

مولانا غلام رسول مہر

محمد نقوش

ناشر : محمد عمر خان

طبع اوّل : ۱۹۸۳ء

مطبع : منظور پریس، لاہور

قیمت : ۷۵ روپے

ع
قیمت

محمد نقوش

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

مُرتّبہ

ڈاکٹر سیّد معین الرحمن

پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور

کاروانِ ادب ○ ملتان صدر

"محمد نقوش" دراصل محمد طفیل ہی کا دُوسرا نام ہے۔ اسے اختیار اس لیے کیا گیا کہ اس نام سے ایک یاد وابستہ ہے اور وہ یاد ہے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ـــــ اس لیے کہ وُہ مجھے اسی نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد میں نے اس نام کو زندہ رکھنا مناسب سمجھا، محض عقیدت کے طور پر، قدرِ مشترک کوئی نہیں۔ وُہ اردو کے لیے جیتے تھے، میں اردو کے لیے مرتا ہُوں۔ وہ بابائے اردو تھے مجھے زیادہ سے زیادہ طفلِ اُردو کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال میرے لیے یہی سب کچھ ہے کہ اُردو سے کوئی نہ کوئی نسبت میری بھی ہو۔"

ــــ محمد طفیل (محمد نقوش):

[نقوش، شمارہ ۱۰۷، مئی ۱۹۶۷ء، ص ۶]

ترتیب :

عرضِ مرتّب : ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن صفحہ ۹

(۱)

داد و تحسین :

جنرل محمد ضیاءُ الحق ۱۳
فیلڈ مارشل محمد ایّوب خاں ۱۸
ذوالفقار علی بھٹو ۱۹
اندرا گاندھی ۲۰

(۲)

صدارتی خُطبات :

جسٹس سجاد احمد جان ۲۳
جسٹس عطاءاللہ سجاد ۲۶
خواجہ شہاب الدین ۲۹
نوابزادہ شبیر علی خان ۳۳
میر علی احمد تالپور ۳۵

(۳)

شخصیت :

اعتراف حفیظ جالندھری ۳۹
انیسِ اردو شورش کاشمیری ۴۱
ہم قلم کرشن چندر ۴۲

طفیل صاحب (چند تاثرات)	احمد ندیم قاسمی	۴۶
شخصیت نگار کی تلاش	ممتاز مفتی	۵۴
طُفیلیات	ڈاکٹر محمد حسن	۶۱
ایک زندہ شخص	رحیم گل	۶۶
محمد طفیل	صادق حسین	۷۰
محمد طفیل	انتظار حسین	۷۷
محمد طفیل	لطیف الزماں خاں	۸۱
قدر آور بونا	ڈاکٹر سلیم اختر	۹۹
المعروف محمد نقوش	فارغ بخاری	۱۱۴
ذکر خرابۂ نجد کے محمد طفیل کا	مقبول جہانگیر	۱۲۱
طفیل صاحب	احسن علی خاں	۱۲۹

(۴)

نقوش :

نقوش کے بارے میں میرے تاثرات	مولانا غلام رسول مہر	۱۳۹
بیاضِ غالب کی دریافت	مولانا غلام رسول مہر	۱۴۳
نقوش اور طفیل	سید وقار عظیم	۱۵۲
مجلاتی صحافت میں نقوش کا مقام	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	۱۵۶
نقوش کے خاص نمبر	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۱۶۴
بیسویں سالگرہ پر	مسعود مفتی	۱۸۶
آج کا حاتم	ڈاکٹر سلیم اختر	۱۹۰
سلیوٹ	کرنل محمد خاں	۱۹۶
ایک عہد آفریں شخصیت	فتح محمد ملک	۱۹۹
عجیب و غریب شخص	اشفاق احمد	۲۰۳

نقوش کے خاص نمبر	خدیجہ مستور	۲۰۵
نقوش: منزل بہ منزل	تحسین فراقی	۲۰۸
نقوش کے دس سال	حسن وارثی	۲۱۹

(۵)

روئیداد (آپ بیتی نمبر): ۲۲۹

مولانا علم الدین سالک	حکیم یوسف حسن	۲۴۰
شاہد احمد دہلوی	عادل رشید	۲۴۷
حفیظ جالندھری	شمس اللہ تعمتی	۲۵۲
مدیر "نقوش"	محمد یٰسین وٹو	۲۵۷

(۶)

خاکہ نگاری:

محمد طفیل کے خاکے اور فنِ خاکہ نگاری	ابوالاعجاز حفیظ صدیقی	۲۶۷
ایک جدید شخصیت نگار	مجنوں گورکھپوری	۳۰۵
صاحبِ طرز شخصیت نگار	ڈاکٹر احسن فاروقی	۳۰۹
محمد طفیل: بحیثیت خاکہ نگار	ڈاکٹر صابرہ سعید	۳۲۱
اردو میں خاکہ نگاری	ڈاکٹر انور سدید	۳۲۸
محمد طفیل: ایک خاکہ نگار	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۳۴۸
ایک نو آباد کار	جوگندر پال	۳۵۸
نقوش کے نقاش	شوکت تھانوی	۳۶۴
طفیل نقوش	سید ضمیر جعفری	۳۷۱
نقوش و نقاش	ڈاکٹر اختر اورینوی	۱۶۱

(۷)

چند تبصرے، چند تقریریں : ۳۷۷ - ۴۳۵

"آپ" پر چند تبصرے
مُرتبہ، محمد طفیل :

حکیم یوسف حسن، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر سید افتخار حسین، مولانا نعیم صدیقی، آلِ احمد سرور، ڈاکٹر خلیق انجم، عبدالمغنی، ڈاکٹر محمد عقیل، احمد جمال پاشا، جوگندر پال، حجاب امتیاز علی، رام لعل، ممتاز مفتی، ستیش بترا، سید مسعود حسن رضوی ادیب، سید علی عباس حسینی، ڈاکٹر قاضی عبدالستار، ہرچرن چاولہ۔

ریڈیو تقریریں :

محمد طفیل، ڈاکٹر وحید قریشی، مرزا ادیب، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صادق حسین۔

(۸)

چند خطوط : ۴۳۷ - ۴۵۴

۱- ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۲- رام بابو سکسینہ
۳- رشید احمد صدیقی
۴- نیاز فتحپوری
۵- پطرس بخاری
۶- وحشت کلکتوی
۷- عبدالرحمٰن چغتائی
۸- چودھری محمد علی ردولوی
۹- ل- احمد اکبرآبادی
۱۰- نصیرالدین ہاشمی
۱۱- ڈاکٹر محی الدین قادری زور
۱۲- مولانا حامد حسن قادری

۱۳ - مولانا امتیاز علی عرشی
۱۴ - ڈاکٹر یوسف حسین خاں
۱۵ - مسعود حسن رضوی ادیب
۱۶ - ڈاکٹر سید اعجاز حسین
۱۷ - معین الدین احمد ندوی
۱۸ - مولانا عبد المجید سالک
۱۹ - آغا محمد اشرف
۲۰ - ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
۲۱ - جیلانی بانو
۲۲ - ابن انشا
۲۳ - غلام عباس
۲۴ - دیوندر ستیارتھی
۲۵ - شوکت تھانوی
۲۶ - ن - م - راشد
۲۷ - شاہد احمد دہلوی
۲۸ - حکیم احمد - ع
۲۹ - ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۳۰ - ڈاکٹر گیان چند
۳۱ - عبد القوی دسنوی
۳۲ - مختار صدیقی
۳۳ - قیوم نظر
۳۴ - ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

(۹)

حاصلِ حیات (رسولؐ نمبر): ۴۵۵ - ۴۶۸

میرا انتہا — محمد طفیل

"نقوش" کا رسولؐ نمبر: اسد اللہ غالب، جسٹس آفتاب حسین، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، نعیم صدیقی، مولانا سید محمد متین ہاشمی، محمد مالک کاندھلوی، مولانا فاضل لکھنوی، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

رسولؐ نمبر (دو انگریزی تحریریں) — خالد احمد، محمد علی صدیقی — ۴۶۹

اختتامی حروف: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن — ۴۷۶

عرضِ مُرتّب :

——— ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

(۱)

محمد طفیل صاحب نے جنھیں بابائے اردو نے "نقوش" سے اُن کے ادارتی اور قلمی تعلق کے حوالے سے "محمد نقوش" کا نام دیا تھا، ۱۹۵۱ء میں "نقوش" کی ادارت سنبھالی تو وہ ستائیں اٹھائیس برس کے جوانِ رعنا تھے۔ اب کہ ادارتی ذمہ داریوں کا بار اٹھائے انھیں اس برس ایک تہائی صدی بیت رہی ہے اور وہ عمرِ عزیز کے ساٹھ برس پُورے کر رہے ہیں[لہ]، زیرِ نظر ارمغان "محمد نقوش" کے لیے کسی عُذر یا حرفِ معذرت کی ضرورت نہیں۔

(۲)

بابائے اردو مولوی عبد الحق میرا پہلا عشق اور میری پہلی ادبی ترجیح ہیں اور رہے ہیں — طفیل صاحب سے میرا پہلا شخصی تعارف مولوی عبد الحق کی ذاتِ گرامی کے حوالے سے ہوا۔ یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے میں نے اردو کالج کراچی کے ادبی مجلّے "برگِ گل" کے زیرِ ترتیب بابائے اردو نمبر کے لیے طفیل صاحب سے مضمون لکھنے کی گزارش کی، انہوں نے "نقوش" کے آپ بیتی نمبر کے لیے مجھ سے بابائے اردو کی آپ بیتی کی فرمائش کی، ہمیں اس کی توفیق ہوئی۔ یوں، باہم اعتماد اور محبت کا جو رشتہ اوّل روز قائم ہوا، وہ گزرانِ وقت کے ساتھ ساتھ استوار تر ہوتا چلا گیا۔
اب اس پر بیس بائیس برس گزر چلے ——— بایں ہمہ ماہ و سال کے پیمانے سے طفیل صاحب پر "پہلی کتاب" کی تالیف و ترتیب شاید میرا استحقاق نہ قرار پائے لیکن یہ ذاتی طور پر میرے لیے ایک اعزاز اور سعادت ضرور ہے!

لہ ولادت: لاہور ۱۴۔ اگست ۱۹۲۳ء

اس کتاب کی تالیف میں جو طفیل صاحب سے محبت اور اُن کے ادبی کمالات اور احسانات کے ادبی اعتراف کے طور پر متشکل ہوئی، مجھے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی پیش بینی اور تصرف کا عمل دخل بھی دکھائی دیتا ہے۔ "نقوش" کے شخصیات نمبر پر اظہار رائے کرتے ہوئے بابائے اُردو نے طفیل صاحب کو لکھا تھا کہ:

"...... یہ نمبر دراصل قاموس شخصیات ہے۔ لوگ حوالے اور استناد کے لیے اسے ڈھونڈا کریں گے۔ آپ کا ہر نمبر...... خاص...... ہوتا ہے، مگر شخصیات نمبر سب پر بازی لے گیا۔ اب صرف ایک شخصیت رہ گئی ہے جو عجیب وغریب ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک نہیں ہو سکتا کئی ہوں گے۔ عجب نہیں کسی روز پورا نمبر آپ ہی کی شخصیت پر نکلے۔"

پیشِ نظر کتاب کی صورت میں جو طفیل صاحب کی "عجیب وغریب" شخصیت کے بارے میں ہے اور جس کا بیشتر حصہ "نقوش" ہی میں چھپے ہوئے مواد پر مبنی ہے اور جس کا لکھنے والا "ایک نہیں کئی ہیں" —— بابائے اردو کی ایک بشارت کی تکمیل اور ان کے ایک بے نام اشارے کی تعمیل کا میرا احساس، کچھ ایسا بے جواز نہیں —— خدا کرے یہ کتاب طفیل صاحب کی شخصیت اور اُن کے کارہائے نمایاں کو سمجھنے کے سلسلے میں قاموس یا کلید کا کام دے اور حوالے اور استناد کے کام آئے!

(۳)

طفیل صاحب کی شخصیت میں ایک خاص ملائمت اور موہنی ہے۔ وہ بڑے نفیس، نستعلیق، کم آمیز، زود حس، سخت کوش اور بے حد دُور بیں اور بلند کمند آزمام دِ معصوم —— اور صاحبِ اسلوب شخص اور شخصیت نگار اور ایک روایت ساز مدیرِ باتدبیر ہیں۔

"نقوش" کی ادارت کے سلسلے میں انہوں نے جو امتیازِ خاص حاصل کیا، جس پیہم محنت اور ان تھک لگن کا مظاہرہ کیا، جو باثمر اور جرأت آزما تجربات کیے اور جن اور جیسی روایات کو قائم کیا اور انھیں جس طرح آگے بڑھایا، اُس نے تاریخ کے اوراق میں اُن کے نام اور کام کو دوام عطا کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ ادارتی اور ادبی میدان میں طفیل صاحب نے جو کارنامے رقم کیے اور جو نقوشِ قدم ثبت کیے ہیں وہ کبھی بے رنگ اور بے نور نہیں ہوں گے۔

طفیل صاحب کی زیرِ ادارت "نقوش" کی تازہ اشاعت 'رسول نمبر' کی صورت میں سامنے آئی ہے جسے خود انہوں نے اپنی منتہائے کمال بتایا ہے۔ اس کارِ بے مثال و لازوال پر انہیں ۹۔ ربیع الاوّل ۱۴۰۳ھ (۲۹۔ دسمبر ۱۹۸۲ء) کو جشنِ ولادتِ نبویؐ کے مبارک موقع پر صدرِ مملکت کے ہاتھوں ایک لاکھ روپے کے انعام سے سرفراز کیا گیا ـــــ میرے علم و یقین کی حد تک پاکستان میں کسی سربراہِ مملکت کی جانب سے کسی علمی اور تخلیقی کاوش پر اتنے خطیر رقمی انعام کے اعلان کی یہ دوسری مثال ہے۔[1]

ادارت کے بعد اور ساتھ، شخصیت نگاری کو طفیل صاحب نے اپنی ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا ایک دوسرا مخصوص میدان اور وسیلہ بنایا ـــــ خاکہ نگاری کو رشید احمد صدیقی نے بڑا دلچسپ لیکن اتنا ہی مشکل فن اور شغل قرار دیا ہے۔ ہمارا کسی سے خوش یا ناخوش ہونا ہمارے لیے جتنا آسان ہے، اتنا ہی یہ مشکل ہے کہ ہم اس شخص کو دوسروں کی پسند یا ناپسند کا موجب بنا دیں! پھر جس کا مرقع پیش کیا جائے وہی پیش پیش ہو، خود لکھنے والا رہ کر سامنے نہ آجاتا ہو! ـــــ جب تک مرقع نگار اپنے "معمول" کو دوسروں سے واضح طور پر منفرد نہ کر سکے گا، اُس وقت تک نہ تو کوئی شخصیت نگار کا قائل ہوگا، نہ زیرِ مشق "شخصیت" کا! یعنی مرقع نگاری کو گویا لازماً" ہاتھ کا کام ہونا چاہیے، مشین کا نہیں!!

اِس معیار اور پیمانے سے طفیل صاحب کی شخصیت نگاری کا جائزہ لیا جائے تو ان کی مشکلات اور اُن کی کامیابی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا ـــــ خدا انہیں تا قیامت سلامت با کرامت رکھے اور ہم اُن کے ہاتھوں خود اُن ہی کے اکتسابات اور نشانات کو بلند تر ہوتے دیکھیں۔

(۴)

"گزرنے کو تو ہر ایک شخص کی زندگی بہر حال گزر ہی جاتی ہے کیونکہ مہینے اور سال کسی کے روکے نہیں رُکتے لیکن کیسی اچھی ہے وہ زندگی جو کارِ خیر میں گزرے

---

[1] طفیل صاحب سے پہلے ایسا ایک اعزاز کلامِ اقبال کے مصور ایڈیشن "عملِ چغتائی" پر مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کو عطا کیا گیا تھا۔

اور جس سے دوسروں کے دل میں بھی عملِ خیر کی ترغیب پیدا ہو۔"

محمد طفیل کی زندگی آج تک تخلیق و تسوید ادب میں انہماک اور اہلِ قلم کی بہبود و بہتری کے کارہائے نیک میں بسر ہوئی ہے۔ ان کے ادبی اور ادارتی کمالات اور امتیازات کے قائل اصحاب اور ان کے حُسنِ نظم اور ان کی دلنوازی کے سلیقے کے گھائل اشخاص کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ "محمد نقوش" طفیل صاحب کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر اُن کے بعض قدر شناسوں کی جانب سے اُن کی علمی وجاہت اور دل پذیر شخصیت کے ادبی اعتراف میں ہے ——— "تکلّف برطرف، اعترافِ کمال بجائے خود ایک بڑی نیکی ہے، ایسی بڑی نیکی جس کی توفیق ہر شخص کے نصیب میں نہیں لکھی!

مجھے یقین ہے کہ طفیل صاحب کو بھی اس مرحلے پر اپنے گزشتہ کاموں کا جائزہ لینے کا موقع ملے گا۔ وہ دیکھ سکیں گے کہ انہوں نے اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں کیا کچھ کیا ہے اور علم و ادب کے معیار اور زندگی کی اقدار کو بلند کرنے اور زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب پیش کرنے میں اُن کا کتنا حصّہ ہے۔

یہ تحسینی اور تنقیدی مجموعہ ایک طرح سے خود طفیل صاحب کے ایک سخت اور تلخ احساس کی عملی نفی بھی ہے۔ مجھے امید ہے، اب وہ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ:

> "تعریف کرنے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا، اس کے باوجود ہم کسی کی تعریف نہیں کرتے۔ خسّت ہمارا رویّہ ہے اور حق رسی کا ہمارے ہاں رواج نہیں!"

[حرفِ آغاز، ندیم نامہ]

(۵)

یہ نہیں ہے کہ اس مجموعے سے گویا طفیل صاحب کی بے نہایت خدمات کا حق ادا ہو گیا ہو، اس کی حیثیت اس سمت میں پہلی کاوش سے زیادہ نہیں ——— لیکن اس سے طفیل صاحب کی ذات و صفات اور اُن کی ادبی خدمات کے کسی ایک بھی مدّاح یا قدردان کا جی بہلے یا کام نکلے اور اس سے ہم عصر اکابرِ ادب کے اعترافِ کمال کی تحریک کو ذرا بھی تقویت ملے تو سمجھوں گا کہ میری محنت بارآور ہوئی۔

زیرِ نظر کتاب کا ایک حصّہ "چند خطوط" سے عبارت ہے جو طفیل صاحب کے نام ہیں اور ان خطوط کے لیے میرا ماخذ "نقوش" کے متفرق شمارے ہیں جن سے یہ اقتباس لیے گئے ہیں۔ یہاں اس امر کا اظہار بے محل نہیں ہوگا کہ طفیل صاحب کے نام اکابر کے خطوں کا ایک بڑا قیمتی مجموعہ ممتاز حسن مرحوم کی خواہش پر نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ کرا دیا گیا تھا ـــــ خود طفیل صاحب کے نام اہلِ علم کے خطوں کے علاوہ غالب سے عہدِ موجودہ تک کے اکابر کے خطوط شامل ہیں۔ بایں ہمہ کوئی پانچ ہزار کے قریب نادر اور نایاب خط اب بھی طفیل صاحب کے ذاتی ذخیرے کی زینت ہیں۔

کہنے کو اس کتاب کی تیاری میں دو سال برس آن لگا ہے، بقول شخصے میرے لیے بڑے فخر کی بات ہوتی اگر میں یہ کہہ سکتا کہ میں نے ہفتوں اور مہینوں اس کتاب پر محنت کی، لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ مدّت کتاب کی قدر بڑھائے بغیر گزر گئی! طفیل صاحب کے علم میں تھا کہ اس نوع کا کچھ کام میرے پیشِ نظر ہے۔ میری سست روی ان کے لیے جیسا کچھ بھی خلش یا خلجان کا باعث رہی ہو، اُن کی مروّت اور عظمت نے گوارا نہ کیا کہ میرے کام میں مداخلت کریں یا اس کا خاکہ دکھانے پر اصرار کریں یا حدود کار جاننے کا اشتیاق ہی ظاہر کریں ـــ اور مجھے دوسری ذمہ داریوں سے اتنی یکسوئی نصیب نہ ہوئی کہ کتاب کو خاطر خواہ مکمل کر سکتا۔ طفیل صاحب اور اُن کے قدر شناسوں سے معذرت واجب آتی ہے:

خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم!

معین الرحمٰن
١٩٨٣ء

شعبۂ اردو،
گورنمنٹ کالج، لاہور

نقوش

اپنی نوعیت کا واحد رسالہ

[اشاعتی خاکہ]

[زمانۂ ادارت ۱۹۵۱ء سے تا حال]

شمارہ نمبر	سنہ	موضوع	صفحات
۱۹ - ۲۰	اپریل ۱۹۵۱ء	عام شمارہ	۲۳۲
۲۱ - ۲۲	مئی ۱۹۵۲ء	عام شمارہ	۲۶۴
۲۳ - ۲۴	جولائی ۱۹۵۲ء	عام شمارہ	۲۴۰
۲۵ - ۲۶	ستمبر ۱۹۵۲ء	○ افسانہ نمبر	۴۰۰
۲۷ - ۲۸	نومبر ۱۹۵۲ء	عام شمارہ	۲۴۰
۲۹ - ۳۰	فروری ۱۹۵۳ء	○ پنج سالہ نمبر	۴۰۸
۳۱ - ۳۲	مئی ۱۹۵۳ء	عام شمارہ	۲۰۸
۳۳ - ۳۴	اگست ۱۹۵۳ء	عام شمارہ	۲۰۸
۳۵ - ۳۶	اکتوبر ۱۹۵۳ء	عام شمارہ	۲۴۸
۳۷ - ۳۸	جنوری ۱۹۵۴ء	○ افسانہ نمبر	۵۰۶
۳۹ - ۴۰	مارچ ۱۹۵۴ء	عام شمارہ	۲۱۶
۴۱ - ۴۲	مئی ۱۹۵۴ء	○ غزل نمبر	۴۸۰
۴۳ - ۴۴	جولائی ۱۹۵۴ء	○ ضمیمہ غزل نمبر	۲۵۶
۴۵ - ۴۶	ستمبر ۱۹۵۴ء	عام شمارہ	۲۶۴
۴۷ - ۴۸	جنوری ۱۹۵۵ء	○ شخصیات نمبر	۷۰۰
۴۹ - ۵۰	۱۹۵۵ء	○ منٹو نمبر	۳۸۴
۵۱ - ۵۲	جولائی ۱۹۵۵ء	عام شمارہ	۲۴۸

۵۳ - ۵۴	دسمبر	۱۹۵۵ء	○ افسانہ نمبر (دو جلدیں)	۱۰۹۰
۵۵ - ۵۶	مارچ	۱۹۵۶ء	عام شمارہ	۲۰۸
۵۷ - ۵۸	جون	۱۹۵۶ء	عام شمارہ	۲۴۶
۵۹ - ۶۰	اکتوبر	۱۹۵۶ء	○ شخصیات نمبر حصہ دوم	۸۱۶
۶۱ - ۶۲	جنوری	۱۹۵۷ء	سالنامہ	۳۸۴
۶۳ - ۶۴	جون	۱۹۵۷ء	عام شمارہ	۳۱۲
۶۵ - ۶۶	نومبر	۱۹۵۷ء	○ مکاتیب نمبر (دو جلدیں)	۱۰۴۸
۶۷ - ۶۸	اگست	۱۹۵۸ء	○ دس سالہ نمبر	۴۵۴
۶۹ - ۷۰	اکتوبر	۱۹۵۸ء	عام شمارہ	۲۷۲
۷۱ - ۷۲	فروری	۱۹۵۹ء	○ طنز و مزاح نمبر	۹۲۸
۷۳ - ۷۴	مئی	۱۹۵۹ء	عام شمارہ	۲۵۲
۷۵ - ۷۶	ستمبر	۱۹۵۹ء	○ پطرس نمبر	۶۴۰
۷۷ - ۷۸	دسمبر	۱۹۵۹ء	○ خاص نمبر	۳۹۴
۷۹ - ۸۰	اپریل	۱۹۶۰ء	○ ادب عالیہ نمبر	۱۲۷۰
۸۱ - ۸۲	جون	۱۹۶۰ء	عام شمارہ	۲۸۰
۸۳ - ۸۴	اگست	۱۹۶۰ء	عام شمارہ	۲۵۶
۸۵ - ۸۶	نومبر	۱۹۶۰ء	○ افسانہ نمبر	۷۰۴
۸۷	فروری	۱۹۶۱ء	عام نمبر	۳۱۲
۸۸	مئی	۱۹۶۱ء	عام نمبر	۲۴۶
۸۹	؟ جنوری	۱۹۶۰ء	○ غزل نمبر (اضافہ شدہ)	۷۵۲
۹۰	اکتوبر	۱۹۶۱ء	عام نمبر	۲۶۴
۹۱	دسمبر	۱۹۶۱ء	عام نمبر	۳۰۴
۹۲	فروری	۱۹۶۲ء	○ لاہور نمبر	۱۲۰۴
۹۳	مئی	۱۹۶۲ء	عام شمارہ	۳۲۸
۹۴	جولائی	۱۹۶۲ء	عام شمارہ	۳۰۶

۹۵	اکتوبر ۱۹۶۲ء	عام شمارہ	۲۱۲
۹۶	جنوری ۱۹۶۳ء	○ سالنامہ	۶۰۸
۹۷	مارچ ۱۹۶۳ء	عام شمارہ	۳۰۸
۹۸	جون ۱۹۶۳ء	عام شمارہ	۴۰۸
۹۹	ستمبر ۱۹۶۳ء	○ شوکت تھانوی نمبر	۶۲۴
۱۰۰	جون ۱۹۶۴ء	○ آپ بیتی نمبر (دو جلدیں)	۱۹۶۴
۱۰۱	نومبر ۱۹۶۴ء	عام شمارہ	۵۶۸
۱۰۲	مئی ۱۹۶۵ء	عام شمارہ	۵۰۰
۱۰۳	ستمبر ۱۹۶۵ء	عام شمارہ	۵۵۲
۱۰۴	جنوری ۱۹۶۶ء	عام شمارہ	۵۱۰
۱۰۵	اپریل ۱۹۶۶ء	○ سالنامہ (تین جلدیں) (جنگ نمبر)	۱۲۲۴
۱۰۶	اکتوبر ۱۹۶۶ء	○ خاص نمبر	۶۱۲
۱۰۷	مئی ۱۹۶۷ء	عام شمارہ	۴۲۶
۱۰۸	ستمبر ۱۹۶۷ء	○ خاص نمبر	۶۲۰
۱۰۹	اپریل ۱۹۶۸ء	○ خطوط نمبر (تین جلدیں)	۱۷۲۰
۱۱۰	نومبر ۱۹۶۸ء	○ افسانہ نمبر	۶۷۶
۱۱۱	فروری ۱۹۶۹ء	○ غالب نمبر ۱	۸۴۰
۱۱۲	اگست ۱۹۶۹ء	عام شمارہ	۴۲۲
۱۱۳	اکتوبر ۱۹۶۹ء	○ غالب نمبر ۲	۲۸۸
۱۱۴	جولائی ۱۹۷۰ء	عام شمارہ	۳۹۲
۱۱۵	دسمبر ۱۹۷۰ء	عام شمارہ	۴۴۸
۱۱۶	ستمبر ۱۹۷۱ء	○ غالب نمبر ۳	۶۱۲
۱۱۷	مئی ۱۹۷۲ء	عام شمارہ	۴۲۴

۱۱۸	جولائی ۱۹۷۳ء	○ سالنامہ	۵۲۸
۱۱۹	ستمبر ۱۹۷۴ء	○ افسانہ نمبر	۵۰۸
۱۲۰	جنوری ۱۹۷۶ء	○ سالنامہ	۶۲۰
۱۲۱	ستمبر ۱۹۷۷ء	○ اقبال نمبر ۱	۵۵۷
۱۲۲	نومبر ۱۹۷۷ء	○ اقبال نمبر (نیرنگِ خیال)	۶۰۰
۱۲۳	دسمبر ۱۹۷۷ء	○ اقبال نمبر ۲	۶۵۴
۱۲۴	جنوری ۱۹۷۹ء	○ سالنامہ	۵۳۰
۱۲۵	اکتوبر ۱۹۸۰ء	○ میر نمبر ۱	۶۳۲
۱۲۶	نومبر ۱۹۸۰ء	○ میر نمبر ۲	۶۴۰
۱۲۷	ستمبر ۱۹۸۱ء	○ ادبی معرکے نمبر (دو جلدیں)	۱۲۸۸
۱۲۸	نومبر ۱۹۸۱ء	○ انیس نمبر	۷۲۸
۱۲۹	ستمبر ۱۹۸۲ء	○ عصری ادب نمبر	۸۶۰
۱۳۰	دسمبر ۱۹۸۲ء	○ رسول نمبر[ل] (دو جلدیں)	۱۵۷۶
۱۳۰	جنوری ۱۹۸۳ء	○ رسول نمبر (دو جلدیں)	۱۵۰۰
۱۳۱	جولائی ۱۹۸۳ء	○ میر نمبر ۳	۵۷۲
		کل صفحات	۴۵۸۹۳

مورخہ ۱۴ راگست ۱۹۸۳ء

ل اس موضوع پر کم از کم دس جلدیں پیش کی جائیں گی ان شاء اللہ!

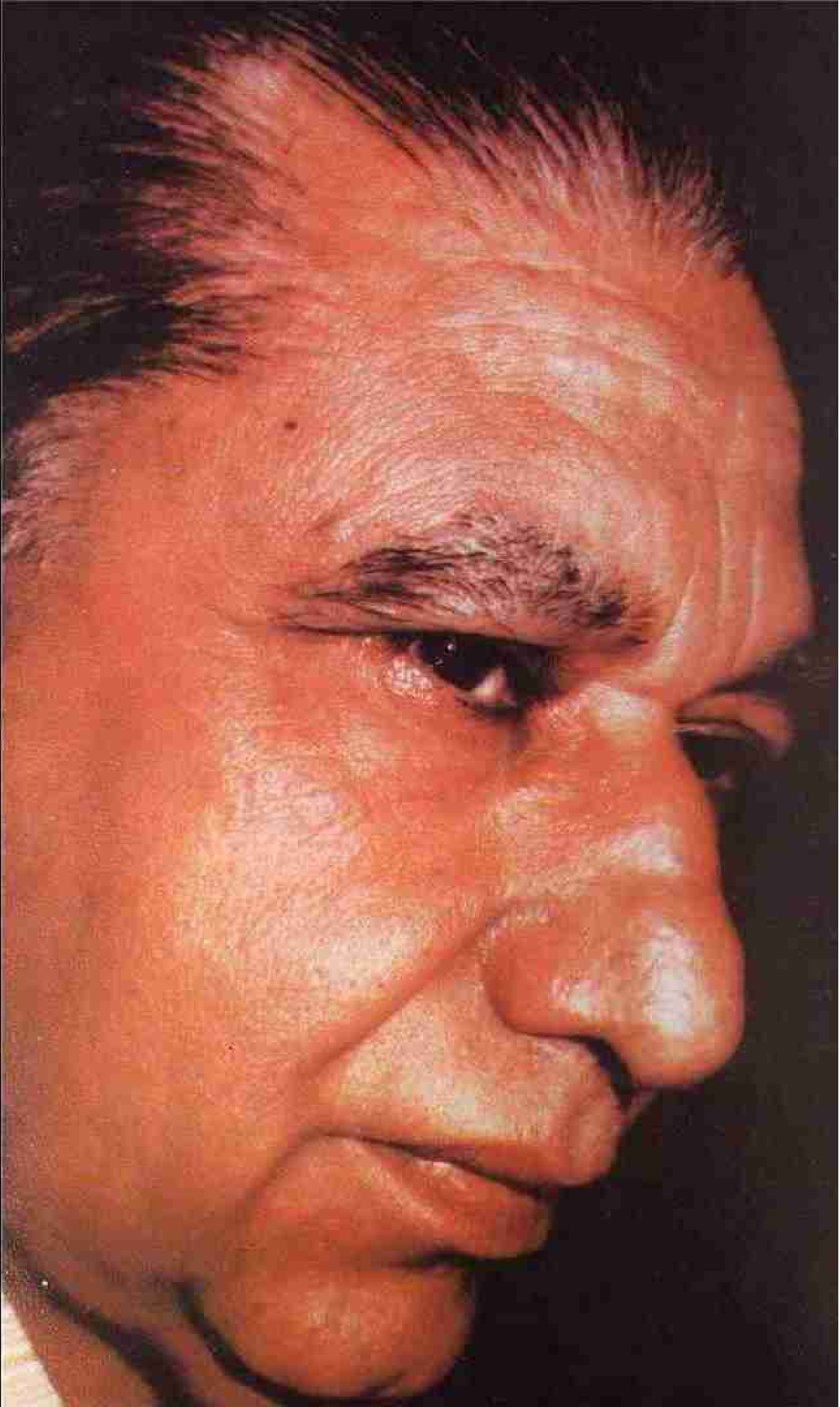

تصانیف

خاکے: ایک نئے اسلوب کے آئینے میں

نام کتاب	زیر بحث شخصیتیں		صفحات
(۱) صاحب	سعادت حسن منٹو	احمد ندیم قاسمی	
	شوکت تھانوی	جگر مراد آبادی	
	فراق گورکھپوری	سید عابد علی عابد	
	احسان دانش		۲۰۶
(۲) جناب	مولوی عبد الحق	پطرس بخاری	
	اختر شیرانی	شکیلہ اختر	
	مدیر نقوش	قاضی عبد الغفار	
	یگانہ چنگیزی	مجاز لکھنوی	
	ڈاکٹر محمد باقر	حمید احمد خاں	
	میرزا ادیب	بلونت سنگھ	
	عشرت رحمانی	ظہیر کاشمیری	
	قدرت اللہ شہاب	قیوم نظر	
	ابراہیم جلیس	سیف الدین سیف	
	اے حمید	اشفاق احمد	
	انتظار حسین	ناصر کاظمی	۲۱۶
(۳) آپ	نیاز فتحپوری	جوش ملیح آبادی	
	اختر اورینوی	کرشن چندر	۲۲۸

(۴) محترم	جوش ملیح آبادی	ایوب محسن	
	ریاض انور	شوکت صدیقی	
	ڈاکٹر نبی بخش بلوچ	حسام الدین راشدی	
	صہبا لکھنوی	آفاق صدیقی	
	محسن بھوپالی	انصار ناصری	
	حفیظ ہوشیارپوری	ماہر القادری	
	حمید نسیم	ابنِ انشا	
	جمیل الدین عالی	ہاجرہ مسرور	
	شاہد احمد دہلوی	شان الحق حقی	۱۵۰
(۵) مکرم	مصطفیٰ زیدی	شاہد احمد دہلوی	
	حکیم یوسف حسن		۲۰۰
(۶) معظم	ممتاز مفتی	خدیجہ مستور	
	صادقین	مولانا کوثر نیازی	
	مختار مسعود		۲۰۲
(۷) مجتبیٰ	چودھری نذیر احمد	میرزا ادیب	
	سیّد وقار عظیم	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	
	اقبال صلاح الدین	قتیل شفائی	
	موجد	عطاءَ الحق قاسمی	۱۸۰
(۸) مخدومی	ابوالاثر حفیظ جالندھری		۱۷۶

کل صفحات : ۱۵۵۸

دادوتحسین، صدارتی خطبات:

جنرل محمد ضیاءُ الحق
فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں
ذوالفقار علی بھٹو
اندرا گاندھی
جسٹس سجّاد احمد جان
جسٹس عطاءُ اللہ سجّاد
خواجہ شہاب الدین
نوابزادہ شیر علی خاں
میر علی احمد تالپور

○

"ادبی معرکے" کی تقریب میں

جنرل محمد ضیاءُ الحق (صدرِ پاکستان)

مدیرِ نقوش جناب طفیل صاحب اور خواتین و حضرات! —— السلامُ علیکم

یہ نقوش کے مدیر محمد طفیل صاحب کی تقریب ہے جنھیں محمد نقوش بھی کہتے ہیں، آج کی تقریب کے میرِ محفل میر علی احمد تالپور ہیں۔ میں نے جب یہ سُنا کہ نقوش کے ادبی معرکے نمبر کے بہانے یہاں ایک ادبی معرکہ برپا ہے تو میں نے سوچا کہ ادھر کا نظارہ بھی کرتے جائیں۔ میں یہاں کوئی تقریر کرنے نہیں آیا آپ حضرات سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے یہاں ادیبوں اور ادبی رسالوں خاص طور پر نقوش کی محبت کھینچ لائی ہے، میں اس محبت کے چند گھونٹ پی کر واپس چلا جاؤں گا کیونکہ اسی شام مجھے اسلام آباد میں ایک اور محفل میں شرکت کرنی ہے اور اس اثناء میں صرف چند کلمات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

آپ سے میں معافی کا خواستگار ہوں کہ محفل میں مُخل ہوا ہوں، یہاں مرزا ادیب اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے، میرے آنے کی وجہ سے شاید انھیں کچھ زحمت ہوئی ہے جس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں چلا جاؤں گا۔ آپ نے باقی مقالے سُن کے جانا ہے کیونکہ نقوش نے آپ کو دعوت دی ہے۔ بعض حضرات نے بعد میں نقوش کی تعریف میں کچھ کہنا ہے یا نقوش کی تنقید کرنی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان سے بہرہ ور نہیں ہو سکوں گا۔ لیکن میں آپ سے اس کی پہلے معافی چاہتا ہوں، کیونکہ یہ نقوش کی تقریب ہے اس لیے مختصراً نقوش کے بارے میں اپنے تاثرات ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میرے اپنے نقطۂ نگاہ سے نقوش ایک وزنی پرچہ ہے جس سے قُلی سے لے کر قاری تک سبھی متاثر ہوتے ہیں۔ قُلی اور اُس کی برادری سے تعلق رکھنے والے عموماً نقوش کی عظمت کا اندازہ اس کے حجم سے کرتے ہیں جبکہ پڑھے لکھے لوگ اس کی معنوی عظمت کی داد دیتے ہیں، میں نقوش کو ایک اعلیٰ پایہ کا عظیم ادبی پرچہ سمجھتا ہوں جس کی نظیر مجھے پاکستان یا اس کے باہر نہیں ملتی۔ اس پرچے کی اپنے قارئین پر گرفت اتنی مضبوط ہے کہ جو کوئی ایک بار اس کا اسیر ہوا

اُس نے کبھی اس کی گرفت سے نجات نہیں پائی - میں گزشتہ تیس سال سے خود اس کا اسیر ہوں۔ نقوش کے زیادہ تر نمبر میرے پاس محفوظ ہیں، کچھ بعض حضرات لے کر غائب ہو گئے ہیں - لیکن اس سے یہ چیز ضرور نظر آئی کہ وہ نقوش کے شیدائی ہیں اور جو کوئی نقوش کا کوئی نمبر ادھار مانگ کر یا چوری کر کے لے جائے، میرے خیال میں اس پر چوری کی حد واجب نہیں ہوتی۔

نقوش کی شہرت کے ذمہ دار دو عناصر ہیں، ایک محمد طفیل اور دوسرے ان کے ترتیب دیے ہوئے لافانی نمبر، جن کی میرے ذخیرے کے مطابق تعداد تقریباً پندرہ ہے، اُن میں سے ایک نمبر اپنی جگہ سینکڑوں کتابوں پر حاوی ہے - ایک ایک نمبر اپنی جگہ سنگِ میل ہے، ایک ایک نمبر ہماری ادبی تخلیقات کا شاہکار ہے - میں دورِ حاضر کو نقوش کا عہدِ شباب سمجھتا ہوں - نقوش کو جوان کرنے میں طفیل صاحب بوڑھے ہو گئے اُنھوں نے نقوش کے بچپن میں اس کی سرپرستی سنبھالی تھی اور اب اسے جوانی کی ایسی شاہراہ پر لے آئے ہیں کہ لوگ طفیل صاحب کی عمر کا اندازہ اُن کے سِن و سال سے نہیں نقوش کے معیار سے کرتے ہیں، جب تک نقوش جوان ہے طفیل صاحب کو کوئی بوڑھا نہیں کہہ سکتا اور جب نقوش بوڑھا ہو گیا تو طفیل صاحب کی جوانی کا بھرم بھی ٹوٹ جائے گا۔

طفیل صاحب کا تازہ ادارتی معرکہ یعنی ادبی معرکے جس کی کہ آج رونمائی ہو رہی ہے دو ضخیم جلدوں پر محیط ہے - اس کے گرد پوش پر فکاہیہ خاکے دیکھ کر پہلے میں سمجھا کوئی ہلکی پھلکی چیز ہے لیکن جب ان کا مطالعہ شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو کئی کتابوں پر بھاری ہے - ذاتی چپقلشوں سے قطع نظر اس تازہ نمبر میں اتنا پُرمغز مواد ہے کہ اسے بلا مبالغہ اردو ادب اور زبان کی تاریخ کہا جا سکتا ہے - میں یہ یادگار نمبر ترتیب دینے پر جناب طفیل صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں میرے لیے ادبی معرکے نمبر کے تمام مندرجات پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں، البتہ ایک چھوٹا سا نکتہ آپ کے غور و فکر کے لیے یہاں چھوڑنا چاہتا ہوں، یہ نکتہ اردو زبان سے متعلق ہے، جس کے بارے میں زیرِ نظر شمارے میں طویل بحث کی گئی ہے - یعنی برّصغیر کے کسی علاقے نے اُردو زبان کی ترویج میں کیا کردار ادا کیا ہے اور کہاں کہاں اُردو زبان میں کیا کیا نشیب و فراز آئے، میں سمجھتا ہوں کہ اب اردو زبان کا مستقبل پاکستان کے ساتھ اور پاکستان کا مستقبل اُس کی قومی زبان کے ساتھ وابستہ ہے ——— (تالیاں) جس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ روایت سے تعلق توڑے بغیر اردو کو پاکستانی ماحول کے مطابق پھلنا پھولنا ہے اور ہر زندہ زبان کی طرح متروک الفاظ سے اپنا دامن جھاڑ کر مقامی اثرات کو اپنے دامن میں جگہ دینا ہے۔

مجھے یہ سُن کر خوشی ہوتی ہے کہ گزشتہ چونتیس برسوں میں اُردو نے جو آہنگ اختیار کیا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ وہ خالصتاً پاکستانی آہنگ ہے یہ پاکستانی آہنگ ہماری پہچان اور تشخص کے لیے بڑا خوش آیند ہے۔ حکومتِ پاکستان کی یہ خواہش اور کوشش ہے کہ اسی پاکستانی آہنگ سے آراستہ اردو زبان کو زندگی کے تمام شعبوں میں رائج کیا جائے جس کے لیے کئی اقدامات کیے جا رہے ہیں، میں پروپیگنڈہ کے الزام سے بچنے کے لیے یہاں ان اقدامات کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا لیکن اگر یہاں تلقین شاہ صاحب موجود ہیں تو وہ میری ضرور تائید کریں گے۔

میں نے جو بات اردو زبان کے حوالے سے کہی ہے وہی اُردو ادب پر بھی صادق آتی ہے یعنی پچھلے تیس پینتیس برسوں میں جہاں ہماری قومی زبان میں انفرادیت کا عنصر داخل ہوا ہے وہاں ہمارے ادب میں بھی قومی سوچ کے دھارے نمایاں ہونے لگے ہیں، ایسی کئی تخلیقات کے بارے میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کے لکھنے والوں کے نام مٹا کر بھی انھیں کسی دوسرے ملک میں شائع کرا دیا جائے تو یہ تخلیقات خود گواہی دیں گی کہ ہمارا خالق پاکستانی ہے اور خالص پاکستانی ہے، مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ قومی رنگ زیادہ سے زیادہ ادبی اور شعری شہ پاروں میں نظر آنے لگے گا۔ حکومتِ پاکستان ایسے مثبت اور پاکستانی ادب کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنا چاہتی ہے، حکومت چاہتی ہے کہ ملک کے ادیب اور شاعر کسی جھجک یا کسی روک ٹوک کے بغیر ادب تخلیق کریں اور ملک کی ادبی اور ثقافتی زندگی میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں، اس ضمن میں یہ وضاحت کر دینا چاہتا ہوں یا اسے آپ ایک اعلان سمجھ لیجئے۔ پچھلے روز، ایک میرے رفیق ہیں اُن سے بات ہو رہی تھی تو انھوں نے کہا کہ ایک حضرت ہیں میں نام اُن کا نہیں لوں گا اُنھیں خود معلوم ہو جائے گا۔ اُنھوں نے اپنی کتاب چھاپی اور وہ کتاب سنسر سے بچ نہیں سکی اور اُنھوں نے جو بھی چھاپا ہے ماشاءاللہ ان کو داد دینی چاہیے، اُنھوں نے سنسر شدہ مواد کی جگہ خالی چھوڑ کر اُس کو چھاپ دیا۔ میں نے اُن سے پُوچھا کہ بھئی کتابوں پر سنسر کب سے لاگو ہو گئی ... کیونکہ اگر جسٹس منیر "جناح ٹو ضیا" چھاپ سکتے ہیں تو پھر یہ صاحب کیوں نہیں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے، مجھے معلوم ہے احمد ندیم قاسمی کے مقالوں پر کوئی سنسر نہیں، مجھے امید ہے نقوش بھی طفیل صاحب نے سنسر کے سامنے پیش نہیں کیا، جہاں تک ادب کا تعلق ہے آپ اسے

اعلان سمجھ لیجیے، آپ اسے حکومت کی پالیسی سمجھ لیجئے کوئی ان پر سنسر نہیں ـــــ (تالیاں) ـــــ ادبی یا تخلیقی کتابوں پر کوئی سنسر نہیں، کیونکہ ادیب سوچوں کے بادشاہ ہوتے ہیں اور سوچوں پر پہرے بٹھانا ناممکن ہے اور ادیب تو ایک ایسا فنکار ہے جو پابندیوں کے باوجود اپنی بات کہنے کا ہُنر جانتا ہے۔ اگر تخلیقی کام کرنے والا سنسر کی زد میں آجائے تو سمجھ لیجئے اس کا فن ناپختہ ہے، اُسے مزید دم پُخت کرنے کی ضرورت ہے، تخلیقی بھٹّی سے نکلا ہوا کھرا فن پارہ خالص سونا ہوتا ہے اور سونے کی کون قدر نہیں کرتا، لہٰذا آپ اپنی تخلیقی کانوں کا سونا تلاش کیجئے، جو چاہے لکھیے، جس طرح چاہے لکھیے، البتہ اس بات کا خیال ضرور رکھیے کہ آپ کا ایک ملک ہے اور اس ملک کا ایک نظریہ ہے، اس ملک اور نظریے کے کچھ حقوق ہیں جنھیں پُورا کرنا ہر شہری کا فرض ہے خواہ کسان ہو، خواہ وہ ادیب ہو، خواہ صنعت کار ہو، شاعر ہو، تاجر ہو، نقّاد ہو، ضیاءُ الحق ہو یا حفیظ جالندھری ہو ـــــ (تالیاں) ـــــ

قومی ادب اور آزادیِ اظہار میرا مرغوب موضوع ہے جس پر میں کافی دیر تک اظہارِ خیال کر سکتا ہوں لیکن شاید آج کی تقریب کے لیے اس سے زیادہ ڈوز (DOSE) دینا جائز نہیں ہوگا۔

میں نقوش کے حوالے سے چند ایک اعلانات کرنا چاہتا ہوں، ایک یہ کہ اس سے ہر سال پچاس ہزار روپے پر مبنی ایک نقوش ایوارڈ دیا جائے گا ـــــ (تالیاں) ـــــ اس ایوارڈ کے مستحق وہ ادیب، وہ شاعر، وہ محقق، وہ نقّاد، وہ دانشور ہوں گے جن کی نقوش میں مطبوعہ تحریر سب سے بہتر قرار دی جائے گی۔ اس ایوارڈ کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک پانچ رکنی کمیٹی تشکیل دی جائے گی جس میں دو ادیب اور دو سرکاری افسر یا اہلکار ہوں گے اور ایڈیٹر نقوش جناب محمد طفیل صاحب اس کمیٹی کے سیکرٹری ہوں گے ـــ (تالیاں) ـــــ

اگرچہ اس ایوارڈ کی تفصیلات کمیٹی طے کرے گی لیکن میرے ذہن میں اس کا خاکہ کچھ اس طرح آرہا ہے کہ یہ ایوارڈ ادب کی معروف اصناف یعنی تخلیقی نثر، شاعری، تحقیق اور تنقید میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی سال بھر میں نقوش میں چھپنے والی بہترین نثری، شعری، تحقیقی یا تنقیدی تخلیق کے لیے چند ہزار روپے کا انعام، کمیٹی چاہے تو ہر صنفِ ادب کے لیے پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام بھی دے سکتی ہے یا اگر وہ چاہے تو اس کا کوئی اور طریقۂ کار اختیار کر سکتی ہے لیکن میری طرف سے یعنی حکومت کی طرف سے ہر سال پچاس ہزار روپے

کی رقم نقوش کے ذریعے تخلیقی اور تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی پر خرچ ہوگی۔

دوسرا اعلان نقوش کے اگلے نمبر کے لیے ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کا آیندہ نمبر تمام سابقہ نمبروں سے اعلیٰ، تمام پرچوں سے بہتر اور تمام شماروں سے بڑھیا ہوگا، کیوں کہ جیسا کہ طفیل صاحب نے فرمایا کہ اگلا نمبر رسولؐ نمبر ہوگا۔

مجھے علم ہوا ہے کہ یہ نمبر کوئی دس ہزار صفحات پر مبنی ہوگا دس بارہ جلدوں میں شائع کیا جائے گا۔ اس نمبر کی قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہوگی کہ اس کا موضوع دنیا کی عظیم ترین شخصیت ہوگی جس کا تعارف میرے بس میں نہیں، یعنی رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم پر مبنی "رسولؐ نمبر" —— طفیل صاحب تو یہ کام اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے کر رہے ہیں لیکن میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کارِ خیر میں ہم اُن کی دنیا بھی خراب نہیں ہونے دیں گے۔ میرا اُن سے یہ وعدہ ہے کہ وہ اپنے ذوق و شوق کے مطابق یہ نمبر ترتیب دیں اور کثیر تعداد میں یہ نمبر خریدنے کی میں ضمانت دیتا ہوں —— ("تالیاں") —— آخر میں، میں ایک چیز ذاتی طور پر کہنا چاہتا ہوں —— طفیل صاحب نے اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ کہا ہے کہ ان کی اہلیہ اس دفعہ حج پر گئیں اور طفیل صاحب نے کہا کہ میں کیا چیز لے کر حج کرنے کے لیے جاؤں، میں اُن کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اگر اس سال نہیں گئے تو اگلے سال ضرور جائیں —— رسولؐ نمبر چھپنے سے پہلے جائیں اور وہاں روضۂ رسولؐ پر کھڑے ہو کر کہیں کہ:

"یا رسول اللہؐ! میں تو خالی ہاتھ آیا ہوں میری جھولی بھر دیجیے۔"

پھر نقوش کا رسولؐ نمبر نکالیے، پھر دیکھیے اس کے اندر کیا برکت ہوگی!

پاکستان زندہ باد —— ("تالیاں")

صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمدؐ ایوبؑ خاں کا پیغام

نقوش کے.. ادبی شمارے کی اشاعت پر میں ادارے اور اس کے مدیر کو مبارکباد دیتا ہوں، جنھوں نے ذاتی محنت اور مسلسل کاوش سے نقوش کو اس معیار پر لا کھڑا کیا ہے کہ آج یہ جریدہ بین الاقوامی شخصیتوں کی خودنوشت سوانح پیش کر رہا ہے۔

اگرچہ بعض مصروفیتوں کی وجہ سے میں اس ادبی اجتماع میں شریک نہیں ہو سکتا، لیکن ذہنی طور میں اس ادبی جشن میں شریک ہوں۔ میں پاکستان کے ادیبوں اور فن کاروں کا مدّاح ہوں۔ ان سے ہماری بہت سی قومی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ ادیب اور فنکار قوم کے معمار ہوتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ پاکستان کے ادیبوں نے آج تک ہم سے تعاون کا ہاتھ بڑھائے رکھا۔ یہ ایک تعمیری رجحان ہے۔

نقوش ادیبوں اور فن کاروں کا ایک نمایندہ جریدہ ہے جو صالح اور تعمیری ادب پیش کرتا رہا ہے۔ اعلیٰ ادب پیش کرنے والے جریدوں کی تعداد ہمارے ہاں بہت کم ہے۔ اسی وجہ سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے میری خواہش ہے کہ ایسے جریدے تعداد میں بڑھیں اور ملک میں باذوق قاری پیدا کریں۔

محمد ایوب خاں فیلڈ مارشل

ذوالفقار علی بھٹو

"نقوش کے سویں شمارہ کی اشاعت کے موقع پر پیغام بھیجتے ہوئے ان شاندار خدمات کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی جو اس جریدے نے اس ملک کے ادبی ارتقا کے سلسلہ میں انجام دی ہیں۔

ایک ایسے دَور میں جبکہ قیامِ پاکستان نے فرسودہ روایات اور پرانے رجحانات میں تبدیلی کی ضرورت پیدا کر دی تھی اس جریدے نے ادبی ماحول میں خوشگوار، صحت مند اور بروقت تبدیلی پیدا کرنے اور ادب کو نئے زاویے عطا کرنے میں بہت گرانقدر کام کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ادب دوست حضرات کے ذوق کو صحتمند دھارے میں موڑنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ خدمات ہماری ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

نقوش کے اس "آپ بیتی نمبر" کی اشاعت پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ نقوش کی زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو

نمبر ۹۸۲۳/۸۲/۴ بی پی   مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء

نقوش اور اندرا گاندھی

محترم طفیل صاحب!

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

فروری ۱۹۸۲ء میں جب ہم لوگ دہلی میں پاکستانی کتابوں کی نمائش کے لیے جا رہے تھے تو میں اور جناب ابراہیم سعد صاحب آپ سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے تھے باہمی دلچسپی کی بہت ساری باتیں ہوئی تھیں آپ نے بہت سے مفید مشورے بھی دیے تھے اور جب سلسلۂ گفتگو دراز ہوا تو آپ نے وہاں کے لکھنے پڑھنے والوں کے حوالے سے بہت ساری محبت بھری باتوں کا بھی ذکر کیا تھا۔

آپ کو جب یہ بتایا گیا کہ اس نمائش کا افتتاح بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کریں گی اور پاکستانی سٹال پر آئیں گی تو آپ نے ان کے لیے "نقوش" کے ادبی معرکے نمبر کی دو مجلد عکسی جلدیں مسز اندرا گاندھی کو پیش کرنے کے لیے ہمیں دی تھیں جو ہم اپنے ساتھ دہلی لیتے گئے۔

۴ فروری ۱۹۸۲ء کو پرگتی میدان میں بین الاقوامی نمائش کتب کا افتتاح ہوا اور حسب توقع مسز اندرا گاندھی دوسرے سٹالوں کو دیکھتی ہوئی پاکستانی سٹال پر آئیں انھوں نے بڑے اشتیاق سے سٹال پر سجائی گئی مختلف موضوعات پر کتابیں دیکھیں اور ان کے معیارِ طباعت کو سراہا انھوں نے پاکستان کی کتابی صنعت کے بارے میں بھی دریافت کیا اور اس کے بارے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

اس موقع پر جناب ابراہیم سعد صاحب نے مسز اندرا گاندھی کو "نقوش" کی مذکورہ دونوں جلدیں پیش کیں اور ساتھ ہی انھیں بتایا کہ یہ خصوصی نمبر کس خاص موضوع سے متعلق ہیں۔ مسز اندرا گاندھی نے موضوع کے حوالے سے بڑی دلچسپی سے دونوں جلدیں وصول کیں اور

شکریہ ادا کیا۔ جب انھیں یہ بتایا گیا کہ آپ کے والد کے دیرینہ شناسا جناب محمد طفیل صاحب نے یہ دونوں جلدیں آپ کے لیے خاص طور پر بھجوائی ہیں تو وہ بے حد خوش ہوئیں اور ممنونیت کا اظہار کیا۔

انھیں یہ بھی بتایا گیا کہ یہ نقوش کے وہ تاریخی شمارے ہیں جن کی اشاعت کے بعد ایک خاص تقریب میں پاکستان کے صدر جناب جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک خاص ادبی ایوارڈ جاری کرنے کا اعلان کیا ہے جس کی مالیت پچاس ہزار روپے ہوگی۔ یہ ایوارڈ ہر سال نقوش میں چھپنے والی ہم عصر تخلیقات کے مصنفین میں تقسیم کیے جایا کریں گے۔

مسز اندرا گاندھی نے رخصت ہوتے وقت ایک بار پھر اس قیمتی تحفے کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی کتاب میلے میں پاکستان کی شرکت کو خوش آمدید کہا۔

مسز اندرا گاندھی کے ہمراہ ان کی بہو بھی تھیں جنھوں نے پاکستانی مطبوعات کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

یہ ایک انتہائی مختصر سی تقریب تھی لیکن اگلے روز جب ہمیں یہ بتایا گیا کہ مسز اندرا گاندھی نے پاکستانی سٹال پر سب سے زیادہ وقت گزارا تھا تو ہمیں مسرت ہوئی کہ پاکستانی کتابوں کے معیار، موضوعات کے تنوع اور "نقوش" کے شماروں[1] نے مسز اندرا گاندھی کو اتنی دیر کے لیے ہمارے سٹال پر روکے رکھا۔

اس موقع پر لی گئی دو تصاویر بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

والسلام

آپ کا صادق

ذوالفقار احمد تابش

ڈپٹی ڈائریکٹر

نیشنل بک کونسل آف پاکستان

---

[1] وہ نمبر اس لیے بھجوائے گئے تھے کہ اس میدان میں پاکستان کے تفوق کا اقرار کرایا جا سکے۔

غالب کی یادیں

جسٹس سجاد احمد جان

ایک صدارتی تقریر جو نقوش کے غالب نمبر
(حصہ اول) کے موقع پر (۳۰ مارچ ۱۹۶۹ء)
کو ارشاد فرمائی گئی

محترم طفیل صاحب، معزز خواتین و حضرات!

جیسا کہ آپ جان چکے ہیں کہ اس پُر لطف صحبت کا مقصد میرزا غالب کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر ادارہ "نقوش" کا نذرانۂ عقیدت ہے جو غالب نمبر کی دلآویز صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ طفیل صاحب نے ازراہِ کرم اس مجلس کے انعقاد سے غالب کے لیے اپنی "پیشکش" کے فیضان میں ہمیں بھی شریک فرمایا ہے۔ جس کے لیے میرا اظہارِ تشکر رسمی نہیں بلکہ ہم سب کے دلی احساسات کی ترجمانی ہے۔

طفیل صاحب نے مجھے اس محفل کی صدارت کی دعوت کچھ اس طریق سے دی کہ مجھے اس بارے میں اپنے استحقاق اور موزونیت پر سوچنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ غالب کی یادیں، اس تقریب سے غالب احساس یہ ہوا کہ اس کی صدارت سے انکار ایک سعادت سے محرومی ہو گی۔ اردو زبان اور اردو ادب کے وابستگان کے لیے غالب کے حضور میں خراجِ عقیدت کی ادائیگی خالصتاً غالب کا حق ہے، جو امتدادِ زمانہ کے باعث کم نہیں ہو گا، بلکہ اردو ادب کی بتدریج ترقی اور عروج کے ساتھ اسی تناسب سے بڑھتی ہوئی مقدار میں ادا ہوتا رہے گا۔

اپنی مربیانہ دعوت کے ساتھ طفیل صاحب نے مجھے غالب نمبر کی ایک جلد مرحمت فرمائی میں اس کی ضخامت اور حسین سرورق سے متاثر ضرور ہوا ہوں لیکن مرعوب نہیں۔ اس لیے کہ میں نقوش کے اس نوعیت کے کئی ایک خصوصی نمبروں سے مانوس ہو چکا ہوں۔ گزشتہ چند مہینوں میں نقوش نے یکے بعد دیگرے خطوط نمبر، افسانہ نمبر اور اب غالب نمبر نکال کر نقوش

طفیل صاحب اردو ادب میں "HAT TRICK" کر دکھایا ہے۔

غالب نمبر کو دیکھتے ہی نقوش کے ان تمام دیگر خصوصی نمبروں کی یادیں بھی تازہ ہو گئیں۔ اور اس کے ٹھوس عام شماروں کا بھی خیال آیا۔ اُن میں سے ہر ایک جس ادبی تحقیق اور علمی ذخیرہ کا حامل ہے اُس سے یک گونہ لذتِ تسکین حاصل ہوئی اور اسی کیفیت میں مَیں نے غالب نمبر کے مندرجات پر نظر ڈالی، تو یہ بھی تحقیق، محنت، کاوش، منفرد مسلک اور حُسنِ انتخاب کے محاسن سے بھرپور نظر آیا جو اب نقوش اور اُس کے ان تھک مدیر کا وطیرہ بن چکا ہے۔ میں نے دیکھا کہ نقوش کے غالب نمبر میں ایسی چیزیں درج ہیں جو ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئی تھیں۔ اگر آئی تھیں تو کمیاب تھیں۔ جیسے ہرگوپال تفتہ کا مرثیہ جس کی غالب شناسوں کو عرصہ سے جستجو تھی۔ میر انیس کا خراجِ تحسین۔ غالب کے مقدمہ کے دلچسپ کوائف وغیرہ۔

میں نے طفیل صاحب سے بے اختیار یہ سوال کیا کہ آپ یہ سب کچھ کیسے کر پاتے ہیں۔ اُن کا بے ساختہ جواب اِس انداز کا تھا کہ میں نے سمجھا اُنھوں نے اپنی ساری شخصیت کا اظہار اِسی ایک فقرے میں کر ڈالا ہے۔ فرمانے لگے، اسے "پاگل پن" سمجھ لیجئے۔ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد کہا، میں جب تہیہ کر لیتا ہُوں کہ یہ کام کرنا ہے تو وہ کام میرے رگ و ریشہ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر میں اُس میں منہمک ہو جاتا ہُوں۔ سُود و زیاں کا احساس غائب ہو جاتا ہے۔ لگن بکل رکھتی ہے کہ کسی طرح یہ کام خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ میں نے کہا طفیل صاحب! آپ کا جواب غیر متوقع نہیں صرف آپ پاگل پن کے لفظ کو مجنوں کی مناسبت سے جنوں میں تبدیل کر دیں تو حقیقت کے زیادہ قریب ہو گا۔ خدا کرے کہ یہ جنوں ہماری قومی زندگی کے ہر شعبہ میں اثر پذیر ہو جائے ایک اصلاح پذیر معاشرہ میں اہم تعمیری کاموں کی تکمیل کے لیے ایسے ہی جنوں کی ضرورت ہے، جس کے بغیر انسانی زندگی حُسن اور موزونیت کی اعلیٰ اقدار سے عاری رہتی ہے ؂

خدایا مجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ میرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

طفیل صاحب تشریف لے گئے تو مزید سوچ پر مجھے اُن کی دعوت قبول کرنے پر اطمینان ہوا۔ انکار فرض ناشناسی ہوتی۔ نقوش نے اپنی مسلسل جد وجہد اور لگاتار محنت سے اردو ادب میں مستقل اور گراں قدر اضافہ کیا ہے جو اد اور رسائل کی تاریخ میں ایک ایسا بلند مقام

حاصل کر لیا ہے جس کے لیے اسے خراجِ تحسین پیش کرنا اس کا حق ہے اور ہمارا فرض۔ مجھے خوشی ہے کہ اس عالی وقار محفل میں مجھے اس فرض کی ادائیگی کا موقعہ میسّر آیا۔

غالب اُن ممتاز شخصیتوں میں سے ہیں جو اپنے عہد کے ماحول کے اعتبار سے قبل از وقت پیدا ہوتی ہیں۔ غالب کی شاعری ماحول اور وقت کی قید سے بالکل آزاد تھی۔ اُنھوں نے ماضی کے شکنجوں اور حال کی پابندیوں سے نکل کر مستقبل کو اپنی آغوش میں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری کی نکتہ سنجی اور دُور رس معانی میں نکھار پیدا ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا وہ اپنے مفکرانہ تجسس کے ساتھ دل کی عمیق گہرائیوں میں اُتر کر انسانی قدروں کے ترجمان بن جاتے ہیں اور اپنے اچھوتے اسلوب سے اپنے خیالات کو حیاتِ جاوداں بخش دیتے ہیں۔

غالب نے اردو کے دامن کو وسیع بنانے میں فارسی اصطلاحات سے کام لیا ہے۔ لیکن صرف وہی اصطلاحات جنھیں اردو کا مزاج آسانی سے قبول کر سکا۔ اور اسی لیے وہ اب اُس کا خوشگوار جزو بن گئی ہیں۔ میری نگاہ میں یہ غالب کا اردو زبان اور ادب پر بہت بڑا احسان ہے۔

غالب نے پیشگوئی کی تھی کہ ؎

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

غالب کی زندگی میں بعض لوگوں نے اُس کے کلام کو مہمل اور بے معنی قرار دیا۔ آج وہ اردو کے مقبول ترین شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کی اردو اور فارسی شاعری جذبات، فکر و دانش اور تاثرات کی حامل ہے جو اپنی انفرادیت، ندرت اور کائناتی تخیل کے باعث دوام حاصل کر چکی ہے غالب کی مدح اور تنقید میں جس قدر لکھا جا چکا ہے یا لکھا جا رہا ہے بہت کم شعرا کو نصیب ہوا ہے۔ مختلف ممالک میں بڑی آب و تاب اور اہتمام کے ساتھ اُن کے دیوان چھپے ہیں روس میں اُن کی صد سالہ برسی بڑی شان سے منائی جا رہی ہے۔ بھارت نے بارہ لاکھ روپیہ صرف کر کے ایک شاندار غالب اکادمی قائم کی ہے صد سالہ برسی کے موقعہ پر وہاں کے بیشتر اردو رسائل نے بڑے شاندار غالب نمبر نکالے ہیں ادب اور شاعری، خصوصاً غالب ایسے وسیع الخیال شاعر کی شاعری جغرافیائی زاویوں سے متعین نہیں کی جا سکتی۔ نہ ہی غالب کی

شخصیت کسی جغرافیائی تقسیم کی حامل ہو سکتی ہے۔ اگر تہذیب و تمدن اور زبان کے لحاظ سے تعین کیا جائے تو میری دانست میں غالب خالص پاکستان کا شاعر ہے۔

بھارت میں جس طریق سے اُردو کے ساتھ نا انصافی کی جا رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ میری رائے میں متعدد وجوہ کی بنا پر غالب کا سب سے زیادہ حق پاکستان اور پاکستان کے لوگوں پر ہے کہ وہ اس کی شخصیت کو اُجاگر کریں تاکہ اُس کی روشن شمع سے علم و ادب کے چراغ جلتے رہیں۔ غالب کے اپنے کلام کی شیرینی اور ہمہ گیری انہی کے اِس شعر کے مصداق ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ادبی معرکے — ایک مبسوط تاریخ

عطاء اللہ سجاد

آج شام کی تقریب محمد طفیل صاحب کے مجلّہ "نقوش" کی اُن دو جلدوں کے تعارف کے لیے منعقد کی گئی ہے جو "ادبی معرکے" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

موجودہ زندگی کی رواداری میں تحقیق و تفحص اور غور و فکر کا رجحان کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن سطحیت اور سہل انگاری کے اِس زمانے میں بھی محمد طفیل نے اپنے لیے ہمیشہ سخت کوشی کا رستہ اختیار کیا اور اردو ادب کی دنیا میں تجسس اور تحقیق کی وقت طلب روش جاری رکھی۔ انھوں نے اردو ادب کے ہر شعبہ میں خواہ اس کا تعلق نظم سے ہو یا نثر سے، افسانے سے ہو یا طنز و مزاح سے، ادبی شخصیات سے ہو یا کسی اور موضوع سے، تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری رکھا اور علم کے گہرے سمندر سے بے بہا موتی نکال کر انھیں اردو کے نگار خانے میں سجا دیا۔ میرے خیال میں اردو زبان کی ایسی ٹھوس، مربوط اور مسلسل خدمت کی مثال دورِ حاضر میں شاذ ہی ملے گی۔

اُن کا تازہ ترین کارنامہ دو جلدوں میں ادبی معرکوں کی اشاعت ہے۔ مضمون کی وسعت کے پیشِ نظر اُنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کے مختلف صُوبوں کے اُن دعاوی کا تجزیہ کیا ہے کہ اُردو اُنھیں کے ہاں سے شروع ہوئی۔ اِس سلسلے میں پنجاب، سندھ، بنگال، بہار، میسور، مدراس اور دکن میں اردو زبان کے آغاز اور اس کی ترویج کا تاریخی پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اِن دعاوی کا تاریخی حوالوں سے موازنہ بھی کیا ہے۔ اس موازنہ کا مجموعی تاثر جو قاری کے ذہن میں آتا ہے وُہ یہ ہے کہ اردو زبان ہندوستان کے مختلف گوشوں میں مختلف قوموں کے ارتباط اور اختلاط سے پیدا ہوئی اور پھر بنگال سے لے کر کشمیر تک اور تورخم سے لے کر کلکتے تک اپنی ہمہ گیری اور عوامی تائید سے پھیلتی گئی کوئی زبان جسے عوامی تائید حاصل ہو اور جو لوگوں کی زبانوں کو چاشنی بخشنے کی صلاحیت رکھتی ہو کسی خارجی تائید اور سرکاری امداد کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ عوامی تائید کا اثر ہے کہ آج ہندوستان میں جہاں اردو کو آزادی کے بعد بڑے صبر آزما مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے شمالی ہند میں ابھی تک اخبارات

اور قلموں کی زبان اردو ہی ہے۔

محمد طفیل صاحب نے ادبی معرکے کی پہلی جلد میں تاریخی حوالوں سے اُن تحریکات کا ذکر بھی کیا ہے جو ۱۸۶۷ء سے اردو کو معدوم کرنے اور ہندی یا ہندوستانی کے نام سے سنسکرت زدہ ہندی کو رائج کرنے کے لیے شروع کی گئیں۔ لیکن اردو کی ہمہ گیری اور اس کے ایک زندہ زبان ہونے کا یہی ثبوت ہے کہ یہ تحریکات بعض اوقات سرکاری تائید کے باوجود بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ طفیل صاحب نے اُس تدریجی سفر کی روداد بھی تاریخ کے صفحات سے نکال کر آپ کے سامنے رکھی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اردو نے فصاحت اور بلاغت کی راہوں میں صدیوں تک کس طرح سفر کیا اور کس طرح نئے نئے الفاظ عوامی ٹکسال سے نکل کر اس کے خزانوں کو معمور کرتے رہے۔

"ادبی معرکے" کی دونوں جلدوں میں زبان کی تاریخ اور اس کی تدریجی ترویج و اشاعت کے علاوہ قواعد، گرامر، تنقید و تقریظ، اصلاحِ سخن اور عروض کے متعلق بھی مستاویزی حوالوں اور شواہد سے نہایت اہم تاریخی اور علمی مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن نہایت اہم مباحث کا بھی تذکرہ ہے جو زبان کے سلسلے میں پیدا ہوئے اور جن پر برعظیم کے ہندو اور مسلمان عمائدین نے اظہارِ خیال فرمایا۔ عمومی موضوعات پر اظہارِ خیال اور اس سلسلے میں ادبی معرکوں کے حوالے کے علاوہ اُن ادبی معرکوں اور مجادلوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جو انفرادی طور پر ادبی شخصیتوں اور شعرا مثلاً انشا اور مصحفی، اور ہمارے اپنے دور کے نزدیک اقبال اور ان کے معترضین اور مولانا ظفر علی خاں اور ان کے حریفوں کے درمیان ہوتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ پرانے شعرا کی باہم آویزی اور چپقلش میں بعض اوقات ثقافت اور تہذیب کی حدوں سے تجاوز نظر آتا ہے۔ لیکن یہ ادب بھی ہمارے ادب کا حصہ ہے اور اس میں زبان کی کاٹ، طنز و مزاح اور تلمیحات اور استعاروں کے لطیف استعمال کا اپنا مقام ہے۔ اس کے علاوہ یہ معرکے اُس زمانے کی ادبی زبان اور ادبی معرکوں کے پس منظر سے آشنا کرتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ان دو نمبروں کی ترتیب و تدوین میں طفیل صاحب نے بے حد عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اردو زبان کی ایک مبسوط تاریخ مع اُن عوامل کے جو اس کی ترویج و اشاعت میں کارفرما تھے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ اُن کے

پہلے کارنامے ہی کیا کم تھے اور ان کے نقوشِ تازہ بھی اپنے آپ میں پائندگی اور ہمیشگی لیے ہوتے ہیں۔

میں اُنھیں اپنی طرف سے اور آپ سب کی طرف سے اِس کارنامے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اُن کی کوششیں آئندہ بھی تابندہ تر اور پائندہ تر نقوش بساطِ اُردو پر ثبت کرنے پر مرکوز رہیں گی۔

خطبۂ صدارت

خواجہ شہاب الدین

محترم طفیل صاحب، معزز خواتین و حضرات!

میرے محترم جناب طفیل صاحب نے میری نسبت جو ستائشی کلمات ارشاد فرمائے وہ خود ان کی عالی ظرفی اور نیک خیالی کا ثبوت ہیں۔ میں اس قدر افزائی کا ممنون ہوں۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ میں ادیبوں اور دانشوروں کی اس مجلس میں اَدب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں۔ ایک عرصہ کے بعد حقیقی معنوں میں ایک خالص ادبی مجلس میں شرکت نصیب ہوئی جو میرے لیے بذاتہٖ ایک سعادت ہے۔

عزیز محترم طفیل صاحب نے جو میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ اپنے مؤقر جریدے 'نقوش' کی بیسویں سالگرہ کی اس تقریب میں شرکت کی دعوت بھی کچھ ایسے محبّت بھرے انداز میں پیش کی کہ مجھے انکار کی مجال نہ ہو سکی۔ اپنے مخصوص دلفریب انداز میں فرمایا:

> "مجھے آپ سے محبّت ہے۔ کیونکہ آپ کو ادب سے محبّت ہے۔ آپ کو بھی مجھ سے اور نقوش سے تعلقِ خاطر ہے۔ اس لیے اپنے 'نقوش' کی بیسویں سالگرہ کی تقریب میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔"

اس دل پذیر فرمائش نے مجھ پر یہ لازم کر دیا کہ اپنے دیگر مشاغل کے باوجود، اس تقریب میں حاضر ہو کر ادب سے اپنے تعلق کا عملی ثبوت دوں اور آپ جیسے ذی قدر اہلِ علم و دانش کا ہمنوا بن کر نقوش کی بیسویں سالگرہ پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کروں۔

بیس سال اُردو کے ادبی رسائل کے لیے عمرِ طبعی سے کچھ زیادہ ہی مدّت ہے۔ اس افسوس ناک صورتِ حال کی وجوہ کا ہم سب کو بخوبی علم ہے اور ہم سے زیادہ خود ان رسائل کے مدیروں کو علم اور ذاتی تجربہ ہے۔ اس کے باوجود ان عوارض کا کوئی تیر بہدف علاج آج تک دریافت نہ ہو سکا۔ اس کا سبب شاید یہ بھی ہو کہ جس قدر یہ عوارض پیچیدہ ہیں اسی قدر ان کے علاج بھی پیچیدہ ہیں اور دیر طلب بھی۔ ہمارے اَن گنت بلند پایہ رسالے اسی کش مکش کا شکار ہو گئے۔ اس خوشی کی تقریب میں ان ناگوار

باتوں سے آپ کو متعارف کرانا مقصود نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ ایسے صبر آزما حالات میں کسی خالص ادبی رسالے کا بیس سال تک مسلسل جاری رہنا معجزہ ہو یا نہ ہو، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کے مدیر غیر معمولی قوت ارادی اور استقامت کے مالک ہیں۔ طفیل صاحب میں ان سب خوبیوں کے علاوہ خلوص اور ادب کی سچی لگن اور خدمت کا جذبہ بھی بدرجۂ وافر ہے۔ یہی ان کی کامیابی کا ضامن ہے۔

نقوش نے بیس سال تک اُردو ادب کی جو گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں۔ میں ہی نہیں پوری ادبی دُنیا اس کی معترف ہے۔ ملک میں جتنے ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں یا ہوتے رہے ہیں ان سب نے، اپنے اپنے طور پر، اُردو ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ملک میں ادب و فن کا جو شعور آج پایا جاتا ہے۔ یہ ہمارے ادبی رسائل ہی کا مرہونِ منت ہے۔ ہر رسالہ اپنی جُداگانہ خوبیوں کا حامل ہے۔ اَدب کے مستند ناقدین نے نقوش کو اس لحاظ سے منفرد قرار دیا ہے کہ اس کے خاص نمبروں نے نہایت اہم تاریخی اور دستاویزی مواد فراہم کیا ہے۔

کہنے کو نقوش ایک ماہنامہ ہے۔ لیکن ادب کے مختلف موضوعات پر اس کے ضخیم خاص نمبر مستقل کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غزل نمبر، افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، آپ بیتی نمبر، یہ تمام خاص نمبر علم و اَدب کے ایسے انمول ذخیرے ہیں جن سے نہ صرف دَورِ حاضر کے ادیب، نقّاد اور طالب علم استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ ان میں تاریخی اہمیت کی جو بیش قیمت معلومات یک جا کر دی گئی ہیں ان سے آنے والی نسلوں کے لکھنے والے، ریسرچ اسکالر اور مبصّر، تذکرہ نگار اور مؤرخ بھی مسلسل فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ یقیناً یہ اُردو ادب کی عظیم خدمت ہے اور اپنے ان تحقیقی کارناموں کی وجہ سے نقوش کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

نقوش کا تازہ شمارہ خطوط نمبر ہے جس میں غالب، سر سیّد احمد خاں، محسن الملک، وقار الملک، علاّمہ اقبال، قائدِ اعظم محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہر، نواب بہادر یار جنگ، حالی اور شبلی سے لے کر دَورِ حاضر کی ممتاز ہستیوں اور نامور ادیبوں اور شاعروں تک، جن کی فہرست خاصی طولانی ہے ان سب کے دو ہزار دو سو ترپن (۲۲۵۳) غیر مطبوعہ خطوط درج کیے گئے ہیں۔ بعض خطوط سو سال پرانے ہیں۔ بعض اس سے کچھ زیادہ اور بعض کچھ کم، ایسے نادر و نایاب خزانے کو بہم تلاش اور مسلسل کاوش سے جمع کرنا پھر ان کرم خوردہ تحریروں کو اس قدر نفاست کے ساتھ طبع کر کے پیش کرنا بہت بڑی خدمت ہے جس کی قدر و منزلت اہل نظر جانتے ہیں۔

ایسے خطوط سے مشاہیر کی شخصیت اور ان کے حالات کے بارے میں ہماری معلومات میں بیش قیمت اضافہ ہوگا۔ متعدد ایسے اہم خطوط بھی ہیں جن سے اسلامیانِ برِصغیر کی تاریخ کے اس دَور کے بہت سے گوشے روشن ہوں گے جسے اکثر ہماری لاعلمی کے باعث تاریک دَور سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس زمانے میں مسلمان چاروں طرف سے شدید خطرات میں محصور تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس تاریک دَور میں بھی ملت مخلص اور دردمند ہستیوں سے خالی نہ تھی۔ قوم کے چند غیور فرزند ایسے بھی تھے جنہوں نے شدید خطرات کے باوجود اپنے اپنے فکر و نظر کے مطابق حرّیت کی شمعیں روشن رکھیں۔ بڑی بڑی قربانیاں دے کر اُنہیں فرنگستانی بادِ سموم کے تھپیڑوں سے بچاتے رہے اور اس شدید ظلمت میں ٹمٹماتی شمعیں لیے آگے بڑھتے رہے۔ اس وقت کسی کو خیال بھی نہ تھا کہ ان کی یہی ٹمٹماتی ہوئی شمعیں ایک دن وہ چراغ روشن کر دیں گی، جو آج خورشیدِ جہاں تاب بن چکا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ایسے اہم خطوط سے جو پہلی بار منظرِ عام پر آرہے ہیں۔ ہمیں اپنی ملی تاریخ کی بعض گم شدہ کڑیوں کو ملانے میں بڑی مدد ملے گی۔ ان سے ہمیں اپنی قومی سرگزشت کے ایسے مستند مآخذ کا سراغ بھی ملے گا جن سے تحریکِ پاکستان کا صحیح تاریخی پس منظر بھی مرتب کیا جا سکے گا کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ مستند مآخذ کے فقدان اور صحیح حالات کے بعض اہم اجزاء کی لاعلمی کے باعث ہماری قومی سرگزشت ابھی تک باضابطہ تدوین کے لیے ترس رہی ہے اور ہمارے اہلِ قلم اور اہلِ فکر کی توجہ کی محتاج ہے۔ آپ جیسے دانشوروں کے سامنے مجھے اس کی مزید تصریح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مستند مآخذ کا جمع کرنا اور ان محرکات و عوامل کا احاطہ کرنا جن سے برِصغیر کے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی تشکیل ہوئی۔ پھر ان عوامل کے نتائج کو مربوط کر کے مکمل حالات کی صحیح رُوداد قلمبند کرنا، ہماری قومی تاریخ کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کام جس قدر مشکل ہے اس سے زیادہ ضروری بھی ہے۔ ہمارے اہلِ قلم حضرات کے علاوہ اور کون ہے جو اس اہم قومی فریضے کو انجام دے سکے؟ زمانے نے انہی کو ہماری تاریخ کے اس عظیم دَور کی ترجمانی کرنے کے جلیل منصب پر فائز کیا ہے۔ کیونکہ ان میں اکثر اصحاب نے اس عہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور خود اپنے ہاتھوں سے یہ تاریخ بنائی ہے۔ اگر یہ حضرات اس فرض کی ادائیگی سے غافل رہے تو آئندہ نسلیں ہمیں کبھی معاف نہ کریں گی۔

مجھے یقین ہے کہ ملک کے تمام اہلِ قلم اس نیک اور اہم فریضے کی ادائیگی میں اپنی خداداد

لیاقت اور محنت کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کریں گے ۔ طفیل صاحب نقوش کا ایک اور ضخیم اور عظیم تر نمبر مرتب کریں گے اور ملک کے دیگر جرائد اور ناشرین کتب بھی اس اہم دستاویزی مواد کو آب و تاب سے شائع کریں گے جس سے ہماری قومی تاریخ صحیح خطوط پر منضبط ہو سکے گی اور آنے والی نسلیں اس تاریخ کو دیکھ کر فخر سے اپنا سر بلند کر سکیں گی ۔

میں مدیر نقوش کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے آج مجھے اس پُر لطف صحبت میں شامل ہونے کا موقع دیا اور مجھے سیاست کے خارزار سے ہٹ کر چند لمحوں کا سکون میسر آیا ۔ خدا اُنہیں اپنی کوششوں میں کامیاب کرے ۔

خطبۂ صدارت

جنرل شیر علی خان

محمد طفیل صاحب ایڈیٹر نقوش نے میرے بارے میں جو تعریفی کلمات ارشاد فرمائے۔ یہ ان کی عزت افزائی ہے۔ میں بھی اُن کا ممنون ہوں۔ موصوف نے حضرت غالب سے میری قرابت داری کا جو ذکر فرمایا ہے اس کی حقیقت اس قدر ہے کہ نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ والئی لوہارو میرے نانا کے پردادا تھے۔ اُن کے بھائی مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم حضرت غالب سے منسوب تھیں۔ اس لحاظ سے حضرت غالب سے میری قرابت داری گویا۔ "ہمیں نسبت ہے دُوری کی"۔

لیکن قرابت داری کے علاوہ میرے بزرگوں کو حضرت غالب سے ہمیشہ گہری عقیدت رہی اور خود حضرت غالب کو بھی اس خاندان سے خصوصی تعلق رہا۔ اس ربط ضبط اور مشفقانہ تعلقات کا تذکرہ ان کے کلام اور خطوط میں جا بجا پایا جاتا ہے۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ میرے پرنانا نواب علاء الدین خاں والئی لوہارو متخلص بہ علائی کو حضرت غالب نے اپنا خلیفۂ اوّل بھی بنایا تھا۔ آپ نے حضرت غالب کا وہ خط بھی پڑھا ہوگا جس میں انہوں نے میرے نانا مرحوم نواب امیر الدین خاں لوہارو کو لکھا تھا کہ میں تمہارا دادا نہیں بلکہ دلدادہ ہوں۔ اس اعتبار سے مجھے بچپن ہی سے یہ سعادت حاصل رہی کہ میں نے حضرت غالب کو دیکھنے والی آنکھوں کو دیکھا اور ان سے گفتگو کرنے والوں کی زبان سے اُن کے بارے میں بہت سی کار آمد اور پُرلطف باتیں سُنیں۔ اگلے زمانے کے بزرگوں کا یہی دستور تھا کہ وہ چھوٹوں کو بڑوں کی اچھی باتیں سنایا کرتے تھے تاکہ اُن کے دل میں بڑوں کا ادب اور احترام بچپن ہی سے قائم ہو جائے۔ اب نہ ویسے بزرگ رہے نہ ویسے چھوٹے اور نہ وہ باتیں ہی رہیں۔ اب اگلوں کا پچھلوں سے تعلق قائم رہے تو کیسے؟ خیر ان ناخوش گوار باتوں کا اس تقریب میں نہ کوئی محل ہے نہ موقع۔

حضرت غالب سے جو مجھے قریبی اور دلی نسبت حاصل ہے اور جسے میں واقعی اپنے لیے ذریعۂ عزت سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں بھی آپ حضرات کی طرح حضرت غالب کا ایک حقیر دلدادہ ہوں میرے لیے یہی باعث فخر ہے کہ غالب کے کروڑوں عقیدت مندوں میں مجھے بھی شمار کیا جائے۔ اس سے

زیادہ اور کچھ نہیں۔ اس مناسبت سے حضرت غالب کے ایک کم معروف شاگرد میاں داد خان سیاح کا ایک شعر غالب کے شیدائیوں کی اس انجمن کی نذر کرتا ہوں۔ یہ شعر میں نے ان کے ایک نادر قلمی نسخے سے نقل کیا تھا جو میرے بزرگوں کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ وہ شعر یہ تھا ؎

ظلِ کرم ہے حضرتِ غالب کا بس، مجھے
سر پر نہیں ہے، سایۂ بالِ ہما، نہ ہو

حضرت غالب کو گزرے سو سال سے زیادہ ہو گئے مگر ان کا کلام بدستور تازہ ہے۔ اُن کے شیدائیوں کی تعداد بھی ساری دُنیا میں روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ خود ان کی پیش گوئی کے مطابق اُن کے کلام کی قدر ان کے بعد ہی ہوئی۔ اُن کی صد سالہ برسی کئی ملکوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ منائی گئی اور اُن کے کلام اور اُن کی دلپذیر شخصیت کے بے شمار پہلو اُجاگر کیے گئے۔

یہ امر اطمینان بخش ہے کہ پاکستان کے اُردو رسائل نے اس موقع پر جو شاندار خدمات انجام دیں وہ کسی دوسرے ملک سے کسی طرح کم نہیں ان میں رسالہ نقوش کا غالب نمبر خاص امتیاز رکھتا ہے اور برِصغیر کے تمام اُردو دانوں سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے لیکن نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل صاحب کی حضرت غالب سے عقیدت اور نیاز گزاری کی وجہ سے اُن کے پاکیزہ ذوق کی اس سے تسکین نہیں ہوئی۔

اب اُنہوں نے کمال محنت اور کثیر صرف سے نقوش کا یہ دوسرا غالب نمبر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حضرت غالب کی خود اپنے قلم سے لکھی ہوئی، اوّلین بیاض کے عکسی بلاک شامل ہیں۔ یہ نادر و نایاب قلمی بیاض محمد طفیل صاحب نے جس تلاش اور جستجو کے ساتھ حاصل کی پھر اُسے تمام و کمال اس آراستگی اور پاکیزگی کے ساتھ شائع کیا یہ ان کے اعلیٰ ادبی اور جذبہ خدمت کا ثبوت ہے۔

حضرت غالب کا پورا اُردو دیوان، خود ان کے خط میں لکھا ہوا، برِصغیر میں پہلی مرتبہ اس سلیقے کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے جس پر ملک کی صحافت اور طباعت دونوں بجا طور پر ناز کر سکتی ہیں۔ میں محمد طفیل صاحب کو اس پر خلوصِ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ غالب کے شیدائی اس عظیم یادگار کی خاطر خواہ قدر کریں گے اور نقوش کا یہ غالب نمبر تاریخ ادب میں خاص مقام حاصل کرے گا۔

صدارتی خطبہ

میر علی احمد تالپور

محترم مہمان خصوصی اور آنریبل جسٹس صاحب، طفیل صاحب، عالی مرتبت حاضرین محفل! سب سے پہلے میں طفیل صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس مجلس میں شمولیت کی دعوت دی۔ بات دراصل یہ ہے کہ طفیل صاحب کو داد دینا تھی۔ لہٰذا داد دینے کے لیے یہاں چلا آیا۔ یہ غلط بات ہوتی کہ کوئی اتنی بڑی تقریب کرے اور اسے داد بھی نہ ملے۔

۱۹۶۲ء کی بات ہے کہ جب میں لاہور آیا تھا ہمارے ایک مہربان دوست تھے اور ہیں۔ کسی بات پر ان کی بیگم صاحبہ سے اختلاف ہو گیا۔ بیگم صاحبہ بڑی ناراض ہوئیں۔ اس وقت مجھے جعفر زٹلی کا یہ شعر یاد آیا ؎

جعفر از دو از یں شہر بدر شو ورنہ
ریچھ تو رید و گیرند تو دھڑا دھڑ بزن

اس پر میاں صاحب نے فرمایا، آج آپ کو یہ شعر کیسے یاد آگیا؟ میں نے کہا میاں صاحب! اس کی کچھ وجوہ ہیں، آج یہاں حاضر ہونے کی بھی کچھ وجوہ ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ اس محفل کا حق ادا کر سکوں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم و ادب کے میدان میں طفیل صاحب کے جو ذاتی کارنامے ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کہ ان کی قدر کرنی چاہیے۔ جو نہیں کرے گا خود اس کا علم مشکوک ہو جائے گا۔

جو بات ابھی صدرِ محترم نے فرمائی ہے کہ اُن کے پاس کچھ 'نقوش' کے رسالے تھے جنہیں یا تو لوگ مانگ کے لے گئے یا چوری کر کے لے گئے۔ تو جناب! میرے پاس بھی نقوش کے متعدد نمبر ہیں۔ اگر طفیل صاحب اور دیں گے تو انہیں بھی بصد احترام قبول کروں گا۔ لیکن یہ بتا دوں کہ میں نے اُن نمبروں میں سے کسی کو ایک نمبر بھی نہیں دیا۔ میں اُن رسالوں کی بہترین جلدیں بندھواتا ہوں اگر کوئی مجھ سے مانگتا ہے تو میں ان سے کہتا ہوں یہ نمبر تمام بک اسٹالوں پر ملتے ہیں۔ لہٰذا ان پر دست درازی نہ فرمائیں۔

طفیل صاحب نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ بڑی انوکھی چیزیں یکجا کر دیں، جو

ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ مگر یہ زبان کہ جس میں طفیل صاحب کے کارنامے موجود ہیں بڑی جان دار زبان ہے۔ اس زبان نے برصغیر کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ زبان ہر حال میں زندہ رہے گی چاہے اسے حاکموں کی سرپرستی ہو یا نہ ہو۔

آپ کے سامنے مثال موجود ہے کہ واہگہ بارڈر کے اس پار ہر ممکن کوشش کی گئی کہ اس زبان کو پنپنے نہ دیا جائے۔ لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ ان کی فلموں کی زبان دیکھیں، اُن کی شاعری کی زبان دیکھیں۔ اردو وہاں دندنا رہی ہے۔ زبان میں جو خود اپنے طور پر توانائی ہوتی ہے وہ اسے زندہ رکھتی ہے۔

ایک دوست نے ابھی اپنے ایک مقالہ میں فرمایا کہ طفیل صاحب کی تمام تر کوششیں کامیاب ہوئیں۔ میں بھی یہ بات مانتا ہوں کہ ان کی تمام تر کوششیں کامیاب ہوئیں۔ کوشش تو ہر انسان کرتا ہے مگر سب کی کوششیں کامیاب نہیں ہوتیں۔ حج کے موقعہ پر جب لوگ منیٰ کے میدان سے واپس آتے ہیں تو وہ ایک دعا مانگتے ہیں۔ اس دعا میں اور بہت سی باتیں ہیں۔ لیکن ایک خاص بات جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللّٰھم سعی مشکورا۔ (اللہ تعالیٰ میری کوششوں کو ٹھکانے لگا دے) کوششوں کا ٹھکانے لگنا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔

طفیل صاحب بڑے خوش قسمت انسان ہیں کہ ان کو ایسے مضمون نگار ساتھی ملے یا انھیں ایسے رفقا میسر آئے کہ جنھوں نے ان کے خوابوں کو تابناک بنا دیا۔ میں طفیل صاحب اور ان کے سارے رفیقانِ قلم کو مبارکباد دیتا ہوں، کیونکہ اتنے اور ایسے بڑے کام مشترکہ کوششوں ہی کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔

طفیل صاحب کی بہت تعریف ہو گئی۔ اب میرے سامنے جو بزرگ حضرات بیٹھے ہیں دو چار باتیں ان کے بارے میں بھی ہو جائیں۔ یہاں حفیظ جالندھری صاحب بیٹھے ہیں۔ احسان دانش، میرزا ادیب اور احمد ندیم قاسمی بیٹھے ہیں۔ میرے پاس ان حضرات کی جو کتابیں ہیں ان کے پہلے ایڈیشن ہیں پھر مجھے ان کے اشعار بھی یاد ہیں۔ حفیظ صاحب! آپ کی کشمیر کے بارے میں جو نظم ہے وہ مجھے پوری یاد ہے۔ مثلاً:

عامیوں نے کہہ دیا کشمیر کو جنت نشاں
ورنہ جنت میں یہ حسن و رنگ و شادابی کہاں
کیا ہے جنت؟ چند حوریں، اک چمن، دو ندیاں
خیر زاہد کی رعایت سے یہ کہتا ہوں کہ ہاں

عالمِ بالا پہ ہے پرتو اسی کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

میرے پاس جناب میرزا ادیب کے صحرانورد کے خطوط کا پہلا ایڈیشن ہے اور حضرت احسان دانش کا یہ شعر :

جو گزر رہی ہے دل پر کوئی ترجماں نہیں ہے
میرے دوستوں میں کوئی میرا چہرہ خواں نہیں ہے

اور جناب قاسمی صاحب! مجھے آپ کا بھی ایک شعر یاد آگیا ہے :

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے

ایک بات اور سن لیں۔ ایک جگہ ہماری دعوت تھی وہ لوگ غریب تھے دوسرے اچھوت۔ انھوں نے کہا کہ جناب! پہلی حکومتوں نے ہمارے لیے کچھ نہیں کیا اب صرف آپ ہی لوگ ہیں جو کچھ کر سکتے ہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ سابقہ حکومتوں نے اپنی عقل و فہم کے مطابق کام کیا، ہم لوگ اپنی عقل و فہم کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ کل کو کن کی سعی کو مشکور گردانا جائے گا؟ اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جس طرح ابھی صدرِ محترم نے فرمایا کہ کتابوں اور رسالوں پر کوئی سنسر نہیں ہے، اچھی بات ہے، اگر سنسر قائم بھی رہتا تو بات کرنے والے بات کر ہی جاتے تھے۔ میر صاحب بھی تو کہہ گئے ہیں :

سلیقہ شرط ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

طفیل صاحب! یہ جو آپ نے انیس نمبر چھاپنے کی نوید سنائی ہے تو انیس کے بھی کچھ اشعار یاد آرہے ہیں۔ ذرا غور سے سنیے گا :

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سُرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گُل رُو کے لیے

داند آنکس کہ فصاحت بکلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اذان ہو رہی ہے گفتگو ختم کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ آپ کو خیر و عافیت سے رکھے۔ میں آپ کی کرمفرمائی اور ذرہ نوازی کا نہایت ہی شکرگزار ہوں۔ السلامُ علیکم!

نوٹ: میر صاحب محترم نے جو کچھ فرمایا، فی البدیہہ فرمایا۔ اس لیے مفہوم تو ان صفحات میں موجود ہے مگر ویسے خوبصورت فقرے ہاتھ نہ آئے۔

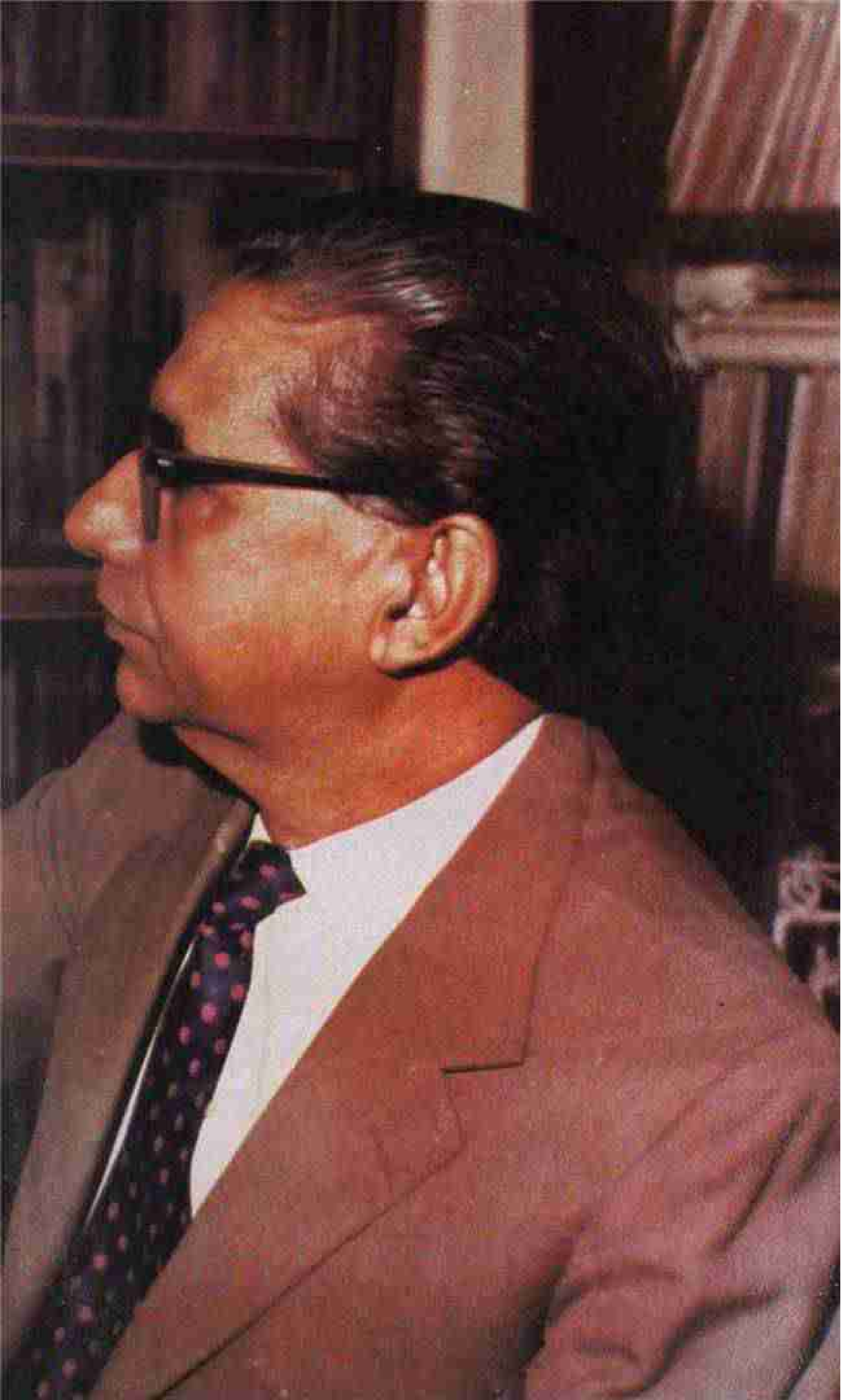

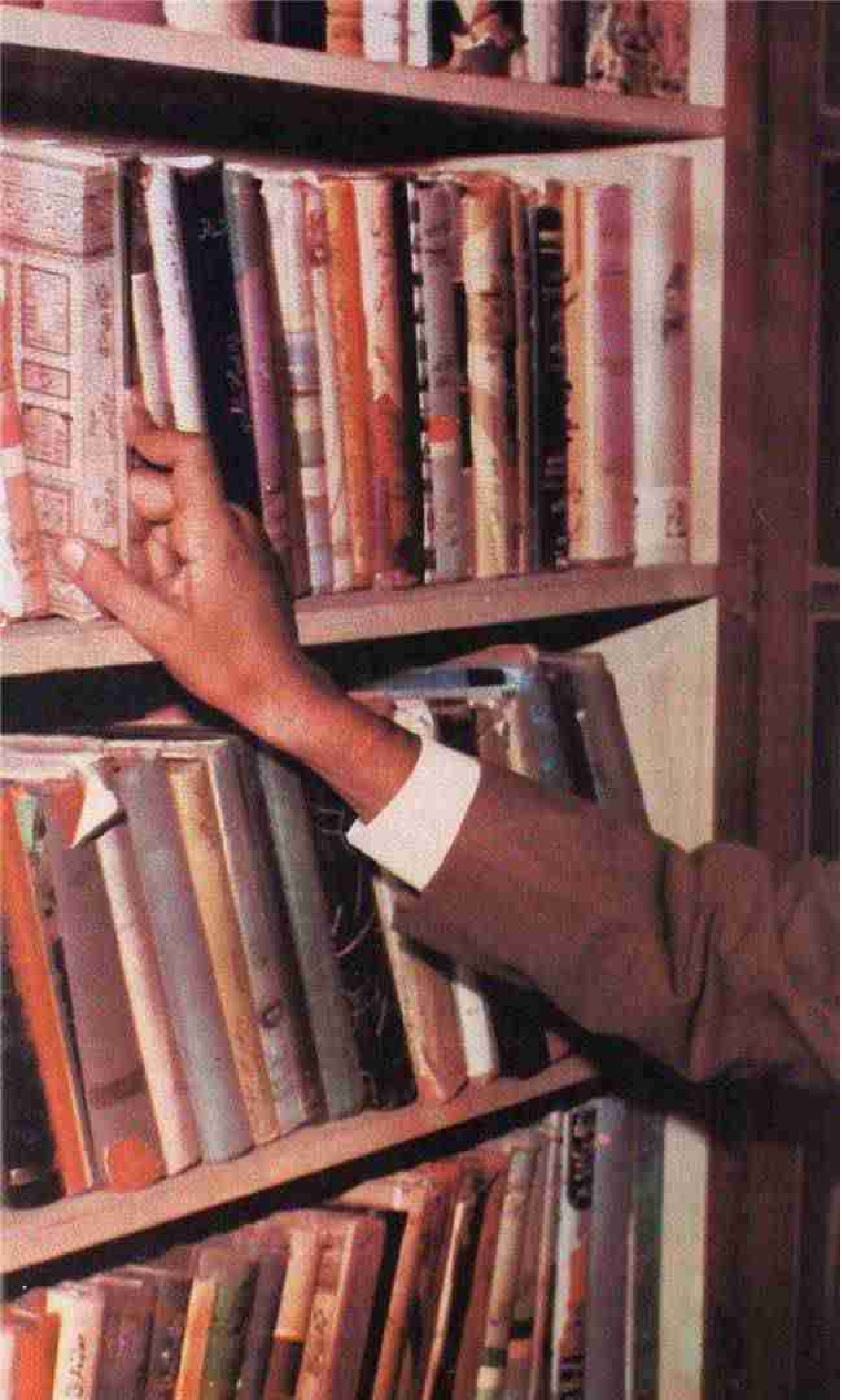

شخصیت :

حفیظ جالندھری

شورش کاشمیری

کرشن چندر

احمد ندیم قاسمی

ممتاز مفتی

ڈاکٹر محمد حسن

رحیم گُل

صادق حسین

انتظار حسین

لطیف الزماں خاں

ڈاکٹر سلیم اختر

فارغ بخاری

مقبول جہانگیر

احسن علی خاں

اعتراف

حفیظ جالندھری

ادبی معرکے نمبر کی بجائے، میں اسے شمارہ کہتا ہوں۔ دونوں کی دونوں جلدیں محمد طفیل کے طفیل مجھ پر نازل ہوئیں، مطالعہ میں آئیں، میرے دیدہ و دل نے یہ عنوان نیا دیکھا۔

ان میں سے چند ایک مضامین کسی زمانے میں میری نگاہ سے گزرے تھے۔ مجھے اس مجلس ادب نواز میں طولانی کہانی سنانا منظور نہیں ہے بلکہ صرف حیرت انگیز اعتراف ہے اور وہ اعتراف یہ ہے کہ جستہ جستہ تنقیدیں، اعتراضات اور تردیدیں تو اپنی حیاتِ متعلقۂ شعر و ادب میں سامنے آتی تھیں یا جن ادبی رسائل اور اخبارات کا میں مدیر رہ چکا ہوں اُن میں بھی درج ہوتی رہی ہیں لیکن ایک جگہ ان کا جمع کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

میں نے انگریزی لٹریچر بھی پڑھا ہے، ہندی بھی پڑھی ہے، فارسی بھی پڑھی ہے، عربی سے بھی واقف ہوں، اردو کو بھی کھنگالا ہے۔ اس لیے اعتماد سے کہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جس میں اتنے معرکۃ الآرا مضامین ایک جگہ جمع ہوں اور نہ میرے تصور میں کوئی ایسا مدیر، صحافی اور نقاد آیا جس نے اتنی مشقت اختیار کی ہو بلکہ اس کا اتنا محیط اور عجیب و غریب اظہار بھی کیا ہو۔

نقوش کے اتنے شمارے شائع ہو چکے ہیں کہ ان کا ذکر میرے فاضل دوست کر چکے ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ہر نمبر کا ایک ایک حرف پڑھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نمبر نے مجھے از سرِ نو پیرِ مشق بیا آموز بنا دیا ہے۔

بیاسی برس کا بوڑھا ہوں، شاعری میرا میدان رہا ہے۔ لیکن زیرِ مطالعہ شمارہ میں بزرگوں نے جس طرح سے اصلاحیں دی ہیں اس کے لیے میں اُن کا شکرگزار ہوں کہ اس طرح طفیل کے طفیل مجھے بھی از سرِ نو اپنی شاعری پر غور کرنے کا موقع مل گیا۔

اس کے بعد میں انھیں سلام کرتا ہوں اور دعوے سے کہتا ہوں کہ دنیا میں اس سے بہتر نمبر کہ جس کو CRITICISM کہتے ہیں یا جو ایسے مضامین کا احاطہ کرتا ہو آج تک کسی نے پیش نہیں کیا۔

میں مبارکباد آپ ہی کو نہیں دیتا بلکہ اس قوم اور پاکستان کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے ایسا کام کر دکھایا۔

محمد طفیل، مدیرِ نقوش

آپ نے مختلف موضوعات پر نقوش کے بیسیوں نمبر مرتب کر کے اردو ادب کو درخشندہ کیا۔ ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ لوگوں کے لیے اتباعِ تقلید کی راہیں کھولیں۔ کوئی سا مورخ ان کے قابلِ تبریک کارناموں کو خراج ادا کیے بغیر اپنے قلم کا سفر مکمل نہیں کر سکتا۔

مدیرِ نقوش فی نفسہٖ ایک صاحبِ طرز ادیب اور ایک خوش ذوق مدیر ہیں۔ انھوں نے شبانہ روز محنت سے نوجوانوں کے لیے اس طرز کے آثار پیدا کیے ہیں کہ ادبی تذکروں کے ایوان میں مرحبا و احسنت کی آوازیں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

چٹان انھیں "انیسِ اردو" کا خطاب دیتا ہے۔

شورش کاشمیری
۱۱ جولائی ۱۹۶۶ء

ہم قلم

کرشن چندر

میں برائی کرنے کے مُوڈ میں ہوں۔ خاص کر دوستوں کی برائی۔ عمر کے جس حصّے میں مَیں ہوں، اُس میں یہی عارضہ لاحق رہتا ہے۔

آج صبح سے تُلا بیٹھا ہوں کہ اپنے دوست محمد طفیل مدیر نقوش ساکن لاہور پاکستان کی بُرائی کروں۔ مگر جس آدمی میں کوئی بُرائی ہی نظر نہ آئے۔ اُس کی کوئی بُرائی بھی کرے تو کیا کرے۔ حالانکہ یہ بات محمد طفیل کے حق میں نہیں جاتی۔ کیونکہ عیوب ہی سے انسان کی شخصیت دلچسپ بنتی ہے۔ نیکی ہمیشہ بور کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ عیوب سے خالی ذات صرف اللہ ہی کی ہے۔ اس لیے محمد طفیل میں بھی بہت سی بُرائیاں ضرور ہوں گی مگر آدمی کائیاں ہے۔ اپنی برائیوں کو اس طرح سینت سینت کر دل کے نہاں خانے میں چھپا کے رکھتا ہے۔ جہاں کسی قریبی سے قریبی دوست کا بھی گزر ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جب کہیں وہ اپنے آپ کو اکیلا دیکھ پاتا ہو تو دل کے خفیہ لاکر کو کھول کر، اپنی بُرائیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہو۔

ذخیرہ اندوزی اُس کی پرانی عادت ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ نقوش کے ضخیم نمبر موجود ہیں۔ میں نے نقوش کے لیے خصوصی کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ اس کمبخت رسالہ کا ہر نمبر ہی خصوصی ہوتا ہے۔ کسی دن اُس لاکر کی کنجی اگر مل گئی تو طفیل کی ساری بُرائیاں طشت از بام کر دوں گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ موقع موقع سے اپنی برائیوں کو دُھوپ دکھانی چاہیے ورنہ برائیوں میں دیمک لگ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر وہ دوست ہی کیا جو بُری صلاح نہ دے!

خوش قسمتی سے میرا شمار بھی طفیلیوں میں ہی ہوتا ہے۔ گو کہ یہ بات طفیل کو معلوم نہیں۔ طفیل کی ظاہری شکل و صورت کا کہوں کہ بالکل اپنے رسالہ نقوش کی طرح گرانڈیل اور بھاری بھرکم ہے۔ وہی سنجیدگی، وہی وقار، جس سے جی اُلجھتا ہے۔ طفیل کو چھپایئے نقوش کو نکالیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ذاتِ باری نے طفیل کو نقوش کے لیے پیدا کیا یا نقوش کو طفیل کے لیے تولد کیا۔ بہرحال دونوں ایک دوسرے کے لیے زندہ ہیں۔ کسی نے جڑواں بھائیوں

میں بھی ایسی یکسانیت نہیں دیکھی ہوگی اور نہ ایسی محبت، اگر کبھی نقوش کے کسی نمبر کے صفحات کی تعداد ایک ہزار سے کم ہو، تو طفیل کی صحت کے بارے میں اندیشے لاحق ہونے لگتے ہیں اور اب تو جب سے مجھے قلب کا عارضہ لاحق ہوا ہے۔ ڈاکٹروں نے مجھے کتابوں کی الماری سے نقوش اٹھا کر لانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب اگر مجھے نقوش پڑھنا مقصود ہے تو ایک ملازم آئے گا اور وہ بے چارہ جیسے تیسے کر کے ہانپتا کانپتا نقوش کا نمبر اٹھا کر میرے سامنے لائے گا اور اُسے میرے مطالعہ کے لیے لکڑی کی رحل پر رکھ دے گا۔ صفحات اُلٹتے جائیے طفیل کے دل و دماغ کی پرتیں خود بخود کھلتی جائیں گی کہ ان دنوں پاکستان کے اردو ادب میں کیا ہو رہا ہے! تمام مواقع، حادثے، رونمائیاں، رسوائیاں، دوستوں کے جگمگھٹ، تخلیقات کے ہجوم، وہ سب آپ کو گھیر لیتے ہیں اور جس دن گھر میں نقوش وارد ہوتا ہے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔

طفیل کسی قدر کنجوس بلکہ کنجوس بھی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں جب وہ لاہور سے دلی میرے ہاں آیا تو میرے لیے گوجرانوالہ کے مالٹوں کی ایک پیٹی لایا، حالانکہ احمد ندیم قاسمی کو لا سکتا تھا۔ میرزا ادیب کو لا سکتا تھا۔ عبدالمتین عارف کو لا سکتا تھا۔ ابن انشا کو لا سکتا تھا۔ حامد علی خان، صلاح الدین احمد اور نذیر چودھری کو لا سکتا تھا۔ اور اسے کرنا بھی کیا تھا۔ ان سب دوستوں کو جن کے میں نے نام لیے اور اُن تمام احباب کے جن کے میں نے نام نہیں لیے ان سب کو مکھی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے لے آتا۔ نہ کسٹم کا ڈر نہ ویزا کا خوف۔ یہاں آ کر ہم منتر پڑھتے، ڈبیا کھولتے تو وہ سب لوگ ہم میں موجود ہوتے، وہ ہمنفسانِ رفتہ اور یارانِ دل گرفتہ اور وہ سب جو ہمارے دل کے پیارے ہیں اور وہ سب جو خدا کو پیارے ہوئے اور وہ سب جن کو ہم نے گویا صدیوں سے نہیں دیکھا۔ ان سب سے ہم گلے مل لیتے۔ طفیل سے اتنا بھی نہ ہوا۔ اس لیے کہ وہ جب میرے گھر کے آنگن میں مجھ سے بغل گیر ہوا تو اتنی دیر تک نہ صرف اس کے سینے بلکہ لاہور کے دوسرے تمام احباب کے سینوں کی حرارت مجھ تک پہنچتی رہی۔ اور جب میں نے اس سے اکیلے آنے کا سبب پوچھا تو اپنے مخصوص سنجیدہ اور نیم شریر لہجے میں وہ بولا "کس کس کو ساتھ لاتا، بھئی وہ سب تو بوڑھے ہو چکے ہیں۔" میں نے کہا: "جھوٹ مت بولو۔ لاہور میں رہ کر کوئی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا سدا بہار جگمگاتا ہوا فانوس بدن شہر اپنی لافانی جوانی کے لیے مشہور ہے۔ اس شہر میں رہ کر اگر کوئی بوڑھا ہوتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دے اور منڈی بہاؤالدین، بستی جھبڑاں والا اور چک نمبر چار سو بیس میں جا کر سکونت

اختیار کرے، مگر لاہور کے نام کو بٹہ نہ لگائے۔ اس پر وہ مجھ سے قہقہہ لگاتے ہوئے پھر بغل گیر ہوا اور بولا: نہیں! میرے سب دوست جوان ہیں اور خوش ہیں اور خیریت سے ہیں اور اس مالٹے کی پیٹی میں ان سب کے خلوص کی خوشبو بھری ہوئی ہے۔

مجھ پر کبھی کبھی جھک چڑھتی ہے تو بمبئی چھوڑ کر دلی چلا آتا ہوں، اس لیے کہ لاہور تو جا نہیں سکتا۔ سوچتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دوں گا اور اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کر دوں گا۔ کبھی چھ مہینے اور کبھی سال بھر دلی میں رہتا ہوں اتنے میں وہاں کے پبلشر مجھ سے ادبھ جاتے ہیں، وہ میری تہی دستی اور میں ان کی بالادستی کا قائل ہونے لگتا ہوں اور پھر دلی چھوڑ کر بمبئی کی فلمی دنیا میں لوٹ آتا ہوں۔ ایسا دو تین بار کر چکا ہوں۔

اب کے جو طفیل سے دلی میں ملاقات ہوئی تو میں بے حد تفریحی موڈ میں تھا۔ طفیل مسز ممتاز مرزا کے ہاں ٹھہرے تھے مگر تقریباً اُن سے ہر روز ملاقات رہتی تھی۔ وہ نو دس دن ایسی ہماہمی میں گزر گئے کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہوا اُن نو دس دنوں میں میں لاہور میں رہا اور وہ دلی میں رہے۔ اور ایک ایک کر کے انھوں نے اپنے تمام دوستوں کو ڈھونڈ نکالا اور اپنی خرابی صحت کے باوجود اس نے ہم سے زبردست دعوتیں کھائیں۔ معلوم نہیں کیا بات ہے جو مزا زبردستی کی دعوت میں ہے وہ اُن ملاقاتوں اور دعوتوں میں کبھی نہیں ہوتا، جہاں خود اصرار سے بلائے اور مدعو کیے جاتے ہیں۔ شام کو اکثر ہم کہیں نہ کہیں کسی بہانے اکیلے بیٹھ جاتے۔ دن کو تو میں انھیں گھومنے کا موقع دے دیتا تھا مگر شام ہوتے ہی انھیں پکڑ لیتا اور پھر یادوں کے گھنے گلزار میں ہم دوستوں کے جُھرمٹ آباد کرتے اور محبت اور خلوص کے اُن حسین لمحوں کو یاد کرتے جن کی نشیلی چھاؤں میں اردو ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں نے ادبی تخلیقات کے کیسے کیسے حسین پیکر تراشے ہیں۔

طفیل احساس کی نازکی کو بہت سمجھتے ہیں۔ خود بھی جلدی آزردہ خاطر اور زود رنج ہو جاتے ہیں کیونکہ طفیل صرف ایک پبلشر ہی نہیں ہے بلکہ ادیب بھی ہے۔ "محترم" ان کا ایک مشہور سفرنامہ ہے جو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس پر جانے کے بعد لکھا گیا۔ مگر طفیل بالخصوص اپنے نازک خاکوں کی تخلیق کے لیے مشہور ہیں جن میں انھوں نے جگر مرادآبادی سے لے کر اختر اورینوی جیسی مقتدر شخصیتوں کے قصر تعمیر کیے ہیں۔ یہ سب کے سب ان کی کتابوں میں شامل ہیں۔ جن کے نام بالترتیب یہ ہیں: نمبر ایک "صاحب" نمبر دو" جناب" نمبر تین "آپ" ان کے بعد دو اور

مجموعے ان کے آنے چاہئیں اور نمبر چار " آپ جناب " نمبر پانچ " اناپ شناپ " موخرالذکر مجموعہ طفیل کے دشمنوں کے متعلق ہوگا یا ایسے مضمون نگاروں کے متعلق جن کی تخلیقات کسی وجہ سے نقوش میں شامل نہیں ہو سکیں۔

طفیل کے یہ خاکے بڑی بے باکی سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں فاصلے بھی ہیں اور قربتیں بھی، دُوریاں بھی ہیں اور طرفداریاں بھی۔ مگر کہیں کیچڑ اچھالنے کی کوشش نہیں ہے مگر چھینٹے ضرور اُڑائے ہیں۔ طفیل ان خاکوں میں اُس بچے کی طرح ہے جو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ہے اور برابر دُوسروں پر چھینٹے اڑائے جاتا ہے اور جب کوئی دوسرا نہیں ملتا تو اپنے آپ پر ہی چھینٹے اڑانے لگ جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل کا بچپن کیسا تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے وُہ ابھی تک بچپن کے عہد سے باہر نکلا ہی نہیں۔

سُنا ہے آج کل طفیل دھڑا دھڑ ٹیکسٹ بک چھاپ رہا ہے اور نقوش سے آج کل اس لیے بیزار ہے کہ اس کے دوست اس کے رسالے کے لیے اس کی پسند کی چیزیں نہیں بھیجتے۔ لیجئے چلتے چلتے میں نے طفیل کی ایک بُرائی تو پکڑ لی۔ طفیل بھائی! تم بیشک ٹیکسٹ بک کے انبار لگادو چھاپ چھاپ کر، لیکن تمھارے نقوش کا صرف ایک شمارہ ان سب پر بھاری رہے گا، علم و ادب دونوں کے اعتبار سے!

آؤ گلے ملو، جھُوٹے کہیں کے، ہر سال آنے کا وعدہ کرتے ہو اور کبھی نہیں آتے!

65108

طفیل صاحب (چند تاثرات)

احمد ندیم قاسمی

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

میں طفیل صاحب کو گذشتہ ربع صدی سے جانتا ہوں مگر شاید ابھی تک اچھی طرح نہیں جانتا۔ اتنے طویل تعلق کے باوجود، اچھی طرح نہ جاننے کا الزام میری بجائے خود طفیل صاحب پر عاید ہوتا ہے کیونکہ انھوں نے خاصی مدت تک اپنی شخصیت کے ایک پہلو کو مجھ سے چھپائے رکھا۔ انھوں نے اپنی شخصیت کا بھرپور اظہار اُس وقت کرنا مناسب سمجھا جب میں ان کی محفل سے غیر حاضر تھا۔ اور جب وہ اس محفلِ ادب میں میرے ہمسفر اور ہم نشین تھے، تو اُس وقت وہ صرف ایک ایسے محمد طفیل تھے جن کا مطمحِ نظر بظاہر صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ معیاری علمی و ادبی کتابوں اور ایک معیاری علمی و ادبی رسالے کے ناشر کی حیثیت سے نام پیدا کریں — اور ظاہر ہے کہ آج اُن کی حیثیت صرف ایک ناشر کی نہیں ہے۔ آج ہم ان کی ایک تصنیف کی تقریب منانے یہاں جمع ہوئے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اپنی اس تصنیف کے ناشر وہ خود ہی ہیں۔

طفیل صاحب سے میری پہلی ملاقات آج سے ٹھیک پچیس برس پہلے ہوئی۔ اُن دنوں، میں ہفتہ وار "پھول" اور ہفتہ وار "تہذیبِ نسواں" کا مرتب تھا اور ساتھ ہی ماہنامہ "ادبِ لطیف" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ انھی دنوں طفیل صاحب شاید لطیف فاروقی کے ہمراہ مجھ سے ملے۔ اُن دنوں وہ خوش نویس تھے۔ اتنے دُبلے پتلے تھے کہ محسوس ہوتا تھا، ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو ان کے قدم اکھڑ جائیں گے۔ وہ ہمیشہ شلوار قمیص میں ملبوس رہتے تھے اور اگر اُس سے دو برس پہلے منٹو اور کرشن چندر نے دہلی میں مجھے کوٹ پتلون پہننا اور ٹائی باندھنا سکھا نہ دیا ہوتا تو میں بھی انھیں شلوار قمیص ہی میں ملبوس ملتا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اُن دنوں میں خاصا تندرست نوجوان تھا۔ میرے بازوؤں میں مچھلیاں تھیں اور میری ٹھوڑی دوہری تھی۔ یوں سمجھیے کہ اُن دنوں میری صحت بالکل ایسی تھی جیسی آج کل طفیل صاحب کی صحت ہے اور ربع صدی پہلے طفیل صاحب بالکل ایسے ہی دُبلے پتلے تھے جیسے آج میں ہوں۔ خدانخواستہ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ طفیل صاحب نے میری صحت مجھ سے چھین لی ہے، اس لیے کہ صحت کا انحصار موٹاپے اور دُبلاپے پر نہیں ہوتا۔ میں

صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ گذشتہ پچیس برس کے دوران، ہم دونوں میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں ــــــ جسمانی لحاظ سے بھی اور نظریاتی و جذباتی لحاظ سے بھی۔ اگر کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور نہ آئندہ آنے کا امکان ہے تو وہ طفیل صاحب کی اور میری دوستی کا رشتہ ہے جو کئی بار طنبورے کے تار کی طرح تن گیا مگر ٹوٹا ایک بار بھی نہیں اور اب اس کے ٹوٹنے کا احتمال ہی ختم ہو چکا ہے۔

یہ شاید ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے جب ایک روز، ایک نہایت سیدھے سادے اور نہایت مؤدب محمد طفیل نے اپنے نئے اشاعتی ادارے کے لیے، مجھ سے کسی شعری یا نثری مجموعے کی فرمائش کی، اور یہ سوچے بغیر کہ خاص بعام لاہور کا یہ ناتجربہ کار نوجوان مجھ سے، یا میرے مجموعے کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرے گا، میں نے اپنے مزاحیہ مضامین و تراجم کا مجموعہ "کیسر کیاری" ان کی سادگی اور معصومیت کی نذر کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے میرے متعدد مجموعے ــــــ 'رم جھم' اور 'آنچل' اور 'آبلے' اور 'بازارِ حیات' شائع کیے مگر میرے ناشرین میں سے یہ واحد ناشر ہیں کہ جس طرح وہ میرے پہلے مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں میری توقعات پر صد فی صد پورے اترے اسی طرح دوسرے مجموعوں کے سلسلے میں بھی انہوں نے اپنے خلوص و دیانت کا معیار برقرار رکھا اور یہ معمولی بات نہیں ہے۔ ایک مصنف اگر یہ کہتا ہے کہ اسے فلاں ناشر سے تمام عمر کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تو یہ معمولی بات نہیں ہے۔ آج کل خود میں ایک چھوٹا سا ناشر ہوں اور ہزار احتیاط کے باوجود ان خواتین و حضرات کی بعض شکایات کا ہدف بنتا رہتا ہوں جن کے مجموعے میں نے شائع کیے ہیں۔

اُس زمانے میں طفیل صاحب کے اشاعتی ادارے کا دفتر لوہاری دروازے کے اندر تاج زریں رقم مرحوم کی بیٹھک کے شاید ایک غسل خانے میں تھا جہاں طفیل صاحب کتابوں کے پارسل باندھتے تھے اور مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم ان پارسلوں کو سر پر اٹھا کر ڈاک خانے یا ریلوے سٹیشن تک پہنچاتے تھے۔ طفیل صاحب بھاٹی دروازے کے اندر اپنے آبائی مکان میں رہتے تھے۔ میں پہلے تو دارالاشاعت پنجاب کے ایک کمرے میں پڑا رہا۔ پھر اچھرے میں ایک مکان کرایے پر لیا اور اس کے بعد میو روڈ کی اُس ملک بلڈنگ کے ایک کمرے میں اُٹھ آیا جو آج کل ہوٹل خیابان کہلاتی ہے۔ پھر اُن دنوں لاہور میں ٹیکسی یا رکشا کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو ہم دونوں کے لیے، از روئے مسئلہ اقتصاد، بیکار ہوتا۔ اس کے باوجود ہماری ملاقاتیں باقاعدگی سے ہوتی رہیں اور ہمارے تعلقات آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ شروع ہی سے ان تعلقات کی بنیاد مصنف اور ناشر کی مشترکہ مصلحتوں پر نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو حالات کے پہلے ہی جھٹکے سے ہم ایک دوسرے سے کٹ کر دور جا گرتے۔ اُن دنوں میری حیثیت

ایک مبتدی شاعر اور ادیب کی تھی اور طفیل صاحب کی حیثیت ایک مبتدی ناشر کی۔ اور کم سے کم ان دنوں تو مبتدی ناشر ہمیشہ معروف مصنفین کے تعاقب میں رہتے تھے اور مبتدی مصنفین کا مفاد معروف ناشرین سے وابستہ تھا۔ دراصل ہم دونوں کے معیاروں کی مشترک قدر وہ خلوص تھا جسے بعض "ترقی یافتہ" حلقے انسانی رشتوں کی حماقت کا نام بھی دیتے ہیں مگر میں آج، اس عمر میں بھی سوچتا ہوں کہ یہ "حماقت" اگر عام ہو جائے تو "دانائیوں" سے لدی ہوئی انسانیت کے کتنے ہی دکھوں کا مداوا ممکن ہے۔ ۱۹۴۵ء کے آخر میں جب میں علیل ہو گیا اور تینوں پرچوں کی ادارت سے دست کش ہو کر گاؤں چلا گیا تو طفیل صاحب کے اور میرے درمیان خلوص کا وہ رشتہ قائم ہو چکا تھا جب دوستوں کی شخصیتیں ایک دوسرے کے لیے آئینے بن جاتی ہیں۔

میں ۱۹۴۶ء کے آخر میں پشاور ریڈیو سے بھی منسلک ہو گیا اور لاہور سے رسالہ "سویرا" نکلا تو میں نے اس کی چند ابتدائی اشاعتیں پشاور ہی سے مرتب کر کے بھیجیں مگر اس دوران طفیل صاحب اور میں ایک سازش کے منصوبے پر بڑی جانفشانی سے کام کرتے رہے۔ سازش یہ تھی کہ لاہور سے ایک اپنا ادبی رسالہ نکالا جائے جس کا نام "نقوش" ہو، جس کے ناشر طفیل صاحب ہوں اور جس کی ادارت ہاجرہ بہن کے اور میرے سپرد ہو۔ اسی سازش کے تحت میں ۱۹۴۸ء کے شروع میں پشاور سے بھاگ کر لاہور آ گیا اور یہاں سے ریڈیو والوں کو اپنا استعفیٰ بھجوا دیا۔ "نقوش" کا ڈیکلریشن منظور ہوا اور جب اس کا پرچہ چھپ کر آیا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ طفیل صاحب نے تو اپنی شخصیت کے بعض پہلو مجھ سے چھپا رکھے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہاجرہ بہن اور میں جب "نقوش" کا پہلا شمارہ مرتب کرنے بیٹھے تو اندر سے خوف زدہ تھے کہ یہ ناتجربہ کار اور سادہ مزاج نوجوان کہیں اتنی محنت سے مرتب کیے ہوئے مضامین نظم و نثر کو ایسے بھونڈے انداز میں نہ شائع کر بیٹھے کہ ہم دونوں کی محنت پر پانی پھر جائے۔ مگر جب رسالہ چھپا تو اس کا صوری حسن اس انتہا پر تھا کہ پاکستان و ہند کے ادبی حلقے حسن و سادگی کے اس متوازن امتزاج پر دم بخود رہ گئے۔ حیرت ہے کہ طفیل صاحب نے اپنا یہ سلیقہ مجھ سے کیسے چھپائے رکھا جب کہ ہم ایک دوسرے کے مزاجوں کے بارے میں ایک ایک تفصیل سے باخبر ہونے کے دعویدار تھے۔ طفیل صاحب کی پوری شخصیت تو جب بھی کھل کر میرے سامنے نہ آئی۔ مگر ان دنوں مجھے یہ ضرور محسوس ہوا کہ اس نوجوان کو اگر اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے مناسب حالات میسر آئے تو کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کے میدان میں تو وہ اپنی انفرادیت کے جھنڈے گاڑ دے گا۔

"نقوش" کے تیسرے شمارے کے شائع ہونے پر صوبائی حکومت نے "ادبِ لطیف" اور "سویرا"

کے ہمراہ "نقوش" کی اشاعت پر بھی چھ مہینے کے لیے پابندی عاید کر دی۔ "نقوش" کے معاملے میں منٹو کے افسانہ "کھول دو" کو قابلِ اعتراض قرار دیا گیا حالانکہ حکام کی نظر میں دراصل "نقوش" کی پالیسی قابلِ اعتراض تھی۔ بحیثیت ترقی پسند ادیب، میں نے "نقوش" کو ترقی پسند ادب کا ترجمان بنا دیا تھا۔ یہ وہ موقع تھا جب طفیل صاحب جائز طور پر مجھ سے کہہ سکتے تھے کہ اعتدال سے چلو ورنہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ مگر انہوں نے اس موضوع پر ایک لفظ تک نہیں کہا اور پابندی کے خاتمے کے انتظار میں چھ مہینے پہلے ہی آئندہ شمارے کے منصوبے بنانے میں مصروف ہو گئے۔ پابندی ہٹی تو ہم تینوں پھر سے اپنے اپنے کام میں جُت گئے مگر جب "نقوش" کا دسواں شمارہ شائع ہوا تو طفیل صاحب نے محسوس کیا کہ یہ لوگ تو شاید کشتیاں جلا کر آئے ہیں اور ان کی شدت کا ساتھ ناممکن ہو چلا ہے۔ میں آج بھی کہتا ہوں کہ طفیل صاحب کو ایسا محسوس کرنے کا حق تھا کیوں کہ ہمارا اشتراک، نظریاتی تو کبھی نہیں تھا۔

اپنے ایک عزیز ترین خواب کی تعبیر کے اس انتشار پر ہاجرہ بہن کا اور میرا طرزِ عمل کیسا رہا، یہ میرے بتانے کی چیز نہیں ہے۔ البتہ میں طفیل صاحب کے طرزِ عمل کے بارے میں بتا سکتا ہوں کہ اگر ان کی جگہ کوئی اور صاحب ہوتے تو اپنے اس فیصلے کا جواز پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ طیش میں آتے، یا شکوہ کرتے کہ میری انتہا پسندی نے ان کے منصوبوں کو ڈیڑھ پونے دو برس تک تشنۂ تکمیل رکھا، یا "نقوش" کی ترتیب اگر ہماری بجائے کسی اور صاحب کے سپرد ہوتی تو رسالہ زیادہ مقبول ہوتا۔ طفیل صاحب ایسی کوئی بات زبان پر نہ لائے بلکہ جب وہ مجھے اپنا یہ فیصلہ سنانے میرے ہاں تشریف لائے تو ان کا انداز سراسر معذرتی تھا۔ ہمارے درمیان اتنا بڑا سانحہ گزر گیا تو چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ طفیل اور ندیم کی گہری دوستی اب شدید دشمنی میں بدل جائے گی۔ دراصل لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ ہم دونوں کے نزدیک انسانی رشتے، کاروباری رشتوں کے مقابلے میں زیادہ اہم اور مقدس تھے، اور یہ رشتے، جنہیں انیس نے آبگینے کہا ہے، اگر بعض صورتوں میں ذرا سی ٹھیس لگنے سے بھی ٹوٹ سکتے ہیں، تو بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ چٹانیں بھی برس پڑیں تو ان پر ایک خراش تک نمودار نہیں ہوتی۔ "نقوش" کی ادارت سے الگ ہونے کے بعد بھی جب میرے اشعار اور افسانے "نقوش" میں شائع ہوتے رہے تو بعض عناصر نے میرے بارے میں یہ تک کہا کہ اس بے چارے کو دشمنی کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔ دراصل وہ نہیں جانتے تھے کہ دشمنی تو دشمنوں کے ساتھ کی جاتی ہے اور مجھے دوستوں سے دشمنی کا سلیقہ واقعی نہیں آتا۔

پھر سید وقار عظیم صاحب کی ادارت میں "نقوش" کے چند ہی نمبر شائع ہوئے تھے کہ

ایک روز جب "نقوش" کا نیا شمارہ میرے پاس آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے ایڈیٹر کوئی صاحب محمد طفیل نام کے ہیں۔ شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے سب طفیلیوں پر میں نے ایک نظر دوڑائی کہ شاید طفیل صاحب نے ان میں سے کسی محمد طفیل کی خدمات حاصل کی ہوں مگر اُن دنوں اس نام کے کوئی صاحب موجود نہیں تھے، اور مجھے یہ ماننے میں تامل تھا کہ "نقوش" کے ناشر محمد طفیل، اب خود ہی "نقوش" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیں گے۔ جب یہ طے پا گیا کہ یہی محمد طفیل "نقوش" کے مدیر ہیں تو سچی بات ہے، مجھے "نقوش" کے مستقبل کے سلسلے میں تشویش لاحق ہو گئی۔ "نقوش" سے الگ ہونے کے بعد بھی اس رسالے کی کامیابی سے مجھے گہری دلچسپی رہی ہے۔ اس تعلقِ خاطر کا اب تک یہ عالم ہے کہ میں اپنے رسالے "فنون" کی جگہ اب تک "نقوش" کا لفظ بول اور لکھ جاتا ہوں۔ اس گہری وابستگی کی دو وجوہ ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ "نقوش" کی تعمیر میں میرے لہو کے بھی چند قطرے شامل تھے، اور دوسری وجہ یہ کہ "نقوش" طفیل صاحب کا رسالہ تھا جو مجھے "نقوش" کے اجرا سے پہلے اور اس کی ادارت کے دوران جس طرح عزیز تھے، اسی طرح "نقوش" سے علیحدگی کے بعد بھی عزیز ہی رہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی عزیز ہو گئے اور اس کا سبب میں ابھی عرض کروں گا۔

بہر حال، یہ دیکھ کر کہ اب "نقوش" کو خود طفیل صاحب مرتب کریں گے، مجھے تشویش ہوئی۔ اس تشویش کا پس منظر یہ تھا کہ طفیل صاحب سے اتنے قریبی تعلقات کے باوجود میں اُن کی شخصیت کے اس پہلو سے بھی قطعی بے خبر تھا۔ اب تک میں نے ان کی تحریر صرف ان کے پیارے پیارے خطوط کی حد تک دیکھی تھی۔ چنانچہ میرے لیے یہ بات ایک اچنبھا تھی کہ طفیل اعلیٰ درجے کے ایک ادبی رسالے کے معیاروں کو کیسے برقرار رکھ سکیں گے، نظم و نثر کی موصولہ چیزوں میں ان کے انتخاب کا پیمانہ کیا ہوگا جب کہ وہ اچھے شعر کی زبانی داد دینے کی بجائے صرف اپنا چہرہ سُرخ کر لیتے ہیں، اور پھر وہ بڑے بڑے شعراء و ادباء کا تعاون کیسے حاصل کر پائیں گے۔ ظاہر ہے میرے اس اچنبھے کی وجہ یہ تھی کہ میں طفیل صاحب کو جانتا تو ایک عرصے سے تھا مگر اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ میری یہ تشویش "نقوش" کے ایک دو شماروں کے بعد ہی نہ صرف ختم ہو گئی بلکہ تحسین میں بدل گئی اور اس کے بعد جو انہوں نے "نقوش" کے خاص نمبروں کا سلسلہ شروع کیا ہے، تو ایک مجھے ہی نہیں، بڑے بڑوں کو علی الاعلان تسلیم کرنا پڑا کہ اتنے بڑے اور اہم علمی و ادبی ذخائر کو قرینے کے ساتھ ایک لڑی میں پرونا اور انہیں تاریخِ ادبِ اُردو کا ایک ناگزیر حصہ بنا دینا کسی ایسے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا جو یونہی، محض ازراہِ تفنن، ایک رسالے کی ملکیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی ادارت کرنے

بیٹھ جائے۔ غزل نمبر اور افسانہ نمبر اور ادبِ عالیہ نمبر کی حد تک تو کہا جاسکتا تھا کہ ٹھیک ہے۔ انتخاب ہی تو کیا ہے اور انتخاب میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں حالانکہ جن حضرات کو ادبیات کے انتخاب کا تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ اگر اعلیٰ معیار پیشِ نظر ہو تو انتخاب میں بھی چند در چند ہاتھی گھوڑے لگ ہی جاتے ہیں۔ مگر اس کے بعد جب طفیل صاحب نے منٹو نمبر اور شخصیات نمبر اور لاہور نمبر اور آپ بیتی نمبر اور خطوط نمبر وغیرہ وغیرہ نکالے اور انہیں لفافوں کی بجائے کارڈ بورڈ کے صندوقچوں میں بند کر کے بھیجا تو میں نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا کہ میں ۱۹۵۰ء کے اوائل ہی میں "نقوش" کی ادارت سے الگ ہو گیا تھا۔ کیوں کہ اگر جب الگ نہ ہوتا تو اب الگ ہو جاتا اور اب میرے استعفے کا مضمون کچھ اس قسم کا ہوتا کہ:

> برادرِ عزیز طفیل صاحب! آپ نے اس نمبر کا جو منصوبہ مجھے دکھایا ہے، اس سے بحیثیت ایڈیٹر تو مجھے صدفی صد اتفاق ہے، مگر میری صحت اور میری ہمت اور میرے اعصاب اور میرے خون کے دباؤ اور میرے دل کی دھڑکنوں کو اس سے صدفی صد اختلاف ہے۔ مجھے ابھی چند روز اور زندہ رہنے کا شوق ہے اس لیے اگر آپ اقدام خودکشی پر بضد ہیں، تو میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا اور "نقوش" کی ادارت سے رخصت ہونے کی اجازت چاہوں گا!

مجھے ایسے عناصر کا علم ہے جو ظرف کی کمی یا حسد یا رقابت یا انانیت یا کسی اور وجہ سے طفیل صاحب کے اداراتی کارناموں کو بیکار اور بے مصرف قرار دے کر بظاہر بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں مگر بباطن وہ مسلسل اس کرب میں مبتلا رہتے ہیں کہ طفیل صاحب نے اتنے بڑے بڑے کام کیسے تکمیل کو پہنچائے جنھیں دوسرے ملکوں میں اکاڈمیاں مکمل کرتی ہیں یا جو خود ہمارے ملک کی اکاڈمیوں اور بورڈوں اور مجلسوں کے کرنے کے کام ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ طفیل صاحب اپنے ان کارناموں پر نہ صرف فخر محسوس کرتے ہیں بلکہ اس فخر کا اظہار بھی کر دیتے ہیں، اور میں کہتا ہوں کہ وہ فخر کا اظہار نہ کریں تو کیا ندامت کا اظہار کریں! انفرادی حقوق پر اس حد تک تو پابندی عاید نہ کیجیے کہ اگر کسی نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے تو اس پر فخر بھی نہ کر سکے۔

انھی عناصر کا یہ وطیرہ بھی ہے کہ وہ جب بھی "نقوش" کے کسی نمبر یا طفیل صاحب کی کسی تصنیف کے بارے میں اظہارِ رائے کریں گے تو اس بات کا حوالہ ضرور دیں گے کہ طفیل صاحب نے تو کسی زمانے

میں کتابت بھی کی ہے۔ بزعمِ خویش، وہ اس طرح طفیل صاحب کی تضحیک کرتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ اس طرح تو وہ اس شخص کی محنت اور لگن اور استقامت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ اگر طفیل صاحب نے کسی زمانے میں کتابت بھی کی ہے تو کون سا چھوٹا کام کیا ہے؟ کتابت تو ایک معزز اور محترم فن ہے اور مسلمانوں کے سرمایۂ فن میں تو کتابت کے شاہکاروں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ یہ تو وہ فن ہے جسے بادشاہوں تک نے اختیار کرنے میں عزت محسوس کی، اور ابھی ایک صدی پہلے تک کوئی شخص اُس وقت تک صحیح معنوں میں پڑھا لکھا نہیں کہلا سکتا تھا، جب تک وہ دوسرے فنون کے علاوہ فنِ کتابت پر بھی حاوی نہیں ہوتا تھا۔ پھر اگر یہ فن محض اس لیے حقیر ہے کہ اس سے متعلق فن کار مالی لحاظ سے عموماً آسودہ نہیں ہوتے تو پھر فنِ شاعری بھی قابلِ مذمت ٹھہرتا ہے کہ اس سے تو کتابت اتنی آمدنی بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اور پھر ہم میں سے بے شمار ایسے ہیں جن کے اجداد سپاہی تھے یا پٹواری تھے یا اسکول ٹیچر تھے یا نمک مرچ بیچنے والے دکاندار تھے۔ خود میرے اجداد کسان تھے اور کڑکتی دھوپ میں کھیتوں میں ہل چلاتے تھے۔ پھر ہم تو اس پیغمبر کی اُمّت میں شامل ہیں جنھوں نے بکریاں چرائی تھیں۔ آخر ہم ادیبوں نے عزّت اور وقار کے معیاروں میں زر و دولت کو کب سے شامل کر لیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں یہ طفیل صاحب کی مستقل مزاجی اور جوانمردی ہے کہ انھوں نے ایک کاتب کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا اور آج وہ ملک کے چند بڑے اشاعتی اداروں میں سے ایک ادارے کے مالک ہیں۔ انہیں جو تھوڑی سی آسودگی حاصل ہوئی ہے وہ کسی کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے بعد حاصل نہیں ہوئی اور انھوں نے علمی و ادبی حلقوں میں جو نام پیدا کیا ہے، وہ یونہی راہ چلتے پیدا نہیں کر لیا بلکہ انھوں نے یہ نام اپنی حیرت انگیز محنت اور جفاکشی سے باقاعدہ کمایا ہے۔ اگر ہم انہیں کھُل کر داد دینے سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ اس طرح ہماری شخصیتوں میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی، تو پھر ان کے کارناموں کی نفی کر کے بھی ہم اپنی شخصیتوں کی خلاؤں کو نہ صرف پُر نہیں کر سکتے بلکہ انہیں اور بھی ہولناک بنا ڈالتے ہیں۔

یہ ہیں طفیل صاحب — سیدھے سادے، محنتی، جنون کی حد تک مستقل مزاج، ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سچے — اور مخلص — اُن کے خلوص کا ذکر میں نے بار بار کیا ہے مگر اب آخر میں اُن کے کردار کی اس خوبی کا ایک اور ثبوت بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ چند برس پہلے طفیل صاحب کو ایک معروف ادیب سے شدید شکایت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے کسی مضمون میں طفیل صاحب پر ایسے اعتراضات کیے تھے جو الزامات کی نوعیت کے تھے اور طفیل صاحب کو اصرار تھا کہ یہ الزامات بے بنیاد ہیں۔ پھر میں نے سُنا کہ طفیل صاحب کے قبضے میں اُن صاحب کی ایک ایسی تحریر آ گئی ہے جو اگر شائع ہو جائے تو ادبی حلقوں میں علاقائی

تعصبات کے شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ مجھ سے بعض احباب نے کہا کہ میں طفیل صاحب کو اس تحریر کی اشاعت سے روکوں۔ اور مجھے طفیل صاحب کے خلوص پر اس حد تک اعتماد تھا کہ میں سیدھا ان کے پاس گیا۔ ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس اس قسم کی کوئی تحریر ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے کہا مجھے بھی دکھایئے۔ انھوں نے میری فرمائش فوراً پوری کی۔ تب میں نے پوچھا کہ کیا آپ اسے "نقوش" میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ بولے: "جی ہاں!" میں نے کہا: "اور اگر میں یہ کہوں کہ آپ اسے شائع نہیں کریں گے تو؟ —" اور طفیل صاحب نے ایک لمحے کی جھجک کے بغیر کہا: "تو میں اسے شائع نہیں کروں گا" — پھر ذرا رُک کر بولے "مگر —" میں نے پوچھا "جی، مگر کیا؟" جواب دیا: "یہی کہ آپ جیسا مناسب سمجھیں" — اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس تحریر کی اشاعت رکوا دی۔

یہ وہ لمحہ تھا جب میں نے سوچا کہ طفیل صاحب کے اور میرے تعلقات کے درمیان کتنے بہت سے انقلابات و سانحات گزرے ہیں، پھر ہم دونوں کے درمیان کتنا نظریاتی بُعد ہے اور ہماری ملاقاتیں کتنی کم ہو چکی ہیں مگر ہمارے درمیان جو چیز اب تک نہیں بدلی اور ان شاء اللہ کبھی نہیں بدلے گی، وہ ہمارا باہمی خلوص ہے اور یہ خلوص زبان کے اظہار کا کبھی محتاج نہیں ہوا۔ یوں سمجھیے کہ یہ رشتہ ہمارے درمیان لاسلکی کا سا رابطہ قائم رکھتا ہے کہ ہم اپنی اپنی عدیم الفرصتیوں کے شکار ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اتنے ہی قریب ہیں جتنے آج سے برسوں پہلے تھے۔ چند برس قبل جب میں نے 'فنون' جاری کیا تو مجھ سے کہا گیا کہ میرے اس اقدام کو طفیل صاحب اپنے 'نقوش' کے حوالے سے بہت بُرا مانیں گے۔ وقتی طور پر میں نے ان حضرات کا یہ خدشہ دُور کر دیا مگر پچھلے دنوں یہی حضرات یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے کہ "فنون" تو "نقوش پریس" میں چھپنے لگا ہے۔ کسی نے کہا کہ "ندیم صاحب آپ بڑے بھولے آدمی ہیں۔ آپ نے یہ کیا کیا؟" — اور میں نے عرض کیا کہ اس سوال کا جواب مجھ سے نہیں، طفیل صاحب سے پوچھیے جو مجھ سے بھی زیادہ بھولے آدمی ہیں!

شخصیّت نگار کی تلاش

ممتاز مفتی

طفیل کی شخصیت کے متعلق کرشن چندر لکھتے ہیں :- "پہلی بار جب طفیل میرے کمرے میں داخل ہوئے تو پہلی نظر میں وہ مجھے سجادہ نشین نظر آئے، دوسری نظر میں لکڑیوں کے ٹال کے مالک، تیسری نظر میں ایک معصوم سے بچّے۔ چوتھی نظر کا انہوں نے موقعہ ہی نہیں دیا —— اس وقت تک وہ مجھ سے بغل گیر ہو چکے تھے ۔" (آپ صفحہ ۲۲)

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

طفیل سے میں بیسیوں مرتبہ مل چکا ہوں لیکن انہوں نے مجھے دوسری نظر کا بھی موقع نہیں دیا۔ میرا اندازہ ہے کہ دوسری نظر کا انہوں نے کبھی کسی کو موقعہ نہیں دیا۔ اگرچہ کبھی کبھار ان کے معصوم ہونٹوں میں دبے ہوئے مبہم سے شرارت آمیز اشارے کو دیکھ کر شک پڑتا ہے کہ وہ دوسری نظر کا موقعہ دے سکتے ہیں

اپنے محلے والوں کے متعلق تشکیلہ سے وضاحت کرتے ہوئے طفیل نے کہا تھا —— "یہ سب لوگ مجھے صوزتاً جانتے ہیں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ میں کون ہوں ——" (جناب صفحہ ۶)

اس لحاظ سے میں طفیل کا محلے دار ہوں۔ غالباً ہم سب ہی ان کے محلے دار ہیں۔ بیسیوں ملاقاتوں کے باوجود میں انہیں صرف صوزتاً جانتا رہا۔ وہی ایک نظر۔ دوسری نظر کا موقعہ طفیل نے نہیں بلکہ "آپ"، "جناب" "صاحب" نے دیا۔ میں نے پہلی مرتبہ طفیل کو ان تحریروں کے آئینے میں دیکھا۔ غالباً طفیل وہ پدمنی ہے جسے آئینے کی مدد کے بغیر دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ طفیل ان شخصیتوں میں سے نہیں جو صوزتاً ہویدا ہوتی ہیں۔ ان شخصیتوں میں سے بھی نہیں جو بات چیت اور برتاؤ میں اپنا آپ اجاگر کرتی ہیں یا کر سکتی ہیں۔ ان شخصیتوں میں سے بھی نہیں جو اپنے آپ سے دل کی بات کہہ سکتی ہیں۔

طفیل کو صوزتاً جاننے اور "آپ" میں ان کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد مجھے ایسا لگتا ہے کہ طفیل گونگا پہلوان ہے اور اگر پہلوان کی قوت کی نوعیت اور اس کے تصرف کے انداز کو مدِ نظر رکھ کر بات کی جائے تو یوں کہنا پڑے گا کہ طفیل گونگی پہلوان ہے۔

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس لیے پہلوان ہیں کہ گونگے ہیں۔ یا اس لیے گونگے ہیں کہ پہلوان ہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اگر طفیل کی شخصیت ان دونوں ستونوں پر استوار ہوتی تو بات

گذر نہ ہوتی ــــ لیکن فطرت نے گونگے پہلوان میں نسائیت کی ایک رنگین لہر دوڑا کر بات اُلجھا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شخصیت میں جاذبیت اور اسرار کی کلی لگ گئی۔ عزم میں نسائی ضد پیدا ہو گئی۔ نقوش کے ماتھے پر بندی لگی اور آنکھ میں سرمے کی دھار ـــــ وہ پبلشر سے ادیب بن گئے۔ تحریر میں آگ نے پھول انگاروں کی شکل اختیار کر لی اور طفیل خود ایک المیہ بن کر رہ گئے۔

اس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے کہ ازلی طور پر اظہار کے راستے مسدود ہوں ایک طوفان چلنے کے لیے بے تاب ہو۔ اور شدید احساسات، احتیاط، سلیقہ، نیکی اور حسن دامن تھام کے بیٹھے ہوں۔

طفیل کے ان "آئینوں" پر تبصرہ کرتے ہوئے کرشن چندر نے لکھا تھا:

"لکڑیوں کے اس گٹھے میں جس کا نام جناب ہے ہر طرح کی لکڑی ہے۔ موٹی اور پتلی بھی۔ نئی اور پرانی بھی، گیلی اور سوکھی بھی۔ مگر ادیبوں کا یہ پشتارہ بے حد دلچسپ۔ صفحہ اوّل سے آخر تک یہ کاغذی زنبیل گوناگوں جادو رنگ کیفیتوں سے معمور ہے اور ان میں ہر لکڑی جلتی ہے کوئی پطرس کی طرح پٹاخے چلاتی ہے، کوئی مرزا ادیب کی طرح رُک رُک کر جلتی ہے کوئی شکیلہ اختر کی طرح ایک ہی رنگ میں جلتی چلی جاتی ہے تو کوئی مجاز کی طرح جل کر راکھ ہو چکی ہے۔" (آپ صفحہ ۲۲)

کرشن چندر نے اس لکڑی کا تذکرہ نہیں کیا جو پھلجھڑی کی طرح جلتی ہے اور جگہ جگہ ایسے پھول انگارے چھوڑتی ہے کہ ساری فضا ان پھول انگاروں سے بھر جاتی ہے اور جُملہ لکڑیاں پس منظر میں سُلگتی رہ جاتی ہیں۔ ایسے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے 'آپ'، 'جناب'، 'صاحب' کے پردے میں مَیں ہی میں جلوہ آرا ہو۔ اس ذوق جلوہ آرائی نے طفیل کو ادیب بنا دیا۔

ویسے طفیل سے پوچھئے تو وہ جلوہ آرائی کے حق میں نہیں۔ چونکہ اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے ـــ شکیلہ نے پوچھا آپ نے مکان پر اپنے نام کی تختی لگائی ہوتی۔ طفیل نے جواب دیا میں اسے پسند نہیں کرتا۔ اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے۔ (آپ صفحہ ۴۷)

خاکہ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

خاکہ میں ضروری ہے کہ لکھنے والا شخصیت میں گھسا ہوا نظر نہ آئے بلکہ شخصیت ہی رواں دواں دکھائی دے۔ اگر مصنف خود کو لانے پر مجبور ہو تو ایسے جیسے قمیص میں بٹن نہ کہ بٹن میں قمیص۔ لیکن ان قمیصوں کو ملاحظہ کیجئے۔ ان پر جا بجا بٹن ٹانکے ہوئے ہیں اور وہ کتنے اچھے لگتے ہیں۔ شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ چپکے سے چق اٹھاتے ہیں اور جھانک کر زیر لب کہتے ہیں[1] "میں خاکسار ہوں۔" (آپ صفحہ ۱۵۲) "میں

[1] صاحب (دیباچہ)

تو کودن ہی رہا۔" (آپ ص ۱۹۲) "شرفا میں سے نہیں ہوں" (آپ ص ۱۹۲) "معقول نہ بن سکا" (آپ ص ۱۵۹) "تعصبات میں کھویا ہوا ہوں۔" (آپ ص ۹) "میری خام خیالی یہ ہے۔"[1]

میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ طفیل کی اپنی ذات کے متعلق "خام خیالیوں" "ناچیز رائوں" "من آنیوں" سے بچیئے۔ ان بھول بھلیوں میں پھنس کر آپ کچھ پا نہیں سکتے صرف کھو سکتے ہیں۔ "انہیں" "راستہ تلاش کرو" قسم کا گورکھ دھندا بننے کا لاشعوری شوق ہے اور قاری کو جستجو پر آمادہ کرنے کے لیے انہوں نے۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ میرا کیا ہے۔ میری بات چھوڑیئے۔ قسم کے انوکھے سنگار ایجاد کر رکھے ہیں۔

بے شک طفیل کا خلوص مسلم اور بے پایاں ہے شرط یہ ہے کہ بات ان کی ذات کے متعلق نہ ہو۔ آپ یا مجھ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے چھپے رہنے کے لیے انہوں نے عجز بازیوں کا ایک عظیم اُلجھاؤ تخلیق کر رکھا ہے۔ پھر بھی کبھی کبھار ان کے خلوص کی کرن ان کی اپنی ذات پر پڑ جاتی ہے۔ وہ چونک پڑتے ہیں۔ پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور پھر موضوع بدل دیتے ہیں اس کے سوا چارہ کار بھی کیا ہو۔

وہ رنگین مخلص اور جہاں دیدہ بڈھا بھی جسے ہم بابائے اُردو کہتے ہیں۔ طفیل کی شخصیت کے متعلق "عجیب و غریب" (آپ ص ۱۳) کہنے سے باز نہ رہ سکا۔ اگر وہ رکھ رکھاؤ کا دیوانہ نہ ہوتا تو یقیناً عجیب و غریب کی وضاحت کرتا۔

طفیل کی منہ بولی بہن شکیلہ اختر نے تہذیب احتیاط اور احترام کے باوجود اپنے بھائی صاحب کو "چپ شاہ" اور "چلتر" کے القاب دیئے۔ چپ + شاہ + چلتر میں طفیل کی شخصیت کے تین پایہ ستون موجود ہیں۔ (آپ ص ۹)

لوگوں کی آراء کو چھوڑیئے۔ جناب میں التزاماً اپنی شخصیت کے ضمنی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے دو ایک جگہ سہواً طفیل صاحب خود اپنی بنیادی شخصیت کا تذکرہ کر گئے ہیں۔ مثلاً:

"میں ان صاحب کو اگست ۱۹۲۳ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں مگر یہ حضرت مسلسل چکمہ دیئے جا رہے ہیں۔ اور اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ آخر ہیں کیا بلا۔" (جناب ص ۹۴)

انہیں صفحات میں انہوں نے اپنے متعلق اپنے دوستوں کا خیال درج کیا ہے:۔ "طفیل برانڈ قسم کے لوگ بہت ہی کمیاب ہیں بلکہ یہ برانڈ اب آتا ہی نہیں۔" (جناب ص ۹۴)

پھر یہ بھی کہ:۔ "جب بھی اپنے بارے میں غور کیا تو طفیل میں دوسرا طفیل چھپا ہوا پایا۔" (جناب ص ۱۱۶)

---

[1] صاحب (دیباچہ)

لیکن "راستہ تلاش کرو" کے ازلی شوق نے حقیقت کا پلّو پھڑ لیا۔ جھٹ سے بات بنائی ـــــــ نقاب گرا یا بولے "یہ دوسرا طفیل مدیر نقوش ہے" یوں کرسیٔ ادارت پر بیٹھنے کا ناٹک کھیل کر، بچ کر صاف نکل گئے۔

بہرحال یہ حقیقت مسلّم ہے کہ طفیل میں ایک اور طفیل چھپا بیٹھا ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک پہلوان ہے۔ مگدر اٹھائے پھرتا۔ ہم چو ما دیگرے نیست۔ دوسرا دھان پان۔ گھونگھٹ نکالے۔ ہاتھ جوڑے من آنم کہ من دانم۔ طفیل اپنے ان دونوں پاٹوں تلے پس رہے ہیں اور آپ اور ہیں راستہ تلاش کرو کی بھول بھلیاں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

علم النجوم کے مطابق یہ ساری قیامت اس لیے ٹوٹی کہ طفیل اگست میں پیدا ہوئے۔ اگر وہ چار ایک دن پہلے پیدا ہوتے لیو[۱] ہوتے جس کا نشان شیر ہے۔ خالص پہلوان۔ اپنے جیسا کسی اور کو نہ سمجھتے۔ ٹھہرو میری بات سنو۔ میری طرف دیکھو۔ میں نے تمہیں کہا نہ تھا۔ سا انداز ہوتا۔ چھاتی نکلی رہتی۔ مونچھ مروڑ کر چلتے۔ اگر وہ دس بارہ دنوں کے بعد پیدا ہوتے تو ورگو[۲] ہوتے۔ جس کا نشان دوشیزہ ہے اور جسے کنیا بھی کہتے ہیں۔ پاکیزہ دوشیزہ۔ آرسی کا کٹورہ بنا کر انتظار کرنے والی۔ لاج کی ماری۔ پہلے سے دیا بجھانے والی بے زبان۔ سر تسلیم خم کرنے والی داسی۔

لیکن طفیل اس وقت پیدا ہوئے جب لیو کا شیر مدھم پڑتا جا رہا تھا اور دوشیزہ ابھر رہی تھی۔ شیر اور دوشیزہ کا ملاپ ہو گیا۔ یوں شیر اور دوشیزہ خلط ملط ہو گئے۔ شیر میں دوشیزہ کا یا دوشیزہ میں شیر کا پیوند لگ گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ طفیل میں شیر کی سی دبی دبی تندی ہے غصّہ ہے۔ خود اعتمادی ہے۔ ایسا کام ہاتھ میں لینے اور اُسے تکمیل دینے کا جذبہ ہے جو کوئی دوسرا نہ کر سکتا ہو۔ دوسرے کو کھری کھری سنا دینے کی جرأت ہے اور اس کے ساتھ ہی دوشیزہ ایسی جھجک ہے رنگین بیانی ہے حُسن پسندی ہے۔ لاج کا احساس ہے۔ عجز ہے۔ برداشت ہے اور نیکی کا بے پناہ خبط۔

آپ، صاحب اور جناب میں جگہ جگہ دوشیزہ گنگناتی ہے۔ کہیں کہیں شیر غرّاتا ہے۔ دوشیزہ اور شیر۔ کس قدر رومان بھرا امتزاج ہے۔ رنگین دو آتشہ۔

دوشیزہ کہتی ہے ـــــــ اچھائیوں کا اظہار برملا کرتا ہوں۔ کمزوریوں کے اظہار کیلئے پہلے جواز ڈھونڈتا ہوں۔ پھر اشارۃً کچھ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیتا ہوں۔ اتنی احتیاط پر بھی دوست کبھی خوش نہ ہوئے" (آپ صفحہ ۱۳۵)

---

[۱] LEO

[۲] VIRGO

شیر کہتا ہے: ——— چونکہ ہمیں کچھ اور کچھ اور کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے ہیں بھی بال کی کھال اتاروں گا۔ خواہ سلیقہ ہو یا نہ ہو (آپ صہ ۱۸۱)

دوشیزہ کہتی ہے: ——— میں نقاد نہیں ہوں کہ جہاں چاہوں ٹونڈی ماروں۔ میرا موضوع شخصیتوں کا مطالعہ ہے جس میں جھوٹ نہیں چلتا بلکہ کنواری لڑکیوں کی طرح اپنی لاجوں آپ مرنا پڑتا ہے۔ (آپ صہ ۱۸۱)

شیر کہتا ہے: ——— میں بھی ایسا کھرا انسان ہوں کہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ خواہ زبان سے کچھ کہوں۔ دماغ یہی کہتا ہے۔ ہنہ! (آپ صہ ۱۸۸)

دوشیزہ کہتی ہے: ——— میں کوئی مفتیٔ وقت ہوں کہ کسی کو مسلمان ہونے کے اور کسی کو مسلمان نہ ہونے کے پرمٹ بانٹتا پھروں۔ (آپ صہ ۱۳)

شیر غراتا ہے: ——— آج مولویوں کا دکاندار طبقہ ادب کو جس طرح مسلمان بنانے کی فکر میں ہے۔ اس میں ادیب کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔ (آپ صہ ۹۴)

شیر اور دوشیزہ الگ الگ بولتے رہیں تو محفل لگی رہتی ہے لیکن کبھی کبھار وہ ایک دوسرے کے مدمقابل آکھڑے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو طعنے دیتے ہیں۔ پھر بھانڈے پھوٹتے ہیں۔ پردے چاک ہوتے ہیں۔ بھرم ٹوٹ جاتے ہیں:۔

دوشیزہ کہتی ہے: ——— انہیں اپنے بارے میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ میں ہر وہ کام کر سکتا ہوں جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی غلط فہمی نے انہیں مدیر نقوش بنا دیا تھا۔ ورنہ یہ اور نقوش کی ادارت۔ ہنہ! (جناب صہ ۱۱)

شیر دھاڑتا ہے: ——— اپنی قسمت میں خدا نے کسی معاملے میں ہار نہیں لکھی۔ (آپ صہ ۲۶)

دوشیزہ مذاق اڑاتی ہے: ——— آج بھی جب کہ اس واقعہ کو تیس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ انہوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی عادت کو ترک نہیں کیا۔ (جناب صہ ۹۶)

شیر قہقہہ مارتا ہے: ——— تمہارے پسینے کیوں چھوٹتے ہیں (جناب صہ ۱۰۳) ———

ان گھر کے بھیدیوں کی باہمی چپقلش کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لنکا ڈھے جاتی ہے اور لنکا کی اوٹ میں چھپے ہوئے مناظر منظر عام پہ آجاتے ہیں۔

لیکن جب یہ دونوں سمجھوتہ کر کے ایک ہو جاتے ہیں تو اندھیرے اجالے سمٹ کر معدوم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ روپیلی شفق چھا جاتی ہے ایک حسین دھندلکا ابھرتا ہے۔ بادِ نسیم چلتی ہے۔ پتیاں چھوٹی

ہیں۔ پھول کھلتے ہیں اور ادب کی دنیا میں بہار آجاتی ہے ـــــ لیکن اس ملاپ کے باوجود شیر شیر رہتا ہے اور دوشیزہ دوشیزہ۔

شیر لکھواتا ہے دوشیزہ لکھتی ہے ملاحظہ ہو:۔

شاہد احمد دہلوی کو خط لکھاتے ہوئے شیر گرجا۔ لکھو دوشیزہ ـــــ شاہد احمد صاحب آپ خطرناک آدمی ہیں۔ (آپ صفحہ ۱۴۵) ـــــ دوشیزہ گھبرا گئی۔ اس نے بڑھ کر شیر کی گمچ پر پھولوں کی چادر ڈال دی۔ بولی ـــــ "شاہد احمد دہلوی تو اچھے آدمی ہیں مگر جو ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں۔ اصل میں وہ ہیں خطرناک" (آپ صفحہ ۱۴۵)

شیر جھنجھلایا۔ لکھو دوشیزہ ـــــ "شاہد احمد صاحب جو مضمون آپ نے لکھا ہے وہ مجھے پسند نہیں" (آپ صفحہ ۱۴۵) دوشیزہ ٹھٹھک کر مسکرائی اور اپنی طرف سے گلی ٹانک دی ـــــ "اس میں میرا شاہد احمد نہیں" (آپ صفحہ ۱۴۵)

نیاز کے متعلق شیر نے لکھا: ـــــ آپ شعروں کا آپریشن بھی خوب کرتے ہیں۔ اس آپریشن میں شعر کو ذبح بھی کر ڈالتے ہیں۔ اصلاحیں بھونڈی دیتے ہیں۔ (آپ صفحہ ۱۴۰) دوشیزہ نے چپکے سے "میری رائے میں" ـــــ بڑھا دیا۔

شیر نے لکھا: ـــــ آپ ابتدائی دور میں ایسا نہیں کرتے تھے چونکہ عمر کے ساتھ ساتھ اُستادی شان بھی بڑھتی ہے ـــــ

دوشیزہ نے وار کند کرنے کے لیے بڑھایا: ـــــ اس لیے سوچنے کا مقام ہے قصور ان کا ہوا یا یہ بھی ان کی عمر کے پلے باندھنا پڑے گا۔ (آپ صفحہ ۱۴۵)

جوشؔ کے متعلق لکھتے ہوئے شیر غرّایا: ـــــ وہ اور لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو اس ڈر سے قابو میں رکھتے ہوں گے کہ ہمیں دنیا دی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ (آپ صفحہ ۱۶) ـــــ دوشیزہ نے اپیج لگائی ـــــ جوشؔ صاحب کو ملمع بازی پسند نہیں مصلحت آمیز قسم کی قیود سے قطعی طور پر نا آشنا ہیں۔ (آپ صفحہ ۱۶)

ادب اور خاکہ نویسی میں طفیل کی عظمت کا راز یہ ہے کہ شیر زنجیر سے بندھا ہوا ہے اور دوشیزہ آزاد ہے۔ نجی زندگی میں طفیل کے اپلے کا یہ راز ہے کہ شیر زنجیر سے بندھا ہوا ہے اور دوشیزہ (دوشیزگی کی ازلی بندشوں کے سوا) آزاد ہے۔ نقوش کے ضخیم نمبروں کی کامیابی اس لیے ہوئی کہ اگرچہ شیر بندھا ہوا ہے مگر ہے وہ سچ مچ کا شیر نقوش کا حسن اور نوک پلک دوشیزہ نے اپنے ذمے لے لی۔ جملہ ادیبوں سے خوشگوار تعلقات اس لیے قائم ہوئے کہ شیر بندھا ہوا ہے اور دوشیزہ آزاد ہے۔

دوشیزہ نے کھل کھیل کر طفیل کو ادیب بنا دیا اگر شیر کھلا ہوتا تو وہ بہت بڑے اور کامیاب بزنس مین

ہوتے اور آج لاکھوں میں کھیلتے۔

دوشیزہ کے کھل کھیلنے کی بات سُن کر شاید طفیل شرما جائیں۔ لیکن کیا کیا جائے جب تک نسائیت کی کلی نہ ٹانکی جائے ادیب کی تخلیق نہیں ہوتی۔ صرف طفیل ہی نہیں بیشتر ادیب ورگو (دوشیزہ) ہیں۔ مثلاً اشفاق احمد ہیں اور اگر مجھے بھی فہرست میں شامل کر لیا جائے تو میں خود ورگو ہوں اور دوشیزہ کے پھنوں سے خاصہ واقف ہوں —— میری دوشیزہ کہہ رہی ہے یہ بھی لکھ دو کہ افسوس مجھ میں شیر کی آمیزش نہ ہوئی۔

"آپ" میں صفحہ ۱۶۲ – ۱۵۵ میں طفیل نے خاکہ نگاری اور خاکہ نگاروں کے متعلق اپنے خیالات کا وضاحت سے اظہار کیا ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ پھول بھی ہوں اور کانٹے بھی چٹکیاں بھی ہوں اور التفات بھی۔ یادِ حق بھی ہو اور رندانہ انداز بھی۔ لیکن طفیل کے جملہ خاکوں کو پڑھنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ طفیل کا ایمان ہے کہ آپ کسی شخصیت کو قلم بند نہیں کر سکتے جب تک آپ کو اس شخصیت سے بے پناہ پیار نہ ہو۔

طفیل کو ان شخصیتوں سے بے حد پیار ہے۔ اتنا پیار ہے کہ پڑھنے والے کو غصہ آنے لگتا ہے۔ کبھی وہ ان کی وکالت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور خاکے سے کورٹ روم کی بو آنے لگتی ہے۔ کبھی وہ ان کا منہ دھوتے ہیں بال بناتے ہیں سرمہ لگاتے ہیں جیسے کسی ایسی عورت کے ہاتھ بچہ لگ گیا ہو جو اولاد سے محروم ہو اور خاکے سے ماں کی بو آنے لگتی ہے۔ لیکن محبت کے ساتھ ساتھ وہ چٹکیاں بھی بھرتے جاتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے طفیل کہہ رہے ہوں، چٹکی بھرنے کا مزا ہی کیا جب تک دل میں محبت نہ ہو۔ اور۔ محبت کا مزا ہی کیا جب تک ساتھ چٹکیاں نہ ہوں۔ اور سچ پوچھئے تو ان تمام خاکوں کی دلکشی اور حُسن کا راز یہی چٹکیوں اور یہی محبت کی آمیزش ہے۔

طفیل کے طرزِ تحریر کی تمام تر رنگینی شگفتگی اور حُسن بھی اسی آمیزش کی وجہ سے ہے۔ شخصیت میں شیر اور دوشیزہ کی آمیزش، بیان میں چٹکیوں اور محبت کی آمیزش، اسلوب میں مٹھاس اور نمک کی آمیزش، عقیدے میں بُت پرست اور مومن کی آمیزش۔ کردار میں رادھا اور راہو کی آمیزش۔ مجھے اس گنگا جمنی رنگ کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ایک جانب عمر خیام بیٹھے ہوں، دُوسری جانب چغتائی کی حسینہ اور درمیان میں صراحی اور شیشے کی جگہ جائے نماز اور تسبیح پڑی ہو۔

طفیلیات

ڈاکٹر محمد حسن

چاہ کن را چاہ در پیش ۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ جو دوسروں پر خاکے لکھے گا ایک دن اس پر بھی خاکہ لکھا جائے گا۔ محمد طفیل کے خاکوں میں دو بنیادی عناصر ہوتے ہیں، ایک محمد طفیل اور دوسرا ان کے طفیل میں ممدوح کا ایسا بانکا ترچھا رُوپ جو خود صاحبِ تصویر کی نظروں سے چھپا ہو۔ ان کے علاوہ کچھ اک "رنج گراں باری زنجیر" بھی ہوتا ہے جسے محمد طفیل کا گھر بار قلم اور تیکھا طرزِ تحریر نشاط میں تبدیل کر دیتا ہے۔

محمد طفیل کے بارے میں شاید سب سے انوکھی بات یہی ہے کہ وہ قطعی طفیلی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے طفیل نقوش نے نئی زندگی پائی اور نقوش کے طفیل اردو کے بہت سے نئے ادیب ابھرے، پرانے ادیب چمکے اور اردو ادب پر نیا نکھار آ گیا۔ پھر انہی محمد طفیل کے طفیل بے رنگ خاکوں میں ایسے چٹکیلے رنگ بھرے گئے کہ بہار آ گئی بظاہر سیدھی سادی شخصیتوں کے ایسے ایسے خط و خال واضح ہوئے کہ آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال بن گیا۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک بار کسی بادشاہ نے مصوروں کی دو ٹولیوں کا مقابلہ کرایا۔ دونوں کو قصرِ شاہی کی دو مقابل دیواروں پر بے مثال نقش و نگار بنانے تھے۔ دیکھنا یہ تھا کہ کون زیادہ بہتر تصویریں بناتا ہے ایک گروہ جی جان سے نقش و نگار بنانے میں لگ گیا، دوسرے گروہ نے پردہ ڈال کر مقابل کی دیوار کو ایسا صیقل کر دیا کہ جب پردہ ہٹایا گیا تو سامنے کی دیوار کے نقش و نگار زیادہ نکھرے اور ستھرے انداز سے اس آئینہ ایسی دیوار میں جھلک رہے تھے۔ محمد نقوش کا فن بھی کچھ اسی ڈھب کا ہے۔ یہ اپنی شخصیت کو آئینہ ایسی صیقل سے آراستہ رکھتے ہیں اور جہاں کہیں کوئی دلچسپ شخصیت نظر آتی ہے اپنی شفاف شخصیت کو لا سامنے کر دیتے ہیں کہ اس کے سبھی نقش و نگار ان کی اپنی شخصیت، ان کے اپنے طرز کے آئینے میں جھلکنے لگیں۔

محمد طفیل نے بڑی ریاضت سے اپنی شخصیت کو شفاف بنایا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا

لگتا ہے جیسے یہ شخصیت آئینہ نہ ہو شیشہ ہو جس سے نگاہیں آسانی سے آر پار ہو جاتی ہیں گرد کدورت سے پاک، ادیبوں ایسی کاٹ پیچ کرنے والی، ایک دوسرے سے برسرپیکار قوم کے درمیان رہ کر اور ان سے معاملہ کرتے ہوئے اپنے دامن کو کدورتوں سے سمیٹ لے جانا حیرت خیز کام ہے اتنا حیرت خیز کہ بیسویں صدی کے معجزوں میں اس کا شمار کرنا چاہیے۔

سیدھے سادے طویل قامت، گداز جسم والے محمد طفیل کو باطنی زندگی گزارنے میں بڑا لطف آتا ہے ان کی شخصیت اس آرام دہ موٹر کار کی مانند ہے جو موسمی اثرات سے محفوظ کر دی گئی ہو دبیز پردوں اور آرام دہ سیٹوں سے آراستہ ہو چاروں طرف شفاف شیشے لگے ہوں جن سے باہر کی دنیا کا نظارہ صاف نظر آتا ہو۔ محمد طفیل اپنی شخصیت کے اسی آرام دہ خول میں مزے سے سفر کرتے ہیں جہاں کہیں جاتے ہیں بقول میراجی:

"میرے پیارے لوگو! میرے پاس آؤ"

پر کاربند نہیں ہوتے بلکہ پبلسٹی سے گریزاں بلکہ شرمندہ اور حیران سے نقوش پرستوں کے مجمع سے دامن کشاں سے ادیبوں سے کچھ اس طرح ملتے جس کا بیان فارسی کے ایک شاعر نے اس طرح کیا ہے۔ "دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" یہ ہیں محمد طفیل، جب کوئی ان سے بات کرتا ہے یہ گویا اپنے ذہن کے لٹمس پیپر پر اس کی باتوں کے نقش اور رنگ ابھرتے دیکھتے رہتے ہیں کیسی شخصیت ابھر رہی ہے کیسے رنگ کس قسم کے دائرے یا نقش بنا رہے ہیں۔ ممکن ہے باتیں کرنے والا ساری داستان امیر حمزہ ختم کرلے اور یہ ایک چونکا دینے والا جملہ سوچتے رہ جائیں یہ بھی اس لیے نہیں کہ چونکا دینا ان کا فن ہے یا انہیں سننے یا پڑھنے والوں کی واہ واہ عزیز ہے بلکہ محض اس لیے کہ اچھا جملہ ان کے نزدیک کار ثواب ہے بلکہ عین عبادت ہے جس کے ستھرے پن اور نفاست کے اس نظام اقدار میں اہم مقام حاصل ہے جسے محمد طفیل تہذیب جانتے ہیں۔

جی ہاں! محمد طفیل کو نفاست عزیز ہے اور ان کے نزدیک نفاست انسانیت کا دوسرا نام ہے نفاست ان کے ہاں امارت کے ہم معنی نہیں سلیقے سے عبارت ہے نقوش پڑھنے والوں کو یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر صفحے پر محمد طفیل کی فطری نفاست کی مہر ثبت ملے گی لیکن نقوش کے صفحوں سے باہر بھی نفاست محمد طفیل کی شخصیت کی کلید ہے ہر چیز قرینے سے ہر نکتہ مقام سے ہر لفظ طریق سے حتیٰ کہ خاموشیاں بھی اپنی جگہ پر! یہ ہیں محمد طفیل۔

اور نفاست کے اس معیار نے محمد طفیل کو ایک اور بڑا وصف بخش دیا وہ ہے بے تکی

باتوں سے مرعوب نہ ہونے کا وصف ہر انسان، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ادیب، وزیر یا بقول تاباں "توپ" کیوں نہ ہو۔ آخر ہے انسان ہی اور جب انسان ہے تو پھر اس کے لوازم سے رعب کھانا چہ معنی دارد! میرا خیال ہے کہ جس ایک خصوصیت نے محمد طفیل کے لکھے ہوئے خاکوں میں جان ڈال دی ہے وہ یہی عدم مرعوبیت ہے۔ آپ، جناب، معظم، محترم وغیرہ وغیرہ میں یہ خصوصیت لال دھاگے کی طرح صاف جھلکتی ہے مرعوبیت نہ ہو تو رشتہ موضوع اور مصنف کا نہیں رہتا شخصیت اور فن کا ہو جاتا ہے اور سوال سیدھا سادا یہ رہ جاتا ہے کہ زندگی کے سادہ ورق پر دیے ہوئے وقت میں کون کس قسم کے نقش و نگار بنا سکا ہے اور کیسے؟ باقی تمام فضائل و مناقب فرضی، تمام تشبیب و گریز مہمل! پٹے پٹائے لفظوں میں یوں کہیے کہ محمد طفیل "برہنہ حرف گفتن" کے قائل ہیں اور اس برہنگی میں وہ شائستگی اور ہنرمندی ہے جس پر ہزار رنگینیاں قربان ہیں (بے جھجک تنقید کے نمونے دیکھنے ہوں تو مولانا کوثر نیازی اور منٹو کے خاکے پڑھ ڈالیے)

محمد طفیل کے نزدیک ہر شخص ایک اسٹائل ہے یعنی اسٹائل اور اس اسٹائل کی کھوج وہ اپنی رگوں میں دوڑتے پھرنے والی عکس ریز نگاہوں سے کرتے ہیں بعض اسٹائل معلق ہوتے ہیں لفظ آپس میں دست و گریباں۔ معنی لفظوں سے برسرپیکار۔ محمد طفیل ان سب کو اپنی اپنی جگہ بٹھاتے ہیں ان کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کا ایک پیٹرن یا آہنگ بنانے کی کوشش کرتے ہیں کچھ اسٹائل نظر فریب ہونے کی حد تک سادہ ہوتے ہیں لیکن اس فریب سے آگے قدم بڑھاتیے کہ پیچیدگیاں دامن کش ہوتی ہیں وہ بھی ایسی جیسے کہتی ہوں کہ 'جا ایں جا است' محمد طفیل ان پیچیدگیوں میں غلطاں پیچاں تو شب آفریدی چراغ آفریدم، گنگناتے گردش کرتے نظر آتے ہیں غرض محمد طفیل کے خاکوں کے موضوع گویا الگ الگ کائناتیں ہیں جو شخصیت کی سطح پر آباد ہیں اور محمد طفیل غالب کے لفظوں میں شطرنجی اور لوٹا لیے کبھی بغداد پہنچے کبھی ایران جا دھمکے۔ الفاظ غالب کے نہیں مفہوم غالب کے ایک خط کا ضرور ہے اسی طرح جیسے شخصیت دوسرے کی ہوتی ہے اور مفہوم محمد طفیل کا۔

محمد طفیل کا آرٹ برجستہ، بلیغ مختصر جملوں کا آرٹ ہے! ۱۷۸۳ کی بڑی خوبی یہی ہے کہ لفظ کم اور پھیلاؤ زیادہ اور پھیلاؤ ایسا کہ کہاں کہاں نہ گئی طبع بدگمان میری۔ طفیل نے اسے جس طرح برتا ہے اس کی مثالیں کم ہیں بہت کم ہیں ان کا حال یہ ہے کہ سیدھے چلتے چلتے

اچانک ایسا موڑ کاٹتے ہیں کہ پڑھنے والا حیرت انگیز انبساط کا شکار ہو جاتا ہے دو قدم بھی سیدھے چل لیں تو سمجھیے کہ نیکی کی جون میں ہیں ورنہ ایک قدم ایران ہے تو دوسرا توران اور اسی قسم کے تضادسے طرزِ تحریر میں ایسا انوکھا پن جگا دیتے ہیں کہ بے محابا لبوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی ہے یا دل میں لطیف درد جاگ اُٹھتا ہے یا ذہن میں کوئی نیا خیال کروٹ لینے لگتا ہے شرارتیوں کی اصطلاح میں اسے چٹکی کاٹنا بھی کہا جاسکتا ہے مگر طفیل کو دراصل ردِّ عمل سے اتنی غرض نہیں ہوتی جتنی خود عمل سے۔ وہ نیکی کو کنویں میں ڈالنے کے قائل ہیں اس لیے نہ ممدوح کے چیں بہ جبیں سے غرض رکھتے ہیں نہ داد و تحسین سے۔ اُنھوں نے تو گویا اپنی عکس ریز نظروں سے مریخ سے آگے کی سربستہ کائنات کو دریافت کرکے رکھ دیا۔ اب اپنی بلا سے، لوگ خوش ہوں یا ناخوش! خود وہ کائنات اپنی دریافت پر نوحہ کناں ہو یا شادماں!

ویسے محمد طفیل واہ واہی نہ ہوتے ہوئے بھی اچھے دردمند قسم کے آدمی ہیں اور یہ بات ان کے خاکوں سے اتنی ظاہر نہیں ہوتی جتنی خود ان کی شخصیت کے برتنے سے! وہ دوستوں کے دوست ہیں اور یاروں کے یار ہیں مگر اس قدر خنکی، نرمی اور شائستگی سے جیسے ہوا کا جھونکا آپ کا ہمدم ہو اور اپنے وجود کا احساس تک نہ ہونے دے۔ ان کا حال کچھ ان کلاسیکی قسم کے بزرگوں کا ہے جو سیدھے ہاتھ کی نیکی کی خبر بائیں ہاتھ کو نہیں ہونے دیتے تھے اور ایسی بہت سی نیکیاں ان کے نامۂ اعمال میں ہیں۔ اس معاملے میں ان کا شمار صوفیا میں کیا جاسکتا ہے گو صوف نہیں پہنتے بلکہ صوفیانہ رنگ کے لباس سے بھی احتراز کرتے ہیں مگر صفا سے ان کا تعلق البتہ مستحکم ہے۔

اردو نثر سے دراز نفسی کا شکوہ عام ہے غزل میں جتنا ایجاز ہے نثر میں اتنا ہی غیر ضروری پھیلاؤ ہے۔ محمد طفیل نے نثر میں غزل کے شعر کہنے کی روایت قائم کی اور ہر شعر برجستہ اور ہر مصرعہ سجل اور سڈول۔ یہ اپنے خاکوں میں بھی لکیروں سے نہیں نقطوں سے کام لیتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے عظیم ترین آرٹ وہی ہے جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اشارے فراہم کرسکے میں نہیں کہہ سکتا کہ محمد نقوش کا آرٹ کتنا عظیم ہے مگر اس میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نکات اُبھار دینے کا ہنر تو ہے۔ مولانا محمد علی کا جملہ ہے کہ "مختصر لکھنے کی فرصت نہیں ہے" محمد طفیل کو مختصر نگاری کے اس ریاض کے لیے کتنی ذہنی فرصت درکار ہوتی ہوگی اس کا اندازہ اُن کے جملوں میں ارتکاز سے کیا جاسکتا ہے۔ ہر جملہ کہتا ہے کہ

صفحۂ قرطاس پر آنے سے قبل ایک عمر شراب کہنہ کے خم میں گزار آیا ہوں۔

مگر جوں جوں آپ، جناب، محترم، معظم کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے میرا جی دھڑکنے لگتا ہے کہ محمد طفیل کہیں اپنی قلم زوری کے بل پر غلط بخشی پر نہ اتر آئیں آخر شاندار قصیدے کے لیے ممدوح بھی ویسا ہی چاہیے غالب تو "وا دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل" کا ماتم کرتے رہے ممدوح نہ سہی موضوع کی مناسبت عظمت کے بغیر تو خیال بندی سے مضمون گھڑ لینے کا فن تو تاریخ تک پہنچا دیتا ہے اور "یلے بود در سیستاں" کو بھی فردوسی کا قلم رستم بنانے میں بے طرح لگ جاتا ہے جی بھی چاہتا ہے کہ طفیل اب جو تصویر اس نگار خانے کے لیے چنیں وہ ہلکی نہ ہو بلکہ پورے مرقعے کی جادوگری اور طلسم خیزی سے لگا کھاتی ہو۔

اور اس سے آگے اپنے زمانے کے ممتاز اور منفرد مختصر نویس کے بارے میں کچھ اور کہا تو طوالت کا الزام سر آئے گا اور کوئی وہ مصرعہ دہرائے گا ع

کہا جو کچھ تو ترا حسن ہو گیا محدود

ایک زندہ شخص

رحیم گل

یہ فنکشن ادبی معرکے نمبر کے حوالے سے ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ کرسی صدارت پر پاکستان کے وزیر جنگ بیٹھے ہیں!

میں نے وزیر دفاع یا ڈیفنس منسٹر اس لیے نہیں کہا کہ یہ دونوں کمزور لفظ ہیں ——

میر علی احمد تالپور جیسا مرد دبنگ تو وزیر جنگ ہی ہو سکتا ہے!

میں محمد نقوش کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ معرکہ آرائی کی یہ محفل ایک معرکہ آفریں وزیر کی صدارت میں ہو رہی ہے۔

ادبی معرکہ نمبر مجھے کچھ دیر سے ملا ہے اس لیے میں نے اُسے جستہ جستہ پڑھا ہے محمد طفیل نے ادارتی صفحے پر ایک خوب صورت فقرہ لکھا ہے:

"ایک بُرا آدمی بھی سارا دن بُرا نہیں رہتا اور ایک اچھا آدمی بھی سارا دن اچھا نہیں رہتا"

مجھے محمد طفیل کی یہ دروں بینی بے حد پسند آئی ——

مجھے یاد ہے ۱۹۵۲ء میں جب میں لاہور فتح کرنے آیا تھا تو بے حد و حساب خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی کہ نقوش میں چھپوں۔

افسانہ لکھا، ڈاک کے سپرد کیا، ذاتی طور پر اس لیے نہ ملا کہ یہ دھان پان آدمی میرے پشتو لہجے سے بدک نہ جائے!

چھ ماہ گزر گئے، سال گزر گیا، نہ رسید ملی نہ افسانہ چھپا، میں ان دنوں جوان تھا اور پٹھان تھا —— بس شکر خدا کا، محمد طفیل میرے ہاتھ سے بچ گیا!

مگر سرد جنگ شروع ہو چکی تھی، نقوش پڑھتا رہا مگر محمد نقوش سے پرخاش جاری رہی —— اُن کو خبر نہ تھی مگر میں مُکتے برساتا رہا، اس سفید دیو، اس ادبی دیو کو علم ہی نہیں تھا کہ ایک بونا اُس کی ٹانگ کھینچ رہا ہے ——

یہ یک طرفہ لڑائی تھی میں اپنی توانائیاں ضائع کر رہا تھا ـــــ بالکل اپنے دوست علی سفیان آفاقی کی طرح ، جو آج کل امریکہ بھاگ گیا ہے اُن دنوں ہم اکٹھے کام کرتے تھے آفاقی ایک فلمی ستارہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا ایک دن پوچھا:

"تمہارے عشق کا کیا حال ہے ؟"

بولے : " ففٹی پرسنٹ کامیاب !"

پوچھا : " کیا مطلب ؟"

فرمانے لگے : " میں مکمل عاشق ہوں لیکن مخالف سمت سے لفٹ نہیں ملتی ، ظاہر ہے ففٹی پرسنٹ کامیابی ہے !"

تو صاحبو ! یہی کیفیت میری اور محمد نقوش کی لڑائی کی تھی ، اِدھر سے تیر پہ تیر چلتے رہے اُدھر سے نمبر پہ نمبر چھپتے رہے میری سزا یہ تھی کہ خود سُولی پر لٹکا رہا ـــــ اتنے طویل عرصے تک تو لوگ محبت سے اکتا جاتے ہیں نفرت کی لاش کون اُٹھائے پھرتا ۔

بہر کیف ایک بات طے تھی میں دل ہی دل میں اس ادبی دیو کا قائل بھی تھا ـــــ شاید میرے تحت الشعور میں ضرور کوئی ایسی بات تھی کہ یہ شخص پھلتا پھولتا رہے ، ورنہ پٹھان ہونے کے ناتے میرا نشانہ ایسا کچا بھی نہیں تھا !

اور سچ بات تو یہ ہے کہ جسے زندہ رہنے کا ڈھنگ آتا ہو اُسے زمانہ نہیں مار سکتا وہ شخص جو کوٹھڑی سے کوٹھی میں پہنچا معمولی آدمی نہیں تھا ۔

پھر وہ دن بھی آیا جب میں نے ندیم صاحب کی ساٹھویں سالگرہ پر مضمون پڑھا ، بہت تالیاں بجیں ، محمد طفیل نے کہا :

" آپ کا مضمون سب سے اچھا تھا میں اسے نقوش میں چھاپوں گا ۔"

تب میں نے اُن کی آنکھوں میں جھانکا وہاں سچ ہی سچ تھا ، محمد طفیل نے ٹھیک لکھا تھا :

" ایک بُرا آدمی بھی سارا دن بُرا نہیں رہتا !"

محمد طفیل مجلسی آدمی نہیں ہے وہ بلند بانگ دعوے نہیں کرتا وہ باتوں کا دھنی بھی نہیں ہے مجلس میں بیٹھ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے فن سے بھی نابلد ہے لیکن وہ اتنا عظیم منصوبہ باز ہے کہ وہ لوگ جو چرب زبانی اور محفل آرائی میں ثانی نہیں رکھتے محمد طفیل کی منصوبہ بندی کے ہشت پہلو نتائج دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں ۔

میں نے کسی مضمون میں محمد طفیل کو ادب کی ویل مچھلی کہا تھا یہ ویل مچھلی ٹنوں گوشت ، ٹنوں چربی اور ٹنوں کے حساب سے ادبی نوادرات سمیٹے ہوئے ہے !

لوگ کام نہیں کرتے مگر محفل جماتے ہیں محمد طفیل ٹھوس کام کرتا ہے پھر محفل جماتا ہے۔

وہ گھوڑے کی طرح جتا ہوا ہے پچیس تیس برس سے دوڑ رہا ہے ، صبح ہوئی شام ہوئی ، دن ہوا رات ہوئی ، کام ، کام ، کام ، وہ مسلسل دوڑ رہا ہے ——— نہ تھکتا ہے نہ سانس لیتا ہے منصوبہ بنتا ہے پروان چڑھتا ہے ——— لوگ ایک بار ہمالہ کی چوٹی سر کرتے ہیں اُس نے کئی بار ہمالہ کی چوٹی سر کی ہے۔

نقوش کے کیسے کیسے نمبر مرتب ہوئے ، ایک سے ایک بڑھ کر ، بے مثال ، لاجواب ، ناقابلِ فراموش ، ——— احباب سوچتے ہیں بس اب تھک جائے گا ، رک جائے گا ، ختم ہو جائے گا ، مگر وہ محمد طفیل کو نہیں جانتے ———

یہ دھیما سا آدمی ، یہ دُبلا سا شخص اپنے میدان میں صرف ایک ہے ——— آٹھ کروڑ میں ایک ——— اس جیسا دُوسرا نہیں ہے !!

وہ جستجو ہے ، وہ تلاش ہے ، وہ بنا لیتا ہے پا لیتا ہے اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔

مگر دِکا رواں کو دیکھتے رہ جاتے ہیں لوگ ، سنگِ میل غائب ہو جاتا ہے نظروں سے ، نشانِ منزل نہیں ملتا تو الفاظ کی سنگباری شروع کر دیتے ہیں ———

سرمایہ داری کا طعنہ ، موٹر اور پریس کا طعنہ ——— کوئی نہیں سوچتا محمد طفیل نے ڈاکہ نہیں ڈالا محنت کی ہے ، خُون جلایا ہے ، یہ دیا جو مسلسل جل رہا ہے خود اُس کے اپنے لہو سے روشن ہے۔

معلوم ہوتا ہے اردو ادب میں رشک کا لفظ ہی نہیں لکھا گیا بس حسد ہی حسد ملا ہے ہمیں وراثت میں !

ذرا پیچھے کی طرف نظر دوڑائیے ، انصاف کیجیے ——— اور اُس شخص کو پہچانیں جس نے اردو ادب کو افسانہ نمبر ، غزل نمبر ، خطوط نمبر ، شخصیات نمبر ، طنز و مزاح نمبر ، آپ بیتی نمبر ، مکاتیب نمبر ، لاہور نمبر ، ادب عالیہ نمبر ، میر نمبر ، غالب نمبر ، اقبال نمبر ، پطرس نمبر ، منٹو نمبر ، شوکت نمبر ، اور اب ادبی معرکہ نمبر جیسی معرکۃ الآرا چیزیں دی ہیں۔

کوئی ہے ——— کوئی کہہ سکتا ہے دُنیائے ادب میں کسی اکیلے شخص نے ، کسی فردِ واحد نے اتنا کام کیا ہے ؟ ——— غالباً نہیں ! ———

میں سمجھتا ہوں اُس نے آنے والی نسلوں کے لیے ادب کے مینار کھڑے کر دیے ہیں اُس کا تازہ ادبی معرکہ نمبر ایسا نمبر نہیں جو دو چار نشستوں میں پڑھا جا سکے ——— نقوش کے دوسرے نمبروں کا بھی یہی حال ہے کہ پڑھتے جاؤ، پڑھتے جاؤ، آگے بڑھتے جاؤ، نہ سڑک ختم ہوگی نہ سفر ختم ہوگا اور نہ نقوش کے نمبر ختم ہوں گے!

صرف ایک چیز ہے موت ———!

جو ہر چیز کو ختم کر دیتی ہے لیکن محمد طفیل کو موت بھی کچھ نہیں کہہ سکتی، یہ شخص کبھی نہیں مرے گا—!!!

محمد طفیل

صادق حسین

محمد طفیل ایک خطرناک آدمی ہے اس لیے کہ وہ ابتدائی ملاقات ہی میں دل جیت لیتا ہے۔ اُس سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۱ء میں ہوئی، جب اُس کا دفتر مال روڈ کے کنارے ایک عمارت کے تہ خانے میں واقع تھا۔ اُس نے خاطر زیادہ اور باتیں کم کیں۔ دورانِ گفتگو اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ اُس مسکراہٹ کے بانکپن میں ایک مقناطیسی کشش تھی۔ کون نہیں جانتا اس طرح تبسم کرنا ایک خداداد فن ہے۔ اسی مسکراہٹ سے تو انسان پہچانا جاتا ہے۔ یہ پہچان ماضی، حال اور مستقبل کی نشان دہی کرتی ہے۔

وہاں سے یہاں تک راستہ طویل ہے اور مختصر بھی۔ حساب کریں تو ہماری دوستی کی عمر رُبع صدی سے کچھ اُوپر ہو چکی ہے مگر اس طرح محسوس ہوتا ہے جیسے وقت آنکھ جھپکنے میں گزر گیا ہو۔ یُوں تو انسان کی عمر پل کے پل میں بیت جاتی ہے لیکن اِسے جی کر بسر کیا جائے تو انسان مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔ محمد طفیل جی کر زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ معراج صرف دیوانہ حاصل کر سکتا ہے۔ محمد طفیل دیوانہ ہے۔

میں، "نقوش"، محمد طفیل کی تصانیف اور "طلوع" کا ذکر نہیں کروں گا۔ یہ فرض اردو ادب کی تاریخ کو ادا کرنا ہو گا۔ فیصلہ وقت کرتا ہے اور وقت کبھی نہیں بھول سکتا کہ محمد طفیل نے اوائل عمر میں 'خوشنویسی' کی خدمت کی۔ ادارت کے فرائض سنبھالے تو دنیا عش عش کر اُٹھی۔ ادب کی وادی میں اُترا تو کامیابی نے بڑھ کر قدم چُومے۔

میں نے دیکھا ہے کہ لوگ اکثر محمد طفیل سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب کوئی شخص محمد طفیل سے کام نکالتا ہے تو وہ سوچتا ہو گا کہ محمد طفیل اللہ میاں کی گائے ہے۔ محمد طفیل اُس شخص کے چلے جانے کے بعد کہتا ہے "میں جانتا تھا کہ یہ شخص مجھے جُل دے رہا ہے لیکن میں خوش ہوں کہ وہ مطمئن ہو کر گیا ہے۔ اگر میں بھانڈا پھوڑ دیتا تو اس کی دل شکنی ہوتی اور میں رات بھر سو نہ سکتا۔"

ایک زمانے میں محمد طفیل کو رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے

کہ وہ دن کو بھانڈا پھوڑتا اور رات کو جاگتا رہتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بندش خیالات اُسے شاہو کے بارے میں سوچنے پر اُکساتی رہتی تھی اِس لیے کہ اُن دنوں وہ گڑھی شاہو میں رہتا تھا بسنت پر وہ اسی کرائے کے مکان کی چھت پر چڑھ کر پتنگ لڑاتا تھا۔ جب پیچ لڑتا اور کنکوے ہوا میں دست وگریباں ہوتے تو وہ دھیرے دھیرے ڈھیل دیتا۔ ڈھیل دینا اُس کے مزاج کا ایک حصّہ ہے۔ کسی نازک مرحلے پر، اِس دم پیچ اُٹھا، اُس دم پتنگ ملا، اس طرح ڈور پہ ڈور رگڑتا کہ "وہ کاٹا، وہ کاٹا" کا شور مچ جاتا۔ شب بیداری کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ لکھتا پڑھتا رہتا تھا۔ اصل میں بات یہی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اردو ادب میں یہ خوشگوار اضافے نہ ہوتے۔

محمد طفیل، سونے جاگنے کی گولیاں بھی تقسیم کرتا ہے۔ اُسے ہومیو پیتھی پر اتنا عبور ہے کہ اگر لوگوں کو اُس کی تشخیص اور نسخہ تجویز کرنے کی صلاحیتوں کا پتا چل جائے تو پھر اُسے کتابیں نہیں نسخے لکھنے پڑیں گے۔ یہ کام وہ چپکے سے کرتا ہے۔ مریضوں کو دوا مفت دیتا ہے اور مالی سہارا بھی۔ اللہ نے اُس کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ یہی ہاتھ "طلوع" لکھتا ہے۔ یہی ہاتھ شخصیت نگاری کا ضامن ہے۔ اسی ہاتھ کے انگوٹھے کو بیچ کی اُنگلی سے ملاکر، محمد طفیل پیدل چلتے، یہ چٹکی بجاتا ہے۔ جب وہ خوش ہوتا ہے تو بایاں شانہ اوپر اُٹھا، قدم قدم پر دائیں ہاتھ سے چٹکیاں بجاتا جاتا ہے۔ بڑے بڑے فیصلے بھی چٹکی بجاتے میں کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود بیگم طفیل کا خیال ہے کہ اُن کا میاں سمجھدار نہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، کم و بیش ہر بیوی اپنے خاوند کے بارے میں یہی رائے رکھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ کی بیوی کا بھی یہی خیال تھا۔ ایک دن وہ بزرگ ہوا میں اُڑتے، اپنے گھر کے اوپر سے گزرے۔ لوٹ کر آئے تو بیوی نے کہا: "سبحان اللہ! آج ایک خدا رسیدہ بزرگ کو ہوا میں اُڑتے دیکھا ہے۔"

بزرگ بولے: "وہ میں ہی تو تھا۔"

بیوی نے تڑاخ سے جواب دیا: "جبھی ٹیڑھا اُڑ رہے تھے۔"

سو بیگم طفیل نے اپنے شوہر سے کہا: "آپ ریفریجریٹر خریدنے جا رہے ہیں تو صادق صاحب کو ساتھ لیتے جائیے، وہ سمجھدار ہیں۔"

یہ سُن کر مجھے ندامت ہوئی۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ریفریجریٹر کا دروازہ آہستہ سے کھولنا اور بند کرنا چاہیے۔

ایک دن بیگم طفیل کی نگاہوں میں میری فراست متزلزل ہوگئی۔ میں اور میری بیگم، محمد طفیل کے

ہاں مدعو تھے۔ کھانے کی میز پر دُنیا جہان کی باتیں ہُوئیں۔ ازدواجی زندگی کا تذکرہ چھڑ گیا تو میں نے عرض کیا: "جس گھر میں مسلسل خاموشی چھائی رہے وہ بیمار گھر ہوتا ہے۔ میاں بیوی کبھی کبھار لڑ جھگڑ لیں تو اچھا ہوتا ہے۔ ازدواجی زندگی ایک عمارت کی مانند ہے، اسے مرمّت کی ضرورت پڑتی ہے۔ میاں بیوی کی نوک جھونک دلوں کی بھڑاس نکال دیتی ہے۔ عمارت کی مرمت ہوجاتی ہے۔ زندگی پھر اپنے ڈھرّے پر چلنے لگتی ہے۔"

دوسرے دن بیگم طفیل ہمارے گھر تشریف لائیں، اُنھوں نے بڑے دُکھ سے کہا: "آپ کے چلے جانے کے بعد طفیل صاحب نے مجھ سے بیساختہ جھگڑنا شروع کر دیا۔ میں نے پُوچھا، آخر بات کیا ہے؟ فرمانے لگے، عمارت کی مرمت کر رہا ہُوں اور یہ ثابت کر رہا ہوں کہ ہمارا گھر بیمار نہیں۔"

اِس حادثہ سے پہلے محمد طفیل جب ناراض ہوتا تو چُپ شاہ بن جاتا، دنوں خاموشی اختیار کیے رکھتا۔ یہ رویہ بڑا جان لیوا ہے۔ اعصاب کی توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ عمارت کا پلستر اکھڑتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ میری رائے میں کبھی کبھی دلوں کا غبار نکل جانے تو حیاتین اور تسکین آور گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ہر اچھی بیوی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے اپنے خاوند پر شک کرے۔ محمد طفیل صورت شکل والا ہے۔ ایک دن اس کے دفتر میں ایک حسین و جمیل عورت دیکھ کر بیگم طفیل نے دُور سے، اُنگلیاں چٹکا، خاموش اعلان کیا "گھر آؤ تو سہی، دیکھنا کیسے ناک چنے چبواتی ہوں۔"

لیکن بیگم طفیل نہیں جانتیں، کتنی خواتین ہیں جو ماشاءاللہ زندہ ہیں، جنھوں نے محمد طفیل پر ڈورے ڈالے مگر ناکام رہیں۔ محمد طفیل کہتا ہے:

"اللہ میرے گناہ معاف کر دے گا۔ میں اتنی کڑی آزمائشوں سے بچ کر نکل آیا ہوں۔"

میرا خیال ہے محمد طفیل شرمیلا اور بُزدل ہے ورنہ انسانی کمزوری کا ثبوت دیتا اور نقوش کا دیوالیہ نکال کر عشق فرماتا اور پھر اپنی محبت کی داستانوں کی کتاب مرتب کر کے گلیوں میں مارا مارا پھرتا۔

میں نے ایک مرتبہ محمد طفیل کو غصّے میں دیکھا ہے۔ مدِ مقابل پڑھے لکھے جاہل تھے۔ محمد طفیل کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ ہونٹ لرز رہے تھے، زبان کم اور چہرہ زیادہ بول رہا تھا۔

یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اُس کے اندر ایک طوفان برپا ہو۔ جیسے سمندر کی لہریں ساحل کو پاش پاش کرنے پر تُلی بیٹھی ہوں۔ نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ جو بات دل میں ہو کہہ ڈالو ورنہ اندر کی دُنیا فنا ہو جائے گی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اِس شخص کو دو چار مرتبہ اِسی طرح غصّہ آیا تو یہ اپنے آپ کو مار ڈالے گا۔

جب کوئی شخص کسی کارخانے کا مالک بن جاتا ہے تو لوگ سو سو باتیں کرتے ہیں۔ کسی کی زبان پکڑی نہیں جاتی۔ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ وہ مقام حاصل کرنے سے پہلے اُس شخص نے کیا کیا مصیبتیں اُٹھائی ہوں گی۔ محمد طفیل کے متعلق اپنے پرائے نے جی بھر کے باتیں بنائیں۔ یہ زمانے کا دستور ہے۔ ایک مرتبہ مرحوم احمد شاہ بخاری نے فرمایا تھا: "احساسِ کمتری کا یہ عالم ہے کہ ہم کسی بڑے آدمی کو دیکھتے ہی بول اُٹھتے ہیں ' چھوڑو جی، کل کی بات ہے یہ شخص لاہور کی مال روڈ پر گھوما کرتا تھا'۔"

برنارڈ شا کے ایک ڈرامے کا مرکزی کردار کہتا ہے "دُنیا میں جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی اُن میں سب سے زیادہ ذہین میں نے اپنے درزی کو پایا، اس لیے کہ جب کبھی میں اُس کی دُکان میں قدم رکھتا ہوں پہلے وہ میرا ناپ لیتا اور پھر بات کرتا ہے۔" میرا مشورہ ہے کہ پہلے محمد طفیل کا ناپ لو اور پھر بات کرو۔ تب ماننا پڑے گا کہ آج محمد طفیل ایک ایسی قدآور شخصیت ہے جس کے کارناموں کی دُور دُور تک پکار پڑی ہے۔

پہلے پہلے محمد طفیل کسی ادبی محفل میں مقالہ پڑھنے سے کنّی کاٹتا تھا۔ چار و ناچار اگر ایسا حادثہ پیش آجاتا تو یہ منظر دیکھنے کے قابل ہوتا۔ عرصے کی بات ہے کہ محمد طفیل نے ایک بہت بڑی ادبی محفل میں اپنا مقالہ پڑھ کر سُنایا تھا، اُس کے گال سُرخ ہو گئے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی کے گھونٹ پی کر حلق تر کرتا، ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر سامعین کی طرف نہ دیکھا۔ طلوع کے انداز میں لکھے مقالے کا ایک ایک حرف دلوں میں اترتا چلا گیا۔ ہر فقرے پر داد ملی۔ اہلِ دل جھوم اُٹھے۔ مگر اب وہ بات نہیں۔ شرمانے کا وُہ حسن رُخصت ہو گیا ہے۔ ایک سادگی سی، جانتے ہوئے بھی نہ جاننے کی ایک انکساری سی، دھیمے پن میں دبدبے کی ایک خوشبو سی، سب کے سب پیچھے رہ گئے ہیں، محمد طفیل آگے نکل گیا ہے۔

محمد طفیل بچپن میں بڑا ہتھ چھٹ تھا جب وُہ سکول میں پڑھتا تھا تو کسی بات پر ایک لڑکے سے تکرار ہو گئی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، دھائیں سے اُس لڑکے کی پیٹھ پر لوہے کی سلاخ مار دی۔

اُس ضرب کا نشان آج بھی اُس شخص کی پیٹھ پر موجود ہے۔ وہ شخص آگے چل کر صوبائی وزیر بنا چنانچہ محمد طفیل یہ کہنے میں حق بجانب ہو گا کہ وہ جس شخص کی پیٹھ پر لوہے کی سلاخ مارے گا، وہ شخص کم سے کم صوبائی وزیر بنے گا ——— لیکن اب تو لوہے کی سلاخ سے کہیں زیادہ طاقتور ہتھیار اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے ——— قلم ——— جس کی نوک سے زندگی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

انسان کا جسم بھی ایک مشین کی مانند ہے۔ بعض اوقات اسے فالتو پرزوں اور سروسنگ کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اگر اسے بیدردی سے استعمال کیا جائے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ تن تنہا نقوش نکالنا بچوں کا کھیل نہیں۔ جان کھپانا پڑتی ہے۔ اگر جان زیادہ کھپ جائے تو پھر دل مخالفت پر اُتر آتا ہے۔ ایک دن اطلاع ملی کہ محمد طفیل پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ جب میں ہسپتال پہنچا تو دیکھا کہ محمد طفیل اطمینان سے بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ دُوسروں کے دلوں پر تو پہلے ہی فتح پا چکا تھا اب اپنے دل پر بھی قابُو پا لیا۔ دو چار روز ہسپتال میں آرام کرنے کے بعد، وہی چھاپہ خانہ، وہی نقوش، وہی زندگی کا چلن، وہی محبتوں کی باتیں۔

ایک دن چند اہم شخصیتوں نے مجھے شیزان میں گھیر لیا، نعرہ بلند ہوا کہ محمد طفیل کے موضوع پر کھیدا ہو گا۔ سب جانتے ہیں کہ ہاتھی کے شکار کا تکنیکی نام "کھیدا" ہے۔ چنانچہ کھیدا ہوا۔ واجب التعظیم ہستیوں نے تابڑ توڑ حملے کیے۔ محمد طفیل کی عدم موجودگی میں اس کی شخصیت اور نکھر کر سامنے آئی۔ اگر میں کہہ دُوں کہ محمد طفیل میں کوئی کمزوری نہیں تو یہ بیسویں صدی کے انسان کی توہین ہو گی اس لیے کہ پھر انسان، انسان نہیں رہتا، فرشتہ بن جاتا ہے، اور فرشتے کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اردو بازار میں دھرنا مار کے نقوش نکالے یا چھاپہ خانہ چلائے۔

انسان زندگی بھر خواب دیکھتا رہتا ہے۔ لیکن محمد طفیل کو جو خواب آتے ہیں وہ سچے ہوتے ہیں، ہُو بہو اور جُوں کے تُوں۔ شاید یہ وصف اس کے دل کے شفاف پن کا صدقہ ہو۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ سچے خوابوں کا اثر، اس کی زندگی پر بھی پڑا ہے۔ ایک دفعہ اس نے ایک ایسا سچا خواب دیکھا کہ ہمارے گھر میں بھونچال آ گیا۔ مگر میں خواب کی تفصیل میں نہ جاؤں گا۔ کیونکہ اس ذکر کو محمد طفیل پسند نہیں کرتا۔

دوستوں کے ہاں کھانا کھانے کے بعد محمد طفیل عام طور پر کہتا ہے "کھانا خوب تھا، لطف آ گیا۔"

ایک مرتبہ ایک سازش کے تحت اُسے ایک کھانے پر بُلایا گیا۔ دہلی کی فتحپوری کے

معیار سے کہیں زیادہ مرچیں سالن میں ڈالی گئیں۔ محمد طفیل سی سی کرتا جاتا کبھی پانی پیتا، کبھی روٹی کا نوالہ چباتا۔ کھانا ختم ہوا تو اس نے حسبِ معمول کہا:

"کھانا خوب تھا، لطف آگیا۔"

سب ہنس پڑے، واقعی لطف آگیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے: "بولو کہ پہچانے جاؤ۔"

عام طور پر یوں بھی ہوتا ہے کہ محفل میں دوسرے لوگ بے تکان بولے جا رہے ہیں اور طفیل منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھا ہے۔ ایک مصنف نے کہا ہے: "وہ آدمی خطرناک ہے جو چپ رہتا ہے۔" محمد طفیل کا معاملہ اور ہے، وہ تو گفتگو کے کسی نازک موڑ پر، آہستہ سے ایک آدھ ایسا فقرہ کہہ دیتا ہے جس میں شہرِ معنی آباد ہوتا ہے۔ تب محفل پر سکوت چھا جاتا ہے اور گفتگو کی کثرت، شعور کی وحدت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔

دقیقہ شناس کہتے ہیں کہ محمد طفیل اپنی شخصیت کی توانائی بکھرنے نہیں دیتا۔ ضرورت پڑے تو ایک طوفان بن کر چٹانوں سے ٹکرا جاتا ہے۔ منہ پر کھری کھری کہہ دیتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اعلیٰ نصب العین سامنے رکھ کر اس نے بڑی بڑی شخصیتوں سے ٹکر لی اور بالآخر انھیں رام کر لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ طفیل کی کامیابی کے پیچھے اُس کی ماں کی دعائیں ہیں۔ ایک دن اُس کے برادرِ خورد نے باتوں باتوں میں کہا تھا "ہم تین بھائی ہیں ہماری ماں جب نماز پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تھی تو مرحومہ کے ہونٹوں پر صرف طفیل کا نام آتا تھا۔ ہماری ماں ساری دعائیں طفیل کو دے گئی۔" طفیل کہتا ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت نہ کر سکا۔ یہ تو اُس فنکار کے دل کی آواز ہے جو خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتا ہے۔ ماں کا نام سن کر طفیل کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ان آنسوؤں کے پیچھے ماضی کی ایک لمبی داستان ہے اور اس داستان کی دھوپ میں ممتا کی گھنی چھاؤں۔ یہ ممتا ظاہری طور پر چپ سادھ لیتی ہے مگر دل کے دروازے پر دستک دیتی رہتی ہے۔ جب طفیل کے دل کے دروازے پر، سوتے جاگتے میں، دستک ہوتی ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے: "میری ماں۔" ماں کے لیے بچہ کبھی بڑا نہیں ہوتا وہ بچہ ہی رہتا ہے اور ماں، ماں ہے وہ کبھی نہیں مرتی۔

ایک دن اطلاع ملی کہ طفیل لندن چلا گیا ہے، لوٹ کر آیا تو اُس میں ایک تبدیلی پائی۔ پہلے وہ ایک مخصوص دھیمے انداز میں اپنے ملک سے محبت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اب اُس کے لہجے

میں شدت آگئی تھی۔ وطنِ عزیز کے لیے پیار دُونا ہو گیا تھا۔ طفیل کو اپنے ملک سے کتنی محبت ہے اس بات کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ۶۵ء کی جنگ میں اُسے مضطرب دیکھا ہے۔ قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی علحدگی پر اُس کے دل پر کیا بیتی۔ ۷۷ء کی عوامی تحریک میں نوجوانوں نے سینوں پر گولیاں کھائیں تو وہ اشکبار ہو گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ جوانوں کا گرم لہو قوموں کو نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ اندھیرا ختم ہو جاتا ہے۔ نیا سورج طلوع ہوتا ہے، سچائی کا قافلہ رواں دواں ہے، اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔

محمد طفیل جب اپنی پوتی عصمت کو سینے سے لگاتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ وہ کیا سوچتا ہو گا۔ شاید عصمت کے بارے میں، نئی نسل کے متعلق، جسے مستقبل میں، محبت دینا ہو گی اور محبت لینا ہو گی۔ جب استحصال کا دور دورہ ختم ہو چکا ہو گا اور ہم محمد طفیل کی طرح دوسروں کے لیے جینا سیکھ چکے ہوں گے۔

محمد طفیل

انتظار حسین

محمد طفیل ادب کے مدیر تو بنتے بنتے بنے مگر ادیب اچانک بنے۔ مارشل لا بھی تو اچانک ہی آیا تھا۔ یہ ۱۹۵۳ء کے مارشل لا کی بات ہے۔ ختم نبوت کی تحریک چل رہی تھی کہ اچانک مارشل لا آگیا، کرفیو لگ گیا، زندگی معطل، لوگ گھروں میں مقید۔ پھر جب مارشل لا اٹھا تو ہم نے دیکھا کہ شہر کے فٹ پاتھوں سے کھوکھے اُٹھ چکے ہیں اور طفیل صاحب ادیب بن چکے ہیں۔

میں نے کہا کہ طفیل صاحب! آخر ہم نے پہلے بھی آپ کو دیکھا تھا اور خوب دیکھا تھا کبھی آپ نے ادیب ہونے کی چغلی نہیں کھائی۔ کیا آپ لکھ کر چھپا دیتے تھے؟

بولے کہ میں نے تو ۵۳ء کے مارشل لا میں قلم اٹھایا تھا۔ گھر سے تو نکل نہیں سکتے تھے، سوچا کہ بیٹھے بیٹھے کیا کرتے ہو، کچھ لکھو۔ میں نے منٹو صاحب اور قاسمی صاحب کے خاکے لکھ ڈالے، منٹو صاحب کا خاکہ مجھے تو بالکل پسند نہ آیا مگر منٹو صاحب کو پسند آگیا۔

مارشل لا تو آگے چل کر بھی آنے تھے مگر طفیل صاحب نے اگلے مارشل لاؤں کا انتظار نہیں کیا، یا یوں سمجھیے کہ منٹو صاحب کی داد تھپکی کا کام کر گئی۔ طفیل صاحب بس چل پڑے اور خاکے پہ خاکہ باندھتے چلے گئے۔ ایک کتاب، دوسری کتاب، تیسری کتاب، پھر چوتھی کتاب، پھر پانچویں پھر چھٹی۔ صاحب، جناب، آپ، محترم، مکرم، معظم۔ مگر یہ دیکھیے کہ آدمی کتنے نستعلیق ہیں کہ آپ اور جناب سے نیچے نہیں آئے اُوپر ہی گئے ہیں۔ مکرم و معظم تک تو پہنچ گئے۔ اس سے آگے قبلہ و کعبہ کی منزل ہے ورنہ یار لوگ فوراً ہی آپ، جناب سے تم پر اور تم سے تو تڑاخ پر اُتر آتے ہیں۔ وہ جو ابو الاثر حفیظ نے کہا ہے کہ: ؎

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

تو طفیل صاحب کے ساتھ کچھ اسی قسم کا مضمون ہُوا۔ احباب نقوش نے تو انھیں فوراً تسلیم کر لیا۔ مگر ادیبوں کی پُوری برادری نے بہت تامل کے ساتھ اور بڑی مشکل سے انھیں تسلیم کیا۔

میں نے اس کا ذکر کیا تو بولے کہ ہم تو اس کے قائل ہیں کہ کام کیے جاؤ کبھی نہ کبھی لوگ مان ہی لیں گے۔ جب رسالہ نکالا تھا تب بھی تو یہی صورت تھی اس وقت ادیبوں کو میری ادارتی صلاحیتوں پر شک تھا، مگر اب یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں۔

اس کہنے پر نقوش کی تاریخ میری آنکھوں میں پھر گئی۔ طفیل صاحب نے کتابیں چھاپتے چھاپتے ایک ادبی رسالہ نکالنے کا بیڑا اٹھایا۔ نقوش کے نام سے پرچہ نکالا۔ خود ناشر بنے۔ احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کو مدیر بنایا۔ ان کے الگ ہو جانے کے بعد پروفیسر سید وقار عظیم اس رسالہ کے مدیر بنے۔ جب وقار صاحب نے ادارت چھوڑی تو پھر خود طفیل صاحب نے ادارت سنبھالی۔ اس وقت ادیبوں نے بہت انگلیاں اٹھائیں کہ بھلا محمد طفیل ادبی رسالہ کی ایڈیٹری کریں گے۔ مگر طفیل صاحب نے تو ایسی ایڈیٹری کی کہ پھر لوگ پچھلے مدیروں کو بھول ہی گئے اور ایک اعتبار سے صحیح مجھولے۔ "نقوش" اپنے ابتدائی دور میں تو بالکل انجمن ترقی پسند مصنفین کا اشتہار نظر آتا تھا، طفیل صاحب کی ادارت میں آ کر وہ ہمعصر ادب کا رسالہ بنا اور پھر طفیل صاحب اور نقوش آپس میں ایسے شیر و شکر ہوئے کہ مولوی عبدالحق نے محمد طفیل کو محمد نقوش کہہ دیا۔ اور طفیل صاحب اتنے خوش ہوئے کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو محمد نقوش کہنے لگے۔

نقوش نے ایک وقت تک ہمعصر ادب کی بہت زور شور سے نمائندگی کی۔ ایسے ایسے نمبر نکالے کہ دنیائے ادب میں شور پڑا۔ خوب داد کے ڈونگرے برسے اور خوب بیداد کے تیر چلے۔ مگر اس کو کیا کہا جائے کہ اس کے بعد طفیل صاحب ہی کا ذہن بدل گیا۔ وہ یوں سوچنے لگے کہ ادبی رسالہ کا اعتبار معمر ادیبوں سے قائم ہوتا ہے بلکہ ادیب ہی وہ ہوتا ہے جس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو۔ بس اس کے بعد نقوش ایک معتبر ادبی رسالہ بن گیا اور پروفیسروں اور محققوں کی نظروں میں عزت حاصل کرتا چلا گیا۔

طفیل صاحب نے میرے اس تاثر سے اختلاف کیا۔ کہا کہ میرے ہر پرچہ میں بالکل نئے نام ہوتے ہیں۔ کوشش کرتا ہوں کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو مگر چونکہ پرچہ میں زیادہ نگارشات مستند لکھنے والوں کی ہوتی ہیں۔ اس لیے شک کیا جاتا ہے کہ میرا رویہ نئے لکھنے والوں کے خلاف ہے۔

میں نے کہا کہ طفیل صاحب! اس بات کو اس طرح دیکھنا چاہیے کہ پچھلے بیس برسوں میں جو ہمارے افسانے اور شاعری میں نئے رجحانات آئے ہیں اور نئے تجربے ہوئے ہیں ان کے لیے

نقوش کے صفحات میں کس حد تک گنجائش پیدا ہوتی ہے؟

بولے کہ یہ صحیح ہے کہ تجرباتی ادب کا میں نے بھرپور طریقے پر ساتھ نہیں دیا۔ اگرچہ میں اس کی اہمیت کو سمجھتا ہوں لیکن ایک بات یہ ہے کہ میں کچھ تقسیم کار کا قائل ہوں۔ نئے لوگوں کو ابھارنے میں قاسمی صاحب کا پرچہ پیش پیش ہے۔ وزیر آغا کا پرچہ بھی اپنا اس قسم کا ایک انداز رکھتا ہے۔ میں نے کوشش کی کہ نقوش ان سے ہٹ کر کوئی فریضہ انجام دے اور اپنی منفرد حیثیت قائم کرے۔

طفیل صاحب کی یہ آخری بات مجھے قائل کر گئی۔ قصہ اصل میں یوں ہے کہ ترقی پسند تحریک نے تو کلاسیکی ادب کو دفن کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اپنی دانست میں یہ کام انجام دے دیا تھا مگر ہوا یہ کہ تحریک کا آخر وقت آتے آتے کلاسیکی ادب کی ہوا پھر سے چل پڑی اور شعر کے رسیا ترقی پسند نظموں کو بھول کر میر میر پکارنے لگے۔ اس وقت کے ادبی رسالوں میں سے نقوش وہ رسالہ ہے جس نے اس بدلتے ہوئے ادبی مذاق کو سونگھا اور وقت کی اس مانگ کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ یعنی نقوش ایک وقت تک ہمعصر ادب کے واسطے سے اپنے عہد کا ترجمان بنا رہا۔ اس کے بعد وہ کلاسیکی ادب کی اشاعت کے واسطے سے عہد کا ترجمان بنا۔

بیچ بیچ میں طفیل صاحب نے نقوش سے کچھ اور کام بھی لیے۔ مثلاً لاہور نمبر نکال کر ایک شہر کے ساتھ ایک روایت سے شناسائی کرائی۔ ابھی پچھلے دنوں نقوش کے سیرۃ النبی نمبر کا اعلان ہوا تھا طفیل صاحب کہتے ہیں کہ اس پر یاروں نے میرا ٹانکا بعض مذہبی جماعتوں سے ملا دیا اور یہ بھول گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کچھ ان کا بھی تعلق ہے۔

اب طفیل صاحب کا منصوبہ یہ ہے کہ جس طرح نقوش نے غالب کے سلسلہ میں کچھ نمبر نکالے تھے اور کارنامے انجام دیے تھے اسی طرح علامہ اقبال کے سلسلہ میں کچھ نمبر نکالے جائیں۔ اس کے بعد وہ میر نمبر اور انیس نمبر نکالنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میر نمبر میں میر کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہوگا، اور انیس نمبر میں کم از کم ۲۵ ایسے مرثیے سامنے آئیں گے جو اب تک نظروں سے اوجھل تھے۔ ساتھ ہی میں انھوں نے یہ وضاحت کر دی کہ دیکھیے میں شیعہ نہیں ہوں۔

پاکستان کے ابتدائی عہد میں ادب اور ادبی رسالہ کی کتنی پذیرائی تھی اور اب کتنی ہے؟

بولے کہ پہلے شاید تفریحات اور مشاغل محدود تھے اور لوگ ادب سے دلچسپی لینے کو شائستگی سمجھتے تھے۔ اب وقت گزارنے کے نئے وسیلے پیدا ہو گئے ہیں جن میں زیادہ کشش ہے پہلے

رقص، موسیقی، مصوری، شاعری اور خوشنویسی کی نہ صرف سرپرستی کرتے تھے بلکہ خود ان سرگرمیوں میں حصّہ لیتے تھے۔ اب اس طبقہ کو کلبوں کی زندگی اور بیرونی دنیا کی سیر سے زیادہ دلچسپی ہے۔

نقوش کی اشاعت کے بارے میں کہا کہ وہ کم تو نہیں ہوئی مگر اس کی اشاعت کو تو بڑھنا چاہیئے تھا۔ افسوس یہی ہے کہ بڑھی نہیں۔ میں نے کہا کہ ادبی رسالہ اور کتابوں والے آخر نئے ذرائع تشہیر سے کیوں استفادہ نہیں کرتے؟ بولے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ صحیح بنیادوں پر ذہنی تربیت ہی نہیں ہوئی ہے تو یہ ذرائع تشہیر ادب کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہیں!

اُٹھتے اُٹھتے میں نے پُوچھا کہ آپ نے ادیبوں کے بہت خاکے لکھے ہیں اس مخلوق کے ساتھ کیا گزری ہے؟ کچھ بتائیے۔ بولے کہ کوئی بیٹی والا کسی دوسرے کی بیٹی کی برائی نہیں بتایا کرتا۔

محمد طفیل

پروفیسر لطیف الزماں خاں

"آئندہ فروری میں غالب کا صد سالہ جشن ہوگا، آپ نقوش کا غالب نمبر تو یقیناً شائع کریں گے؟"

"جی نہیں۔"

"آپ نے بے حد اہم نمبر شائع کیے ہیں، غالب نمبر کیوں نہیں؟"

"جو کام ساری دنیا کر رہی ہو وہ میں کیوں کروں؟"

کچھ دیر سکوت کے بعد میں نے کہا: "میرے پاس چند غیر مطبوعہ اور کئی ہزار مطبوعہ مضامین ہیں ان کا انتخاب کر لیجیے، نقوش کا غالب نمبر ضرور چھاپیے۔"

سُرخ و سپید رنگ، گھنی بھنویں جو چہرے پر سب سے نمایاں ہیں۔ ناک لانبی لیکن نتھنے جیسے پھلوا رکھی ہو۔ آنکھیں متجسس و متلاشی، سیاہ بال، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، ایک شانہ جھکا ہوا، نگاہ نیچی، نہایت اعلیٰ درجہ کا سُوٹ پہنے ہوئے —— باتوں میں بیحد اختصار —— طفیل صاحب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

"میں آپ کے ساتھ ملتان چلوں؟"

یوں غالب نے طفیل صاحب سے میرا تعارف کرایا۔

جب تک میں اُن سے ملا نہیں تھا، میں ان سے سخت برہم تھا۔ میں نے انھیں کئی خطوط لکھے تھے مگر جواب نہیں آیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اکثر خطوط کا جواب نہیں دیتے اور نقوش میں کیا چھپنا چاہیے اور کیا نہیں چھپنا چاہیے۔ اس کا فیصلہ تحریر کو پڑھ کر وہ خود کرتے ہیں۔ کوئی شخص اس سلسلہ میں دخیل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے دن جب وہ میرے ہمراہ چلنے کے لیے لاہور سٹیشن پر پہنچ گئے۔ تو میری برہمی اور غصہ فرو ہو گیا۔ طلبِ ادب کی لگن، شوق اور حوصلہ، خلوص، مقصد سے لگن اور حقیقت پسندی کی روشن مثال میرے سامنے آئی۔ محض خط لکھ دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ ادبی پرچے کے معیار کو بلند رکھنے کے لیے سفر کر لینا بھی کافی نہیں اس میں کئی سخت مقام آتے ہیں۔

غالبؔ کی عظمت اور اہمیت کو ہمہ وقت اور ہرجا ذہن میں رکھنے والوں کی تعداد کم نہیں لیکن اس سوادِ کو یکجا کرنا، اسے سلیقہ سے چھاپنا، حقیقت یہ ہے کہ عظمتِ رفتہ کی بازیافت کے مترادف ہے۔

چونکہ میں فرسٹ کلاس میں سفر کرنے پر نہ قادر تھا نہ آمادہ، طفیل صاحب فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہوتے ہوئے بھی تھرڈ کلاس میں آ بیٹھے تھے۔

غالبؔ میرا پہلا اور آخری عشق ہے۔ رشید احمد صدیقی صاحب میرے لیے انتہائی محترم ہیں اور محمد طفیل ـــــ میرا بھائی بھی، میرا محسن بھی، میرا دوست بھی۔ غالبؔ کو نہ پڑھا ہوتا تو انسانیت کے مفہوم سے ناواقف رہتا۔ رشید صاحب کی تحریروں کو نہ پڑھتا تو علی گڑھ کی اہمیت کو نہ جان پاتا۔ طفیل صاحب سے نہ ملا ہوتا تو دوستی کے معنی و مفہوم سے بیگانہ محض ہوتا۔ یہ تینوں نہ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ غالب جیسا نہ شاعر اردو شاعری تو کیا دنیا کی کسی زبان نے پیدا ہی نہیں کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا، اچھا بھی بُرا بھی، لیکن جس پامردی کے ساتھ رشید صاحب نے سرسیّد احمد خاں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے اپنے قلب و ذہن، قلم اور تحریر کو استعمال کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے نہ ہونے کا یہی ثبوت ہے کہ اصل ایمان و نا داری بہ شرطِ استواری ہوتا ہے۔ میں تو رشید صاحب کی نثر کو غالب کی نثر کے بعد سب سے اچھی نثر سمجھتا ہوں۔

نقوش پر بھی ہر طرح کا وقت آیا لیکن جس استقامت کے ساتھ طفیل صاحب نے اسے جاری رکھا اور ہر شمارہ کو خاص شمارہ بنا دیا۔ یہ کام ایک نہ ہی کر سکتا تھا کہ حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہونا ہر ایک کو نصیب نہیں۔ اردو رسائل کے جو ایڈیٹر گزرے ہیں یا جو موجود ہیں ان میں سے اکثر مصلحت یا تنگ نظری کا شکار رہے ہیں۔ طفیل صاحب نے نقوش کا ایک معیار متعین کیا۔ اس بلندی سے یہ کبھی نیچے نہیں اُترتے ایک راستہ ایک منزل ایک طریق فکر ایک طرزِ استدلال جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔

ان حضرت کو نقوش سے کس درجہ عشق ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے۔ میں لاہور جاؤں تو قیام انہی کے یہاں ہوتا ہے۔ میں جاتے ہی یہ اعلان کرتا ہوں کہ فلاں ٹرین سے واپس جاؤں گا۔ لیکن طفیل مجھے کبھی اس ٹرین سے نہیں آنے دیتے۔ ایک مرتبہ یہ ہوا کہ صبح سے شام اور شام سے رات ہوگئی۔ طفیل صاحب نے بول کر نہ دیا۔ جب رات کے دو بج گئے تو رام پور سے آمدہ

ایک پوسٹ کارڈ میرے سامنے رکھ دیا، ایک ماہر غالبیات نے لکھا تھا کہ اگر نو دریافت دیوانِ غالب شائع کرنا چاہتے ہو تو فلاں حکیم صاحب کے پاس شرائط نامہ ہے اسے پڑھ لو۔

خدا نے ایسا سامان پیدا کر دیا کہ نو دریافت کلامِ غالب کا فوٹو سٹیٹ ہاتھ آگیا۔ برصغیر میں ہم دونوں کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ نقوش میں "بیاضِ غالب بر خطِ غالب" شائع ہو رہی ہے۔ میں نے کہا:

"طفیل بھائی! اس بیاض کو کتابی شکل میں کیوں نہیں چھاپ دیتے؟"

بڑی متانت اور سنجیدگی سے بولے:

"لطیف صاحب! اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر کوئی الہامی کتاب نازل فرماتا تو میں اُسے بھی نقوش میں چھاپتا۔"

یہ ہے نقوش سے عشق کا حال!

نقوش غالب نمبر ایک' جس کے بارے میں مالک رام صاحب نے دلّی سے لکھا تھا کہ ہندوستان نے لاکھوں روپیہ غالب صدی پر صرف کیا مگر نقوش جیسا غالب نمبر شائع نہیں ہو سکا۔ بیاضِ غالب دریافت ہوئی ہندوستان میں، لیکن اسے پہلے شائع کیا طفیل صاحب نے۔ انہی دو باتوں سے ان کی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعد میں ہندوستان میں بیاض چھپی، لیکن قیمت تین سو روپے تھی۔ نقوش میں بیاض کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا اس کی قیمت صرف تیس روپے تھی۔ تجارت اور خدمت میں فرق تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں دیگر رسائل نے بھی غالب نمبر شائع کیے ہیں مگر مولوی مدن کی سی بات کہیں نہیں پائی جاتی۔ ایسی ہی باتیں طفیل صاحب کی سیرت کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ غالب پر جو کچھ شائع ہوا میں یہ سمجھتا ہوں کہ لکھنے والے نے مجھ پر احسان کیا۔ نقوش کے غالب نمبر پا کر جو خوشی میں نے محسوس کی اس کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ ان غالب نمبروں کو اوّلیت اور اہمیت اس لیے دیتا ہوں کہ اول تو معاملہ غالب سے عشق کا ہے، دوم یہ کہ جن حضرات نے غالب صدی پر چھپنے والے رسائل کے غالب نمبر پڑھے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ نقوش ہی کا پلّہ بھاری ہے۔

طفیل صاحب اور نقوش دونوں نے بڑے حاسد پیدا کیے ہیں۔ حاسدوں کو جہان میں راحت نہیں ہوتی اور جب تک جان میں جان ہے رنجِ حسد رہتا ہی ہے۔ لیکن حاسدوں کے لیے شاید ہی کبھی اُنھوں نے زبان سے ناشائستہ لفظ ادا کیا ہو۔ ایک مہذب اور معقول

انسان کا لہجہ نہ اشتعال انگیز ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ شائستگی کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔
اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ طفیل صاحب خطوط کا جواب نہیں دیتے۔ اول تو ہر خط اس قابل ہوتا کہاں ہے کہ اس کا جواب دیا جائے، دوم یہ کہ لکھنے والا بھول جاتا ہے کہ اگر ایک رسالہ کا ایڈیٹر اسلوب، الفاظ اور آواز کو نہیں پہچانتا تو وہ ایڈیٹر کیا ہوا۔ کچھ لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ ان کی تحریر نقوش میں نہیں چھپتی، ایسے لوگ نہیں جانتے کہ ادبی لطافت، موضوع اور نفسِ مضمون، تحریر کی شستگی اور پاکیزگی اور اس کے کلاسیکی حسن کو طفیل صاحب ایک نگاہ ڈال کر جان لیتے ہیں اس کے مرتبہ کو پہچان لیتے ہیں وہ ہر تحریر کو دو مرتبہ ضرور پڑھتے ہیں، ایک مرتبہ اس وقت جب وہ نقوش میں اشاعت کے لیے منتخب کر لی جائے، دوسری بار اس وقت جب کتابت ہو جائے۔ انتشار اور بدنظمی ادب میں ہو یا کسی اور شعبہ میں، انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ایسے بدمذاق لوگوں سے کٹ کر بقول منٹو وہ "باجو کی گلی" میں مڑ جاتے ہیں تاکہ بداخلاقی اور بدمذاقی کے چھینٹوں سے خود کو بچا سکیں۔

یہ جب گڑھی شاہو میں رہتے تھے تو صبح ہی چل پڑتے۔ تانگہ میں سوار ہوتے اور نقوش کے دفتر میں آ بیٹھتے۔ سوائے ضروری کام کے ہرگز دفتر نہ چھوڑتے۔ دفتر اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ منہ ان کا مغرب کی جانب رہتا ہے، کعبہ کی طرف پیٹھ نہیں کرنا چاہتے۔ بیدھے ہاتھ پر ایک دقیانوسی کا بکس ہے جس میں نہ جانے کب کب کے مسودات، کتابت شدہ اور غیر کتابت شدہ بھرے پڑے ہیں۔ جنوب میں آنے والے رسائل اور کتب کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں اور اکثر ادیب اس ڈھیر میں سے اپنی پسند کی کتاب یا رسالہ اٹھا لیتے ہیں وہ ٹک ٹک دیکھتے رہتے ہیں اور کچھ نہیں کہہ پاتے۔ خود میں نے اس ڈھیر سے کتابیں اٹھائی ہیں ان کی پشت پر مشرق ہے وہاں بھی اخبارات و رسائل جمع رہتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک میز پر خطوط، مضامین، نظمیں اور غزلیں اور مقالات کے علاوہ خدا جانے کیا کیا جمع رہتا ہے۔ اس میز کو میں نے کبھی سلیقہ سے سجا ہوا نہ پایا۔ مگر کمال یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے یہ کابک یا میز پر سے ڈھونڈ لیتے ہیں دوسرا شخص خواہ کتنا ہی تلاش کرے اسے مطلوبہ چیز نہ ملے گی۔ کمرہ تاریک ہے روشن دان تک نہیں، آتے ہی بلب روشن کریں گے اور کرسی پر بیٹھتے ہی ویسٹ پیپر باسکٹ میں تھوکنا شروع کر دیں گے اور یہ عمل دن بھر جاری رہے گا۔ ہر آنے جانے والے کو دیکھتے رہیں گے جیسے جین آسٹن دیکھتی تھی۔ خطوط اور خاکے اسی دفتر میں

بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔ میرزا ادیب آگئے تو ان سے ڈراموں پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اسلم کمال آگئے تو جدید مصوری پر تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ پریس کا مشین مین آگیا: "باؤ جی!" تو باؤ جی اسے بھی جواب دے رہے ہیں۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی لوگ جمع ہو جاتے ہیں یہ ہر ایک سے اس طرح باتیں کریں گے کہ موجود ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ مخاطب وہی تھا۔ ناک پر عینک رکھے یہ لکھتے بھی رہیں گے کوئی جانے لگے گا تو کھڑے ہو کر ہاتھ بھی ملائیں گے اور پھر لکھنے لگیں گے۔

انہماک کی ایک صورت وہ ہوتی ہے جب ٹی وی پر کرکٹ ٹیسٹ میچ دکھایا جا رہا ہو، یا ریڈیو پر کمنٹری نشر ہو رہی ہو۔ جب پاکستانی ٹیم کھیل رہی ہو تو ان کا چہرہ گلنار ہو جاتا ہے انہیں کرکٹ کی ہر اصطلاح کا علم ہے۔ ظہیر عباس بیک فٹ پر سکوائر کٹ اور ماجد خاں کور ڈرائیو پر لاجواب شاٹ کھیلتے ہیں۔ جاوید (میاں داد اس کے والد مرحوم کا نام ہے) پوائنٹ پر بہترین کھیلتے لیکن آؤٹ بھی وہیں ہوتے ہیں۔ عمران خان کے سٹرائڈز دیکھ کر اس کے بال کی تیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بڈ آن، بڈ آف، ڈیپ فائن لیگ، ان سوئنگ اور آؤٹ سوئنگ، لیٹ کٹ، آؤٹ سائڈ دی لیگ سٹمپ، غرض ہر اصطلاح کا ذکر اس خوبی سے کریں گے کہ سننے والا حیران ہو جاتا ہے۔ کرکٹ کمنٹری سنتے ہوئے یا ٹی وی پر میچ دیکھتے ہوئے یہ کسی قسم کی دخل در معقولات کو برداشت نہیں کر پاتے۔ گھر پر ہوں تو ایسے مواقع پہ کمرے میں بند ہو جاتے ہیں۔ بھابی جان یا بہوئیں چائے بنا کر لائیں تو احساسِ شکرگزاری سے ان کے چہرہ پر شفق پھوٹ پڑتی ہے۔ ایک روزہ میچ ہو تو پھر ان کی بھنویں اور زیادہ گھنی ہو جاتی ہیں، یہ تن کر بیٹھ جاتے ہیں، پیشانی پر شل پڑ جاتے ہیں اور خون کا دوران بڑھ جاتا ہے۔ مدِ مقابل اگر اچھا کھیل رہا ہو تو اسے بھی داد دیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ کھیل خواہ کوئی کھیلے اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔

جب کوئی صاحب دفتر میں داخل ہوتے ہیں تو یہ پوچھیں گے "چائے؟"۔ موسم گرما ہو تب بھی کہیں گے "چائے؟"۔ جواب خواہ کچھ ہو دوسرے کے لیے کولڈ اور اپنے لیے چائے منگا لیں گے۔ بات دراصل یہ ہے کہ چائے بہت پیتے ہیں، اچھی بری کی قید نہیں، جب مل جائے اور جہاں مل جائے جیسی مل جائے چائے نہیں چھوڑیں گے۔ جب دفتر کی اوپر والی منزل میں قیام تھا بھابی جان اس وقت ضرور یاد دلاتیں جب یہ زینے سے اُترتے "تسی بزار دی چاہ نہیں پینی جے"۔ وہ دو چار مرتبہ چائے بنا کر بھیج دیتیں لیکن یہ "بزار" کی

چائے پئے بغیر باز نہ آتے۔

ڈاکٹر سلیم اختر بتاتے ہیں کہ اکثر ادیبوں کا یہ خیال ہے کہ یہ جو طفیل صاحب ہوٹلوں میں نہیں جاتے اور عصرِ جدید کے ادبا و شعرا کے ساتھ وقت نہیں گزارتے وہ اس لیے کہ روپیہ خرچ نہیں کرنا چاہتے معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایک مرتبہ ہم دونوں مجنوں گورکھپوری صاحب سے ملنے گئے۔ دورانِ گفتگو مجنوں صاحب نے فرمایا: "میں ہندوستان سے بیک بلینی ویک یوں آیا تھا، لاہور میں اگر طفیل نے میری جیب میں پانچ سو روپے نہ ٹھونس دیئے ہوتے تو میں کراچی بھی نہیں پہنچ سکتا تھا" یہ سنتے جاتے ہیں اور شرمار ہے ہیں۔ فوراً بات کا رُخ موڑنا چاہا لیکن مجنوں صاحب کو کون روک سکتا تھا۔ "میں نے سوچا تھا نقوش کے لیے لکھتا رہوں گا لیکن میری بد توفیقی کہ اب تک کچھ نہیں لکھ سکا ہوں۔" طفیل چند لمحوں کے بعد اُٹھ کھڑے ہوئے "پھر حاضر ہوں گے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔"

ایک روز ہم دونوں نقوش کے دفتر میں بیٹھے تھے، ایک صاحب آئے، بدن پر چیتھڑے آنکھیں چڑھی ہوئیں، ہاتھ پاؤں پر میل، ٹانگوں پہ غلاظت لتھڑی ہوئی۔ "آئیے آئیے ساغر صاحب!" ہاتھ ملاتے ہوئے ان کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھما رہے تھے۔ میں نے پہلی اور آخری بار ساغر صدیقی کو دیکھا تھا۔ طفیل صاحب کہنے لگے: "شراب کی طلب ہو تو آجاتے ہیں۔ کلال نہ ان کے مرتبہ سے واقف ہیں نہ منٹو کی عظمت سے آشنا تھے۔"

طفیل صاحب کے ایک استاد ہیں، انھیں بھی میں نے نقوش کے دفتر ہی میں دیکھا مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے منٹو کا کردار ایشر سنگھ سامنے کھڑا ہو" ایوب خان وی پڑ پڑ اک"۔ نہ جانے کیا کہتے تھے اپنے استاد کے سامنے مودب بیٹھتے ہیں اور خدا جانے کب سے ان کی ہی نہیں سارے گھر کی ضروریات کا خیال کرتے ہیں۔

بمبئی سے عصمت چغتائی آئیں۔ میں ٹیلیفون پر ان سے کہہ رہا تھا "آپ جلد آئیے۔" "ارے بھائی! کیسے آؤں، کسی پبلشر سے کہو کہ میری کتابیں بغیر اجازت چھاپتے رہتے ہو کچھ رقم دلواؤ تو لاہور اور اسلام آباد تک ہو آؤں۔"

مجھے معلوم ہے کہ پبلشر دلی کا ہو یا لاہور کا، کراچی کا ہو یا بمبئی کا، علی گڑھ کا ہو یا راولپنڈی کا، اُسے تو صرف پیسہ چاہیے۔ میں نے ٹیلیفون پر طفیل صاحب کو ساری گفتگو سنا دی۔ کہنے لگے "یار! عصمت آپا سے کہو ایک بار کسی طرح لاہور آجائیں سب کچھ ٹھیک

ہو جائے گا۔" پھر رازداری کے ساتھ عصمت آپا کو کراچی سے لاہور کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی بھجوایا۔

عصمت آپا لاہور پہنچ گئیں۔ چند روز قیام کرنے کے بعد وہ اسلام آباد روانہ ہوئیں تو پورا قافلہ ساتھ تھا۔ کراچی سے عصمت آپا کے ہمراہ مدحت (عظیم بیگ چغتائی کی بڑی صاحبزادی) ڈاکٹر عطیہ (جنھوں نے تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں سب سے پہلے سوتے سے اٹھ کر "لحاف" سنا تھا) کچھ بچے اور میں، سب ریل کار میں سوار تھے۔ واپسی ہوائی جہاز سے ہوئی اور سارا خرچ طفیل صاحب نے برداشت کیا۔

میں نے اپنے پس انداز کیے ہوئے روپے سے رقم حاصل کی جو اجازت نامہ ملا اس میں میرے اندازے سے رقم کم کی تھی شام کو کھانے کے بعد پوچھنے لگے "مولانا! کیا بات ہے؟" صورتِ حال بتلائی۔ چپ ہو رہے۔ دوسرے دن صبح اپنے بیٹے پرویز سے کہنے لگے: "پتر! بیڈن روڈ چلنا ہے۔" میں بھی ساتھ تھا۔ بنک سے دو ہزار روپیہ نکلوایا "یار! یہ لیتے جانا" میں نے کل رقم بنک میں جمع کرا دی اور ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد زکوٰۃ کاٹ لی گئی۔ میں نے طفیل صاحب کی رقم واپس بھیج دی لیکن اس دور میں دوست کی یا کسی اور کی ضرورت کا خیال کرنے والے کتنے ہیں! ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان کی کشادہ قلبی اور فیاضی کا اندازہ ہوتا ہے حرص و آز انھیں چھو کر نہیں گزرے۔ میں ایسے بے شمار واقعات سے واقف ہوں جو ان کے صاحب دل اور صاحب نظر ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ یہ دیدہ و دانستہ فریب کھاتے ہیں، سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی۔ کیا مجال جو گفتگو یا تحریر میں تلخی یا شوریدگی آئے ہرگز بدمزہ نہ ہوں گے بلکہ مسکراتے رہیں گے اور خندہ روئی سے پیش آئیں گے ان کی خوش طبعی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اپنی بذلہ سنجی کو برقرار رکھیں گے اور انسانی کمزوری کو درگزر کریں گے اور قابلِ عفو گردانیں گے۔ مالی نقصان برداشت کریں گے لیکن خوش گفتاری میں فرق نہ آنے دیں گے۔ دوسرے شخص کی حرص جوں جوں بڑھتی جائے گی ان کے لہجہ کی نرمی اور مزاج کی معصومیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ میں محمد طفیل کی خوبیوں پر جان دیتا ہوں ان کے عیوب سے واقف نہیں۔ رہی بات انسانی کمزوریوں کی، تو وہ کس میں نہیں ہوتیں۔ لیکن ایسی کمزوریاں جن سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا نہ قلم سے نہ زبان سے نہ تحریر سے۔ ان کی حمایت یا مخالفت میں خواہ کچھ کہا جائے یہ کسی قیمت پر اصابتِ رائے کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے کبھی ہوشمندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے گا۔ یہی ان کی شخصیت کی کلید ہے۔

یہ درست ہے کہ ہر تحریر نقوش میں نہیں چھپ سکتی۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جن کے دل میں یہ خواہش برسوں سے موجود ہے کہ ان کی تحریر نقوش میں جگہ پا جائے اور بعض اسی غم میں گھلے جاتے ہیں کہ ان کی تصویر نقوش کے ٹائٹل پر کیوں نہیں چھپتی، اور پھر حاسدوں کا حلقہ بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن طفیل صاحب کی نظر انھیں ادبی بددیانتی نہیں کرنے دیتی۔ ناقص اور نارسا تحریر نقوش میں جگہ نہیں پا سکتی۔ ادب کے نام پر رکاکت، اخلاقی پستی، تنگ نظری، کھوکھلی اور نمائشی روایت، تعصب اور مصلحت آمیزی کا گذر نقوش میں نہیں ہو سکتا۔

جب نقوش کا کوئی شمارہ چھپتا ہے تو یہ حضرت مٹّھی بانٹنے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب بیاضِ غالب بہ خطِ غالب کا نقوش نمبر آیا تو تقسیم اور مٹّھی کا دائرہ اور پھیل گیا۔ میں ایک دن نقوش کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، میں نے کہا "جی"۔ طفیل صاحب ٹیلیفون پر ریسیور اٹھاتے ہی یہی دو حرفی لفظ کہتے ہیں" طفیل جی! بڑا زور دار نمبر کڈھیا جے ایس واری دو بھیجناں۔" میں بقول منٹو جل کر کباب ہو گیا لیکن ان حضرت نے دو نسخے فوراً بھیج دیے۔ ہندوستان سے ایک صاحب آئے تو کئی نسخے لے گئے اور وہاں جا کر تین سو روپیہ فی نسخہ کے حساب سے فروخت کیے حالانکہ اس کی قیمت صرف تیس روپے تھی۔ خود میں نے بیاضِ غالب والے نقوش نمبر کو بہت سے حضرات کو بیس بائیس روپے میں دلوایا تھا۔ میں جھلّا گیا کہ "آپ یہ کیا کر رہے ہیں!"

"یار! تم غصہ نہ کرو، لوگ پڑھیں گے، غالب شناسی کا دائرہ وسیع ہو گا نہ پڑھیں گے تو ڈرائنگ رُوم میں سجائیں گے، پھر بھی غالب اور نقوش کا نام بلند ہو گا۔" اسی کو بلند نفسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خلوص، حقیقی لگن اور شدید جذبہ کی یہی وہ روشن اور تابناک صداقت ہے جو ان کو عام ایڈیٹروں سے ممتاز و محترم بناتی ہے۔

محکمہ تعلیم کے ایک ڈائرکٹر ایک دن میرے گھر آ گئے اور حکم صادر فرمایا کہ نقوش کا وہ شمارہ لاؤ جس میں غالب کا دیوان شائع ہوا ہے۔ میں نے طفیل صاحب کو ٹیلیفون کیا، پھر خط لکھا، جواب آیا کہ " غالب نمبر ۲ ختم ہو چکا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے کسی سے لوں گا اور واپس نہ کروں گا، تمھاری خاطر اس بے اخلاقی کو بھی گوارا کر لوں گا۔" میں نے ڈائرکٹر صاحب سے تو کچھ نہ کہا لیکن شکر و سپاس کا درجہ جو طفیل صاحب کے لیے میرے دل میں تھا، اپنی محدود بصیرت کے باوجود کہیں بلند ہو گیا۔

کسی شخص کے ذوق و ذہن کا اندازہ اس کے دسترخوان سے بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان سے جیلانی بانو آئیں یا رام لعل عصمت چغتائی آئیں یا ڈاکٹر محمد حسن یہ ممکن ہی نہیں کہ طفیل صاحب انھیں مدعو نہ کریں۔ کراچی اور لاہور کے ادبا و شعرا ہی نہیں ملک بھر کے ادیب و شاعر آتے ہی رہتے ہیں۔ ایک روز ٹی ہاؤس سے مسعود اشعر کے ہمراہ میں بھی اُٹھا۔ مسعود صاحب کہنے لگے "فاصلہ زیادہ ہے ہم آپ کو طفیل صاحب کے ہاں چھوڑ آئیں"۔

یوسف کامران صاحب نے کار سٹارٹ کی اور "کشورِ حسین" کا ذکر کرتے ہوئے جب نیو مسلم ٹاؤن پہنچے تو یوسف کامران گویا ہوئے "اچھا! تو یہ ہے طفیل صاحب کا گھر۔" ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ نہ طفیل صاحب گھر پر تھے نہ بھابی جان۔ بڑی بہو زاہدہ فاروق نے فوراً چائے کا اہتمام کیا اور اس سے قبل آم پیش کیے۔ لودھی اور فرخندہ لودھی نے آموں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا کہ آم کھانے کے لیے بھی ذوق و ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسعود اشعر اور یوسف کامران صاحب نے آموں کے ساتھ انصاف کیا۔ چائے کی طرف توجہ نہ کی۔ کامران صاحب نے جاتے ہوئے فرمایا "طفیل صاحب سے میرا سلام کہیے گا اور یہ بھی کہ بھائی! آم سردخانے میں رکھنے کی چیز نہیں اسے جس قدر جلد ممکن ہو تنورِ شکم میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ اگر وہ یہ کام نہ کر سکے تو یہ سردخانہ میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔" میں نے دل میں کہا یہ طفیل کے دسترخوان کے کونے کا ایک مختصر ترین حصہ ہے۔ بھابی اور بہوئیں زاہدہ اور بشریٰ لذیذ کھانے پکاتی ہیں۔ طفیل صاحب ہر آنے والے کو کھلاتے اور خوش ہوتے ہیں۔ خود بھی اچھا کھاتے ہیں اور اپنی ہومیوپیتھی کے علم کے بل بوتے پر ہر طرح کی بدپرہیزی کرتے ہیں۔

میرے ایک دوست نذیر احمد صاحب ہیں۔ کبھی انگریزی زبان کے بہت اچھے استاد اور اردو افسانے کے بہت اچھے ناقد تھے۔ اب مرکزی سرکار کے بڑے افسر ہیں ادب منصب و مرتبہ کے بھاری بوجھ کے نیچے کچل گیا۔ خدا جانے کیا مرض تھا کہ دُنیا بھر کا علاج کرا لیا ٹھیک ہی نہ ہوتے تھے طفیل بھائی کے ایک ہم جماعت اور دوست محمود عالم قریشی صاحب بھی ہومیوپیتھی کے ماہر ہیں۔ ایک صاحب اور تھے ان کا نام میرے ذہن میں نہیں ہے۔ تینوں ماہرین کا بورڈ بیٹھا، تشخیص ہوئی۔ طفیل صاحب نے دوائی تجویز کی۔ تیسرے دن نذیر صاحب کا پیٹ تین انچ کم ہو گیا۔ شانے جو پتھر کی طرح سخت اور سُن تھے ٹھیک ہو گئے۔ طفیل صاحب نے بتایا کہ نذیر صاحب کا کیس بہت ہی ہوپلیس (HOPELESS) ہو گیا تھا۔

گڑھی شاہو میں رہتے تھے تو ایک شخص کا علاج کیا جس کے تمام جسم سے پانی ٹپکتا تھا۔ وہ امراضِ خبیثہ کا شکار تھا۔ دورانِ علاج وہ پھر اس گلی میں چلا گیا جہاں ایسے امراض پرورش پاتے ہیں۔ یہ ناراض ہو گئے اور علاج کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب اس کی جان پر آ بنی اور اس کی غربت نے اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ دوا اور غذا خرید سکے تو یہ اس کے جسم پر پھائے رکھتے اور دوا کھلاتے رہے حتیٰ کہ وہ صحت یاب ہو گیا۔

گڑھی شاہو والے مکان میں ایک شب میری ڈاڑھ میں شدید درد اٹھا۔ میں کراہنے لگا میں نہیں چاہتا تھا کہ طفیل صاحب کو تکلیف ہو۔ کراہنے کی آواز سن کر خود آ گئے۔ ہومیوپیتھی کی چند گولیاں پانی میں حل کر کے کلیاں کرائیں اور درد غائب ہو گیا۔

اس سلسلہ کی ایک بات اور سن لیجئے۔ جمیلہ ہاشمی کے شوہر کا انتقال لندن میں ہوا، تدفین بہاول پور کے قریب کسی خانقاہ میں ہونی تھی۔ خبر ملتے ہی دو کاریں لاہور سے روانہ ہوئیں۔ ایک میں خواتین، دوسری میں طفیل صاحب اور مرحوم کے ہم زلف۔ خواتین جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے آگے نکل گئیں۔ ملتان سے دس میل کے فاصلہ پر طفیل صاحب کی کار کا ڈرائیور اونگھ گیا۔ آنکھ کھلی تو موت یقینی نظر آئی۔ بھلا آدمی تھا اور سمجھدار۔ طفیل صاحب آگے کی سیٹ پر تھے۔ ڈرائیور نے خود کو بچانے کے لیے طفیل صاحب کو اس درخت کے سامنے کر دیا جس سے ٹکرا کر کار چکنا چور ہو گئی۔ ڈرائیور نے تو اردو ادب کو نقصان پہنچانے میں کسر اٹھا نہ رکھی تھی مگر جسے خدا رکھے۔

ایک ٹرک ڈرائیور نے انھیں نشتر ہسپتال ملتان میں پہنچا دیا اور وہی مجھے اطلاع دینے آیا۔ میں جب پہنچا تو جنرل وارڈ میں اس طرح بیٹھے تھے کہ پٹی پیشانی سے گزر کر سر کے پچھلے حصہ کو چھپاتی ہوئی، سر کے درمیانی حصہ سے گزر کر ٹھوڑی کو ڈھانپ رہی تھی۔ کپڑے خون میں لت پت تھے۔ سب سے پہلی بات جو انھوں نے کہی وہ یہ تھی:

"یار! میں انجکشن کسی قیمت پر نہیں لگواؤں گا اور ہاں تم جلدی سے یہ دوا لا دو اور ڈاکٹروں سے ہرگز اس کا ذکر نہ کرنا۔"

جب تک ہسپتال میں رہے نہ انجکشن لگوایا اور نہ ہومیوپیتھی کی دوا چھوڑی جبھی تو میں کہتا ہوں کہ صاحبِ عزم و ہمت ہیں اور اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت سے بخوبی واقف۔

یہاں ایک اور بات بھی بتاؤں کہ انھیں حادثہ میں اتنی شدید چوٹیں آئی تھیں کہ ضرورت آپریشن کی تھی کہ بیہوش کر کے ٹانکے لگائے جا سکیں۔ انھوں نے ڈاکٹر سے کہا مجھے بے ہوش

نہ کیجئے اور ٹانکے لگائیے۔

ڈاکٹر نے بہتیرا کہا کہ کم از کم پانچ ٹانکے لگیں گے۔ سر کے پچھلے حصہ میں درخت کی ٹہنی گھسی ہوئی ہے۔ بیہوش کیے بغیر یہ عمل ناممکن ہوگا۔ مگر یہ ضد کرتے رہے کہ بیہوش کیے بغیر اپنا عمل جاری کریں۔ ڈاکٹر نے محض بتانے کے لیے کہ بڑا درد ہوگا اس نے اسپرٹ سے تر کر کے رُوئی کا بڑا سا لوندا اُن کے زخموں پر رکھ دیا۔ مگر اُنھوں نے سی تک نہ کی۔ ڈاکٹر نے نرسوں سے پُوچھا یہ اسپرٹ ہے یا پانی؟

جب نرسوں نے بتایا اسپرٹ ہے تو ڈاکٹر نے طفیل صاحب سے پوچھا:

"درد نہیں ہوا؟"

طفیل صاحب نے کہا:

"آپ زخموں پر اسپرٹ ڈال کر پُوچھتے ہیں درد ہوا کہ نہیں، بہرحال آپ اپنا کام کریں۔"

چنانچہ اُنھوں نے پانچ ٹانکے عالمِ ہوش ہی میں لگوائے۔

طفیل صاحب کے چار بیٹے ہیں: فاروق، جاوید، پرویز اور اخلاق۔ چاروں باپ پر ترس کھا کر ان کے کاموں میں مدد دیتے ہیں، یعنی دال روٹی کمانے کے چکر میں رہتے ہیں ورنہ یہ تو فنا فی الادب ہو کر بیکار ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن جاوید نے طفیل صاحب سے کہا:

ابّا جان! آپ جو کچھ چاہیں کریں مگر اتنا خیال رکھیں کہ سال میں پندرہ بیس ہزار سے زیادہ کا نقصان نہ ہو ورنہ ہم سنبھل نہ پائیں گے۔

ہماری بھابی کا حوصلہ بھی قابلِ تقلید ہے۔ وہ کوشش کرتی ہیں کہ انھیں زیادہ پریشان نہ کیا جائے۔ وہ ساری پریشانیوں کے سامنے خود سینہ سپر ہیں۔ گھریلو معاملات سے انھیں "فارغ خطی" دے چکی ہیں۔ شادی بیاہ، موت مرگ سے انھیں آزاد کر رکھا ہے مطلب یہ کہ رشتہ داروں میں کوئی بیاہ ہو تو انھیں بیاہ سے زیادہ ادبی تقریب سے دلچسپی ہوگی۔ کوئی مر جائے تو یہ اس کے جنازے میں شریک ہونے کی بجائے کسی ادیب کی مزاج پرسی کو ترجیح دیں گے۔ غرض یہ ادب اور ادیب کے معاملات کے علاوہ "رشتہ بیزار" آدمی ہیں۔ پھر یہ بھلکڑ اتنے عظیم ہیں کہ کسی رشتہ دار کا ایکسیڈنٹ ہو جائے اور انھیں اطلاع دی جائے کہ وہ ہسپتال میں ہے تو کہیں گے ابھی پہنچا۔ مگر پھر کسی دوسرے کام میں لگ جائیں گے اور دو تین

دن بعد یاد آئے گا۔ پھر بیوی سے کہیں گے ناراض نہ ہوں تو ایک بات بتاؤں، فلاں ــــ

میں نے دو بار طفیل صاحب کو غصے ہوتے بھی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ بھابی جان نے ان کے چھوٹے بھائی ملک اکرم کے لیے کچھ کہہ دیا، انھیں غصہ آ گیا اور یہ بے باک صداقت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ دوسری مرتبہ غصہ اس وقت آیا جب یہ مجھے اسٹیشن پر سی آف کرنے میرے ہمراہ ٹیکسی میں سوار تھے۔ ڈرائیور نے طویل راستہ اختیار کرنا چاہا، وقت تنگ ہو رہا تھا ورنہ شاید اسے کچھ نہ کہتے لیکن جب ٹرین کے روانہ ہو جانے کا خدشہ بہت بڑھ گیا تو یہ ڈرائیور پر برس پڑے۔ ایسے موقع پر لاہور میں جو زبان عام لوگ بولتے ہیں اس سے بھی واقف ہیں۔ اس تندی و تیزی کے عالم میں بھی تلخی و زہرناکی نہ تھی، دوسرا شخص ہوتا تو بے قابو اور بے کیف ہو جاتا۔ نفرت ہو یا غصہ، طفیل کبھی پست سطح پر نہیں اتریں گے۔ ضبط و تحمل قدرت نے مزاج میں اس درجہ ودیعت کیا ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر مقام پر نرمی و ملائمت کے قائل ہیں۔

دو مواقع پر بہت گھبراتے ہیں، موصوف کو پسینہ آجاتا ہے، حلق خشک اور اکثر آواز رُندھ جاتی ہے۔ ایک موقع تو وہ ہے جب کوئی خاتون ملنے آجائیں۔ اور دوسرا موقع وہ جب کہیں برسرِ محفل تقریر کرنی پڑے یا تحریر سنانی پڑے۔

میں نقوش کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ طفیل' موجد صاحب کی مزاج پرسی کو گئے تھے۔ ایک خاتون گلبرگ سے تشریف لائیں اور طفیل صاحب کو نہ پا کر یہ کہہ کر چلی گئیں "پھر حاضر ہوں گی"۔ تھوڑی دیر کے بعد طفیل صاحب آ گئے۔ جب میں نے بتلایا کہ ایک خاتون ملنے آئی تھیں' تو یک لخت چہرے کا رنگ متغیر ہوا" ہیں؟ کون خاتون؟ میں ابھی آیا"۔ پھر جو گئے تو چار بجے ڈرتے ڈرتے لوٹے "یار! معاف کرنا' میں ضروری کام سے چلا گیا تھا۔" بھوک لگی ہو گی "پتر پرویز! فٹافٹ چرغے لے آ۔" کھانے کے دوران میں نے کہا "وہ کالی کلوٹی خاتون دو مرتبہ آ چکی ہیں۔"

"یار! کھانا کھا لینے دو' ورنہ میں پھر ضروری کام سے چلا جاؤں گا۔"

یہ بھی کہا" اوّل تو عورتوں کا ذکر نہ کرو، کرو تو حسین عورتوں کا ذکر کرو۔"

ایسی خواتین جو ادب کی آڑ میں ملنا چاہیں یہ ان سے کوسوں دور بھاگتے ہیں اور ضروری کام یاد آجاتا ہے لیکن جو ادب تخلیق کرتی ہیں ان سے یہ گھنٹوں باتیں کر لیں گے۔ شکیلہ اختر ہوں یا اختر جمال، عصمت چغتائی ہوں یا ہاجرہ مسرور و خدیجہ مستور۔ یہ سب ہوں مگر ایسی خواتین ہوں جنھیں دیکھنا

اور ملنا تو در کنار ذکر سنتے ہی ضروری کام یاد آجائے۔

نومبر ۱۹۸۵ء میں گلڈ کے نئے سیکرٹری جنرل کا انتخاب ہونا تھا۔ ہم سب کراچی پہنچے ہوئے تھے۔ ایک دن ایک صاحب آگئے، ان کا نام لطف اللہ خاں تھا۔ ان حضرت کو عجیب و غریب شوق تھا۔ انہوں نے اپنے گھر پر آوازوں کی لائبریری بنا رکھی ہے میں نے اس سے قبل اور اس کے بعد کبھی دیکھا نہ سنا کہ آوازوں کی بھی لائبریری ہوتی ہے۔ وہ، طفیل صاحب کی آواز ریکارڈ کرنا چاہتے تھے اور یہ آمادہ نہ ہوتے تھے۔ میں نے بہلایا پھسلایا اور ہم سین گیتا روڈ کاسموپولیٹن روڈ کراچی پہنچے۔ لطف اللہ صاحب کے صاحبزادے اپنے والد محترم ہی کے مرض میں گرفتار تھے۔ سٹوڈیو میں کل چار افراد تھے۔ آلات اس قدر حساس کہ ہلکی سے ہلکی آواز کو بھی گرفت میں لے لیتے تھے۔ طفیل صاحب نے اپنا کوئی خاکہ پڑھنا شروع کیا تو بلا مبالغہ سات مرتبہ پانی پیا۔

کسی بھی ادارہ کو چلانے کے لیے بڑے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہے۔ چار آدمی یک جا ہوئے اور یونین بنی۔ فرائض کم سے کم تر ہوتے جاتے ہیں اور حقوق کا مطالبہ بڑھتا جاتا ہے۔ نقوش پریس میں بعض لوگ سال ہا سال سے کام کر رہے ہیں اور آج تک یہ نوبت نہیں آئی کہ پھاٹک پر بے حیائی اور ڈھٹائی سے کسی کو نعرہ زنی کرتے ہوئے دیکھا گیا ہو۔ اس میں انتظامی صلاحیت کا دخل اتنا نہیں ہے جتنا حسنِ سلوک کا۔

پریس میں قرآن مجید کے سیپارے چھپ رہے تھے۔ ایک کارکن روز سیپارے چراتا اور بازار میں فروخت کرتا تھا۔ یہ بات طفیل صاحب کے علم میں تھی۔ انہوں نے اس کی تنخواہ اور بڑھا دی مگر وہ پھر بھی چوری سے باز نہ آیا، لیکن یہ اسے الگ نہ کر سکے۔ الگ کر سکتے ہی نہ تھے۔ لندن جو ایک شہر ہے دنیا میں انتخاب، کہ سیاست داں ہو یا ادیب، مورخ ہو یا مدرس، کارل مارکس ہو یا سکندر مرزا، لندن سب کو جگہ دیتا ہے۔ طفیل صاحب بھی سیدھے لندن پہنچ گئے۔ جو اپنے ملک سے نکالا جاتا ہے وہ بھی اور جو از خود جائے وہ بھی ___ لندن سب کو پناہ دیتا ہے۔

طفیل صاحب کے بیٹے جاوید نے پریس کا چارج سنبھالا تو سیپارہ چوری کرنے والے ہی کو نہیں مشین کے پرزے تبدیل کرنے والے سے لے کر کاغذ چرانے والے تک سب کو نکال باہر کیا۔ لندن کسی کا کچھ بگاڑے تو بگاڑے ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ یہ جیسے

گئے تھے ویسے ہی گھر لَوٹ آئے۔ نہ سفرنامہ لکھا نہ بتانِ سیم تن کا حال سنایا۔ کوئی ایران میں اور کوئی اندلس میں اجنبی ہوتا ہے یہ ہر جگہ اجنبی ہیں سوائے گھر کے۔

لندن سے آتے ہی پریس کا حال معلوم ہوا تو سخت پریشان ہوئے اور اداس بھی۔ پریس کے چوکیدار جعفری کو بلایا اور باری باری ہر کارکن کے گھر بھیجا" اگر اوہنوں نوکری نہیں ملی تے اوہنوں کہہ واپس آجائے۔"

سب سے بڑے بیٹے فاروق کی شادی کی۔ دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا۔ ایک چرمی تھیلا میرے سپرد کیا جس میں نوٹ تھے" خوب خرچ کرو" مجھے چاول کی کوالٹی پسند نہ تھی "یار! دوسری بوری خرید لو۔" فوراً نئی بوریاں آگئیں، دُولھا میاں کو سلامی مل رہی تھی "تم ہی وصول کرو، تم ہی لکھو"۔ حفیظ جالندھری صاحب نے سہرا لکھا "یار! تم پڑھو"____ "طفیل بھائی! فلاں صاحب کو دعوت نامہ بھیجا ہے؟"

"یار! تم سے دوستی اسی لیے تو ہے کہ یُوں سوچتے ہو۔"

مجھے معلوم تھا کہ کسی زمانہ میں اُن صاحب سے ہر روز کا ملنا تھا۔ نقوش کے سلسلہ میں کوئی بات ہوئی اور بڑھ گئی تھی۔ یہ بک پڑھنے ہونے کا دوسرا موقع تھا۔ صلح صفائی تو ہوئی لیکن آمد و رفت کم سے کم تر ہوتی گئی اور ملنا جلنا ترک ہو گیا۔ جن صاحب کا ذکر ہے وہ یوپی کے پٹھان ہیں اُن کے اسلاف نے جہانداری کی ہے اور انھوں نے جہان بینی۔ انھیں دعوت میں شرکت کرنی ہی چاہیے تھی۔ وہ شریک ہوئے۔ دونوں نے اپنی بڑائی کا ثبوت دیا۔

دُوسرے دن صبح کو پلاؤ کی دیگ کے گرد ہم دونوں بیٹھے بوٹیاں چُن چُن کر کھا رہے تھے یہ ناشتہ وقفہ وقفہ سے دوپہر تک جاری رہا۔ کہنے لگے:

"یار! آپ کو ایک خاکہ سُناتے ہیں، چھپا ہُوا تو پڑھ ہی لیا ہو گا۔"

پانی پیتے جاتے تھے اور خاکہ سُنا رہے تھے۔ خاکہ ایک افسانہ نگار خاتون کے بارے میں تھا۔ میں نے کہا: "یہ تو اس سے بہت مختلف ہے جو چھپا ہے۔"

"ہاں! میں اپنی تحریروں کو بار بار لکھتا ہُوں۔ دُوسرے یہ معاملہ بہن کا ہے جس حد تک چھپ سکتا تھا وہ چھپ گیا۔ میں سوچتا ہوں وہ تو اب بھی ناراض ہی ہو گی۔"

معلوم ہوا کہ آبگینوں کو ٹھیس نہیں لگنے دیتے۔ نگاہ نیچی رکھ کر گفتگو کرنے والا انسان کسی بھی موقع پہ نہ بے تکلف ہوتا ہے نہ بے محابا۔

ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے لیکن بھابی جان کی ہر خواہش کا احترام تو جیسے ایمان کا حصّہ ہے۔ کہنے کو یار لوگ اسے "طفیل محل" کہتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ مکان کا بالائی حصّہ اب بھی نامکمل ہے۔ طفیل صاحب مقروض ہیں۔ جب میں پہلی مرتبہ نو تعمیر شدہ مکان پر پہنچا تو بولے:

"آپ نے ہماری بیگم صاحبہ کی 'حماقت' ملاحظہ کر لی؟"

ایک مرتبہ کراچی میں خریداری کو نکلے محمود عالم قریشی صاحب ساتھ تھے (محمود بھائی چور پکڑنے کے ماہر ہیں) محمود بھائی ہم دونوں کو صدر بازار کراچی لے گئے اور ایک دلی والے کی دُکان پر جا بٹھایا۔ جو تاجر دلی سے آئے تھے ان کی پہلی نسل جوان ہو رہی تھی۔ کراچی کی آب و ہوا، پارسی حسن کی کافرماجرائی اور گوا نیز نوخیز لڑکیوں کی عشوہ زائی کی دید او، قرب نے دلی والوں کی نئی نسل کو کپڑے کی فروخت کے نئے انداز سکھائے تھے۔ دکان پر کئی ملازم تھے جب کوئی اچھے ڈیزائن کا کپڑا آتا تو ایک لڑکا اندازِ دلبری سے کپڑے کو اپنے گرد یوں لپیٹتا جیسے کسی کامنی نے ساڑھی باندھ رکھی ہو۔ طفیل صاحب صرف ایک بار تو متحمل ہوئے کہ اس عالم میں اس پر نگاہ ڈالیں" التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا"۔ بھابی جان کے لیے اتنا کپڑا خریدا کہ میں حیران رہ گیا۔

شام کو جب یہ گھر پہنچتے ہیں تو فاروق کے بچے دروازے ہی پر گھیر لیتے ہیں۔ بندیا (تابندہ) اور عصمت اتنی تیز، شوخ اور طرار ہیں کہ ان دونوں بچیوں نے اپنے باپ فاروق کی کم گوئی اور کم سخنی کا بدلہ سارے خاندان سے لے لیا ہے۔ کوئی اس جیب پر لٹکی جاتی ہے کوئی اُس پر، تیسری پوتی فرخندہ پتلون کھینچ رہی ہے اور پوتا سعدون رُوٹھ کر زمین پر لوٹ گیا۔ یہ اسے منانے اور گود میں اٹھانے کو فرش ہی پر بیٹھ گئے، اب کوئی کندھے پر سوار ہو رہا ہے، کوئی پھلوں کا تھیلا لے بھاگا۔ دادی چلا رہی ہیں مگر دادا جان ہنس رہے ہیں۔ کپڑے تبدیل کر کے سلیپر مل گئے تو خیر، ورنہ ننگے پاؤں گھر میں گھومتے پھریں گے۔ عام طور پر شلوار کرتا پہنتے ہیں۔ کھانا کھا کر ہال میں ٹہلیں گے۔ ساری عمر ہو گئی گھر سے باہر ٹہلنے کبھی نہیں گئے۔ ٹیلیویژن پر کوئی اچھا ڈرامہ ہوا تو دیکھ لیں گے ورنہ کمرے میں جا کر لیٹ جائیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ ہر کتاب کتاب نہیں ہوتی۔ چنانچہ گھر کے کتب خانے میں جو پہنچ گئی وہ کتاب ہے ورنہ دفتر کے ڈھیر میں سے جس کا جی چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے غالب لائبریری

والے مرزا ظفر الحسن صاحب اسی لیے تو طفیل صاحب سے ناراض ہیں کہ وہ اس ڈھیر کو غالب لائبریری میں کیوں نہیں بھیج دیتے۔ طفیل صاحب کا کہنا یہ ہے کہ غالب سے منسوب جو ادارے ہیں اس میں کتابیں ہونی چاہئیں ڈھیر تو ہر جگہ ملتے ہیں۔ دراصل یہ مزاج کا فرق ہے ۔ یہ ذہن و فکر اور توضیح و تشریح کا فرق ہے ۔ یہ انداز اور اسلوب کا فرق ہے۔

سونے سے قبل کوئی کتاب مطالعہ کے لیے اٹھا لیں گے ۔ ان کا دلچسپ ترین مشغلہ لغت پڑھنا ہے ۔ میں نے ایک روز پوچھ ہی لیا :

"آپ لغت کیسے اور کیوں پڑھتے ہیں؟"

"ہر لفظ ایک اکائی ہے ، اس کے معنی و مفہوم کو سمجھانے کے لیے مترادفات دیئے جاتے ہیں میں ہر لفظ میں ایک تصویر دیکھتا ہوں ، صرف ایک اور مکمل تصویر ، لیکن جب دیے ہوئے معنی و مفاہیم کو پڑھتا ہوں تو اس تصویر کے مختلف زاویے بھی سامنے آتے ہیں۔ تصویر ایک مگر اس کے رُخ کئی ہوتے ہیں۔"

ایک شب کہنے لگے : "یار! آج جلدی سو جاؤ ، صبح چہل قدمی کو چلیں گے۔" صبح ہوئی اردو بازار سے نکلے اور سڑک پر آکر رکشہ میں بیٹھے اور مینارِ پاکستان پہنچ گئے ۔ ایک ناٹے قد کا پہلوان دوڑ لگا رہا تھا اور ایک خاتون خیمہ نما بُرقع پہنے تیز رفتاری سے سبزہ پر سیر میں مصروف تھیں طفیل صاحب نے سلیپر اتارے اور پھر کرتا ، سوکھے ہوئے ہاتھ دو تین بار ہوا میں لہرائے۔ میں بنیان کے نیچے سے جھانکتی ہوئی پسلیوں کو گن بھی نہیں پایا تھا کہ ان کی ورزش ختم ہو گئی ۔ بھاٹی دروازے سے ہوتے ہوئے کچھ کھانے کی چیزیں خرید کر گھر آ گئے ۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ لاہور میں حلوہ پوری کس دکان پر اچھی ملتی ہے ، چھولے کہاں عمدہ ہوتے ہیں ؛ کچوریاں کس وقت اور کہاں تلی جاتی ہیں ، نہاری کا ماہر کہاں پایا جاتا ہے ۔ دلی والے جب تک بازار میں کچھ کھا نہیں لیتے تھے ان کا پیٹ نہیں بھرتا تھا ۔ طفیل لاہوری میں اس حد تک چٹورپن ہے کہ کبھی کبھار منہ کا مزہ ضرور بدلتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے گھر نہایت اعلیٰ درجہ کا کھانا تیار ہوتا ہے ۔

میں اور طفیل صاحب ایک دن اے جی آفس میں ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے اس دفتر کے نصف سے زیادہ ملازمین گزرتے ہیں ۔ جن صاحب سے ملنا تھا وہ بہت دیر میں آئے ، گرمی کی حدت میں شدت پیدا ہو چلی تھی ۔ پیدل ہی چل پڑے ۔ اک دکان پر رُک گئے

"لاہور میں یہاں سے اچھی دہی کی لسی اور کھیر نہیں ہوتی۔" میں نے لسی پی اور کھیر انھوں نے کھائی۔ طفیل صاحب اکثر حیران ہوتے ہیں کہ میں چائے کیوں نہیں پیتا۔ اور میں حیران ہوں کہ وہ لسی کیوں نہیں پیتے۔ کہتے یہ ہیں کہ اب نہ موچی دروازے میں جلسہ ہوتا ہے اور نہ قوم کی خاطر چندہ، لسی پینے کا لطف بھی جاتا رہا۔

طفیل صاحب کے خلاف جب کچھ لکھا جاتا ہے یا ہوٹلوں میں دن بھر بیٹھنے والے بیکار باتوں میں وقت گزارتے اور بیروں کو پانی کے گلاس کا آرڈر دینے والے ادبا و شعرا اُن کی بُرائی کرتے ہیں تو مجھے ذرا حیرانی نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ حضرات طفیل صاحب کی طرح اَن تھک کام نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں میں یہ صلاحیت بھی نہیں ہوتی کہ وہ کام کرنے والوں کی تلاش و جستجو کر سکیں۔ نہ انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ یا دوسرے اکابرین ادب پر مواد کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ چائے کی چُسکی لگا کر دن گزارنے والوں کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ ادب کے دفینے اور خزینے کہاں ہیں۔ انھیں کیسے برآمد کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ان کی ترتیب و تدوین کی جا سکتی ہے۔ اپنی ناواقفیت کی بنا پر یہ حضرات بے کار دن اور بے کار راتیں گزارتے اور شرفا کو تنقیص و تعریض کا نشانہ بناتے ہیں۔ طفیل صاحب نے کبھی سوقیانہ اور فحش باتوں پر توجہ نہ کی۔ لوگوں کے پھکڑ پن اور رکاکت کی طرف کبھی دھیان نہ دیا، ایسے لوگوں کی بے بصری کا ماتم کرنے کی بجائے اپنی ذہانت اور ذہن کو تخلیقی کاموں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ہمیشہ کہتے ہیں "لوگوں کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے صرف کام کرنا چاہیے۔ اگر کوئی تعریف کرے تو بھی دھیان نہیں دینا چاہیے، ورنہ قلم کاغذ کی پٹڑی سے اُتر جائے گا۔"

طفیل صاحب اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور بے تعلق نہیں ہوتے۔ ملک کا دولخت ہونا ہو یا اس کی زبوں حالی، عوام کی بے بسی ہو یا بے حسی، ان کی ناکامی ہو یا افتاد و اضطراب یہ کسی بات سے بے خبر نہیں ہیں۔ موقع پرست افراد سے سخت بیزار ہے۔ ملکی حالات کی نامساعدت اور غیر ملکی حکومتوں کی ستم کیشیوں سے بخوبی واقف ہیں لیکن ہر شخص کے سامنے اظہار سے کتراتے ہیں اور چپ رہتے ہیں لیکن بے تکلف دوستوں میں دبے لفظوں میں نہیں واشگاف الفاظ میں وہ باتیں کہہ جاتے ہیں جو ہر شخص نہیں کہہ پاتا۔ ان کی فکر بڑی واضح ہے، وہ خارجی ماحول کا بھرپور انداز میں جائزہ لینے اور تجزیہ کرنے کے اہل ہیں۔ نقوش کے 'طلوع' کے عنوان سے ان کی بعض تحریریں سماجی کیفیت کی عبرت انگیز عکاسی کرتی ہیں۔ یہ حضرت حالات کی بھٹی سے تپ کر

نکلے ہیں۔ یہ پرومیتھیس (PROMETHEUS) کی طرح کرب مسلسل میں گرفتار رہتے ہیں۔
اور اسی لیے نقوش کے ہر شمارے کو گزشتہ شمارے سے بہتر بنانے میں خون کو پانی کرتے ہیں۔
اردو شعر و ادب کے مستقبل کے لیے رجائی تعمیر کے لیے جد وجہد ہمہ وقت ان کے پیش نظر ہے۔
اس کی پاداش میں کتنا مالی نقصان اٹھایا ہے، اس کا اندازہ عام شخص نہیں لگا سکتا۔

طفیل ہر شخص کے سامنے نہیں کھلتے۔ اجنبی ہو تو ہوں ہاں اور جی سے آگے نہیں بڑھتے لیکن بے تکلف دوستوں کی موجودگی میں قہقہہ بھی لگاتے ہیں۔ ہنستے ہیں تو سارا جسم ہلنے لگتا ہے، چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے۔ میں نے انھیں اس وقت بیحد طول پایا ہے جب کوئی شخص مسلمانوں کی تہذیب کو گڑھے میں گرانے کی کوشش کرتا ہے یا ادب وشعر کی روایت کو رسوا کرنے پر تُل جاتا ہے یا ادب کو بد مذاقی پر محمول کرتا ہے۔

کیسا خوش گفتار، خوش اطوار، کیسا باکردار، ایڈیٹر کی حیثیت سے کیسا بلند قامت، کیسا مخلص، کتنا عالی حوصلہ، کس قدر ان تھک، کیسا باذوق، کیسا معقول و معتبر، کتنا خاموش طبع، لیکن کس قدر شفیق اور کیسا شریف النفس جسے ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ دنیائے ادب کے لیے یہ محمد طفیل ہے، محمد نقوش ہے لیکن میرا تو یہ بھائی بھی، محسن بھی اور دوست بھی!

واقعہ یہ ہے کہ عشق ایک ہی سے ہو سکتا ہے اور دوستی بھی ایک ہی سے ممکن ہے۔ غالب کو نہ پڑھا ہوتا تو انسانیت کے معنی و مفہوم سے ناواقف رہتا۔ رشید صاحب کی تحریروں کو نہ پڑھتا تو علی گڑھ کی اہمیت سے ناآشنا رہتا، طفیل صاحب سے نہ ملا ہوتا تو دوستی کی نعمت سے محروم رہتا۔

قد آور بونا

ڈاکٹر سلیم اختر

"شخصی مطالعے قربت اور دوری کی وجہ سے دھندلے اور روشن ہوتے ہیں۔ جتنی قربت ہوگی اتنی ہی تصویر دھندلی بنے گی جتنا فاصلہ ہوگا اتنی ہی واضح تصویر بنے گی۔ یہ کلیہ ہر معاملے میں ساتھ نہیں دیتا مگر پیش نظر کوئی شخصیت ہو تو پھر یونہی ہوگا۔ یوں سوچیں کہ قد آور شخصیت کے سامنے ایک بونا کھڑا ہے وہ اگر کسی کو سر سے پیر تک جانچنا بھی چاہے گا تو کیسے جانچے گا؟ فاصلہ ضروری ہوا نا! اگر شخصیت اور شخصیت نگار دونوں ہی قد آور ہوں گے تو پھر بے چاری شخصیت دم توڑ دے گی۔ شخصیت نگار اُسے پچھاڑ دے گا۔"

میں ایک بونا ہوں!

("جناب" کی بسم اللہ)

کلنٹے کی تول میں تُلی ان طرار سطروں کے لکھنے والے محمد طفیل (عرف محمد نقوش) سے ملیے تو ایک ڈھیلے ڈھالے شخص کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا شخص جس کے جسم پر سوٹ کبھی فٹ نہ آئے گا، جو آنکھ جھکا کر بات کرے گا اور جو گالیاں سُن کر شیرینی لب کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی طبعی جھجک کی وجہ سے بے مزہ نہ ہوگا لیکن ــــ اور یہ لیکن بہت بڑی ہے ــــ لیکن محمد طفیل یہ سب کچھ نہیں، یہ تو اس کے کیموفلاج کا ایک انداز ہے تاکہ کوئی اصل طفیل کو نہ دیکھ لے۔ یہ شخص جو نقوش کے دفتر میں کتابوں، کاغذات، کتابت شدہ مسودات اور گرد کے درمیان چائے کے گھونٹ بھرتا اور آنکھیں جھکا کر دھیمی دھیمی بلکہ کسی حد تک لجائی مسکراہٹ سے باتیں کرتا ہے نہایت سخت، دُھن کا پکا اور کیل ایسا نوکیلا شخص ہے۔ اگر وہ اپنی ذات کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا تو اس لیے نہیں کہ اس کی کوئی ذاتی زندگی نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ بہت کم لوگوں کو اپنے اعتماد کا اہل سمجھتا ہے۔ وہ خاموشی سے بیٹھا سب کی باتیں، ڈینگیں، الن ترانیاں اور غیبتیں سُنتا رہتا ہے اور شعوری طور سے دوسروں کو خود پر "چھا" جانے کا موقع دیتا ہے۔ لیکن یہ بہت گھنا ہے اسے باتوں سے شاید بہلایا تو جا سکے لیکن باتوں سے بیوقوف

نہیں بنایا جا سکتا۔

میری دانست میں اس کی سب سے اہم صفت۔ ایسی صفت جس پر اس کی شخصیت کی اساس استوار ہے۔ اس کا یک رُخہ ذہن اور انفرادیت پسندی ہے ویسے ان کے علاوہ وہ خود پسند بھی ہے اور انانیؔ پندار بھی رکھتا ہے۔ یہ سب شدید جذبات کو جنم دیتے ہیں لیکن محمد طفیل نے ان سے وابستہ نفسی توانائی کو ایک ایسے راستہ پر ڈالا کہ ان سب کی اعلیٰ ترین پیمانہ پر تسکین بھی ہوتی رہتی ہے اور پائیدان کی گرد کی مانند اسے اپنی انفرادیت کی گرد دوسروں پر جھاڑنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ میری مراد اس کے "نقوش" سے ہے۔

نقوش اور اس کے مدیر کے حق اور مخالفت میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ مجھے یہاں اس سے تعرض نہیں لیکن اتنا یقین ہے کہ محمد طفیل کی شخصیت کا اظہار اگر کسی چیز سے ہو سکتا ہے تو وہ "نقوش" ہے اور بقول ایک "ستم ظریف"

"انھوں نے اپنے بارے میں جب بھی غور کیا تو۔ ایک طفیل کے اندر دوسرا طفیل بھی چھپا ہوا پایا۔ ایک طفیل تو وہ ہے جس نے بزرگوں کا احترام کرنا سیکھا ہے، جو پڑھے لکھوں کے سامنے طالب علمانہ حیثیت میں بیٹھا ہے جس نے چھوٹوں اور بڑوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہا ہے اور اپنے آپ کو بالکل مبتدی جانا ہے۔

دوسرا طفیل مدیر نقوش ہے۔ جب یہ کرسیٔ ادارت پر ہوتے ہیں تو ان کا دماغ عرش پر ہوتا ہے اس وقت انہیں بڑے سے بڑے علامہ کی تخلیق میں بھی نقائص نظر آتے ہیں۔ اپنے ذہن کی اس خرابی کی بنا پر کئی بڑے بڑے لکھنے والوں کی چیزیں ناقابل اشاعت قرار دے کر واپس کر چکے ہیں۔"

("جناب" ص: ۱۴۷)

یہ سطریں طفیل نے خود اپنے بارے میں "مدیر نقوش" کے نام سے لکھی ہیں۔ خود نوشت تحریروں کا نفسیاتی مطالعہ اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور سود مند ہوتا ہے کہ تحت الشعور کی باتیں بنا جانے بوجھے باہر نکل آتی ہیں چنانچہ اس مضمون کا عنوان اس امر کا غماز ہے کہ طفیل اپنی سب سے اہم ترین خصوصیت نقوش کا مدیر ہونا سمجھتا ہے۔ بحیثیت ایک فرد اس میں اور بھی شخصی اوصاف ہوں گے مگر وہ ان سب پر "نقوش" کو فوقیت دیتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ:

"انہیں اپنے رسالے اور اس کے کام سے اتنا عشق ہے کہ کیا کسی عاشق کو اپنے محبوب سے ہوگا بلا مبالغہ انہوں نے اپنے ایک نمبر پر اتنی آتنی محنت کی ہے کہ ان کی جان پر بن آئی ہے آپ باور کریں یا نہ کریں۔ جن دنوں کوئی خاص نمبر زیرِ ترتیب ہوتا ہے تو ان کا دس بارہ پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے نہ وقت پر کھانا، نہ سونا، دن رات کام، صبح کے بیٹھے بیٹھے اگر رات کے ایک دو بھی بج گئے تو بھی انہیں کچھ پروا نہیں، بلکہ لگن میں مست ہیں۔" (ایضاً ص: ۱۱۸)

بلاشبہ محمد طفیل انفرادیت پسند ہے لیکن اس لحاظ سے خطرناک ہے کہ نقوش سے قطعِ نظر اُس نے شاید ہی کسی اور معاملہ میں اپنی انفرادیت کے اظہار کی کوشش کی ہو۔ ایسا انفرادیت پسند جو شعوری طور سے انفرادیت کا اظہار نہ کرتا ہو۔ اس کی صحیح پہچان خاصی مشکل ہو جاتی ہے اور محمد طفیل کا بھی یہی معاملہ ہوتا اگر اس نے شخصیت نگاری نہ کی ہوتی۔ یہ معروف ادبی شخصیات کے خاکے تو ہیں ہی لیکن اس کے علاوہ جب ہم شخصیت کے انتخاب، تعلقات کی نوعیت اور شخصیت کے سادہ خاکہ میں رنگ آمیزی کے انداز کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ سب دراصل محمد طفیل کی اپنی ذات کی توسیع کا ایک فن کارانہ انداز ہے اور یوں شخصیت نگاری خود محمد طفیل کی شخصیت کا آئینہ بن جاتی ہے لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو کہ محمد طفیل نے شخصیت نگاری صرف خود انعکاسی (SELF PROJECTION) کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ سب دراصل لاشعوری طور پر ہوتا ہے۔ جس طرح عام زندگی میں وہ خود کو چھپائے چھپائے رکھتا ہے اسی طرح ان مضامین میں بھی اُس نے خود کو پس منظر میں رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن جس طرح فلم میں پس منظر کی موسیقی نہ ہونے پر بھی اپنے وجود کا احساس کراتی رہتی ہے بلکہ اس مخصوص منظر کیفیات و تاثرات کا ایک لازمی عنصر بھی ہوتی ہے کچھ اسی طرح سے محمد طفیل کی اپنی شخصیت حجابات میں سے بھی رنگ افروز ہوتی نظر آتی ہے۔ نہ ہوتے ہوئے بھی ہونا۔ ایک ایسی فن کارانہ خوبی ہے کہ صرف ایک اسی کی بنا پر ہی محمد طفیل کو ان شخصیات نگاروں پر فوقیت دی جا سکتی ہے جن کے مضامین واحد متکلم میں اپنے حق میں ایک طرح کی خود کلامی SOLOLOQUI بن کر مضمون کو بعض اوقات قصیدہ در مدح خود قسم کی شے بنا دیتے ہیں۔

اپنی ہی تصنیف "صاحب" میں "اعترافِ جرم" کے سلسلہ میں محمد طفیل نے جن خیالات کا اظہار کیا ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعوری طور سے خود کو اوجھل رکھنے کی سعی کرتا ہے!

"طرزِ بیان میں خامی ہو تو ہو، شخصیتوں کے مطالعہ میں مجھ سے زیادہ

چوک نہیں ہوئی اور اس طرز بیان کو میں نے اس لیے اپنایا کہ میرے خام خیال میں ضروری ہے کہ لکھنے والا شخصیت میں گھسا ہوا نظر نہ آئے بلکہ شخصیت ہی رواں دواں دکھائی دے اگر مصنف خود کو لانے پر مجبور ہی ہو تو ایسے جیسے قمیص میں بٹن نہ کہ بٹن میں قمیص۔ اور ان مضامین میں میری "شخصیت" ایک وسیلہ محض۔!"

شاید عام زندگی میں محمد طفیل سردمہر، غیر جذباتی اور علائق سے لاتعلق نقوش کے تخت طاؤس پر براجمان نظر آتا ہو۔ اگر واقعی ایسے ہی محسوس ہوتا ہے تو یہ غالباً دوسروں کے شہر سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے لاشعوری قسم کا ایک دفاعی حصار ہے ورنہ ان مضامین سے اس محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو وہ اپنے احباب کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اور جس کا اعتراف اُس نے یوں کیا ہے:

"ویسے یہ کہہ دوں کہ جتنا پیار میں نے اپنے دوستوں سے کیا کم کسی نے کیا ہوگا میں نے دوستوں کے بارے میں جھوٹے مضامین نہیں لکھے کہ وہ اچھائیوں کا تاثر بھی ختم کر دیں۔ میرے دوست جیسے ہیں میرے مضمون بھی ویسے ہی ہیں میں نے اوروں کی طرح اپنے دوستوں کو مخصوں اور وہموں کے حوالے نہیں کیا۔ میری تحریر میں خامی ہو سکتی ہے میرے جذبہ میں نہیں۔" (مکرم۔ ص۔ ۱۴)

اسی "جذبہ" کا ثبوت احمد ندیم قاسمی پر لکھے گئے مضمون میں ملتا ہے جب بقول ان کے قاسمی صاحب کی گرفتاری کے بعد دفتر میں لگی ان کی تصویر اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو تصویر سے مجھے بولتی ہوئی محسوس ہوئی" "بس اتنی ہی محبت تھی" "میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔" (صاحب" ص ۶۸)

سوانح نگاری ہو یا خاکہ نگاری۔ بلکہ کسی بھی نوع کی شخصیت نگاری ہی کیوں نہ ہو لکھنے والے کے پیش نظر کچھ فنی اصول و ضوابط ضرور ہوتے ہیں بعض اوقات اسے خود بھی ان کا احساس ہوتا ہے اور یہ اس کے شعور اور فکر کے مرہون منت ہوتے ہیں لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو اور شخصیت نگار نے اپنے فنی نقطۂ نظر کا باضابطہ اظہار نہ بھی کیا ہو تو بھی ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر اس کی تحریروں اور شخصیات کی پیش کش کے انداز سے بھی کچھ اصولوں کا استخراج کیا جا سکتا ہے کسی بھی شخصیت نگار کا مطالعہ کرنے سے پہلے ان اصولوں اور مقاصد کے بارے میں معلومات کا ہونا بہت ضروری ہے جن کو پیش نظر رکھ کر وہ دوسروں کی شخصیت پر ایک خاص زاویہ سے روشنی ڈال کر اس کے ایک خاص رُخ کا انعکاس کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کے راہنما اصولوں کو جان کر خود شخصیت نگار کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اگر اس کے اصول و مقاصد ہی بنیادی طور سے غلط ہیں اور شخصیت نگاری کے

بارے میں خود اس کا اپنا نقطۂ نظر ہی غیر واضح، خام یا کمزور ہے تو اس کی پیش کردہ شخصیت کی تصاویر بھی درست نہ ہوں گی۔

اس نقطۂ نظر سے محمد طفیل کی تحریروں کا جائزہ لیں تو ان میں ایسے مواد کی کمی نہیں جن کی بناء پر اس کے نظریۂ شخصیت نگاری اور رہنما اصولوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں خاص طور سے وہ خط بے حد اہم ہے جو شاہد احمد دہلوی کو لکھا گیا اور "آپ"[1] میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ "آپ" "مکرم" میں بھی ایسے اشارات موجود ہیں جو اس کے نقطۂ نظر کی تفہیم میں ممد ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ خود اپنے نظریات کو "اوٹ پٹانگ" بتاتا ہے۔ اس کے بقول:

"شخصیت نگاری ہنسوں تے کی مگر تلوار کی دھار پر چلنا ان میں سے ہر ایک نے ضروری نہ جانا۔ واقعہ یہ ہے کہ شخصیت نگاری صرف اور صرف تلوار کی دھار پر چلنے کا نام ہے ایسی تلوار جس سے لکھنے والا بھی زخمی ہوتا ہے اور وہ بھی جو لکھنے والے کی زد میں ہو...... اس "کھیل" میں خود بھی زخمی ہوا، دوسروں کو بھی زخمی کیا۔ آخر میں خود زخمی ہونے یا دوسروں کو زخمی کرنے کا خطرناک کھیل کیوں کھیلتا ہوں؟ صرف اس لیے کہ کہیں شخصیت نگاری کے ضمن میں سچ بولنا گناہ نہ سمجھ لیا جائے۔

ویسے بھی جب سے ہم نے انسانوں کو فرشتہ بنایا، اصل شخصیتیں اوجھل ہو گئیں مہربانوں نے شائستہ کلمات کے وہ وہ غازے اور وہ وہ پوڈر تھوپے کہ اصل صورتیں خوردبین سے بھی نظر نہ آئیں۔ ہمارے محققین پتہ نہیں کیا کرتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ ایسی تمام شخصیتوں کے ہاتھ منہ دھلوا دیں تاکہ ہم ان کی اصلی صورتوں کو دیکھ سکیں میں نے اور گناہ کیے ہوں گے مگر یہ گناہ نہیں کیا کہ کسی کو خوش کرنے کے لیے کتاب المناقب لکھی ہو یا کسی کو خوف زدہ کرنے کے لیے کتاب المعائب!

یہاں یہ بات واضح کر دوں صرف عیب جوئی شخصیت نگاری ہی نہیں اور نہ ہی عیب پوشی کا نام شخصیت نگاری ہے۔ میرے نزدیک تو خوفِ خدا کے ساتھ فنکارانہ عکاسی کا نام شخصیت نگاری ہے........ میں تو ہر چیز کو اس کے اصلی نام

---

[1] "آپ"، ص: ۱۵۵ [2] بقول ان کے "مجھ سے ہاتو پیوں کی سلامی والا مضمون لکھا نہ جائے گا"۔ (مکرم۔ ص ۱۱)

سے پکاروں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شخصیت نگاری میں ذاتی خواہشوں اور عمل کے ٹکراؤ میں توازن کے برقرار رکھنے ہی کو میں فن سمجھتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے نزدیک سوئی کے ناکے میں سے اونٹ کو گزار دینا آسان ہے مگر ایک اچھا شخصی مضمون لکھنا مشکل ہے۔" ("چہرہ نمائی": "مکرم" ص: ۱۶ - ۱۰)

اسی ضمن میں "آپ" میں بھی بعض کار آمد اشارے ملتے ہیں مثلاً:

"میں نقاد نہیں کہ جہاں چاہوں ڈنڈی مار دوں ۔ میرا موضوع شخصیتوں کا مطالعہ ہے جس میں جھوٹ نہیں چلتا بلکہ کنواری لڑکیوں کی طرح اپنی لاجوں آپ مرنا پڑتا ہے۔" (ص: ۲۴)

"میری نگاہ اچھائیاں اور برائیاں دونوں دیکھتی ہے۔ اچھائیوں کا اظہار برملا کرتا ہوں، مگر برائیوں کے اظہار کے لیے پہلے جواز ڈھونڈتا ہوں پھر اشارۃً کچھ کہہ کر اپنا دامن بچا لیتا ہوں۔" (ص: ۱۳۵)

"شخصیت نگاری ایک ایسا موضوع ہے جسے میں اُستروں کی مالا کہا کرتا ہوں۔" (ص: ۱۵۶)

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ خاکہ نگار کو حقیقت نگاری سے آنکھیں نہ چرانا چاہئیں لیکن اس کے پاس ایسا حکمت آمیز قلم ہونا چاہیے کہ وہ کہے سب کچھ، مگر اس ڈھب سے ہر قدم پر سمجھا سمجھا کے انجان بنتا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خاکہ نگاری میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری مراد توازن سے ہے۔" (ص: ۶۰ - ۱۵۹)

اور ان کے ساتھ "صادقین" کے بارے میں مندرجہ ذیل سطور بھی قابلِ توجہ ہیں:

"کسی سے بھی یاری اس وقت تک نہیں نبھائی جا سکتی جب تک کہ اس کے دماغ کو اپنے دماغ میں رکھ کر سمجھا نہ جائے، اسی طرح سوچا نہ جائے، اسی طرح برتا نہ جائے، اگر یوں نہ ہوگا تو بات چیت اس شخص کے بارے میں نہ ہوگی جو مرکزِ توجہ ہوگا بلکہ کسی اور ہی شخص کے بارے میں ہوگی۔ اب یہ اتنا کڑا امتحان ہے کہ جس پر پورا اترنا نہ مجھ سے پہلے کسی کے بس میں تھا اور نہ میرے بس میں ہے۔ پہلے شخصیت نگاروں نے اس مسئلے کو دال برابر جانا میں نے اسے

گھر کی مرغی سمجھا"۔ (نقوش، سالنامہ جولائی ۱۹۷۳ء)

ان منتشر فقرات کی ترتیب نو سے میرے خیال میں محمد طفیل کے نظریات کو سمجھنا مشکل نہیں رہتا وہ نظریات جنہیں اس نے ایک موقع پر "عجیبٹ" سے تعبیر کیا۔ یہ نظریات ایک ایسی شخصیت کے عکاس ہیں جو صلح پسند، منکسر المزاج اور متوازن ذہن کی حامل ہے جس طرح محمد طفیل کو زندگی میں افراط و تفریط ناپسند ہے اسی طرح وہ شخصیت نگاری میں بھی غلو اور انتہا پسندی سے متنفر ہے اسے اپنے احباب سے جو پیار ہے اس کی بنا پر وہ ان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں سے بھی پیار کرتا ہے اور ان کا پیار بھرے انداز میں یوں تذکرہ کرتا ہے۔ اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گزارنا ناممکن ہے لیکن وہ غلو میں بھی خلوص نیت کی بنا پر یہی کام کیے جا رہا ہے۔ اسے اپنے "جذبہ" پر اعتماد ہے اور اسی لیے پھول کی پتی سے ہیروں کی جگر کاوی میں مگن ہے اس کا سب سے بڑا انعام دوسروں کی ستائش نہیں بلکہ تکمیل کا وہ احساس ہے جو فن کارانہ کاوش کا اعلیٰ ترین ثمر ہوتا ہے۔

محمد طفیل اس لیے شخصیت نگار نہ بنا کہ "نقوش" کی وجہ سے بڑے بڑے ادیبوں سے ملاقات تھی اور یہ کہ جو الٹا سیدھا لکھا اس کی طباعت کے لیے "نقوش" ایسے پرچے کے صفحات حاضر تھے ایسا نہیں ہے کیونکہ مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ اس مشکل فن کی تکنیکی باریکیوں سے باخبر ہی نہیں بلکہ اس ضمن میں دوسرے ناقدین کے اقوال زریں جمع کرنے کے برعکس اپنے ذاتی خیالات رکھتا ہے ان سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی معقولیت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خیالات اس لحاظ سے اہم ہیں کہ اس کا فن ان کی تفسیر پیش کرتا ہے کہ اس کے بقول:

> "حرکات و سکنات، عادات و اطوار، کرامات و انکشافات کے ذکر سے پہلے ضروری یہ ہے کہ ہم ممدوح کی سوچوں کو پکڑیں اگر یوں نہ ہوگا تو اس مضمون میں صرف شخصیت کا خول نظر آئے گا، شخصیت کی روح نظر نہ آئے گی۔"
>
> (نقوش: ۱۱۸، جولائی ۱۹۷۳ء)

محمد طفیل نے اپنی پہلی کتاب "صاحب" میں "اعتراف جرم" کرتے ہوئے نیم مزاحیہ انداز میں اپنی شخصیت نگاری کے بارے میں یوں لکھا تھا:

> "قاضی جی جب شہر کے اندیشے میں دُبلے ہوئے تھے تو اس بچارے نے بھی میری ہی طرح سوچا تھا۔ مجھے بھی جب شخصیت نگاری کا میدان قریب قریب

لہ "آپ" ص: ۱۵۶

سنسان نظر آیا تو میں نے شخصی مضامین لکھے اگر مجھے شعری ادب ڈربا نظر آتا تو شعر کہتا اگر تنقید میں ہُو کا عالم دیکھتا تو اس صنف میں بھی لوہا منوا کر رہتا اس لیے کہ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔"

یہ دعویٰ اُس نے ۱۹۵۵ء میں کیا تھا اور اب ۱۹۷۳ء ہے۔ اس دوران میں وہ صاحب، جناب، آپ، محترم اور مکرم۔ پانچ کتابیں دے چکا ہے۔ ان میں سے "محترم" سے قطع نظر بقیہ چار کتابوں میں ۷۳ شخصی مضامین ہیں۔ صرف تعداد کی بنا پر ہی اس کا پلّہ بھاری نہیں بلکہ معیار، اسلوب اور تکنیک کی بناء پر بھی وہ اپنے لیے ایک منفرد مقام بنا چکا ہے۔ محمد طفیل کی انفرادیت تسلیم کرانے کو صرف یہی ایک بات کافی ہے کہ یہ واحد ادیب ہے جس نے خود کو صرف شخصیت نگاری کے لیے وقف کر رکھا ہے بلکہ میں تو اس حد تک جانے کو تیار ہوں کہ "گذشتہ دہائی میں خاکہ نگاری میں جو خصوصی ترقی نظر آتی ہے اس کی یہ وجہ نہیں کہ بہت سے اچھا لکھنے والوں نے اس طرف خصوصی توجہ کی بلکہ اس لیے کہ صرف ایک ہی اچھا لکھنے والے نے اسے مرکزِ توجہ بنائے رکھا۔"[1] اور وہ ہے محمد طفیل!

بحیثیت مجموعی محمد طفیل کے مضامین کی تین اقسام کی جا سکتی ہیں (۱) طویل مضامین (۲) خاکے اور (۳) منی خاکے۔!

طویل مضامین خاکہ نگاری کے مروج انداز سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں۔ ان میں شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کا عہد اور اس سے وابستہ اور بہت سی شخصیات بھی زیرِ بحث آ جاتی ہیں۔ اگر ہم خاکہ کو کلوز اَپ سمجھیں تو یہ طویل مضامین سینما اسکوپ قسم کی چیز قرار دیئے جا سکتے ہیں اس لیے ان میں شخصیت اس کا پس منظر، پیش منظر اور دیگر جزئیات اور متنوع تفصیلات بھی ملتی ہیں اس ضمن میں "مکرم" میں شامل شاہد صاحب اور حکیم صاحب اور "آپ" میں شامل جوش ملیح آبادی اور اختر اورینوی وغیرہ کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان مضامین میں محمد طفیل نے کسی ماہر ناول نگار کی مانند اپنے قلم سے ہر نوع کی تفصیلات اور باریکیوں کو لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ طوالت کے باوجود وہ تکرار و تواردسے دامن بچائے رکھتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس فنی رمز سے آشنا ہے کہ کسی بات، واقعہ یا موقع کی تفصیلات دلچسپ ہیں اور کس کی کم! اس لحاظ سے وہ ان کے تذکرہ میں الفاظ کی کمی یا زیادتی کو ملحوظ رکھتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں طوالت کے باوجود بھی مضمون بے ہنگم

---

[1] "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" ص: ۲۲۶

نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے قلم کا فوکس شخصیت پر ہی رکھتا ہے۔ یوں تمام تفصیلات شخصیت کے مدار پر گردش کناں ملتی ہیں اور اس لیے مضمون بد آہنگ نہیں ہوتا۔

خالص خاکہ نگاری کی ذیل میں آنے والے مضامین میں بھی طوالت کی دو سطحیں نظر آتی ہیں مثلاً مولوی عبدالحق، پطرس، اختر شیرانی، شکیلہ اختر، منٹو، ندیم، شوکت تھانوی، جگر، فراق، عابد علی عابد، احسان دانش، کرشن چندر، اور نیاز فتح پوری پر لکھے گئے مضامین نسبتاً طویل ہیں جبکہ قاضی عبدالغفار، یگانہ، مجاز، ڈاکٹر محمد باقر، حمید احمد خاں، میرزا ادیب، بلونت سنگھ، عشرت رحمانی، ظہیر کاشمیری، قدرت اللہ شہاب، قیوم نظر، ابراہیم جلیس، سیف الدین سیف، اے حمید، اشفاق احمد، انتظار حسین اور ناصر کاظمی کے خاکے بہت مختصر ہیں۔ بس دو تین صفحات!

خاکے اور عام شخصیت نگاری میں وہی فرق ہے جو افسانہ اور ناول میں ہے۔ جس طرح ایک کامیاب افسانے میں افسانہ نگار تمام جزئیات اور تمام تفصیلات سے کام نہیں لیتا بلکہ حسنِ انتخاب سے چند ایسی انوکھی یا چونکا دینے والی جزئیات کی یوں ترتیب نو کرتا ہے کہ ان کے تناظر میں فرد اور زندگی با اندازِ نو رنگ افروز ہوتی ہے بعض اوقات وہ زندگی کی ایسے زاویئے سے ایک ہی جھلک دکھاتا ہے مگر وہ ایسی جھلک ہوتی ہے کہ زندگی کی تمام گہرائیاں اور رنگینیاں اس میں سمٹ آتی ہیں بالکل یہی حال خاکہ کا ہے کہ اس میں بھی ناول کے برعکس اور افسانہ کی مانند پھیلاؤ نہیں بلکہ اٹھاؤ نظر آتا ہے یہ قدِ آدم تصویر نہیں بلکہ ایک انوکھے زاویہ سے چہرہ کی یک رخی تصویر (PROFILE) ہے۔ اس میں شخصیت کا کوائف نامہ مرتب نہیں ہوتا بلکہ چند جھلکیوں سے شخصیت کی ہمہ گیری کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ الغرض! اگر سوانح نگاری مثنوی ہے تو اس کے مقابلہ میں خاکہ غزل کا شعر ہے جو اپنی ایمائیت سے ایجاز کا اعجاز بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

ہمارے ہاں خاکہ نگاری کا مزاج اور انداز وہی ہے جس کی اساس ترقی پسندوں نے رکھی تھی چنانچہ منٹو، کرشن چندر اور عصمت چغتائی وغیرہ نے تیز طرار زبان سے خاکہ کو بارہ مصالحہ کی چاٹ بنا دیا عصمت چغتائی کا اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر خاکہ "دوزخی" تو اس انداز کی خاکہ نگاری میں کلاسک کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ جب کہ "گنجے فرشتے" اور "لاؤڈ اسپیکر" میں منٹو نے بڑے بڑوں کے بخیئے ادھیڑے ان کا یہ شوخ و شنگ انداز ایسا مقبول ہوا کہ بعد میں آنے والوں کے لیے ان کی پیروی لازم ٹھہری۔ منٹو اور عصمت تو اپنے اپنے انداز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی! انہوں نے جو لکھا اچھا لکھا اور جیسے لکھا خوب لکھا مگر ان کے مقلدین ابھی تک ان ہی کی پیروی میں لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن نئی شعور کی

ناپختگی کی وجہ سے بالعموم نتیجہ:

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

سا نکلتا ہے۔ لیکن محمد طفیل نے شعوری طور سے خود کو اس روش سے بچانے کی کوشش کی ہے اور اس کی خاکہ نگاری کو اس رجحان کا ردِ عمل بھی قرار دیا جا سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ تو دوسروں کو شرمسار کرنا چاہتا ہے کہ یہ سب اس کے ایسے احباب ہیں جن سے اُس نے محبت کی اور پھر اُس کا اندازِ نظر بھی تو کچھ ایسا ہی ہے:

"اچھی باتیں تو سب کے منہ سے اچھی لگتی ہیں بُری باتوں کو اچھے اندازمیں کہہ دینا بھی تو فن کہلاتا ہے"۔ ("آپ" ص ۱۵۹)

اسی طرح کے خیالات "مکرّم" میں بھی ملتے ہیں:

"صرف عیب جوئی شخصیت نگاری نہیں اور نہ ہی عیب پوشی کا نام شخصیت نگاری ہے میرے نزدیک تو خوف خدا کے ساتھ فن کارانہ عکاسی کا نام شخصیت نگاری ہے"۔ (ص ۱۵)

اسی لیے اپنے ان مضامین میں اس نے نمک پاشی تو کی لیکن پوسٹ مارٹم سے گریز کیا۔ اس فن میں اس کا اندازِ بیان "متین شرارت" کا ہوتا ہے۔ اس کے پاس موزوں الفاظ کا وافر ذخیرہ ہے جن سے کام لے کر وہ ناگفتنی کو گفتنی بنانے کی خاص صلاحیت رکھتا ہے۔ مثلاً نیاز فتح پوری کے ضمن میں لکھا:

"جہاں تک میں نیاز صاحب کی تحریروں سے اندازہ کر سکا وہ تو یہی کچھ ہے کہ ابتدائی زندگی انہیں بڑی پابندیوں اور بڑی گھٹر کیوں کے سے ماحول میں بسر کرنی پڑی مگر جب عمر ایسی لگی جس میں ذہنی نشاط کی قیمت معلوم ہوتی ہے تو پھر انہوں نے غسل کی حاجت کو عیب کا درجہ دینا بند نہ کیا"۔ ("آپ" ص: ۱۰۴)

مصطفیٰ زیدی کے بارے میں لکھا:

"یہ جو مضمون میں یہاں پڑھ رہا ہوں یہ کوئی اصلی تھوڑا ہے اصلی مضمون تو یار دوستوں میں بیٹھ کر زبانی ہی سُنا سکتا ہوں یہاں آکر میں نے ایسی بے تکلفی برتی تو آپ بھی مجھ سے ناراض ہو جائیں گے اور زیدی صاحب بھی۔ لہٰذا میں آپ کی خوشنودیٔ طبع کے لیے نقلی مضمون پڑھوں گا"۔ ("مکرّم" ص: ۲۰۰)

محمد طفیل کو زبان پر عبور حاصل ہے اور الفاظ کا مزاج داں ہے اس لیے ایسے مواقع پر اس کا

تمام تر انحصار زبان پر ہوتا ہے۔ بہت کم خاکہ نگاروں نے طفیل کے انداز میں زبان کو پردہ دری کا ذریعہ بنانے کے بہانے یوں پردہ دری کی ہوگی۔ ثبت سے منفی کا پہلو نکالنا یہ محمد طفیل کے اسلوب کی اہم ترین خصوصیت ہے لیکن اس سے قطع نظر بھی اُس نے شخصیت کے خدوخال اُبھارنے کے لیے ہمیشہ موزوں ترین الفاظ کا سہارا لیا ہے۔

صرف چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو جائے گا: "جناب" میں انہوں نے لکھا:

"پطرس نے جب بھی لکھا لفظوں کے تاج محل بنائے" (ص: ۲۱)

قیوم نظر کے بارے میں یہ لکھا:

"زندگی میں ان کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئی ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بھی کبھی کبھی شعر مکمل کرنے کے لیے دوسرا مصرع کہہ ڈالا ہے۔" (ص: ۱۸۴)

انتظار حسین کے بارے میں لکھا:

"یہ دو دھاری تلوار ہیں۔ دوستوں سے بھی ہنس ہنس کے بات کریں گے اور دشمنوں سے بھی، معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ باتیں کس کھاتے میں سے پیش کی جا رہی ہیں۔" (ص: ۱۹۸)

"صاحب" میں شوکت تھانوی کے بارے میں لکھا:

"شوکت صاحب کی ناراضی ایک دم بلب کا فیوز ہونا ہوتی ہے لیکن اس کے بعد خود ان کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے گھپ اندھیرا نہیں رہ سکتا۔" (ص: ۹۴)

عابد علی عابد کے بارے میں:

"یہ دشمنوں کے پکے دشمن اور دوستوں کے دوست تھے۔ اگر طبعاً جذباتی نہ ہوتے تو دوستوں کے پکے دوست بھی ہوتے۔" (ص: ۱۷۵)

"مکرم" میں شاہد احمد دہلوی کے بارے میں:

"ہٹ کے پکے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شوربے کو چپاتی چوس نہ سکی۔" (ص: ۳۹)

محمد طفیل شخصیت کے باطن میں بھی جھانکتے ہیں لیکن اس مقصد کے لیے وہ تیز فقرات اور چبھتے ہوئے لہجے سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ اپنے اصول کے مطابق سچ بھی بولتا ہے لیکن دوسروں کے ڈھول کا پول کھولنا ضروری نہیں سمجھتا اس ضمن میں اس کا انداز یہ ہے کہ شخصیت کی خامیاں

تو اُجاگر کر دی جائیں لیکن اس کی فطرت کی کجی سے تعرض نہ کیا جائے کہ یہ قدرت نے ودیعت کی ہے۔ (لیکن منٹو اور عصمت کا برعکس رویہ تھا یعنی وہ فطرت کی کجی کو بطورِ خاص اُجاگر کرتے تھے) اس مقصد کے لیے بھی طفیل، منٹو کی مانند BLUNT ہو کر لٹھ نہیں مارتے بلکہ اپنے نرم نرم اسلوب سے کام لیتے ہیں۔ اس کے اسلوب کی بحیثیت مجموعی سب سے اہم صفت شگفتگی کے ساتھ بات کرنے کا وہ بھولا بھالا لہجہ ہے کہ سب کچھ کہہ جانے پر بھی ——— محسوس یہ ہوتا ہے گویا کچھ کہا ہی نہیں یوں ان کی سادہ نگارش اگر ایک طرف تہہ در تہہ جذبات و احساسات کی ترجمان بنی تو دوسری طرف جوہرِ ہنر کی مظہر! اس نے خود بھی لکھا تھا:

"میں نے چاہا ہے کہ عام بول چال اور بہت ہی سادہ سے اسلوب میں چہروں کی نقاب کشائی کرتا جاؤں"۔ (صاحب)

محمد طفیل کے خاکوں میں ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کی طرف غالباً اب تک کسی ناقد نے بطورِ خاص توجہ نہ دی اور وہ ہے افراد کی گفتگو کو بعینہٖ ان کے لب و لہجہ میں قلم بند کرنا اور خاکہ نگاروں نے بھی گفتگو قلم بند کی ہوگی لیکن شاید ہی کسی نے محمد طفیل کی مانند اسے خاکہ نگاری کے لوازم میں سمجھتے ہوئے اس پر بطورِ خاص توجہ دی ہو اس لیے طفیل کے بہتیرے خاکوں میں سیرت و صورت کی نقاب کشائی ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے مخصوص الفاظ، تکیہ کلام اور لہجہ کے مخصوص آہنگ کے ساتھ بات چیت کرتے نظر آتے ہیں۔ جو شخص خود کم گو ہو لیکن وہ دوسروں کی گفتگو کو ٹیپ ریکارڈر کی طرح محفوظ کر لیتا ہو یہ بذاتِ خود ایک اہم نفسیاتی نکتہ ہے۔

شکیلہ اختر کی گفتگو یوں ہے:

"ہم تجا (سمجھا) صبح اُٹھی تو طبیعت خراب تھی ہم تجا، تھوڑی سی چائے پی۔ ہم تجا۔ دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا ہم تجا"۔ ("جناب": ۷۴)

منٹو یوں نتارتے تھے:

"کل آپ نے فلاں صاحب کے آگے کیا بکواس کی تھی! میری جان! میرے اور اس کے تعلقات اور قسم کے ہیں۔ معاف کرنا وہ بھی حرامزادہ، میں بھی حرامزادہ پر آپ کو کیا پڑی تھی کہ وہی بات آپ اس سے بھی کہہ دیں جو میں نے آپ سے چھپا کر کہی تھی، ویسے میں ڈرتا تو نہیں ہوں، وہ میرا کیا کرے گا میری جان! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ معاف کرنا آپکو پتہ نہیں کہ آپنے بڑی کمینہ حرکت کی ہے۔ جب

میں نے سنا تو کباب ہو گیا میری ...." ("صاحب" ص : ۲۰)

اور جوش صاحب کا لیکچر :

"مسلمانوں نے تجارت شروع کر رکھی ہے نمازیں پڑھو، روزے رکھو، جنت ملے گی اس تاجرانہ ذہن کو ختم کرنے کی ضرورت ہے اچھے کام اس لیے کرنے چاہئیں کہ اس سے اپنا اور دوسروں کا بھلا ہوتا ہے کانوں کی معرفت بڑا زہر پلایا گیا ہے جہاں تک ہو سکے آدمی کو مذہب سے دور رہنا چاہیے اور اگر کوئی مذہب قبول کرنا پڑے تو اسلام قبول کرنا چاہیئے اس لیے کہ اس میں سب سے کم وہم ہے ......" ("آپ" : ص ۱۱۳)

گفتگو کو بعینہٖ قلم بند کرنے کی معنویت سے ایک اور معنویت نے بھی جنم لیا ہے اور وہ ہے کامیاب مکالمہ نگاری، اس معاملہ میں طفیل نے بالکل ایک ماہر ڈرامہ نگار کے انداز میں نہ صرف کامیاب مکالمے ہی لکھے ہیں بلکہ ان سے مضمون میں افسانہ کی چاشنی بھی پیدا کر دی طوالت کی بناء پر مثالیں نقل کرنے سے گریز کرتے ہوئے صرف بعض خوبصورت مثالوں کی نشان دہی پر اکتفا کروں گا۔ "جناب" (ص ۵۲، ۷۶) "آپ" (ص : ۵۲، ۹۲) "مکرم" (ص : ۵۲)۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں ورنہ برجستہ اور برمحل مکالموں کی ان مضامین میں کمی نہیں۔ محمد طفیل نے ان مکالموں کو کیوں کر شخصیت سے آمیز کیے رکھا ہے اس لیے یہ بھی ایک طرح سے اس نقاب کشائی کی ذیل میں ہی آجاتے ہیں۔

ایک اور خصوصیت بھی قابل توجہ ہے اور وہ ہے بعض مضامین کا اچانک اور خوبصورت افسانوی اختتام! اور کمال یہ ہے کہ طفیل شعوری طور سے خاکہ کو افسانہ بنانے کی کوشش نہیں کرتا لیکن ان میں جہاں خوبصورت افسانوی ٹچز ملتے ہیں وہاں بعض اوقات اختتام بالکل افسانوی ہوتا ہے۔ مثلاً ظہیر کاشمیری کا خاکہ یوں ختم کیا ہے :

"ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مشاعرے میں ہوٹ ہو گئے۔ سخت پریشان ہوئے کہنے لگے "دوستو! میں آج تک ہوٹ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ لوگ اپنی ہوٹنگ واپس لے لیں!"

"بیٹھ جاؤ۔"

"ہائیں!"

("جناب" : ص : ۱۷۴)

پطرس بخاری پر مضمون یوں ختم کیا :

"یہ مانگے تانگے کا مضمون ہے اس بلیے میں نہیں کہتا "مستزاد ہے میرا فرمایا ہوا۔" (جناب ص: ۱۳۲)

اور شکیلہ اختر پر یوں:

"یہ سنجیدہ ہیں، وہ بھی اس، براہِ راست رسولِ مقبولؐ کی چودھویں پشت میں، اس لیے قلم رکھتا ہوں توبہ استغفار کرتا ہوں۔" ("جناب": ۹۲)

موت کے بعد منٹو کے قلم سے عالم بالا سے ایک خط لکھوایا گیا جس پر خاکہ کا اختتام ہوتا ہے۔ اس کی آخری سطریں یوں ہیں:

"...... اتنے بڑے ہوکم (یعنی خدا) کے سامنے اتنا کہہ دیا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ تمہارے ہاں ایسی کوئی کھری بات ذرا سے وزیر اعظم کے سامنے کہہ دیتا تو میری زبان گدّی سے نکلوا دی جاتی۔ باقی اللہ اعلیٰ عرض ہے یہاں میری کتاب "گنجے فرشتے" کافی پسند کی گئی ہے ہوسکے تو میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔" ("صاحب" ص: ۴۸)

محمد طفیل نے خاکہ نگاری میں ایک جدت یہ کی کہ نہایت ہی مختصر الفاظ میں بھی خاکے لکھے جنھیں "منی خاکے" کہنا زیادہ مناسب ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں شخصیت کی اساسی صفات کو نمایاں کر دینا کمالِ فن ہے اور انہیں پڑھ کر یوں تعجب بھی ہوتا ہے کہ یہ اسی محمد طفیل کے ہیں جس نے حکیم یوسف حسن پر ۳۰ صفحات کا طویل و عریض مضمون قلم بند کیا اب ہی طفیل ان منی خاکوں میں گنتی کی چند سطروں کی امداد سے یوں تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ منی خاکے "محترم" میں ہیں۔ "محترم" دراصل ایک سفر کی رُوداد ہے جس میں ہمسفروں کا بیان بھی ہے اور شہروں کا حال بھی! اور بیچ میں۔ آٹے میں نمک کی مانند بعض حضرات کی ننھی منی تصویریں بھی ملتی ہیں۔ یوں "محترم" نے دہوں کے البم کی صورت اختیار کر لی:

جمیل الدین عالی:

"ڈکٹیٹرانہ شان رکھنے والے مگر مصلحت آمیزی میں طاق، معاملہ فہم مگر ضد کے بادشاہ، مخلص اتنے کہ مسکرا مسکرا کے رجھا دیں، حاب دار اتنے کہ اصول شرما جائیں۔ رائٹرز گلڈ کے ناخدا مگر خود گلڈ کی دریافت! نام نامی جمیل الدین عالی اور ساتھ ہی ایک بے حد معتبر آدمی! اس معتبر آدمی کے جو لوگ قریب ہیں وہ کہتے ہیں کہ بہت اچھے آدمی ہیں یہ۔"

دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی کہہ دے سہرا!

صرف اس ایک مثال سے ہی ان ہی خاکوں کی کاٹ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر اسی انداز کے اور خاکے بھی لکھے جائیں تو یہ خاکہ نگاری میں ایک طرح کی خوبی ہی نہ ہوگی بلکہ خوب سے خوب تر کے متلاشی محمد طفیل کے لیے ایک چیلنج بھی! یہ چیلنج والی بات اس لیے ضروری ہے کہ وہ خود اپنے لیے بھی چیلنج تلاش کرتا رہتا ہے۔

میں اس بات کی محمد طفیل کی خود نوشت مثال سے وضاحت کرتا ہوں:

"ابھی یہ چار پانچ برس ہی کے ہوں گے کہ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنی خوب گت بنوائی، روئے، چیخے اور کپکپائے، گھر والوں نے جناب کی یہ حالت دیکھی تو بھڑوں کے چھتے کو جلا ڈالا۔ کوئی دو مہینے بعد بھڑوں نے پھر وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ انھوں نے دوبارہ چھتے میں ہاتھ ڈال کر اپنا حلیہ حسب سابق بنا لیا۔ آج جب کہ اس واقعہ کو بیس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی عادت ترک نہیں کی۔"

("مدیر نقوش"۔ "جناب"۔ ص: ۹۶)

— تو کیا آج چھتے اور بھڑیں نہیں ہیں؟

المعروف محمد نقوش

فارغ بخاری

کچھ لوگ بہت دیر سے آتے ہیں اور بہت آگے نکل جاتے ہیں، ادبی دنیا میں جو چند ایک ایسی مثالیں ملتی ہیں محمد طفیل کا نام ان میں ایک معقول اضافہ ہے۔ جنسی جذبے کی طرح تخلیقی جذبہ بھی بڑا سرکش ہے، اسے جتنا دبایا جائے اتنی ہی قوت سے ابھرتا ہے تو تمام حد بندیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔

محمد طفیل جو اپنے وقیع جریدے "نقوش" کی مقبولیت کے سبب محمد نقوش کہلانے لگا ہے ایک عرصہ تک نجانے اس جذبے کو کیسے سینت سینت کر رکھتا اور اندر ہی اندر پالتا رہا۔ میری اس سے اس وقت سے سلام دعا ہے جب وہ نہ مدیر تھا نہ مصنف بلکہ صرف ایک ناشر تھا اور ایبک روڈ کی ایک چھوٹی سی دکان میں کتابوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کی اس سے پہلے کی زندگی کے متعلق میں ذاتی طور پر کچھ نہیں جانتا۔ سنی سنائی کہانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ناشر کے مقام تک پہنچنے کیلئے بھی اسے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے اور ایک محنت کش کا جرأت مندانہ کردار ادا کرنا پڑا۔ میری ملاقات اس سے اسی ٹیڈی قسم کی دکان پر ہوئی تھی جس پر ادارہ فروغ اردو کا بورڈ اب بھی آویزاں ہے اور آثارِ قدیمہ کے طور پر یہ دکان اب بھی اسی ہیئت کذائی کے ساتھ موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت وہاں ملک کے چوٹی کے ادیبوں، شاعروں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور اب یہ رونق نقوش پریس میں منتقل ہو گئی ہے۔

مجھے طفیل کی اس دکان سے ایک گونہ ذہنی لگاؤ ہے کہ بیشتر ادبی شخصیتوں سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، وقار عظیم، عبادت بریلوی، جگر مراد آبادی، تاثیر مرحوم، سید عابد علی عابد اور بہت سے دوسرے اہل قلم سے اسی دکان میں مجھے متعارف ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ یہ قیام پاکستان کے بعد کی بات ہے اس وقت مجلہ نقوش کا اجرا ہو چکا تھا۔ احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں یہ ادبی پرچہ اپنے آغاز ہی میں ادبی حلقوں کا محبوب نمائندہ بن گیا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے میرے عقیدت مندانہ تعلقات کا آغاز تقسیم ملک سے بہت پہلے ہو چکا تھا، ایک عرصہ تک

خط و کتابت رہی پھر وہ پشاور ریڈیو سٹیشن پر سکرپٹ رائٹر ہو کر آئے اور پُورے تین برس تک یہاں ان سے شب و روز کا ساتھ رہا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کا اعلان ہم نے ایک ساتھ سنا ان دنوں وہ میرے ہاں مقیم تھے۔ یہ اعلان سُن کر ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اگلے روز میں اور قاسمی صاحب مسلم لیگی لیڈر خان عبدالقیوم خان کو (جو ہمارے پڑوس میں رہتے تھے) مبارکباد دینے گئے۔ میں نے قیوم خان سے قاسمی صاحب کا تعارف کرایا وہ سرسری طور پر ہاتھ ملا کر دوسرے لوگوں سے باتوں میں لگ گیا یعنی کوئی لفٹ ہی نہ دی، میں قاسمی صاحب کو اس بدذوق انسان کے پاس لے جا کر اس قدر پشیمان ہوا کہ میری ساری خوشی کافور ہو گئی۔ آج تک قاسمی صاحب سے مل کر اپنی اس حماقت کو یاد کرتا ہوں تو ہم دونوں خوب ہنستے ہیں۔

ہاں، تو بات نقوش کی ہو رہی تھی، اُنھی دنوں اس کے ایک شمارے میں فسادات کے متعلق منٹو مرحوم کا ایک افسانہ "کھول دو" شائع ہوا جس کی بنا پر نقوش کا وہ پرچہ ضبط کر لیا گیا اور چھ ماہ کے لیے اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی اس کے ساتھ ہی ماہنامہ "ادب لطیف" اور "سویرا" کو بھی بعض قابلِ اعتراض مضامین کی اشاعت کے باعث چھ ماہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ حکومت کے اس ادب دشمن اقدام کے خلاف میری نظم "فن کار کہاں جائیں؟" کا بڑا چرچا ہوا یہ نظم ہمارے ادبی جریدے "سنگِ میل" پشاور میں چھپی اور پھر ملک کے بیشتر پرچوں میں نقل کی گئی، مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے مجھے وارننگ دی اور پُورے دو ماہ تک پولیس افسروں نے خاصا پریشان کیے رکھا۔

نقوش کے اس ممنوعہ پرچے کی روداد یہ ہے کہ ادھر پرچہ چھپ کر آیا ادھر اطلاع مل کر حکومت کا عتاب نازل ہونے والا ہے۔ طفیل نے راتوں رات دوستوں کی مدد سے جس طرح ایمان کی حرارت والے ایک شب میں مسجد کھڑی کر دیتے ہیں اس طرح پرچے کی بائنڈنگ بھی کرائی، مل جل کر پیکنگ بھی کی، ایڈریس بھی لکھے اور نہ صرف مقامی پرچے تقسیم کرا دیے بلکہ پورے ملک میں پرچہ پہنچا دیا اور جب صبح پولیس نے چھاپہ مارا تو سوائے چند پرچوں کے اسے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

یہ اس شخص کی مستعدی کی ایک ادنیٰ مثال ہے جو بظاہر بڑا کاہل، مضمحل اور سست الوجود دکھائی دیتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ طفیل کو اس وقت اپنی ہزاروں روپے کی رقم کے ضائع ہونے کی اتنی فکر نہ تھی (لازماً وہ بھی ہو گی) جتنا یہ غم تھا کہ پرچہ مستحق لوگوں تک

پہنچ کر محفوظ ہو جاتے۔

ویسے طفیل کے لیے یہ سانحہ کوئی نیا نہیں تھا اس سے پہلے منٹو پر اس کے افسانوں ٹھنڈا گوشت' اور کالی شلوار' کے سلسلے میں جو مقدمے چلے وہ اس کی ضمانت دے کر یہ عذاب بھگت چکا تھا جن کی تفصیل اس نے منٹو کے خاکے میں اپنے منفرد انداز میں لکھی ہے اسے منٹو کی افتاد طبع کا پتا تھا اس کے لاابالی پن کو بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا اور اس کی غیر ذمہ دارانہ عادات سے بھی بخوبی واقف تھا اس کے باوجود اس نے اس کی ضمانت دینے کا خطرہ مول لیا اور ایک عرصہ تک اس کی سزا بھگتتا رہا، اس لیے کہ اسے منٹو کے مقام کا احساس تھا اور اس کے دل میں منٹو کی اتنی قدر تھی کہ وہ اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھا اور یہ اس ملک میں جہاں ہم بس رہے ہیں یقیناً بہت بڑی بات ہے۔

وہ پہلی دفعہ میرے دوست مبارک علی کے ساتھ پشاور آیا اور میرے ہاں قیام کیا۔ گرمی کا موسم تھا دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے لڑکے کو دو سیر آم لانے کے لیے کہا۔ طفیل معنی خیز طور پر مسکراتے ہوئے بولے:

"دو سیر آموں سے کیا ہوگا؟"

میں نے پوچھا: کہیے کتنے منگواؤں؟

بولے: زیادہ نہیں، ایک ٹوکرا منگوا لو۔

ٹوکرا منگوا لیا گیا۔ یہ دونوں حضرات آمنے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹوکرا خالی ہو گیا اور ان کے سامنے چھلکوں اور گٹھلیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ ملک مبارک سے تو خیر میں واقف تھا کہ وہ ہماری "کھٹو پارٹی" کا ممبر تھا اور اس کی پُرخوری کا تماشہ میں بارہا دیکھ چکا تھا لیکن طفیل کی دھان پان جسامت کے پیش نظر اس کی اس خوش خوراکی پر بڑا تعجب ہوا اور ملا نصر الدین کا وہ لطیفہ یاد آیا کہ اس نے ایک دفعہ دو سیر گوشت گھر بھیجا اور بیگم کو کہلوایا کہ رات کو ایک مہمان آ رہا ہے اسے بھون کر تیار رکھنا۔ وہ نیک بخت نمک چکھتے چکھتے سارا چٹ کر گئی۔ ملا مہمان کو لے کر گھر آیا تو بیگم نے بہانہ گھڑ کے بتایا کہ وہ تو بلی ہڑپ کر گئی ہے۔ یہ گھر کی دُبلی سی پالتو بلی تھی۔ ملا نے اسے پکڑ کر ترازو میں تولا جس کا وزن دو سیر نکلا۔ مُلا نے بیگم کی طرف دیکھ کر کہا: بھاگوان! اگر یہ بلی ہے تو گوشت کہاں گیا؟ اور اگر یہ گوشت ہے تو بلی کیا ہوئی! مجھے بھی اس وقت ملا نصر الدین کی طرح یہی تجسس تھا کہ اگر یہ طفیل میاں ہیں تو آم کہاں گئے اور اگر یہ آم ہیں تو وہ خود کیا ہوئے!

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ طفیل شروع ہی سے چھپا رستم تھا وہ نوجوانی میں ایک سرو قد، نازک اندام دوشیزہ کی طرح نہایت شرمیلا اور اللہ میاں کی گائے قسم کی چیز لگتا تھا، جوں جوں عمر ڈھلنے لگی پر پُرزے نکالنے لگا، دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم بھی بھر گیا، حجاب بھی اُترنے لگا اور زبان بھی جڑ گئی۔ لیکن اس سے پہلے بھی اس کی دلآویز مسکراہٹ میں ایک دبی دبی سی شرارت محسوس ہوتی تھی اور کبھی کبھار اپنے خول سے نکل کر کوئی چبھتا ہوا فقرہ چست کر دیتا تو دوست چونک جاتے کہ یہ تو نہ صرف بول لیتا ہے بلکہ اس قدر تیز و طرار حسِ مزاح بھی رکھتا ہے۔

عموماً بسیار خوری بسیار نویسی کی ضد ہوتی ہے اور بسیار نویسی یا زود نویسی میں خوب نویسی کا معیار قائم رکھنا دشوار ہوتا ہے۔ لیکن طفیل کے معاملہ میں یہ مشاہدے بھی غلط ثابت ہوئے وہ بسیار خوری کے ساتھ بسیار نویس اور زود نویسی کے ساتھ ساتھ خوب نویس بھی ہے۔

طفیل کی ادبی فتوحات کے کارنامے رفتہ رفتہ قسطوں میں سامنے ہوئے ہیں، پہلے وہ ایک کامیاب پبلشر بنا، پھر ایک کامیاب مدیر ہو کر دکھایا، پھر خاکہ نگاری کی۔ اوپر نیچے چار کتابیں تخلیق کر ڈالیں اور اب اس نے افسانے کی مملکت کی تسخیر کا بیڑا اٹھایا ہے ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

میں بتا چکا ہوں کہ اس کی شخصیت کے جوہر کھلتے کھلتے کھلے ہیں۔ تخلیقی انکشافات کے باوجود اس کی وجہ شہرت ایک کم گو اور خاموش طبع ہونے کے حوالے سے تھی۔ پھر اس نے یہ جُوا بھی اتار پھینکا۔ اب وہ ایک ہنگامہ باز ادبی سیاس کے رُوپ میں سامنے آیا اور لطف یہ ہے کہ اس میدان میں بھی اسے کوئی نہ پچھاڑ سکا۔ کچھ دنوں یہ افواہ بھی گرم تھی کہ اس نے کسی معاشقے کا ڈول ڈالا ہے اگرچہ وہ یہی کہتا رہا کہ ع

یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہو گی

لیکن یار لوگوں نے باتصویر سکینڈل پیش کر کے اس کی خشک زندگی میں رنگینیاں گھولنے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی، سچ پوچھیے تو ہمیں اس سے ایک گونہ خوشی بھی ہوئی کہ اردو ادب جو اب تک ہمارے ایک محترم فنکار احمد ندیم قاسمی صاحب کی نیک چلنی بھگت رہا ہے یہی اتنا کافی ہے کہ اس میں کسی مزید پاکدامن ادیب کی مطلق کوئی گنجائش نہیں۔ قاسمی صاحب کی اور بات ہے انھوں نے اپنی کتنی ہی دوسری خوبیوں کی چاشنی سے اس تلخی کو یادوں کیلیے

بہت حد تک گوارا بنا دیا ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ کوئی دوسرا فن کار اس زادِ راہ کے ساتھ یہ سفر جاری نہیں رکھ سکتا کیونکہ ادب و فن کے کام میں کم از کم ذہنی بدچلنی بہت ضروری ہے کہ اس کے بغیر تخلیق میں وہ حُسن، وہ خوشبُو اور وہ رنگ آ ہی نہیں سکتا جو اسے امر بنا سکے۔

یہ تو خیر میرا ذاتی خیال ہے جس کے حرفِ آخر ہونے پر میں اصرار نہیں کروں گا اور پھر اپنے وطنِ عزیز میں تو کچھ اس عجلت سے قدریں بدل رہی ہیں کہ کس قدر کو حرفِ آخر سمجھنا ویسے بھی یہ ممکن نہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ آج جس چیز کو ہم ادب و فن کے لیے بے ہنری سمجھتے ہیں کل وہی عیب اس کے لیے طُرّۂ امتیاز بن جائے۔

طفیل میرا دیرینہ دوست ہے اس کی زندگی کے کئی اچھے بُرے پہلو میری نظر میں ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ دوستوں پر قلم اٹھاتے ہوئے انصاف کے تقاضے پُورے کرنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے، کیونکہ بڑے فراخدل دوست کی بھی دکھتی رگ پر اگر بھولے سے انگلی پڑ جائے تو عزتِ سادات خطرے میں پڑ جاتی ہے اور برسوں کے یارانے تلخی و ترشی کے طوفانوں کی زد میں آجاتے ہیں، خصوصاً زندہ دوستوں کے تو صرف قصیدے ہی لکھے جا سکتے ہیں لیکن خاکہ نگاری ایک ایسی ظالم صنف ہے کہ اس میں صرف ستائشی کلمات سے بات نہیں بنتی تاوقتیکہ انسانی زندگی کے دونوں پہلو پیش نہ کیے جائیں، موصوف کا تشخص ہو ہی نہیں سکتا۔ زیادہ نہ سہی چند ایک حماقتوں کی نشاندہی تو اسے انسان ثابت کرنے کے لیے بھی ناگزیر ہوتی ہے۔ بڑے لوگوں کی طرح بڑے فن کاروں کی کمزوریاں بھی بڑی ہوتی ہیں لیکن طفیل اس معاملہ میں کوئی بڑا فن کار نہیں لگتا کیونکہ اس کی لغزشیں بڑی ہونی بلکہ عامیانہ سی نظر آتی ہیں۔ وہ بظاہر نہایت سیدھا سادا ایک شریف سا آدمی معلوم ہوتا ہے، وضعدار، نیک اطوار، دوستدار اور صلح کار۔ لیکن دراصل ایسا نہیں ہے اس میں شرعی عیب نہ سہی غیر شرعی عیوب کا سراغ لگانے میں انسان کو مایوسی نہیں ہوتی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے ع

خدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

طفیل بھی شہرت و ناموری کے پُل صراط پر پہنچ کر اپنے روایتی مرنجاں مرنج کردار سے کچھ ڈگمگا گیا اس میں اس کا قصور کم اور خوشامدی مداحین کا عمل دخل کار فرما تھا جنھوں نے اسے بعض جگری دوستوں سے بدظن کرنے میں نہایت مہلک کردار ادا کیا۔ اور طفیل نے اپنے ان دیرینہ دوستوں سے کچھ ایسا رویہ اختیار کیا جس کی اس جیسے انسان سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی

لیکن وہ جو کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب کچھ روا ہوتا ہے، شاید اس نے بھی ایسا ہی سمجھا ہو۔

ہماری دوستی میں کچھ ایسے مقامات بھی آئے کہ شکوک و شبہات کی آندھیوں سے تعلقات کے نازک آبگینوں کی شکست یقینی نظر آنے لگی، اس میں کچھ ان کا بھی قصور تھا، کچھ ہماری غلطیاں بھی تھیں، کچھ خفتنی قسم کے لوگوں کی پیدا کردہ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں بھی تھیں، اور کچھ "سبک سر ہو کر کیوں پوچھیں" والی جانبین کی جھوٹی انا بھی —— زیادتی کس کی تھی، اس کے متعلق نہ اس وقت کوئی فیصلہ ہو سکا نہ اب فیصلہ ہو سکتا ہے، اس وقت جذباتی رنگ میں ہم اسے گنہگار سمجھتے تھے وہ ہمیں متہم گردانتا تھا اور اب جبکہ صلح صفائی ہو چکی ہے، ہم اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں اور شاید اب اس کی رائے بھی اپنے متعلق ہم سے مختلف نہیں ہوگی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ انسان کی ذہنی کیفیات سے اس کا مزاج اور کردار کس قدر متاثر ہوتا ہے اشتعال میں ہم جسے گردن زدنی سمجھتے ہیں، محبت میں اس کے لیے جان پر کھیل جانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مخالفت میں جو عیوب کا مجسمہ لگتا ہے دوستی میں اس پر مر مٹنے کو جی چاہتا ہے، دراصل ہر انسان کہنے کو تو فردِ واحد ہے لیکن اس کے اندر ان گنت مخلوق اپنا اپنا کردار ادا کرنے میں سرگرمِ عمل ہے۔ ہمارے جاننے والوں میں سے ہر ایک انہی کرداروں میں سے کسی نہ کسی کردار کے حوالے سے ہماری پہچان کرتے ہوئے ہم سے محبت، نفرت، مروّت، ہمدردی کرتا ہے، دوسروں کو چھوڑیے! المیہ تو یہ ہے کہ خود اپنی شخصیت کے کئی کردار ہمارے لیے اجنبی ہوتے ہیں اور جب کبھی اچانک وہ اُبھر کر سامنے آتے ہیں تو ہم انہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتے ہیں اور یقین نہیں آتا کہ یہ ہم ہیں۔

طفیل ایک ذہین انسان ہے وہ ان باتوں کا شعور رکھتا ہے گلڈ کے الیکشن کے بعد اسے احساس ہوا اور اپنے رویّے کی اس نے خود ہی بہت حد تک اصلاح کر لی، تاہم اب بھی اس دَور کی تلخیوں نے اسے اپنے کچھ پرانے دوستوں سے دُور کر رکھا ہے، مجھے یقین ہے جلد ہی اسے یہ عقل بھی آجائے گی کہ دوست بڑی قیمتی چیز ہیں اور انہیں اتنی معمولی شکر رنجیوں پر گنوانا کوئی ہوش مندی کی علامت نہیں۔

نقوش کے مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر، لاہور نمبر، غالب نمبر، منٹو نمبر، اقبال نمبر وغیرہ طفیل کے ایسے کارنامے ہیں کہ وہ اور کچھ بھی نہ کرتا تو صرف یہی کام اس کا نام زندہ رکھنے کو

کافی تھا۔ نقوش کے یہ گراں قدر نمبر ایسی اہم دستاویزات ہیں جو ادب کے طالب علموں کی ہمیشہ رہنمائی کرتے رہیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ نقوش کو اس نے ایک مثالی ادبی صحیفہ بنا کر ادبی پرچوں میں ایک نئی روایت قایم کی۔ لیکن نقوش نے بھی اسے وہ کچھ دیا جو آج تک کوئی مدیر حاصل نہ کر سکا۔ میری مراد مالی منفعت سے نہیں، وہ بھی ہو گی لیکن جو نام اور مقام اس نے کمایا وہ اتنا انمول ہے کہ اس کے آگے باقی تمام مفادات ہیچ ہیں۔ اس پرچے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جہاں دوسرے ادبی ماہناموں کے خاص نمبر کبھی کبھار نکلتے ہیں وہاں اس کا عام پرچہ دیکھنے کو آنکھیں ترس جاتی ہیں کہ وہ شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے ورنہ عموماً بھاری بھرکم نمبر ہی چھلتے رہتے ہیں۔ کتنے نمبر تو ایسے ہیں جو سمٹ نہ سکے نقوش کے جامۂ اصلی میں سما نہیں سکے اور جڑواں بچوں کی طرح ظہور میں آئے۔ نمبر کاری کے میدان میں نقوش نے نہ صرف ادبی پرچوں کے سارے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیے بلکہ اب تو یہ نظر بد دور اپنے ہی تمام قایم کردہ ریکارڈ توڑنے کے درپے ہے۔ طفیل ہر رخ پر قیامت کی چال چلنے والا انسان ہے، اس کی ہنر مندی کا قد و قامت جتنا باہر ہے اس سے کئی گنا اندر ہے جو بتدریج دھیرے دھیرے منظرِ عام پر آ رہا ہے اگر اس طرّہ پرپیچ و خم کے تمام پیچ و خم کھل گئے تو نجانے اس کے قامت کی درازی کا کیا عالم ہو گا۔

ذکر خرابۂ نجد کے محمد طفیل ، محمد نقوش کا

مقبول جہانگیر

طفیل صاحب کا شمار یارانِ نجد میں ہے۔ شہر نجد لاہور کے در و دیوار اور کوچہ و بازار سے اُن کا تعلق بہت قدیم ہے۔ اس شہر کی آب و ہوا اور رنگ و فضا میں طفیل صاحب کی من موہنی شخصیت کا خمیر تیار ہوا ہے اور یہیں کی آتش و خاک نے انھیں پروان چڑھایا ہے۔ اُن کی ابتدا ایسی تھی کوئی اُن کی انتہا کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ داغ کے ایک شاگرد کا لہجہ مستعار لُوں تو کہہ سکتا ہوں کہ ابتدا میں نقشہ یہ تھا ؎

بھبھوکا رنگ ہے، ابرو کشیدہ، آنکھ کالی ہے

اور انتہا کا حال یہ ؎

جواں ہو کر میرے قاتل نے کیا صورت نکالی ہے

یُوں تو مجھے اپنی اس مختصر سی زندگی میں بہت سے خود ساختہ افراد کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، لیکن تین آدمیوں نے مجھے جس حد تک متاثر کیا ہے، شاید کسی نے اتنا متاثر نہیں کیا۔ ان میں ایک ایڈیٹر ریاست سردار دیوان سنگھ مفتوںؔ، دوسرے حضرت احسان دانشؔ اور تیسرے مدیر نقوش جناب محمد طفیل۔ دیوان سنگھ کو اُس زمانے میں قریب سے دیکھا جب شعور کی کچھ کچھ آنکھیں کھل چکا تھا اور ذہن کی صاف شفاف تختی پر آڑی ترچھی لکیریں اور نقوش ثبت ہونے لگے تھے یعنی اچھے بُرے کاموں اور انسانوں کی پرکھ پیدا ہو چکی تھی۔ ایسا محنتی اور انتھک کام کرنے والا اور نہایت مستقل مزاج آدمی دیوان سنگھ کے بعد کوئی نہ دیکھا۔ اپنے نصب العین سے جو عشق انہیں تھا، ویسا عشق اب خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اُس عشق کی ایک نرم اور دُھندلی سی جھلک اگر مجھے شہر نجد میں کہیں نظر آئی تو وہ طفیل صاحب کی ذات میں نظر آئی۔

حضرت احسان دانش کا نام نامی بھی عمر کے اُسی دَور میں کانوں میں پڑ چکا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد جب لاہور میں آئے تو احسان صاحب کی زیارت بھی بار ہا ہوئی مگر دُور دُور سے۔ اب گذشتہ چھ سات برس سے اُن کے شب و روز نگاہ میں ہیں اور میں نے اُنہیں ہر اعتبار سے ایک مثالی انسان پایا، اور یہ کیسی

عجیب بات ہے کہ ان تینوں شخصیتوں کی ذہنی پرورش و پرداخت اسی شہر نجد لاہور میں ہوئی۔ جناب دیوان سنگھ حضرت جالب دہلوی کے شاگردوں کی فہرست میں داخل ہونے سے پیشتر اور دلی سے "ریاست" کی اشاعت سے قبل لاہور میں متعدد سکھ اور ہندو اخباروں کی ایڈیٹری کر چکے تھے اور یہ اُن کی صحافتی زندگی کا بالکل ابتدائی دَور تھا۔ کاندھلے کے احسان الحق کو احسان دانش اسی شہر نے بنایا اور کلیجے سے لگا کر رکھا۔ محمد طفیل کی خاک کا تو خمیر ہی اسی خطۂ عاشقاں اور جانبازاں سے اُٹھا ہے ؏

سلامٌ علی نجدٍ و من حل بالنجد

گذشتہ دس بارہ برس سے اس عاجز کو دُعا سلام کا علاقہ اُن سے بھی ہے اور کبھی اُن کی جانب سے خلوص، شفقت اور محبت میں کمی نہ آئی۔ اُن سے آمنا سامنا کبھی ہفتوں، مہینوں بلکہ برسوں میں ہوتا ہے مگر مل کر اور ان کا اخلاق دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے ؏

بڑا خلوص ملاقاتِ گاہ گاہ میں ہے

جب کبھی میں طفیل صاحب کو دیکھتا ہوں تو نہ جانے کیوں مجھے منٹو صاحب یاد آجاتے ہیں۔ میں نے منٹو کو اس عالم رنگ و بو میں کبھی نہ دیکھا اور اگر دیکھ بھی لیتا تو شاید کچھ زیادہ خوش گوار اثر قبول نہ کرتا۔ اس لیے کہ میرا خیال کچھ ایسا ہے۔ سعادت حسن منٹو کو اس کے افسانوں ہی میں اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ خیر، یہ تو جملۂ معترضہ تھا، عرض یہ کر رہا تھا کہ طفیل صاحب کو دیکھ کر منٹو صاحب یاد آتے ہیں اور منٹو سے ذہن فوراً احمد ندیم قاسمی کی طرف منتقل ہوتا ہے جنھیں دیکھنے کا اتفاق بارہا ہوا۔ اُن کی تخلیقات میں بھی، ادبی تقریبوں اور محفلوں میں بھی۔ اور ہر جگہ وہ بقول منٹو، شریف آدمی نظر آئے۔ کچھ ایسا ہی میرا عقیدہ طفیل صاحب کے بارے میں ہے کہ جی چاہے تو دفتر کے دفتر سیاہ کر والیجیے، مگر مجھے بار بار یہی لکھنا پڑے گا کہ طفیل صاحب شریف آدمی ہیں، اپنی شرافت کا احساس جناب طفیل کو بھی ہے، چنانچہ اپنے قلم سے اپنا خاکہ کھینچتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:

"بعض ناسمجھوں کا خیال ہے کہ جناب طفیل ایسے شریف آدمی اگر پیدا ہونے بند نہیں ہوئے تو کمیاب ضرور ہو گئے ہیں، بلکہ یہاں تک کہ اب تو ایسا برانڈ آتا ہی نہیں۔"

اب یہ تو خدا جانے کہ اس میں خطا ناسمجھوں کی ہے یا سمجھداروں کی جو طفیل صاحب کو شریف آدمی سمجھتے ہیں تاہم طفیل صاحب میں یہ دونوں خوبیاں بعض شرفاء کو ضرور دکھائی دی ہیں کہ وہ شریف بھی ہیں اور سمجھ دار بھی بلکہ نہایت مستند سمجھ دار۔ اُن کی ذہانت، اُن کی محنت، اُن کی لگن اور جنونِ عشق کے

اندازہ کیجیے کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم نے انہیں محمد طفیل سے محمد نقوش بنایا اور یہ کہنا غیر ضروری ہو گا کہ ہر وہ شخص جو اُردو کے لیے بُرا بھلا کچھ کام کرتا تھا، بابائے اُردو کی نگاہ میں شریف آدمی کہلائے جانے کا پورا مستحق تھا۔

شرافت اور طفیل صاحب کچھ لازم و ملزوم سے ہیں، بشرطیکہ شرافت کو مرکب پڑھا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر طفیل صاحب شریف نہ ہوتے تو کیا ہوتے۔ جیسے شرافت سے ہٹ کر اُن کے وجود کی نفی ہو جاتی ہو اور طفیل صاحب کو دیکھ کر شرافت کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہو۔ اللہ میاں اس اعتبار سے طفیل صاحب پر خاصے مہربان رہے ہیں کہ انہوں نے طفیل صاحب کو شرافت کے زیور سے آراستہ کیا تو ابتدا ہی میں ایسے لوگوں کی ہم نشینی و ہم سخنی کا شرف بخشا جن میں ایک سے ایک بڑھ کر شریف آدمی تھا۔ مثلاً قاسمی صاحب۔ حد یہ کہ قاسمی صاحب کی شرافت کا اقرار منٹو جیسے عبقری نے بھی کیا جس کی شرافت بہت سوں کے نزدیک کچھ غیر معتبر سی رہی جیسے زندوں میں حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی اعلی اللہ مقامہ، اور مردوں میں پریس برانچ لاہور کے چودھری محمد حسین غفرلہٗ مولانا ماجد سے شرافت و نجابت کی سند لینا کچھ آسان نہ تھا۔ اس معاملے میں منٹو بے چارے کا کیا ذکر، نیاز فتح پوری، ابوالکلام آزاد اور جوش ملیح آبادی جیسے شرفا بھی ماجد میاں کی بارگاہِ قدس میں اس جرم کے تحت پکڑ کر لائے گئے کہ اس ہمہ بچہ شتر است۔ ماجد میاں کو اللہ میاں عمرِ نوح عطا کریں۔ واللہ اعلم طفیل صاحب کا واسطہ کبھی ماجد میاں سے پڑا یا نہیں تاہم یقین ہے کہ مولانا ماجد سے شرافت کی سند ہتھیا لینا طفیل صاحب کے لیے کچھ مشکل نہ ہوتا۔

ممکن ہے میں طفیل صاحب کی شرافتِ قلبی اور نجابتِ طبعی کو ایک لفظ میں بیان کرنا چاہتا تو انہیں فرشتہ کہہ دیتا، مگر پھر طفیل صاحب کی شرافت ہی آڑے آتی اور میں یہ لفظ نہ لکھتا اس لیے کہ کسی انسان کا فرشتہ بن جانا یا فرشتہ کہلوانا بقول طفیل صاحب خود انسان کی تذلیل ہے اور ظاہر ہے طفیل صاحب ایسے پیارے اور شریف انسان کی تذلیل کون گوارا کرے گا؟

طفیل صاحب نے زندگی کی بڑی ٹھوکریں اُٹھائی ہیں، مگر ان کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی ہے۔ دم لینے کے لیے کہیں رُکے ہی نہیں کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہے۔ پہلے کتابوں کے تاجر بنے، پھر پبلشر آہستہ آہستہ مدیر پھر چپکے چپکے مصنف اور ادیب سے

تُو نے اُن کو کیا سے کیا ذوقِ فراواں کر دیا
پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں کر دیا

مطلع خواجہ عزیز الحسن مجذوب کا ہے، لیکن طفیل صاحب بحمد اللہ مجذوب نہیں، سالک ہیں۔ راہ و رسم کی ہر منزل کو خوب جانتے ہوئے، اچھی طرح پہچانے ہوئے اور اُسے ہنس کھیل کر روند ڈالنے کے عادی۔ کیسا ہی کٹھن مرحلہ ہو اور کیسا ہی جانکاہ سفر، وہ ہمہ وقت کمربستہ رہتے اور جان جان کر مشکل سے مشکل کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ انھیں اسی میں لطف آتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا کام اگر وہ مارے باندھے کرنے پر آمادہ کیے جائیں تو اُسے بھی اس انداز سے کرتے ہیں کہ ہم جیسے نزدیکانِ بے بصر کو وہ کام آسمان سے باتیں کرتا ایک پہاڑ دکھائی دینے لگتا ہے یا پھر جگر کے الفاظ میں وہ کچھ ایسا منظر دکھا دیتے ہیں کہ ع

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

طفیل صاحب کا ظاہر بھی حسین، باطن بھی حسین۔ کشیدہ قامت جیسے فراق کی مرصع غزل، صبیح و ملیح چہرہ جیسے جوش کی شوخ رباعی، چال جیسے اختر شیرانی کی رومانی نظم، کچھ کچھ لغزشِ مستانہ کا اثر لیے ہوئے، لیکن اس مدہوشی میں بھی ہوش کا ہاتھ تھامے ہوئے ؎

ممکن نہیں کہ ایک قدم بھی غلط اُٹھے
چلتا ہے راہِ عشق میں دیوانہ دیکھ کر

گفتگو گاہ پھول کی پنکھڑی، گاہ تلوار کی دھار۔ منٹو کی انانیت، شوکت کی بذلہ سنجی، قاسمی کی شرافت اور جگر کی مروّت کے آمیختے سے طفیل صاحب کی شخصیت کا دلفریب پیکر تیار ہوا ہے، وہ بلا کے محنتی آدمی ہیں۔ تن تنہا انھوں نے گزشتہ چند برسوں میں نقوش کے ایسے ایسے نمبر مرتب کر دیے ہیں کہ بقول مولوی عبدالحق نقوش کو دیکھ کر درود شریف پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ طفیل صاحب خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتے ہیں اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ جب کسی منصوبے پر کام شروع کر دیتے ہیں تو دن دیکھتے ہیں نہ رات، کولھو کا بیل بن جاتے ہیں۔ بیوی بچّے تو ایک طرف، حضرت کو کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ ع

آرام سے فارغ بصفتِ جوہرِ سیماب

اقبالؔ نے انھی کے بارے میں کہا ہے پھر یہ کہ ہر کام خود کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو مشین پر کھڑے ہو کر رسالہ بھی خود چھاپ لیں اور جزو بندی کے مراحل بھی اپنے ہاتھ سے طے کریں۔ نقوش کا کوئی خاص نمبر نکل رہا ہو تو طفیل صاحب کی حالت قابلِ دید ہوتی ہے، جو کام ہو چکا ہوا سے دیکھ دیکھ خوش ہوتے چلے جائیں گے، جو نہیں ہو رہا ہے، اس پر بار بار کفِ افسوس ملیں گے۔ حد یہ

کہ رہا سہا ہوش بھی رخصت ہو جائے گا۔ دامن کے چاک اور گریبان کے چاک میں کچھ فاصلہ باقی نہیں رہتا۔ وہ حال ہوتا ہے کہ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی۔ انہیں نقوش کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔ ذکر کریں گے تو نقوش کا، فکر ہوگی تو نقوش کی۔ سوئیں گے تو نقوش کے خواب دیکھیں گے، جاگیں گے تو نقوش کے نقش سامنے ہوں گے۔ اس آشفتہ سری کے عالم میں ایک بار میں نے انہیں دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا کہ یا اللہ یہ فرزانگی ہے یا دیوانگی۔ بے اختیار سرمد کی رباعی ذہن میں گونجنے لگی

مجنوں بہ خیالِ لیلیٰ در دشت
در دشت جستجوئے لیلیٰ می گشت
می گشت بدشت بر زبانش لیلیٰ
لیلیٰ می گفت تا زبانش می گشت

طفیل صاحب کبھی کبھی جنگ کے دو پاٹوں میں آ کے پس بھی گئے ہیں۔ جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی مرحوم میں جنگ شروع ہوئی تو طفیل صاحب کی جان پر بھی بنی۔ ان کے قلبی تعلقات دونوں سے تھے، یعنی دل کو روؤں کہ جگر کو میر، میری دونوں سے آشنائی ہے۔ شاہد صاحب غصے کی جھونجھ میں "ساقی" کا جوش نمبر نکالنے پر گھٹا کی طرح تُلے کھڑے تھے اور چاہتے تھے کہ بادلوں کی ایک فوج لے کر جوش صاحب پر برسیں اور کھُل کر برسیں، انہوں نے طفیل صاحب کو مجبور کیا کہ جوش کی کمزوریوں پر مشتمل ایک مضمون لکھیں تاکہ "ساقی" کے جوش نمبر کی غذا بنے۔ طفیل صاحب نے شاہد مرحوم کو محبت، پیار سے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی، اس کام سے باز آجائیں، مگر مرحوم نہ مانے۔ یہ تو دراصل جوش و شاہد کے حواریوں کی شرارت تھی کہ انہوں نے ادب کے ان دو دیوؤں کو آمنے سامنے کھڑا کر دیا تھا، شاہد صاحب نے پورا زور لگایا، ایسا کہ طفیل صاحب زخمی ہو ہو گئے مگر انہوں نے جوش کے بارے میں مضمون نہیں لکھا، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انداز کچھ ایسا اختیار کیا کہ باغبان بھی خوش رہے، راضی رہے صیاد بھی ــــ اس سے طفیل صاحب کی خداداد ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔

طفیل صاحب، ڈھیل کے پینچ لڑانے کے عادی ہیں۔ ایسی ادبی پتنگ بازی میں وہ نہایت صبر سے اپنی پتنگ کو ڈور پلاتے رہتے ہیں اور موقع پاتے ہی حریف کا ایسا پیٹا کاٹتے ہیں کہ وہ منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ مدیر "افکار" صہبا لکھنوی بڑے سخت جان ہیں۔ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ مدت سے زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں، بدقسمتی سے طفیل صاحب کے معاملے میں وہ حسد کا شکار

ہوگئے اور طفیل کی چٹکی پر انھوں نے لیے حملے کیے جو ذاتیات کی ذیل میں آتے تھے۔ طفیل صاحب کے ذہن میں معاصرت یا رقابت کا کوئی فتنہ نہ تھا اور نہ وہ صہبا صاحب کو اپنا حریف سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے صہبا صاحب کو رسید نہ دی، اُدھر وہ غافل ہوئے اور اُدھر طفیل صاحب نے وار کیا۔ نتیجہ یہ کہ صہبا صاحب آج تک چپ ہیں۔

طفیل صاحب کی شخصیت کے دو رُخ ہیں۔ ایک محمد طفیل، دوسرا محمد نقوش۔ محمد طفیل خوش نہاد، خوش وضع، خوش لباس، خوش ادا، خوش خلق اور خوش مزاج آدمی ہے جس کی ذاتی زندگی میں کوئی اُونچ نیچ، کوئی ہیر پھیر، کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ یہ محمد طفیل اپنی بیوی سے محبت کرنے والا ذمہ دار شوہر، بچوں کے لیے نہایت شفیق باپ اور خویش و اقارب کے لیے سراپا ایثار و ہمدردی ہے۔ ہر کس و ناکس کے کام آنے والا آدمی ہے۔ ہر روز صبح باقاعدگی سے گھر سے نکلتا اپنے دفتر پہنچتا، دن بھر اپنے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتا، دوستوں اور مہمانوں کی خاطر تواضع کرتا، اور شام کو گھر چلا جاتا ہے۔ کاروباری حلقے میں اس کی بڑی ساکھ ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جسے یہ شکایت رہی ہو کہ محمد طفیل نے اس کا پیسہ دبا لیا ہے، جائیداد ہتھیالی ہے یا کچھ اور نقصان پہنچایا ہے۔ محمد طفیل جس معاشرے میں رہ رہا ہے اس کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو اس کی نگاہ میں ہیں۔ وہ بُرے آدمیوں سے بھی محبت کرتا اور دشمنوں کو گلے لگانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اُس نے اپنے نام نہاد دوستوں کے ہاتھوں بڑے بڑے نقصان اُٹھائے ہیں مگر شکایت تو کجا، ایسی باتیں وہ زبان پر بھی نہیں لاتا۔ وہ نہایت مرنجاں مرنج، بھولا بھالا، شرمیلا، بہو بیٹیوں کے سے انداز رکھنے والا کم سخن شخص ہے جس سے مل کر خوشی ہوتی ہے اور جس کے پاس بیٹھ کر ایک عجیب طرح کا اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک طالبعلم سمجھتا ہے اور ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کا متمنّی رہتا ہے۔ ممکن ہے وہ دل ہی دل میں بعض لوگوں سے جنھوں نے کبھی اسے اذیت دی ہے، انتقام لینے کا ارادہ رکھتا ہو، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دینے کی صلاحیت سے قطعی محروم ہے۔ صداقت، دیانت، محنت اور ذہانت محمد طفیل کی شخصیت کے عناصر اربعہ ہیں۔

دوسرا شخص محمد نقوش ہے جو محمد طفیل کی ذات سے اُبھرا ہے اور نہایت متضاد صفات کا مالک ہے۔ محمد نقوش ادیب ہے، مدیر ہے، مفکر ہے، مصنف ہے، سخن فہم ہے، عالم ہے، فاضل ہے، طنز نگار ہے، خاکہ نویس ہے، نہایت ضدی اور خود سر آدمی ہے، اپنے آگے کسی کو گانٹھتا نہیں۔ بڑی سے بڑی شخصیت کا آناً فاناً جھٹکا کر دیتا ہے۔ مرعوب ہونا تو جانتا ہی نہیں۔ ہر شخص کے آگے آئینہ اور پیچھے لٹھ

لیے پھرتا ہے۔ جہاں موقع ملا لٹھ دے مارا، جب جی چاہا آئینہ دکھلا دیا، اپنے دونوں ہاتھ نکلے کام کے۔ قلم سے کبھی تلوار، کبھی نشتر، کبھی خنجر اور کبھی پھول کی پتی کا کام لے لیتا ہے اور ہیرے کا جگر کاٹتا چلا جاتا ہے۔ ادارت کی کرسی پر رونق افروز ہو اور اچھے موڈ میں ہو تو "ایک بڑے مشہور افسانہ نگار" کو ادیب ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور ماننے پر آئے تو انتظار حسین کو اہلِ زبان میں شمار کر کے اہلِ زبان پر ظلم کرتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ نقوش میں جو کچھ چھپے وہ خود محمد نقوش کی سمجھ میں بھی آئے، مگر کبھی کبھی نقوش میں ایسی چیزیں بھی چھاپنا پڑ جاتی ہیں جنھیں ہفتوں خمیرہ گاؤزبان کھا کر بھی محمد نقوش سمجھ نہیں پاتا جیسے حضرت قیوم نظر کا کلام بلاغت نظام۔

"نقوش" کے سوا محمد نقوش کو دنیا میں کسی سے بھی پیار نہیں ہے حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی نہیں۔ نقوش پر بڑے بڑے پیغمبری وقت پڑے ہیں مگر محمد نقوش نے اس چہیتی اولاد کو بچانے کے لیے اپنا سب کچھ نثار کر دیا ہے۔ اس پوت کے پاؤں تو دیکھنے والوں کو پالنے ہی میں نظر آ گئے تھے مگر جوان ہو کر تو اس نے غضب ڈھا دیا ہر طرف سے نگاہیں پڑنے لگیں۔ کہیں سے واہ وا کی آوازیں آئیں تو کہیں سے آہ آہ کی۔ محمد نقوش نے واہ وا کی طرف دھیان دیا نہ آہ آہ کی پروا کی۔ اس کی زندگی کا بہترین لمحہ وہ تھا جب اس کے ایک دوست نے کہا تھا: "تو تو کچھ بھی نہیں"۔ اور زندگی کا بدترین لمحہ وہ تھا جب اس کے ایک دشمن نے کہا تھا: "تو تو سب کچھ ہے"۔ اگر آپ اُس سے پوچھیں کہ وہ اپنے حالات سے مطمئن ہے تو محمد نقوش جواب میں کہے گا: اگر میں یہ کہوں کہ مطمئن ہوں تو بندوں سے ڈر لگتا ہے۔ اگر یہ کہوں کہ مطمئن نہیں ہوں تو خدا سے ڈر لگتا ہے۔ اس کے دل میں ایک بڑی خواہش چٹکیاں لیتی رہتی ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکتی اور وہ یہ کہ محمد نقوش سے سب خوش رہیں۔ وہ مرنا چاہتا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ مرنا کسی مقصد کے لیے ہو۔

محمد نقوش کو الفاظ متاثر کرتے ہیں نہ انسان، نہ تعریف، نہ گالیاں۔ وہ اپنے رقیبوں کو محبوب، اور محبوبوں کو رقیب سمجھتا ہے۔ گالیوں کے جواب میں کبھی پتھر برسا دیتا ہے، کبھی پھول اور تعریف کے جواب میں کبھی خندۂ استہزا اور کبھی یہ بھی نہیں۔ — اسے ایسوں کے گریبانوں میں ہاتھ ڈالتے میں مزا آتا ہے جو بزعم خود بڑائی کے نشے میں چور ہوں۔ اس کے پاس ایسے ایسے بہت سے گریبانوں کا ڈھیر لگا ہے۔ محمد نقوش عجب بے ڈھب، منہ پھٹ اور پُراسرار آدمی ہے۔ وہ ہنس رہا ہو تو سمجھ لیجیے اندر سے کھول رہا ہے۔ منہ بنائے بیٹھا ہو تو جان جائیے کہ خوش ہے۔ بات کہنے پر آئے تو لگی لپٹی رہنے نہیں دیتا۔ اس عادت نے بہت سوں کو محمد نقوش کے ساتھ ساتھ محمد طفیل کا دشمن بھی بنا دیا

ہے۔ کاش اس کے یہ دشمن محمد طفیل اور محمد نقوش میں فرق محسوس کرتے۔ بات سینے پر آئے تو کڑوے گھونٹ کی طرح نگل جاتا اور چوٹ کھانے پر مسکرا دیتا ہے۔ مگر صبر سے بدلے کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔

محمد نقوش نے دن رات جان کھپا کر اور خونِ جگر جلا کر اپنے پرچے کا ایک خاص شمارہ شائع کیا دل میں ہزار بدگمانیاں رکھنے والے اپنے مرزا ادیب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ مرزا صاحب ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھتے اور پڑھتے رہے۔ محمد نقوش کی شامت جو آئی تو پوچھ بیٹھا

"مرزا صاحب! پرچہ پسند آیا؟"

"ہاں، ٹائیٹل اچھا ہے۔"

محمد نقوش کا خون کھول گیا، تلوؤں سے چڑھی تو تالو سے جا لگی مگر ضبط کا بندہ تھا۔ کچھ نہ بولا۔ کچھ عرصے بعد مرزا صاحب بھی "ادبِ لطیف" کا سالنامہ لے کر نکلے۔ پرچہ محمد نقوش کو دکھایا۔ اس نے اِدھر اُدھر سے دیکھا۔ مرزا صاحب بے خیالی میں پوچھ بیٹھے:

"کیسا ہے؟"

"اس کا تو ٹائیٹل بھی اچھا نہیں" محمد نقوش نے اطمینان سے جواب دیا اور انتقام کی آگ بجھا کر مطمئن ہو گیا۔

طفیل صاحب

احسن علی خان

ایک شخصیت نگار کی شخصیت اور فن پر خامہ فرسائی کا بیڑا اُٹھالیا۔ سوچا تھا کہ یہ کام آسان ہوگا، لیکن اب جو لکھنے بیٹھا ہوں تو دن میں تارے نظر آرہے ہیں اور ہر تارے میں طفیل صاحب کا عکس یہ کہتا ہوا معلوم ہو رہا ہے کہ "دیکھا بچو! ہم نہ کہتے تھے کہ شخصیت نگاری آسان کام نہیں ہے۔" میں سمجھتا تھا کہ ان حضرت کو میں جانتا ہوں۔ قلم برداشتہ کچھ لکھ دوں گا۔ لیکن تو بہ کیجئے۔ میں ہزار ان کی شخصیت کا تعین کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں لیکن ہاتھ نہیں آرہے ہے۔ خود انھوں نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ

"میں انہیں ۱۵ راگست ۱۹۲۳ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ حضرت جُل دیئے جا رہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ یہ آخر ہیں کیا بلا۔"

ایک بار اصغر گونڈوی نے اپنی نشاندہی اس طرح کی تھی

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہیں

میں نے سوچا کہ طفیل صاحب بھی اپنی تصنیفات میں ضرور نظر آئیں گے۔ ان کی ساری کتابیں "صاحب" سے لے کر "محترم" تک دوبارہ پڑھ ڈالیں، "نقوش" کے ضخیم شمارے بھی ادھر اُدھر سے اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیے، "محمد نقوش" کا خاکہ بھی پڑھا، اور غور سے پڑھا، مگر کام نہیں بنا۔ اس پڑھائی کا اُلٹا اثر یہ ہوا کہ طفیل صاحب کی شخصیت ان کی کتابوں اور نقوش کے شماروں میں بکھری ہوئی نظر آنے لگی اور اب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے کس طرح سمیٹوں' ملایک کوزے میں بند کر لوں۔ حیرت تو یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ خود طفیل صاحب نے کتنے سلیقے اور خوبی کے ساتھ بڑے بڑے جنوں کو اپنے خاکوں کی چھوٹی چھوٹی بوتلوں میں بند کر لیا ہے۔ سچ ہے۔ یہ انہیں کا حصّہ ہے میرے بس کا روگ نہیں۔ ہار مانتا ہوں اور صرف اتنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ طفیل صاحب کی صرف وہ جھلکیاں پیش کر دوں جو میری نظر سے گزری ہیں۔ ان جھلکیوں کو یکجا کر کے جو تصویر بنے گی وہ یقیناً ناتمام اور نامکمل ہوگی۔ اس لیے میں یہ تبصرہ سُننے کو پہلے سے تیار ہوں کہ خاکہ نگاری میں میری یہ پہلی اور شاید آخری کوشش ایک ناکام کوشش ہے۔

طفیل صاحب سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۵ء میں لاہور میں احمد علی خاں کے مکان پر ہوئی تھی۔ ہاجرہ بھابی نے میرا تعارف احمد علی خاں کے ایک عزیز دوست کی حیثیت سے کرایا تھا۔ شاید ہاجرہ بھابی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میں شاعر بھی ہوں ورنہ شاعر کی حیثیت سے بھی تعارف کراتیں اور میں شاعر بھی کچھ اتو کھا ہی ہوں۔ یعنی لڑکپن سے شعر کہتا ہوں لیکن شعر سنانے اور چھپنے چھپانے کا شوقین نہیں ہوں۔ کیونکہ میرا تعارف ادیب یا شاعر کی حیثیت سے نہیں کرایا گیا تھا اس لیے میرے اور ایک مدیر کے درمیان ملاقات کی کوئی تقریب نہیں تھی۔ طفیل صاحب خاموش طبع اور کم گو ہیں۔ اپنا بھی یہی حال ہے۔ دونوں میں سے کسی نے گفتگو کا سلسلہ نہیں چھیڑا اور مجاز کی طرح یہ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ "اچھا یہ بتایئے کہ اس رفتار سے آپ والناس تک کب پہنچیں گے"۔ اس ملاقات کے بعد کئی سال گزر گئے۔ میری زفیقہ حیات اختر جمال، نقوش کے لیے افسانے لکھا کرتی تھیں اور مجھ سے کہتی تھیں کہ تم بھی طفیل بھائی کو کوئی چیز بھیج دو لیکن مجھے شعر کہنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ ایک عرصہ بعد جب میں نے ایک نظم کہی تو اختر کے تقاضہ پر طفیل بھائی کو بھیج دی۔ طفیل صاحب کے لیے یہ ایک سرپرائز (SURPRISE) تھا۔ بواپسی جواب آیا۔ نظم کی دل کھول کر تعریف کی اور لکھتے رہنے کی تلقین فرمائی۔ اس طرح ان سے میرا ادبی تعلق پیدا ہوا۔ اس سے پہلے تو میں ان کے لیے احمد علی خاں کا دوست اور اختر جمال کا شوہر ہی تھا جس کی خیر خیریت اختر کے نام اپنے خطوں میں دریافت کر لیتے تھے۔

ہاں تو میں بات کر رہا تھا پہلی ملاقات کی۔ پہلی نظر میں کرشن چندر کو وہ سجادہ نشین معلوم ہوتے تھے اور دوسری نظر میں "لکڑیوں کے ٹال کے مالک"۔ میری نظر نے یہ دھوکے نہیں کھائے۔ میری پہلی نظر تو ان کے فلسفیانہ انداز اور سوچتی ہوئی متجسس آنکھوں پر گئی تھی۔ باقی خدوخال پر میں نے غور ہی نہیں کیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے طفیل صاحب ڈرائینگ روم میں بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ہاجرہ بھابی اور اختر تیار ہو کر آگئیں اور ہم سب مل کر گنگارام ہسپتال میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی عیادت کو چلے گئے۔ بعد میں ہاجرہ بھابی نے بتایا کہ ان دنوں عبادت صاحب سے طفیل صاحب کی اَن بن ہے۔ اس کے باوجود وہ ان کی عیادت کو جانا چاہتے تھے اور اسی غرض سے ہاجرہ بھابی کے پاس آئے تھے۔ یہ سُن کر میرے دل میں ان کی عزت پیدا ہوئی۔ پھر جیسے جیسے میں انہیں قریب سے دیکھتا گیا عزت و احترام کا یہ پودا ایک تناور درخت بنتا گیا۔

طفیل صاحب نے اپنے کیریئر (CARRIER) کا آغاز کتابت سے کیا۔ چند سال بعد کتابت چھوڑ پبلشر بن گئے جب احمد ندیم قاسمی صاحب کی تحریک پر ہاجرہ مسرور، قاسمی صاحب اور ان کی ادارت

میں نقوش کا آغاز ہوا تو یہ آدھے پبلشر بھی تھے۔ آدھے اس لیے کہ نفع اور نقصان میں ان کی ساجھے داری تھی۔ ابتدا ہی سے نقوش پر حکومت کا عتاب نازل رہا۔ ابھی پانچ ہی شمارے نکلے تھے کہ نقوش کی پالیسی کے متعلق قاسمی صاحب اور طفیل صاحب کے درمیان چند بنیادی اختلافات پیدا ہو گئے۔ قاسمی صاحب نقوش کے ذریعہ نہ صرف ادب کی خدمت بلکہ اپنے سیاسی اور سماجی نظریات کی اشاعت بھی چاہتے تھے لیکن طفیل صاحب کا خیال تھا کہ یہ خالص ادبی پرچہ کی حیثیت سے ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ قاسمی صاحب کو آدرش عزیز تھے اور طفیل صاحب نقوش سے پیار کرتے تھے۔ سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ خود طفیل نے بڑی دیانت داری سے یہ لکھا ہے کہ وہ جسم کے اعتبار سے بھی کمزور ہیں اور دل کے اعتبار سے بھی۔ اس لیے اعتدال پسند ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قاسمی صاحب کے ساتھ نہ چل سکے اور دس شماروں کے بعد نقوش بند ہو گیا لیکن طفیل صاحب تو نقوش پر عاشق ہو چکے تھے۔ جدائی برداشت نہ کر سکے۔ چند مہینوں بعد قاسمی صاحب سے درخواست کی کہ نقوش مجھے دے دو۔ اور قاسمی صاحب نے نیک خواہشات اور دلی دعاؤں کے ساتھ نقوش کو اس طرح طفیل صاحب کے حوالے کر دیا جیسے کوئی غریب باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتا ہے۔ اس دن سے آج کا دن۔ طفیل صاحب "نقوش" پر واری نثار ہی ہیں اور اب تو "من تو شدم تو من شدی" تک بات پہنچی ہے۔ محمد طفیل اور محمد نقوش ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ محمد طفیل کا عشق ایک مسلسل عمل تخلیق ہے جس کا اظہار محمد نقوش کے حسن کی صورت میں ہوتا ہے اور یہ عمل اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک محمد طفیل کے دم میں دم باقی ہے مگر طفیل صاحب کبھی کبھی زمانے کی ناقدری کے ڈر سے اس طرح بھی سوچتے ہیں کہ

> "میرے مرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ "انھوں نے اپنے زمانے میں اچھے نمبر نکالے ...." غور کیجئے، میرے بعد میری زندگی کا حاصل بھی ایک فقرہ ہوگا۔ صرف اسی ایک فقرے کے سلسلے میں نے کیا کیا کچھ نہیں کیا ہے؟ دُنیا تیاگ دی ہے۔ مجھے زندگی کی دلکشیوں اور مسرتوں سے واسطہ نہیں رہا۔ دن رات کام کرتا ہوں۔ دن رات مرتا ہوں۔ دن رات مرتا ہوں، دن رات کام کرتا ہوں۔"

طفیل صاحب کی سوچ کے اس انداز سے میں متفق نہیں ہوں۔ مجھے اپنی قوم کی کوتاہیوں سے انکار نہیں۔ لیکن ہماری یہ قوم اتنی بھی بے حس، جاہل اور ناقدر نہیں ہے کہ ادبی خدمات کو یکسر فراموش کر دے۔ طفیل مرنے کے بعد کی بات کرتے ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان کی زندگی ہی میں نقوش کے اکثر شمارے ادب و تاریخ کے طالب علموں کے لیے تحقیقی حوالے فراہم کرتے ہیں اور اکثر پڑھے لکھے

گھرانوں میں نقوش کے فائل قیمتی کتابوں سے زیادہ سنبھال کر رکھے جاتے ہیں۔ رہی دُنیا بنا گنے اور کام کرنے اور مرنے والی بات، سو بھائی طفیل عشق میں تو یونہی ہوتا ہے۔

یہ ایک عرصہ سے پبلشر کم لیکن مدیر اور ادیب زیادہ ہیں۔ پبلشنگ سے جو کچھ منافع کماتے ہیں وہ "نقوش" کے خسارہ کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر پھر بھی پورا نہ ہو تو قرض لینے سے بھی نہیں چوکتے۔ خطوط نمبر کی تیاری کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے بیگم طفیل سے پانچ ہزار روپے قرض لیے ہیں (جو انہوں نے اپنے زیور بیچ کر دیئے) میں نے بھابی سے کہا کہ آپ نے کیوں دیئے کہنے لگیں نہ دیتی تو کیا کرتی۔ ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ یہ کم گو اور بھولا بھالا آدمی من موہنی مسکراہٹ کے ساتھ ایسی باتیں بنانے لگا کہ میں حیرت سے منہ دیکھتا رہ گیا۔ کہنے لگے کہ جناب میں اس کو (بھابی کو) پانچ ہزار کے بدلے دس ہزار دوں گا۔ میں اس کے لیے یہ کروں گا، وہ کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ دیکھا آپ نے عشق کا کمال۔ وقت پڑے تو یہ بے زبانوں کو بھی زبان عطا کر دیتا ہے۔ میں نے بھابی سے پوچھا کہ کیا واقعی بھائی طفیل اپنے وعدے پورے کریں گے۔ بھابی ہنس پڑیں۔ کہنے لگیں ان کے یہ بول ہی کافی ہیں۔ انہوں نے کہا اور ہم کو مل گیا۔ لیجئے صاحب، بھابی کو طفیل سے عشق، طفیل کو نقوش سے عشق اور عشق کی لغات میں سود و زیاں کے الفاظ ہی نہیں ہیں۔

ایک دن نقوش کے دفتر میں قبلہ حکیم یوسف حسن صاحب بھی بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ تو نیرنگِ خیال کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں طفیل صاحب کو سمجھایئے کہ پریس اور پبلشنگ کے کام پر زیادہ توجہ دیں اور نقوش کو اس ڈھنگ سے نکالیں کہ نفع نہیں ہوتا تو نقصان بھی نہ ہو۔ حکیم صاحب نے مجھ سے اتفاق کیا اور طفیل صاحب کو کچھ مشورے دیتے رہے۔ طفیل صاحب ہم دونوں کی باتیں سنتے رہے اور زیرِ لب مسکراتے رہے اور جب بولے تو معلوم ہوا کہ ہماری باتوں کا اثر کچھ اُلٹا ہی ہوا ہے۔ کہنے لگے کہ میں ابھی فلاں فلاں نمبر اور نکالوں گا اور پھر تفصیلات بتانے لگے کہ ان نمبروں میں کیا کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ ان نمبروں کے نکلنے میں یا تو آپ بالکل دیوالیہ ہو جائیں گے یا اپنی جان گنوا بیٹھیں گے۔ جواب ملا کہ کچھ بھی ہو مگر میں یہ نمبر نکالوں گا ضرور۔ یہ جواب سُن کر میں خاموش ہو رہا اور ان کی شکل دیکھنے لگا۔ یہ ادھر اُدھر دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں ؎

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

طفیل صاحب دھن کے پکّے ہی نہیں ضدی بھی ہیں۔ یہ سُنتے سب کی ہیں اور کرتے وہی ہیں جو ان کے دل میں ہے۔ راہ کی رکاوٹیں ان کا منہ نہیں موڑ سکتیں۔ اگر کھائی گہری اور تنگ ہے تو یہ

چھلانگ لگا کر گزر جائیں گے۔ اگر گہری اور چوڑی ہے تو اسے پاٹنے کی فکر کریں گے۔ کچھ بھی ہو لیکن یہ جائیں گے ناک کی سیدھ۔ اور منزل پر پہنچ کر یہ دیکھیں گے کہ آگے کون سی منزل ہے۔ پیچھے رہنا ان کی فطرت میں نہیں۔ یہ تو جس میدان میں بھی ہوں ہر قیمت پر سب سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فطرت کی اس افتاد نے طفیل صاحب کو فائدہ پہنچایا ہے یا نقصان یہ تو وہ خود ہی بہتر جانتے ہوں گے لیکن اردو ادب کو اس سے جو فائدہ پہنچا ہے اس کا صحیح اندازہ آئندہ نسلیں ہی لگا سکیں گی۔

طفیل صاحب کو قریب سے دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ؎

ہے یہ کوکب کچھ نظر آتا ہے کچھ

ام طور پر سنجیدہ اور بور نظر آتے ہیں۔ بے تکلف ہو جائیں تو معلوم ہو گا کہ یہ تو باغ و بہار آدمی ہیں۔ یہ اصل اتنے سنجیدہ نہیں جتنے شرمیلے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئے لوگوں میں چپ چپ سے رہتے یں۔ ان کا اصل روپ اپنے گھر میں یا بے تکلف دوستوں کے درمیان نظر آتا ہے۔ بیوی کو خوش کھنے کا گر جانتے ہیں۔ اس کے کانوں میں رس گھولتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں تو تم سے ڈرتا ہوں۔ ؤں کے شفیق باپ ہی نہیں شفیق دوست بھی ہیں اور دوستوں کے دوست تو ہیں ہی۔ دشمنوں کی ت کا برا نہیں مانتے۔ لیکن دوستوں کی طرف سے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو بہت محسوس تے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ لڑکپن میں انہیں کھیلنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اسی لیے کھیلنے کی حسرت آج تک ل میں کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی کرکٹ کی کومنٹری سن کر یا پتنگ اڑا کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اب یہ موقع بھی ایک عرصہ سے نہیں ملا ہے۔ میں نے ایک بار انہیں پتنگ اڑاتے تو نہیں البتہ پتنگ بازی لطف اٹھاتے دیکھا ہے۔ اگر آپ اس وقت انہیں دیکھتے تو یہ سوچتے کہ یہ وہ طفیل ہے ہی نہیں نقوش کی کرسی ادارت پر بیٹھتا ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی اکرم نے ایک پیچ ڈالا۔ پیچ بہت لمبا نچ گیا۔ دونوں پتنگیں تاروں کی مانند نظر آنے لگیں۔ پھر یکایک حریف کی پتنگ کٹ گئی۔ پتنگ ے کٹتے ہی کسی نے پیچھے سے "بو" کی لمبی تان اڑائی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ یہ تان اڑانے والا کوئی اور ہیں طفیل صاحب ہی تھے۔ شاید میرا لحاظ کر گئے ورنہ اس وقت یہ ناچنے کے موڈ میں تھے۔

یہ بظاہر دنیا دار ہیں لیکن بباطن اللہ والے ہیں۔ اپنے رکے ہوئے کاموں کے متعلق انہیں عموماً غیب ے علم ہو جاتا ہے کہ وہ ہوں گے یا نہیں اور اگر ہوں گے تو کب اور کس وقت ہوں گے۔ انہیں اکثر القا ہوتا ہے۔ ایک بار یہ پشاور میں کسی افسر کے ہاں مہمان تھے۔ سوتے میں انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے کوئی

کوئی کہہ رہا ہو " تم اپنی جگہ سے ہٹ جاؤ"۔ صبح ہوتے ہی ان کے میزبان اپنے ہتھیار، پستول، رائفل وغیرہ دکھانے لگے۔ جب وہ ایک بندوق دکھا رہے تھے اس کی نالی طفیل صاحب کی طرف تھی۔ انہیں معاً خواب کی بات یاد آئی اور یہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور ان کے ہٹتے ہی بندوق کی گولی چل گئی۔

انہوں نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں یہ اتنے سخت بیمار پڑے تھے کہ ڈاکٹر ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ محمد نقوش کے بیان کے مطابق ان کی صحت یابی اپنی پُرخلوص دعاؤں اور غیر معمولی قوتِ ارادی کا نتیجہ تھی۔ مجھے اس بیان کی صحت سے انکار نہیں مگر جو بات طفیل صاحب نے نہیں لکھی اور مجھے سنائی وہ یہ ہے کہ انہیں سوتے میں کسی نے کہا کہ تو حلوہ کھالے تو اچھا ہو جائے گا۔ آنکھ کھلنے پر انہوں نے اشارے سے بیوی کو بلایا، اس لیے کہ نقاہت کی وجہ سے بول نہ سکتے تھے اور کہا کہ مجھے حلوہ کھلا دو۔ وہ بے چاری چکرا گئیں۔ انہیں تو پانی تک ہضم نہیں ہو رہا تھا اور یہ حلوہ مانگ رہے تھے۔ انہوں نے انکار کیا۔ اس کے جواب میں طفیل صاحب نے کہا کہ یہ میری آخری خواہش ہے۔ بے چاری بھابی رونے لگیں۔ کہا کہ گھر میں تو کوئی مجھے حلوہ بنانے نہیں دے گا، میں پڑوس سے بنا کر لاؤں گی اور آپ کو چھپا کر کھلاؤں گی۔ غرض طفیل صاحب نے چوری چھپے حلوہ کھالیا اور حلوہ کھاتے ہی ان کی صحت بحال ہونے لگی۔ بحال ہو گئی۔ ناممکن بات ممکن ہو گئی۔

بظاہر طفیل صاحب بڑے خشک معلوم ہوتے ہیں لیکن ہیں رنگین مزاج۔ ایک بار میں نے انہیں ایک غزل سنائی۔ میں نے شعر پڑھا ؎

جو کر کے چکا چوند حقیقت کو چھپا ئیں
ہم ایسے اُجالوں کو بھی ظلمات کہیں گے

انہوں نے سر ہلا دیا۔
میں نے دوسرا شعر سنایا ؎

میخانے میں ایسے بھی ہیں محرومِ نوازش
اوس اُن پہ پڑے گی تو وہ برسات کہیں گے

انہوں نے "ہوں" کر دی۔
میں نے تیسرا شعر سنایا ؎

ہاں، ترکِ تعلق پہ بھی یہ ربط ہے باقی
مل جائیں نگاہیں تو ملاقات کہیں گے

طفیل صاحب پھڑک اُٹھے۔ کھُل کر داد دی۔ غزل ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر یہ شعر پڑھوایا اور کہنے لگے کہ آپ اس زمین میں ایک غزل اور کہیے جس میں زیادہ تعداد اس قسم کے اشعار کی ہو۔ میں نے طفیل صاحب کی طرف دیکھا اور دل میں سوچا کہ "بنیادی طور پر حضرت کا مزاج عاشقانہ ہے"۔

اب طفیل صاحب یہ سوچ رہے ہوں گے کہ سہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

میں سوچتا ہوں کہ یہ شخص جو "نقوش" سے عشق کرتا ہے اگر کسی عورت سے عشق کرتا اور ناکام ہوتا تو شاعر بن جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ نوجوانی کے عالم میں ایک لڑکی نے ان سے عشق کیا، خطوط بازی بھی ہوئی۔ مگر جب بات آگے بڑھنے لگی تو یہ پیچھے ہٹ گئے۔ ایک بار، گو ازراہِ مذاق ہی سہی، تانگہ میں بیٹھی ہوئی ایک آوارہ عورت کا پیچھا اس کے گھر تک کیا اور پھر وہاں سے سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔ بظاہر تو یہ "آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنا اور بھاگ جانا" اخلاقی قیود و رسوم سے جکڑے ہوئے متوسط طبقہ کا مخصوص بزدلانہ برتاؤ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر طفیل صاحب کی افتادِ طبع کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کسی عورت سے عشق کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دماغ ان کے دل پر حاوی ہے۔ ان کی نگاہیں ایکس رے سے بھی زیادہ دروں بینی کی عادی ہیں۔ یہ دوسروں کی اچھائیاں، برائیاں، خوبیاں، خامیاں بیک نظر دیکھ لیتے ہیں اور انہیں کوئی بھی شخصیت مکمل نہیں معلوم ہوتی۔ ادھر حُسن کے متعلق ان کا معیار یہ ہے کہ وہ مکمل خوبی ہو۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ کسی عورت سے عشق نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تو کسی ایسی شے سے عشق کر سکتے تھے۔ جو بجائے خود حُسن ہو اور حُسن بھی ایسا کہ جس کا بناؤ سنگھار اور نکھار ان کے اختیار میں ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا معشوق کوئی انسان نہیں ہوسکتا۔ وہ یا تو نقوش ہو سکتا ہے یا ان کی اپنی تخلیقات۔

یہ بظاہر بڑے سیدھے سادے نظر آتے ہیں لیکن بقولِ خود ہیں اس کے برعکس۔ میرے خیال میں یہ کبھی سیدھے ہوں گے لیکن اب زمانے کی ٹھوکروں نے انہیں سیانا بنا دیا ہے۔ اب تو یہ اُڑتی چڑیا پہچانتے ہیں یہ اور بات ہے کہ مروت اور شرافت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اب بھی دانستہ دھوکا کھا لیتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر طفیل صاحب "نقوش" کے مدیر نہ ہوتے تو شخصیت نگار کبھی نہ ہوتے۔ نقوش کے عشق میں جہاں انہوں نے ادبیا پڑ بیلے وہاں ادیبوں اور شاعروں سے بھی قریبی تعلق پیدا کیا۔ لیکن یہ کام تو ہر ایڈیٹر کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بغیر تو کوئی ادبی جریدہ چل ہی نہیں سکتا۔ مگر طفیل صاحب کچھ مختلف قسم کے مدیر ہیں۔ انہوں نے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا ہی نہیں

ان کی ذات کا بھی مطالعہ کیا۔ اور اس مطالعہ کا نتیجہ وہ شخصی خاکے ہیں جو نیاز فتحپوری جیسے ناقدوں سے بھی خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔

جوہری توانائی کے موجودہ دَور میں انسان کی توجہ اُن خارجی اور مادی وسائل اور اسباب پر مرکوز ہے جو اسے چاند ستاروں پر حکمرانی کا اہل بنا سکتے ہیں۔ مادی طاقت کا حصول اور خارجی عناصر کی تسخیر ہر قوم کا مطمحِ نظر ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس رجحان کی وجہ سے انسان اپنے داخلی مسائل سے، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی غافل ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ زخم جو کبھی مرہم سے مندمل ہو سکتے تھے اب ناسُور بن چکے ہیں۔ انسانی قدریں ڈانواں ڈول ہیں، معاشرے کی بنیادیں ہل رہی ہیں اور ہماری نئی نسل کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ ایسے عالم میں انسان کی فطرت کا مشاہدہ اور ایسی شخصیات کا مطالعہ جو اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود اخلاقی اقدار اور صالح نظریات کی حامل ہیں، وقت کی ایک سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ طفیل صاحب کے شخصی خاکے اور نقوش کے وہ شمارے جو شخصیتوں سے متعلق ہیں (مثلاً شخصیات نمبر، آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر وغیرہ) اس ضرورت کو ایک بڑی حد تک پورا کرتے ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

یہ طفیل صاحب ہی کا دل گردہ تھا کہ انہوں نے اپنے معاصرین (اور معاصرین بھی وہ جو ادیب و شاعر ہیں) کی شخصیات پر قلم اُٹھانے کی جسارت کی۔ مگر کمال یہ ہے کہ لوگوں کو آئینہ دکھلانے اور بقول ان کے "رگڑنے" کے باوجود ان کی کسی سے بھی اس طرح نہیں ٹھنی جس طرح جوش صاحب اور شاہد احمد دہلوی مرحوم کے درمیان ٹھن گئی تھی۔ طفیل صاحب نے خاکہ نگاری میں جس حکمت سے کام لیا ہے وہ ان کے بھولے پن کا نہیں بلکہ فطانت اور ذہانت کا ثبوت ہے۔ لیجئے خود ان کی زبان سے سنئے کہ وہ حکمت کیا ہے؟ فرماتے ہیں:

> "میں تسلیم کرتا ہوں کہ خاکہ نگار کو حقیقت نگاری سے آنکھیں نہیں چرانا چاہیئں۔ لیکن اس کے پاس ایسا حکمت آمیز قلم ہونا چاہیئے کہ وہ کہے سب کچھ مگر اس ڈھب سے کہ ہر قدم پر پُھونک پُھونک کے انجان بنتا چلا جائے۔"

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

> اچھی باتیں تو سب کے منہ سے اچھی لگتی ہیں، بُری باتوں کو اچھے

انداز میں کہہ دینا ہی تو فن کہلاتا ہے۔"

اور اس میں شک نہیں کہ طفیل صاحب کو یہ فن آتا ہے۔ ان کے خاکوں میں جو توازن ہے وہ اسی فن کی دین ہے۔ یہ شخصیت کے فوٹو پر ایسی فن کارانہ ری ٹچنگ (RETOUCHING) کرتے ہیں کہ وہ صاحب تصویر کو بھی اچھا لگتا ہے اور دوسرے بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ تصویر وہ نہیں جو ہونی چاہیئے تھی۔

لیکن خاکہ نگاری محض فوٹوگرافی نہیں ہے۔ خاکہ نگاری اور فوٹوگرافی میں وہی فرق ہے جو انسان کی آنکھوں اور کیمرے کی شیشی آنکھوں میں ہے۔ انسان کی آنکھیں دیکھتی بھی ہیں اور سمجھتی بھی ہیں۔ کیمرے کی آنکھ دیکھتی ہے سمجھتی نہیں۔ اسی طرح خاکہ نگاری محض مصوّری بھی نہیں ہے۔ خاکہ نگاری اور مصوّری میں وہی فرق ہے جو الفاظ کی بامعنی ترتیب و تدوین اور رنگ و خطوط کی فن کارانہ ترکیب و تزئین میں ہے۔ تصویر دونوں ہی کھینچتے ہیں لیکن خاکہ نگاری کی تصویر کا عکس ذہن پر پڑتا ہے اور مصوّر کی تصویر کا عکس آنکھ کے ہیرے میں سماتا ہے۔ اس لحاظ سے خاکہ نگاری مصوّری سے زیادہ مشکل ہے۔ اگر خاکہ نگار کی ذہنی آنکھ میں ذرا بھی کھوٹ ہو تو نہ صرف یہ کہ شخصیت کی صحیح تصویر نہیں بنتی بلکہ خود خاکہ نگار کی شخصیت دوسروں کو داغدار نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فوٹوگرافر یا مصوّر کی طرح خاکہ نگار ایک بار تصویر بنا کر خود ناظر کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو جاتا بلکہ اسکی اپنی شخصیت خاکہ کی شخصیت کے ساتھ جا بجا نمایاں نظر آتی ہے۔ طفیل صاحب کے خاکوں میں توازن اسی لیے ہے کہ ان کی نظر میں کھوٹ نہیں ہے ان کی نیّت میں فتور نہیں ہے۔ یہ تو خاکے ہی ان لوگوں کا کھینچتے ہیں جن سے متاثر ہوتے ہیں یا جن سے لگاؤ ہوتا ہے۔ انہوں نے بعض شخصیتوں کو پرکھنے اور سمجھنے میں غلطیاں کی ہوں گی لیکن ان غلطیوں کے اسباب خارجی ہوں گے داخلی نہیں ہو سکتے۔

طفیل صاحب نے اپنی نیک نیتی کی بنا پر ہی یہ دعویٰ کیا ہے کہ "طرز بیان میں خامی ہو تو ہو، شخصیتوں کے مطالعہ میں مجھ سے زیادہ چوک نہیں ہوئی"۔ مگر مجھے تو ان کا طرز بیان ہی بہت پیارا لگتا ہے۔ اگر یہ طرز بیان نہ ہوتا تو طفیل صاحب کے خاکے محض روایتی تذکرے ہوتے۔ ان کا اسلوب اپنی مثال آپ ہے۔ ایسا شگفتہ مزاح آمیز، سادہ و سلیس اور رواں دواں طرز تحریر بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب کی خوبیاں واضح کرنے کے لیے غالب، پطرس، فرحت اللہ بیگ، برنارڈ شا اور چیسٹرٹن وغیرہ کے ناموں کا سہارا نہیں لینا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے طفیل کی

انفرادیت مجروح ہو جائے گی۔

ان کے بعض فقروں اور محاوروں مثلاً "مٹی ڈالو" پر شاید اہلِ زبان اعتراض کریں گے۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ یہ فقرے اور محاورے اُردو میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور طفیل صاحب کو میرا مشورہ یہ ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگ اعتراض کریں تو سُن لیجئے مگر محسوس نہ کیجئے۔ لکھیئے اور خوب دھڑلے سے لکھیئے۔ آئندہ آپ کا لکھا ہی سند مانا جائے گا۔

نقوش:

مولانا غلام رسول مہر

سیّد وقار عظیم

ڈاکٹر عبد السّلام خورشید

ڈاکٹر اختر اورینوی

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

مسعود مفتی

ڈاکٹر سلیم اختر

کرنل محمد خاں

فتح محمد ملک

اشفاق احمد

خدیجہ مستور

تحسین فراقی

حسن وارثی

○

نقوش کے بارے میں میرے تاثرات

مولانا غلام رسول مہرؔ

مجھے پیش نظر کاموں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ اطمینان سے ہر رسالہ بالاستیعاب پڑھ سکوں۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ مختلف رسالوں کے متفرق مضامین فرصت کے اوقات میں جستہ جستہ دیکھ لیتا ہوں۔ ان میں ایک رسالہ 'نقوش' بھی ہے، جس کے خاص نمبر اکثر میرے لیے حیرت و استعجاب کا موجب بنے رہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ اُردو رسائل میں خاص نمبروں کی ابتدا کب ہوئی اور کس رسالے کو اس میدان میں سبقت کا شرف حاصل ہے۔ خود میری نظر سے جو پرانے رسالے گزرے، ان میں سب سے پہلے خاص نمبر "مخزن" کا دیکھا جو دسمبر ۱۹۰۲ء میں ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی پر نکلا تھا اور اس کا نام "دربار نمبر تھا۔" "مخزن" کا سائز چھوٹا تھا اور اس خاص نمبر کی ضخامت "مخزن" کے دو ماہوار نمبروں کے برابر بھی نہ تھی۔ ہمارے عہد میں جو خاص نمبر نکلتے رہے، ان میں سے بھی اکثر دیکھے، تاہم اگر میں کہوں کہ "نقوش" نے خاص نمبروں میں یگانگی کا ایسا معیار قائم کر دیا ہے، جس کی کوئی نظیر کم از کم اُردو زبان کے رسالوں میں نہیں مل سکتی، تو غالباً اسے مبالغہ نہیں سمجھا جائے گا۔ میں نے کم از کم محض احتیاط کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے کہا، حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی زبان کے رسائل میں ایسے خاص نمبر کبھی نہیں دیکھے۔ ایک زمانے میں افغانستان کا مشہور مجلّہ "کابل" اس سے ملتے جلتے "سالنامے" نکالا کرتا تھا، لیکن یہ دوسری عالمی جنگ سے پیشتر کے دور کا ذکر ہے اور اس وقت مجلّہ "کابل" کی زبان پشتو نہیں فارسی تھی۔

'نقوش' کے خاص نمبر

"نقوش" کے خاص نمبروں کی یگانگی محض ضخامت کی فخامت یا ظاہری تحسین و تزئین تک کبھی محدود نہ رہی۔ یعنی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اوراق زیادہ سے زیادہ مقدار میں فراہم کر دیئے گئے اور سرورق کو دلآویز نقش و نگار کے ذریعے سے بہ طور خاص جاذب و کشش افزا بنا دیا گیا۔ اس سلسلے میں جو امر خصوصی توجہ کا مستحق ہے، یہ ہے کہ خاص نمبر کے معنوی لوازم کو ہر لحاظ سے پورا کرنے میں زیادہ سے زیادہ اہتمام پیش نظر

رہا۔ گویا خاص نمبر کا جو موضوع تجویز کر لیا، اس کے ہر پہلو کے متعلق جتنی معلومات ضروری سمجھی جا سکتی تھیں وہ سب فراہم کر دیں اور جو بھی خاص نمبر نکالا اسے مجوزہ موضوع کے باب میں جامع الحقائق بنا دیا گیا۔ اگر کوئی صاحبِ ذوق کسی موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ بھی فراہم کر لے اور انھیں تفصیلاً دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ذہن کا دامن اتنی معلومات شاید ہی اکٹھی کر سکے گا جو "نقوش" کے ایک خاص نمبر میں مل سکتی ہیں۔

عام شیوہ یہ دیکھا گیا کہ جب خاص نمبر نکالا جاتا ہے تو اس کا ایک حصہ مخصوص مضامین کے لیے وقف کیا جاتا ہے، باقی اوراق میں دوسرے بے تعلق مضامین ومقالات چھاپے جاتے ہیں۔ خواہ یہ سبب ہو کہ ایک ہی موضوع کے تمام مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین فراہم کر لینا سہل نہیں اور سعی و اہتمام کو آخری منزل پر پہنچانے کے لیے جس قدر صبر و دل سوزی درکار ہے، اس سے ہر ادارہ تحریر مسلسل کام نہیں لے سکتا، خواہ یہ سبب ہو کہ تخصیص کے باوجود تنوع اور بوقلمونی کو نظرانداز نہیں کیا جاتا اور خواجہ حالی مرحوم و مغفور کا یہ ارشاد مشعلِ راہ رہتا ہے کہ:

برزم میں اہلِ سخن بھی ہیں تماشائی بھی

معنوی محاسن

"نقوش" نے اس لحاظ سے بھی شیوۂ عام کی پیروی کبھی نہ کی اور اپنے اختیار کردہ مسلک ہی پر قائم رہا۔ یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ "نقوش" کا ادارۂ تحریر تنوع کی جاذبیت سے ناواقف ہے یا اسے علم نہیں کہ مضامین میں بوقلمونی کی رعایت پیشِ نظر رہے تو مختلف اذواق اور مختلف درجاتِ علم کی نگاہوں کے دامن کھنچے آئیں گے۔ حاشا وکلا۔ تاہم اُس نے خاص نمبروں کو ہمیشہ تجویز کردہ موضوع ہی سے وابستہ رکھا البتہ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے تنوع کے اہتمام میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ مثلاً اگر نمبر کسی شخصیت کے متعلق تھا تو اس کے سوانح حیات بھی شائع کیے، ان خاص کارناموں کی تفصیل بھی بتائی، جن کی بدولت اس شخصیت نے ایک خاص نمبر کا استحقاق پیدا کیا۔ اس کی سیرت کے گوناگوں پہلو بھی اُبھارے۔ مختلف اصحابِ علم و نظر کے تاثرات بھی فراہم کیے اور اس کی زیادہ سے زیادہ تحریرات و نگارشات کو بھی یکجا کر دیا۔ گویا جو کچھ اس نمبر میں چھپا، وہ برابر اصل شخصیت کے متعلق تھا۔ بایں ہمہ تمام مضامین میں زیادہ سے زیادہ تنوع موجود تھا۔ دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چُن دیئے، ہر شخص جن کھانوں کو پسندیدہ سمجھے اور اپنے ذوق کے مطابق پائے، اُٹھالے۔ باغ میں رنگ رنگ کے پھولوں کی کیاریاں سجا دیں

جن کی خوشبوئیں حد درجہ دل آویز و عنبر بیز تھیں ۔ جسے جس رنگ اور جس خوشبو کا پھول پسند ہو، اس سے اپنے باصرہ و شامہ کی تواضع فرمالے ۔ مثال کے طور پر "پطرس نمبر" کو لے لیجئے ۔ مجھے معلوم نہیں بخاری مرحوم کے سوانح حیات کبھی ترتیب پائیں گے یا نہیں پائیں گے لیکن "نقوش" کے خاص نمبر نے یہ فرض کفایہ ادا کر دیا اور وہ سب کچھ فراہم ہو گیا جو مرحوم کی سیرت و سوانح، اخلاق و عادات، علم و فضل، خدمت ملک و ملت کے سلسلے میں ضروری اور قابلِ ذکر تھا، یہاں تک کہ اُن کی بیشتر تحریریں اور تقریریں بھی شامل کر دیں ۔

یگانگی کے مختلف پہلو

"نقوش" کے دوسرے خاص شماروں مثلاً شخصیات نمبر، مکاتیب نمبر، افسانہ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر، اور منٹو نمبر وغیرہ پر مفصل بحث کروں تو ایک ضخیم مجلّہ تیار ہو جائے گا ۔ بہر حال میں نے "نقوش" کے خاص نمبروں کو مختلف وجوہ سے یگانہ قرار دیا :

۱- اتنی ضخامت کے خاص نمبر شاید ہی کسی دوسرے رسالے نے مسلسل شائع کیے ہوں ۔ کم از کم میرے علم میں کوئی مثال نہیں ۔

۲- معنوی اعتبار سے بھی ایسے نمبر کہیں نہ دیکھے یعنی ہر مجوزہ موضوع کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی گئیں ۔ کوشش یہ رہی کہ اس موضوع کا کوئی بھی پہلو اصحابِ ذوق کی نظروں سے اوجھل نہ رہ جائے ۔ بہ ایں ہمہ تنوع، بوقلمونی اور وسعتِ مشرب کے تقاضے ہمیشہ پیشِ نظر رکھے ۔

۳- یہ خاص نمبر اس انداز میں مرتب نہیں ہوئے کہ وقتی طور پر اربابِ ذوق کی دلچسپی کا سرو سامان بن سکیں بلکہ اپنے خاص عنوانوں کے متعلق گراں قدر معلومات کا یہ ایسا ذخیرہ ہیں، جسے کتب خانوں کا نچوڑ قرار دیا جا سکتا ہے ۔

۴- ان کی اہمیت کا ایک پہلو غالباً اب تک پوری طرح اُبھر نہیں سکا، اور وہ یہ ہے کہ ان نمبروں کی ایک مخصوص تاریخی حیثیت ہے ۔ دس بیس سال گزر جانے کے بعد یہ موجودہ عہد کے علم و فضل اور ذوق و مشرب کا نادر و جامع مرقع رہ جائیں گے اور محض انھیں سے ہمارے عہد کی بیسیوں خصوصیات کے متعلق زیادہ سے زیادہ روشنی مہیا کی جا سکے گی ۔

۵- "غالب نمبر" یا "پطرس نمبر" وغیرہ جیسے شماروں کو اس لحاظ سے بے حد بیش قیمت سمجھا جائے گا کہ بلند منزلت شخصیتوں کے متعلق معاصرین و احباب کے تاثرات کا کوئی بھی مرقع ان کے سوا باقی نہ ہوگا ۔

۶۔ مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر وغیرہ بھی اس لحاظ سے صد درجہ قابلِ قدر متصور ہوں گے کہ جو کچھ انکے ذریعے سے یکجا ہو چکا ہے، وہ دوسری جگہ ہرگز نہ مل سکے گا۔

دُعا

آخر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ تحریر نہ تو " دہ سالہ نمبر" کا مقدمہ و تعارف ہے اور نہ اس میں ان مضامین و مقالات کی کیفیت پیش کی گئی ہے جو دس سال کے شماروں سے منتخب کر کے یہ گراں قدر مجموعہ تیار کیا گیا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ "نقوش" کے خاص نمبروں کے باب میں اپنے تاثرات پیش کر دوں۔ ضروری نہیں کہ ادارہ "نقوش" یا اصحاب علم و فضل ان سے حرفاً حرفاً متفق ہوں۔ ان خاص نمبروں کی افادی حیثیت کے مختلف پہلوؤں کا سامنے آجانا اس لیے بھی ضروری نظر آیا کہ اگر پہلے بلا ارادہ یہ خدمات انجام پائیں تو اب ان کے لیے بالارادہ اور بالاہتمام سرگرم کوششیں جاری رہنی چاہیئں۔
آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ادارہ "نقوش" کو بدرجہا زیادہ قابلِ قدر اور بہ اعتبار نتائج و اثرات وسیع تر خدمات کا سرچشمہ بنائے:

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

بیاضِ غالب کی دریافت

مولانا غلام رسُول مہر

قدسی گہرم ہر کہ بسازد بہ من از مہر
باید کہ بنازد شرفِ علتِ ضم را

(غالبؔ)

میرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی اس وسیع پیمانے پر منائی گئی کہ سرگزشت شعر و ادب میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ رُوئے زمین کا کوئی ملک کوئی خطہ، کوئی قابلِ ذکر شہر اور قصبہ، کوئی علمی و ادبی ادارہ ایسا نہیں رہا، جس نے اس عالی منزلت اور بدیع الفکر شاعر و ادیب کی یاد میں کوئی مجلس منعقد نہ کی ہو۔ کلامِ میرزا کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے، اس کے اندازِ شعر گوئی کی پیروی شروع ہو گئی۔ فارسی اور اُردو کے علاوہ، جو میرزا کی زبانیں تھیں، دوسری زبانوں میں بھی بے شمار کتابیں چھپیں۔ ان سب کی تعداد کا صحیح اندازہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ رسالوں اور اخباروں نے صرف پاک و ہند میں جتنے خاص نمبر مرتب کیے، ان کا شمار ممکن نہیں۔ دورِ حاضر کے ترقی یافتہ وسائل نشر و اشاعت کے ذریعے سے جو کچھ ہوا اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔ غرض اس سال کے لیل و نہار کا بیشتر حصہ میرزا ہی کے ذکر میں صرف ہوا۔ ان کے کمالِ فن سے دنیا بھر کے لیے شناسائی کا موقع بہم پہنچا۔ اُردو اور فارسی کے وقار و ہر دلعزیزی کو تقویت پہنچی۔ کرۂ ارض کا شاید ہی کوئی حصہ ہو جس کے ادبی ایوان میرزا کے ذکر کی گونج سے ناآشنا رہے ہوں۔ روسیوں نے ایک خاص وضع کا نیا اور نہایت خوبصورت پھول پیدا کر کے اس کا نام "میرزا غالب" رکھ دیا۔ وہ پھول اسی نام سے خیابانوں اور چمن زاروں میں نگاہوں کے لیے طراوت اور دل و دماغ کے لیے فرحت و تشمیم انگیزی کا سروسامان مہیا کرتا رہے گا۔

ہمارے ہمسایے کے متعلق کہا گیا کہ اُس نے اُردو سے اچھا سلوک نہ کیا، حالانکہ یہ زبان اسی کے دامن میں پیدا ہوئی۔ پھولی پھلی اور معراجِ کمال تک پہنچی تھی اور یہ مختلف اللسان طبقات کی یک جائی کا ایک زندہ جاوید نشان تھی، جنہیں احوالِ روزگار نے ایک سرزمین میں جمع کر دیا تھا۔ یہ درست ہے،

لیکن آپ نے میرزا غالب کی عظمت و شوکت اور شان و شکوہ کی ندرت کاریاں دیکھیں ؟ اس ملک میں میرزا کی برسی اس والہیت سے منائی گئی کہ شاید ہی کوئی ملک اس پر تفوق و برتری کا دعویٰ کر سکے!

سب سے آخر میں یہ کہ یہ سال میرزا سے متعلق بعض نوادر کی دریافت اور تہذیب و طباعت کے اعتبار سے بھی بڑا ہی بابرکت اور ثروت مند ثابت ہوا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ برسات میں زمین سیراب و شاداب ہوتی ہے تو وہ اپنے اندر کی پوری استعداد نمو اچھال کر سطح پر پھینک دیتی ہے، "اور دامنِ خاک سر سر رو کش سطحِ چرخ مینائی" بن جاتا ہے۔ میرزا غالب تو برسات ہی کو ہندوستان کی بہار کہا کرتے تھے :

بہارِ ہند بود برشکال ، ہاں غالب
دریں خزاں کدہ ہم موسمِ شرابے ہست

فصلِ بہار کا ورود درختوں اور پودوں کے لیے نشئہ تازہ کا پیغام ہوتا ہے۔ ان کی رگوں میں زندگی کا افسردہ اور پژمردہ مادہ یکایک جاگ اُٹھتا ہے بلکہ شوقِ شہود میں کھولنے اور جوش مارنے لگتا ہے :

در شاخ بود موجِ گل از جوشِ بہاراں
چوں بادہ بہ مینا کہ نہاں است و نہاں نیست

معلوم ہوتا ہے کہ صد سالہ برسی کے سال کی ایسی ہی کوئی پُر اسرار کشش اور ایسا ہی کوئی ناشناسا جاذبہ یہ نادر ادبی خزانے منظرِ عام پر لے آیا۔ ان میں سب سے زیادہ بیش قیمت اور بے بہا گنجینہ، جسے گنجِ شایگاں کہنا چاہیئے، وہ ہے جس کی تقریب افتتاح آج ہم سب کو یہاں لائی ہے۔

باد بُرد آں گنج باد آورد و غالب را ہنوز
دیدۂ الماس پاش و چشمِ گوہر بار ہست

اس سال کا قافلۂ شوق گیارہویں منزلیں طے کر کے بارہویں میں قدم رکھ چکا ہے۔ جو اس کی آخری منزل ہے، اب ایسی کسی اور دریافت کے لیے دامنِ اُمید پھیلانے کی کونسی گنجائش باقی رہ گئی ہے ؟

میرزا نے زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں، جب گمنامی کی تاریکی ان کے گرد و پیش مسلط تھی کہا تھا :

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

بظاہر یہ شاعرانہ ادعا تھا اور کون سا شاعر ہے جس کی زبان پر ایسے ادعا جاری نہ رہے ہیں ؟ پھر

میرزا نے حیاتِ مستعار کے آخری دَور میں فرمایا تھا:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یہ بھی محض ایک تعلّی اور اپنے دل کے لیے طفل تسلّی ہی سمجھی جاتی رہی۔

تاہم ایک سو سال کے اندر اندر دُنیا پر آشکارا ہو گیا کہ یہ خالی اور خیالی دعوے نہ تھے۔ محض فکری تعلّیاں نہ تھیں۔ یہ پیشگوئیاں تھیں، جن کا مشاہدہ عملی شکل میں آج ہر جگہ کیا جا سکتا ہے اور ان کی تصدیق کے وثیقے صحیفۂ روزگار کے اوراق ایسے زریں حروف میں ثبت ہو چکے ہیں، جن کی درخشانی، انشاء اللہ رہتی دُنیا تک روز افزوں رہے گی:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما (حافظ)

عالمی شاعروں کا ذکر جہاں بھی چھڑے گا۔ ان کی فہرست کتنی ہی محدود رہے، تاہم میرزا کا نام ان میں ضرور شامل ہوگا، جو نسلاً ترکستانی، مولداً اکبر آبادی، موطناً دہلوی اور بہ اعتبارِ کمالِ فن عالمی تھے۔ دیکھئے قدرت اربابِ کمال کو مختلف انتسابات سے نکالتی ہوئی کس طرح اس مقامِ بلند پر پہنچا دیتی ہے، جہاں محدود انتسابات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ جہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کوئی کہاں کا ہے؟ کس نسل اور کس خاندان سے ہے؟ اس نے کہاں تربیت حاصل کی؟ کہاں زندگی گذاری؟ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے فطری جوہروں اور کمالِ ہنرمندی کا درجہ، مرتبہ اور کیفیت کیا ہے؟

گر تنزّل نبود ابرِ بہاری غالبؔ
کہ دُر افشانی و زر افشانی و شمارے نہ دہی

جس نسخۂ نادرہ کا افتتاح ہمیں یہاں لایا ہے اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں، لیکن انتہائی تعجب کا مقام ہے کہ یہ نسخہ بھی بھوپال پہنچا۔ جہاں اس سے پہلے یا بعد وہ نسخہ پہنچ چکا تھا جو اب "نسخۂ حمیدیہ" کہلاتا ہے۔ "نسخۂ حمیدیہ" ۱۹۲۱ء میں چھپ کر شائع ہو گیا لیکن یہ نسخہ، جس نے "نسخۂ امروہیہ" کے نام سے شہرت پائی، بدستور گوشۂ خمول میں پڑا رہا۔

اس سے بھی بڑھ کر تعجب اس امر پر ہے کہ جس شخص کے پاس یہ نسخہ موجود تھا، وہ اس کی حقیقی حیثیت اور قدر و قیمت سے کاملاً ناآشنا رہا۔ حالانکہ جانتا تھا، یہ میرزا غالبؔ کا لکھا ہوا ہے۔ اس نے صرف پچیس روپے قیمت بتائی اور گیارہ روپے میں اسے فروخت کر دیا۔ جس نے اسے خریدا،

وہ زیادہ ہوشمند تھا۔ اُس نے چند ہی گھنٹے بعد دہلی پہنچ کر اس کی دریافت کا اعلان کیا تو قیمت کم از کم چھ ہزار روپے مقرر کی۔ گویا جو نسخہ پہلے مالک کے نزدیک محض پتھر کا ایک ٹکڑا تھا، وہ دوسرے مالک کے ہاتھوں پہنچتے ہی "کوہ نور" بن گیا۔ کیونکہ وہ جوہری تھا یا جوہری ثابت ہوا۔

پھر تعجب کا آخری مرحلہ پیش آیا جس کے سامنے پہلے دونوں مرحلے بے حقیقت رہ گئے۔ جب اس نسخے کی دریافت کا اعلان ہوا تھا، اس کی اشاعت کے لیے ہماری نگاہیں ہندوستان پر جمی ہوئی تھیں۔ انتظار میں تھے کہ دیکھیں یہ کب چھپے؟ کہاں چھپے؟ کون چھاپے؟ پھر اس کی زیارت سے کیوں کر شرف اندوز ہوں؟ کیونکہ پاک و ہند کے تعلقات میں جو گرہیں پڑی ہوئی ہیں اس کے پیش نظر ایک ملک میں کسی کتاب کا چھپ جانا ہی کافی نہیں۔ دوسرے ملک میں رہنے والوں کے لیے اس کا حصول بھی ہفت خوان رستم سے کم نہیں۔ حالانکہ اس مدت میں ہمارے عزیز دوست محمد طفیل صاحب مدیر "نقوش" نہایت اطمینان و دلجمعی سے بیٹھے ہوئے انتہائی اہتمام کے ساتھ اسے چھاپ رہے تھے۔

میرزا غالب کا ایک مشہور شعر ہے:

سادہ پُرکار ہیں خُوباں غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

ہمارے دوست محمد طفیل صاحب جو کبھی کبھی ایڈیٹری کی سرمستی میں اپنے آپ کو محمد نقوش بھی لکھتے رہتے ہیں، اُن اوصاف سے مزیّن ہیں، جو میرزا کے نزدیک حسینوں سے مختص تھے یعنی سادگی اور پُرکاری۔ پھر ان وصفوں میں اُنھوں نے بظاہر کسی مشق کے بغیر ایسا کمال بہم پہنچا لیا ہے، جو حسینوں کو فطری بخششوں اور عطیوں کے بعد عمر بھر کی ریاضت سے بھی شاید ہی حاصل ہُوا ہو۔

اتنی بڑی دولت ان کے قبضے میں تھی، مگر صاحب! ان کے ضبط و ہضم کی داد کے لیے الفاظ مساعدت نہیں کرتے بھنک تک سنائی نہ دی۔ لبوں پر مہر سکوت، دل و دماغ اور کام و زبان پر پورا قابو۔ اس کاروبار بر دیں پردہ خفا میں بھی اپنے آپ کو ان کے نیاز مندوں یا بہ اعتبار عمر دعاگوؤں میں سمجھتا تھا اور اہل علم میں سے نہ سہی مگر مولانا شبلی مرحوم کے قول کے مطابق یہ

دوستاں تہمت ایں شیوہ بہ ما نیز کنند

میں تو کلام نہ تھا۔ ایک روز یکایک اخبار میں پڑھا کہ راولپنڈی میں اس نسخے کی طباعت پر ایک

تقریب منائی گئی۔ یقین رکھیے کہ یقین نہ آیا کہ یہ وہی نسخہ نادرہ ہوگا جس کے انتظار میں نگاہِ شوق ہمسایہ ملک پر جمی ہوئی تھک کر لڑکھڑانے لگی تھی۔ تاہم آج یہ سب کچھ اسی طرح ہمارے سامنے حقیقتِ ثابتہ کی صورت میں پیش ہے، جس طرح اپنے متعلق میرزا غالب کے پیشگویانہ تصورات و تاثرات حقیقتِ ثابتہ بن چکے ہیں۔

میرا احساس یہ ہے کہ یہ میرزا غالب کے متعلق آخری بڑی دریافت ہے۔ کیونکہ بظاہر یہ میرزا کے مستند اُردو کلام کا پہلا مجموعہ ہے، جس کے بعد وہ فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے اور اُردو میں گنتی کی نئی غزلوں کے سوا کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ کہے ہوئے کلام میں جزوی ترمیمیں ضرور کرتے رہے یا ممکن ہے انہوں نے کہیں کہیں چند شعروں کا اضافہ کر دیا ہو۔ یہی نسخہ "نسخۂ حمیدیہ" کی اصل واساس بنا۔ اسی میں تھوڑا سا اضافہ ہوا تو وہ نسخۂ شیرانی کہلایا۔ پھر خاصی لمبی مدت تک وہ اپنے آپ کو اُردو کے بجائے فارسی ہی کا شاعر سمجھتے رہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ کے دربار سے وابستگی کے بعد اُردو اشعار کہے۔

اس نسخے کی تاریخِ کتابت کا معاملہ میرے نزدیک مزید غور و فکر کا محتاج ہے۔ میرزا نے اختتامی تحریر میں صرف تاریخ، مہینا اور دن بتایا، یعنی رجب کی چودھویں تاریخ اور سہ شنبہ، سال نہ لکھا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ تاریخ، مہینے اور دن کی بناء پر ۱۲۳۱ھ کا سال کیونکر متعین کر لیا گیا؟ اس حقیقت کے اعادے کی ضرورت نہیں کہ رجب کے مہینے میں چودھویں تاریخ کو منگل اسی صورت میں آئے گا کہ اس مہینے کا آغاز چہارشنبہ یعنی بدھ سے ہو۔ ۱۲۳۱ھ میں رجب کا آغاز سہ شنبہ یعنی منگل سے ہوتا ہے اور ۱۴ رجب کو چہارشنبہ یعنی بدھ نکلتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر رجب سے پیشتر کے مہینے یعنی جمادی الاخریٰ کو تیس دن کے بجائے انتیس دن کا مان لیا جائے تو ۱۴ رجب کو سہ شنبہ یعنی منگل ہوگا۔

عجیب امر یہ ہے کہ مروجہ تقویم میں جمادی الاخریٰ کو انتیس ہی کا مان کر رجب کا آغاز سہ شنبہ سے کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ دلیل تو کارآمد معلوم نہیں ہوتی۔ نیز پیشِ نظر حساب میں ایک دن گھٹا لینے سے پورے حساب میں اس دن کا وجود ختم نہیں ہو جائے گا۔ جمادی الاخریٰ میں ایک دن گھٹایا جائے گا تو وہ جمادی الاولیٰ میں بڑھ جائے گا اور معاملہ بہر حال وہیں رہے گا جہاں تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مروجہ تقویم کو پیشِ نظر مقصد کے لیے ساقط الاعتبار قرار دے لیا جائے۔

میں نے خود چھان بین میں کچھ وقت صرف کیا تو معلوم ہوا کہ ۱۲۴۳ھ (جولائی ۱۸۲۷ء) سے

پیشتر رجب کے صرف دو مہینے ایسے ہیں، جن کا آغاز چہارشنبہ سے ہوا:

(۱) رجب ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) جب میرزا غالب کی عمر سولہ سال کی تھی۔

(۲) رجب ۱۲۳۶ھ (یہ سال ۹ اکتوبر ۱۸۲۰ء سے شروع ہوا) جب میرزا زندگی کے چوبیس مرحلے طے کر چکے تھے۔

سولہ برس کی عمر تک میرزا کے پاس ایسے اُردو اشعار کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع نہ ہُوا ہو گا۔ کیونکہ ان کے جو شعر محفوظ رہے اور مستند مانے جاتے ہیں، ان کی ابتدا پندرہ برس کی عمر سے ہوئی۔ لہٰذا تسلیم کر لینا چاہیئے کہ زیر غور نسخۂ نادرہ کی تکمیل تحریر ۴ ار رجب ۱۲۳۶ھ کو بروز شنبہ ہوئی یعنی ۷ اپریل ۱۸۲۱ء کو۔ جب تک کوئی دوسرا مستند ثبوت بروئے کار نہ آئے۔ میرے نزدیک یہی تاریخ صحیح ہے۔

اصل نسخے کے حاشیے پر ایک جگہ میرزا غالب نے لعل خاں نام کسی شخص کو ملازم رکھنے کی یادداشت لکھی ہے اور وہ تحریر صفر ۱۲۳۵ھ کی ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لعل خاں کو ملازم رکھنے کے وقت تک یہ نسخہ زیر تحریر تھا اور بالآخر یہ ۴ ار رجب ۱۲۳۶ھ کو مکمل ہوا۔

نزاعی مسائل چھیڑنے کا یہ محل نہیں لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اب بھی سنجیدہ مذاق کے علم دوست حضرات میرزا غالب اور میر تقی مرحوم والے قصے کو حقیقت سمجھتے ہیں!

میر تقی مرحوم کا انتقال ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ (۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء) کو ہوا۔ اس وقت میرزا غالب کی عمر تیرہ سال، ایک مہینے اور بارہ دن کی تھی۔ میر تقی مرحوم آخری دَور میں بہت بیمار رہے۔ عام روایت کو درست فرض کیا جائے تو میرزا کا جو کلام میر کے سامنے پیش کیا گیا ہو گا، وہ بارہ ساڑھے بارہ برس ہی کی عمر میں کہا گیا ہو گا۔

میرزا غالب بڑے بلند پایہ شاعر تھے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بارہ سال کی عمر میں ایسے شعر کہتے تھے جیسے پیش نظر مجموعے میں ہیں۔ انہوں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں ضرور پڑھ لی ہوں گی، لیکن میرزا بیدل کا کلام تو وہ سمجھنے کے قابل بھی نہ ہوئے ہوں گے چہ جائیکہ اس کی پیروی میں اُردو شعر کہتے۔ اس زمانے میں ایسے شعر کہتے ہوں گے:

ایک دن مثل پتنگ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادگی

وغیرہ ایسا کلام نہ میر تقی مرحوم کے سامنے پیش ہو سکتا تھا، نہ وہ ویسی رائے ظاہر کر سکتے تھے جیسی ان سے منسوب ہے۔

پھر اصل رائے حد درجہ تعجب انگیز ہے، جس کے کسی بھی حصّے کو میر تقی مرحوم کی مسلّمہ عظمت سے کوئی مناسبت نہیں۔ فرماتے ہیں:

"اگر اس لڑکے کو کوئی استاد کامل مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔"

اب غور فرمائیے:

۱۔ یہ رائے شاعری میں اُستادی شاگردی کے عام سلسلے کو مسلّم مان کر پیش کی گئی ہے حالانکہ وہ غیر مسلّم ہے۔ مثلاً میرزا غالب شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اقبال کی اصل شاعری میں ان کا کوئی اُستاد نہ تھا۔ میرزا داغ کی شاگردی کے زمانے کی غزلیات میں سے شاید کوئی بھی اقبال کے مستند کلام میں شامل نہیں۔

۲۔ غالب کو کوئی کامل یا غیر کامل اُستاد نہ ملا، جو اسے سیدھے راستے پہ ڈال دیتا۔ فطرت نے خود اس کی رہنمائی کی۔

۳۔ معلوم ہے کہ غالب لاجواب شاعر بن گیا اور مہمل نہ بکتا رہا، حالانکہ میرزا کو سیدھے راستے پر ڈال دینے والے کسی استاد کا سراغ آج تک نہیں مل سکا۔ اس سے میر تقی مرحوم کی شعری بصیرت اور حقیقت شناسی کے کون سے پہلو کو تقویت پہنچتی ہے؟ ہاں، کوئی شخص روایات کو مسلّم مان کر توجیہات میں پڑا رہنا گوارا سمجھ لے، اگرچہ وہ توجیہات بارِدہ ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں۔ اس نادر نسخے کے ساتھ طفیل صاحب نے بعض اور نوادر بھی شامل کر دیئے ہیں۔ مثلاً مولانا عباس بھوپالی کے نام میرزا کے دو غیر مطبوعہ فارسی خط، بعض اور مکاتیب کے عکس، غالب کے سات فارسی خط بنام تفضل حسین خاں مع تصریحات و ترجمہ و عکس، یہ فاضل مکرم سیّد وزیر الحسن صاحب عابدی کے مرتبہ ہیں جن کے ابرِ فیض سے جتنی زیادہ سعیِ کرم کی آرزو رہتی ہے، وہ پوری نہیں ہوتی یعنی ہماری تشنگی اور تشنہ لبی پر انہیں ترس نہیں آتا۔ "گلِ رعنا" کے بعض اوراق کے عکس۔

البتہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اصل نسخے میں انتہائی اہتمام کے باوجود غلطیاں رہ گئی ہیں جن کا ذکر یہاں نہیں کروں گا۔ یہاں تک کہ "ابو المعانی" بیدل کو ابوالمعالی بنا دیا گیا ہے۔

اس نسخے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۲۱ء تک میرزا غالب پر بیدل کا اثر بہت زیادہ تھا شاید ایک دو سال اور بھی رہا ہو لیکن جب اُنھوں نے فارسی اختیار کر لی تو یہ اثر جلد زائل ہو گیا۔

اس تبدیلی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم نے بھی "شعر العجم" میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایرانی شاعری

میں قاآنی نے انقلاب پیدا کیا، ساتھ ہی ہندوستان کی فارسی شاعری میں بھی انقلاب آیا۔

"شاعری کا جو مذاق ناصر علی وغیرہ کی بدولت سیکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا، درست ہو چلا، میرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے لیکن عرفی، طالب آملی، نظیری اور کلیم کی پیروی نے انھیں سنبھالا...... میرزا غالب کی طبیعت میں نہایت شدت سے اجتہاد اور جدت کا مادہ تھا۔ اگرچہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں۔ تاہم اپنا خاص انداز بھی نہیں چھوڑتے۔

پھر چند مثالیں دی ہیں۔

آخر میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میرزا غالب کے اس کلام میں بھی جو زیادہ سے زیادہ چوبیس برس کی عمر تک کا ہے، اردو کے بہت سے شعر موجود ہیں جن کی مثالیں ہماری غزلیہ شاعری میں بہت کم ملیں گی۔ مثلاً:۔

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سر تا سرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی، زبانیِ شمع

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اپنے کلام پر آپ اصلاح دینے کی مثالیں بھی کم نہیں۔ مثلاً:

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے حساب بے گنہی اے خدا نہ مانگ

آخری مصرع بدل کر یوں کر دیا گیا۔

مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے:

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تاب دردِ نومیدی
کفِ افسوس سودن عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

آخر میں یہ شعر یوں ہو گیا:

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تاب رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

اچھے شعروں میں سے چند یہ بھی ہیں:

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے اسدؔ
شوقِ عنان گسیختہ، دریا کہیں جسے

اسدؔ کی جگہ بعد میں "نہاں" بنا دیا گیا۔

نقوش اور طفیل

سیّد وقار عظیم

مجھے بڑے اختصار کے ساتھ، نقوش اور طفیل کے متعلق یا ان دونوں کے باہمی رشتے کے متعلق جو کچھ عرض کرنا ہے اس سے پہلے کچھ اعداد و شمار پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آج ہم نقوش کی بیسویں سالگرہ منانے کے لیے یک جا ہوئے ہیں، اس لیے کہ نقوش کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۴۸ء میں چھپا تھا۔

۱۔ اُس وقت سے اس وقت تک اس کے ۱۰۹ شمارے چھپے۔

۲۔ ان میں سے ۴۸ شمارے خاص نمبر ہیں اور ۶۱ شمارے عام نمبر۔

۳۔ ان سب شماروں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۳۱۳۵۸ ہے۔

۴۔ ان ۳۱۳۵۸ صفحوں میں مختلف اصناف سے تعلق رکھنے والی نگارشات کی تعداد یہ ہے۔

ڈرامے	۲۶
ناولٹ	۱۲
افسانے	۹۲۸
نظمیں	۷۴۵
غزلیں	۲۰۸۴
مضامین	۱۴۷۱
خطوط	۳۶۸۹

(کل مشمولات ۸۹۵۵)

ان اعداد سے محترم قاضی عبدالودود صاحب اور عزیزی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب جو نکتے پیدا کریں گے ان تک میرے ذہن کی رسائی نہیں، البتہ بعض بدیہی نتائج میں نے بھی نکالے ہیں۔ ۳۱ ہزار سے زیادہ صفحوں کا یہ ضخیم دفتر (کہ جس کے ہر صفحے میں ۲۷ سطریں اور ہر سطر میں اوسطاً ۲۵ لفظ ہیں) اگر ایسے زمانے میں مرتب ہوا ہوتا جب کوئی بڑی مہم سر کرنے والوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں بٹھا کر سونے میں تول دیا جاتا تھا تو محمد طفیل کو ان کی جان کا یہی صلہ مل جاتا اور وہ ہنسی خوشی گھر لوٹ کر آتے۔ اب

جو کچھ ہوا ہے اس کی داستان بڑی دردناک ہے۔ نقوش ۱۹۴۸ء میں چھپنا شروع ہوا اور اسی سال طفیل اتنے بیمار پڑے کہ وہ اچھے ہوئے تو سب نے جانا کہ آج انہیں نئی زندگی ملی ہے۔ طفیل کا سر جان آفریں کے آگے جھک گیا اور انہوں نے نئی زندگی کا سفر احسان مندی کے ایک تازہ جذبے اور احساس کے ساتھ شروع کیا۔ کچھ کرنے اور کچھ کر کے زندہ رہنے کی آرزو اس سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس سفرِ شوق میں خلوص، انہماک، عزمِ راسخ، مروّت، ایثار، حق پسندی، یقین، خود اعتمادی نے زادِ راہ کا کام دیا ہے اور شوق کی بلندی اور ہمت کی استقامت نے برابر کا حصہ لے کر دس برس کی مدت میں نقوش کو اردوئے معلیٰ، مخزن، صلائے عام، زمانہ، ساقی، ہمایوں اور نیرنگِ خیال کا حریف بنا دیا۔ آزادی نمبر، امن نمبر، ناولٹ نمبر، افسانہ نمبر، غزل نمبر، شخصیات نمبر، طنزو مزاح نمبر، مکاتیب نمبر اس دور کے خاص نمبر تھے۔ ان نمبروں نے خاص نمبر کے مفہوم اور معنی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ نمبر ہمیشہ کے لیے ادیب سے شناسائی اور معرفت کا وسیلہ بنے، انہوں نے اہم ادبی اصناف کی ابتدا اور ارتقا کی داستان بھی سنائی اور ادب کے تخلیقی عوامل کی نشان دہی کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ان خاص نمبروں کی حیثیت ادب اور ادیب پر کام کرنے والوں کے لیے ناگزیر، مآخذ اور منابع کی ہو گئی۔ ان کے ذریعے ماضی اور حال کے باہمی رشتوں کا سراغ لگانے کے راستے کھل گئے۔ ان میں عہدِ حاضر کے انسان کا قلب اور ذہن محفوظ ہو گیا۔ زندگی سے محبت اور اس کی ترجمانی، تفسیر، تنقید، اصلاح اور رہنمائی کا جو فریضہ ادیب نے انجام دیا، ان خاص نمبروں کے اوراق اس کی دستاویز بن گئے۔ جن ادیبوں کا رشتہ ادب کے ساتھ اب محض وضعداری کا رشتہ ہے نقوش نے ان کے غیر فانی مرقعوں کو محفوظ کیا اور جن ادیبوں نے پہلے پہل افسانے اور غزل کی دنیا میں قدم رکھا۔ وہ ان کے نقشِ اوّل کا امانت دار بنا......

نقوش کے ان نمبروں میں سے اور بھی بے شمار چیزیں نکلتی اور ابھرتی ہیں اور ان سب چیزوں کے لیے قیام اور بقا ہے، لیکن جو کچھ میری اپنی نظر میں سب سے زیادہ ابھرتا ہے وہ اس کا مدیر ہے اور اس مدیر کے پیکر میں چھپا ہوا ادیب اور انسان، جو پہلے محمد طفیل تھا اور نقوش کے ابدی اور ازلی رشتے کی بدولت محمد نقوش تک کا سفر، اس سخت کوشش اور سخت جان انسان نے نہ جانے کتنے صحراؤں میں سے گزر کر، کتنی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر، کتنے سمندروں میں ڈوب کر اور کتنے پہاڑوں پر چڑھ کر طے کیا ہے۔

۱۹۴۸ء کی طرح ۱۹۶۰ء میں ایک مرتبہ پھر وہ حیات و ممات کی کشمکش میں مبتلا ہوا۔ میری آنکھوں نے دیکھا کہ اس نے چائے کی پیالی کو منہ لگایا اور چائے کے چند قطرے اسے ہوش کی دنیا سے کہیں اور

لے گئے ...... بے ہوشی، نبضوں کا غائب ہو جانا اور پھر امید و بیم کے کئی مہینے، لیکن محمد طفیل نے بڑی رازداری کے انداز میں اپنے اللہ سے محمد نقوش بننے کا جو عہد کیا تھا اس عہد کی خاطر اللہ نے اسے ایک زندگی اور دی اور اس نئی زندگی میں اُس نے نقوش کو زندۂ جاوید بنا دیا ...... اور اب مجھے محمد طفیل اور محمد نقوش میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ہم دونوں کے ممنونِ احسان ہیں۔ اگلی نسلیں بھی اس احسان کا بار محسوس کریں گی اور یہ دونوں نقش جو باہم ایک دوسرے کا عکس بن گئے ہیں ہمیشہ قائم رہیں گے ...... لیکن میں ایک بات اور بتاتا چلوں۔ نقوش سے طفیل کا پہلا رشتہ مدیر کا ہے۔ اس رشتے کی نشانیاں وہ چھوٹے چھوٹے اداریے ہیں جنھیں طفیل نے "طلوع" کا نام دیا۔ طلوع کے لہجے اور انداز پر جو جو اعتراض ہوئے ان کی فہرست بڑی طویل ہے، لیکن ان کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ ان اداریوں نے ان سے بہت سے دوستوں کی دوستی چھین لی اور سیدھی سادی رنجشیں طول کھینچ کر سرگرانیاں بن گئیں، لیکن سچ پوچھئے تو طلوع کی شکل میں اداریوں کا یہ مخلصانہ سرمایہ نقوش کے سارے اونچ نیچ کی کہانی ہے اور نقوش کی طویل داستان میں معنویت انھی بے باکانہ اداریوں سے پیدا ہوتی ہے، اور اب نقوش کے تازہ اداریوں کو غور سے دیکھئے تو ان کے لہجے میں گلہ شکوہ کہیں نہیں، دل پر چوٹ لگانے والی دلسوزی اور دردمندی البتہ ہے ...... لہجے کا ذکر آیا تو محمد طفیل کے لکھے ہوئے وہ خاکے یاد آ گئے جو صاحب آپ، اور جناب کی شکل میں محفوظ ہیں۔ خاکہ نگاری کے متعلق خاکہ نگار کے اپنے نظریات ہیں۔ وہ انسان کو فرشتہ سمجھ کر ذلیل نہیں کرنا چاہتا، وہ اسے دیوتا اور اوتار تصور نہیں کرتا اور اس لیے بڑی صاف گوئی اور بے خوفی سے بزرگی کا لحاظ کیے بغیر، جاننے والوں کے متعلق سچی باتیں کہتا ہے اور ایسے لفظوں میں کہتا ہے جنھیں سن کر آدمی چونک پڑتا ہے۔ ان لفظوں میں پڑھنے والے کو احتیاط کی کمی کے علاوہ کہنے والے کے انا کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے — وہ انا جس کے زیر اثر وہ عبدالحق، رشید احمد صدیقی، پطرس، شاہد احمد دہلوی، اور عصمت کی خاکہ نگاری میں کوئی نہ کوئی عیب دیکھ لیتا ہے۔ شکر ہے کہ خاکہ نگار محمد طفیل کے انا پر اب عجز و انکسار کا رنگ چڑھ رہا ہے اور اس کی بیباکی احتیاط کی پابند ہو رہی ہے۔ یقین ہے کہ ان دونوں باتوں میں بیان کی لطافت اور نزاکت بھی شامل ہوتی رہی تو اس کے لکھے ہوئے خاکوں میں جو بلاشبہ ایک منفرد اسلوب کے حامل ہیں، عبدالحق کے نام دیومالی، رشید احمد صدیقی کے ایوب، پطرس کے مرحوم مرزا، عصمت کے دوزخی، منٹو کا گنجا فرشتہ اور شاہد احمد دہلوی کے اُستاد بندو خاں کی جھلکیاں بھی دکھائی دینے لگیں گی۔

محمد طفیل نے بیس سال تک نقوش نکال کر کیا کھویا کیا اور کیا پایا ـــــ اگر ہم زندگی کے عام رواج کے مطابق نفع نقصان، سود وزیاں اور واجبات و واصلات کو کھونے اور پانے کا معیار بنائیں تو میرا اندازہ یہ ہے کہ ۲۲۵۳ غیر مطبوعہ خطوں کے اس شمارے کی تکمیل اور تقسیم کے بعد نقصان کے کھاتے میں ان کا شمار لکھ پتیوں میں ہوگا ـــــ نقصان کے اس سودے کو محمد طفیل نے بجا طور پر نفع کا سودا سمجھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شوق کی سربراہی میں اُنھوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا وہ شوق، شیفتگی، وارفتگی اور دیوانگی کے مرحلوں سے گزرتا ہوا اب جنون کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے اور مجھے میرؔ کے دو شعر یاد آ رہے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے ؎

قیس کا ذکر مری شانِ جنوں کے آگے
اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

لیکن اپنے جنون کا ذکر طفیل اب جس عجز وانکسار اور جاں سوزی کے ساتھ کریں گے اس کا لہجہ یہ ہوگا: ؎

دل تڑپے ہے، جان کھپے ہے، حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہیں ہیں، مجنوں کیا ہم سا ہوگا

طفیل نے نقوش بن کر ادب اور صحافت کی دنیا میں جنون کی جس نئی راہ کی طرح ڈالی ہے وہ قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ داد بھی اور ہماری رسم نے ہمیں جنون کی داد دینے کا صرف ایک طریقہ سکھایا ہے کہ ہم اپنے سینوں کو سدا اپنے مجنونوں کی یاد سے آباد رکھتے ہیں۔

مجلّاتی صحافت میں "نقوش" کا مقام

ڈاکٹر عبدالسّلام خورشید

ہم قومی سطح پر سوچیں، یا بین الاقوامی سطح پر، جب مجلّاتی صحافت کی اصطلاح سامنے آتی ہے تو تصور کے پردے پر صرف ادبی رسائل نمودار نہیں ہوتے، بلکہ وہ تمام عوام پسند ہفت روزہ، پندرہ روزہ ماہانہ اور سہ ماہی رسائل بھی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ جو اگرچہ علم و ادب کے فروغ میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن ایسا خیال افروز مواد بہت کم پیش کرتے ہیں جو اہلِ دانش اور اہلِ علم کے لیے بھرپور علمی غذا کا کام دے۔ بہر حال اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجلّاتی صحافت میں عوام پسند رُجحانات نے خالص علمی اور ادبی رسائل کو پسپائی پر مجبور کر دیا ہے۔ ایسے رسائل دُنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ اہلِ علم انھیں ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ لیکن اہلِ علم کی تعداد ہر معاشرے میں کم ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے رسائل کی اشاعت بھی محدود ہوتی ہے۔ اس سے یہ مطلب اخذ کرنا درست نہیں کہ اشاعت کم ہونے کی وجہ سے ان کا دائرۂ اثر بھی محدود ہے۔ چونکہ ان کے قارئین اہلِ علم اور اہلِ دانش ہوتے ہیں اور وہی معاشرے میں رہنمائی کا فرض سرانجام دیتے ہیں اس لیے محدود اشاعت کے باوجود ان رسائل کا اثر ذہنوں پر بہت گہرا ہوتا ہے۔

مجلّاتی صحافت میں "نقوش" کے مقام کا تعین کرنے کے لیے ہمیں اس کا مطالعہ عوام پسند رسائل کی روشنی میں نہیں، خواص پسند رسائل کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ ایسے رسائل کے لیے دُنیا میں مختلف اصطلاحات رائج ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں ان رسائل کے لیے "کوالٹی میگزین" کی اصطلاح رائج ہے اور اشتراکی دُنیا میں "کلچرل میگزین" کی بعض مغربی ممالک میں انھیں HIGH - BROW ہائی بُرو میگزین بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ رسالے جو بلند ذہنی سطح کے لوگ پڑھتے ہیں۔ اپنے ہاں رسمی طور پر ایسی تمیز کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ لیکن جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہ کون سے رسالے عوام پسند ہیں اور کون سے خواص پسند۔ کون سے کم و بیش تفریحی مواد پیش کرتے ہیں اور کون سے خیال افروز تحریریں مہیّا کرتے ہیں۔ پس اس مقالے میں میں صرف خیال افروز علمی و ادبی صحافت کی روشنی میں یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ "نقوش" کا مقام کیا ہے۔

برِعظیم میں مجلّاتی صحافت کا آغاز خالص علمی رسائل سے ہوا جو کم و بیش سوا سو سال پہلے

اجنبی راج کی سرپرستی میں جاری ہوئے۔ مقصد یہ تھا کہ برعظیم کے پڑھے لکھے لوگوں کو بتایا جائے کہ جس اجنبی طاقت کے زیرِ سایہ وہ زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ ایک علمی نشاۃِ ثانیہ کی نقیب ہے۔ ہمارا پہلا آزاد رسالہ "تہذیب الاخلاق" تھا۔ جسے سرسیّد نے جاری کیا۔ اور اس کے ذریعے سے نہ صرف اسلامی معاشرے میں علمی تجدد کو فروغ دیا بلکہ اُردو زبان میں ایک ایسے مقصدی ادب کی بنیاد رکھ دی جس نے آگے چل کر اُردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور اُسے جمود سے نجات دلا کر اس قابل کر دیا کہ وہ نئے خیالات اور نئے اسالیب کو اپنے آپ میں سموئے۔ اور اس طرح معاشرے کی خدمت کا فرض سرانجام دے "تہذیب الاخلاق" کی تقلید میں کئی رسالے نکلے اور انہوں نے اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اس تحریک کو آگے بڑھایا۔

ہماری مجلاتی صحافت میں "مخزن" کو دوسرے سنگِ میل کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ بھی محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک کا علمبردار تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اُردو ادب کو نئی اصناف سے آشنا کیا جائے نثر اور شاعری میں نئے تجربے کیے جائیں اور مغربی ادب کے شہ پارے اُردو میں منتقل کیے جائیں۔ اس دَور میں کچھ اور رسائل بھی نکلے۔ جن میں عبدالحلیم شررؔ کا "دلگداز"، اکبر شاہ نجیب آبادی کا "عبرت" محمد دین فوق کا "کشمیری میگزین" اور مولانا ظفر علی خان کے دو رسالے "دکن ریویو" اور "پنجاب ریویو" نمایاں تھے۔

اس صدی کے آغاز میں جب سیاست منظرِ عام پر آئی تو چند ایسے رسائل نکلے جو ادب اور سیاست کا امتزاج پیش کرتے تھے۔ وہ ادب کی کلاسیکی روایات کے عکاس تھے اور سیاست کے جدید رجحانات کے علمبردار تھے ان میں حسرت موہانی کا "اُردوئے معلّٰے" بدرالزماں بدرؔ کا "شمس بنگالہ" ظفرالملک علوی کا "الناظر" دیا نرائن نگم کا "زمانہ" سید سلیمان ندوی کا "معارف" اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا "جامعہ" اور انجمن ترقی اُردو کا "اُردو" شامل ہیں۔ مؤخر الذکر رسالہ سیاست سے خالی تھا لیکن باقی رسائل میں سے بعض میں سیاست نمایاں تھی اور بعض میں علم السیاست، تاریخ اور عمرانیات۔ ان رسالوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ایک تو نئی کتابوں پر مخصوص تبصرے کیے جاتے تھے، دوسرے علمی اور تہذیبی خبریں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں پیش کی جاتی تھیں۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد عوام پسند ادبی رسائل کا دَور دورہ ہوا۔ ان میں "کہکشاں"، "ہزار داستان"، "خیالستان"، "رومان" اور بعض دوسرے رسالے تو شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے، لیکن "نگار"، "ساقی"، "نیرنگِ خیال"، "عالمگیر" "ہمایوں"، "ادبی دنیا" اور "ادبِ لطیف" نے طویل زندگی پائی اور ماشاء اللہ

ان میں سے چند رسائل اب بھی زندہ ہیں، ان رسائل نے نئے ادیبوں کے فن کو نکھارنے اور اُن کی حوصلہ افزائی میں اتنا نمایاں کردار ادا کیا کہ نہ صرف مجلاتی صحافت کی تاریخ میں بلکہ اُردو ادب کی تاریخ میں بھی اُنھیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ یہ رسالے صرف عوام پسند نہیں تھے خیال افروز بھی تھے اور یہ علم و ادب کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتے تھے کہ اہلِ دانش اُنھیں قدر کی نظروں سے دیکھتے رہے۔

اسی دَور میں یہ کوشش ہوئی کہ رسالوں کے خاص نمبر نکالے جائیں۔ جن میں کسی مخصوص موضوع پر بھرپور مواد پیش کیا جائے۔ "نیرنگِ خیال" سے سالناموں کا آغاز ہوا۔ جو اگر اُس زمانے کی پروڈکشن کے معیار کی روشنی میں دیکھے جائیں تو ایک عظیم کارنامے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی مخصوص موضوع پر خاص نمبر کا آغاز بھی "نیرنگِ خیال" سے ہوا جس نے پہلی مرتبہ "بانگِ درا" کے سائز میں تین ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل "اقبال نمبر" شائع کیا۔ "زمانہ" نے ایک ضخیم "پریم چند نمبر" چھاپا۔ "عالمگیر" نے "روسی ادب نمبر" پیش کیا اور "ہمایوں" نے "روسی ادب نمبر" اور "فرانسیسی ادب نمبر" شائع کیے۔ اور لاہور سے مجید ملک مرحوم نے "نرگس کا نظم نمبر" مرتب کر کے ایک اور طرح ڈال دی۔

میرے نزدیک "نقوش" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جو کام پہلے اکا دُکا رسالہ کبھی کبھی اور نامکمل اور غیر جامع انداز میں کرتا تھا۔ وہ اس نے ایک بہت بڑے پیمانے پر، ایک منظم انداز میں اور جامعیت کے تمام تقاضوں کے ساتھ کر کے مجلاتی صحافت کو ایک انسائیکلو پیڈیائی رنگ بخش دیا۔ شخصیات نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح نمبر، لاہور نمبر، پطرس نمبر، شوکت تھانوی نمبر، سعادت حسن منٹو نمبر اور اسی قسم کے دوسرے نمبر ایسے اہم اور نادر مواد پر مشتمل ہیں جو اکٹھا نہ ہوتا تو اُردو ادب کا بہت بڑا ضیاع ہوتا۔ ان نمبروں کی ترتیب میں جس ریاضت سے کام لیا گیا ہے مجلاتی صحافت میں اس کی مثال نہیں ملتی اور اس کا ایک خوش گوار پہلو یہ ہے کہ محققین کا کام آسان ہو گیا ہے۔ کیوں کہ اُنھیں بنتا مآخذی مواد "نقوش" کے خصوصی نمبروں میں ایک جگہ اور اچھی اور مستند صورت میں مل جاتا ہے۔ اتنا بے شمار کتابوں، دستاویزوں اور فائلوں میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔ "نقوش" نے جن موضوعات پر خاص نمبر چھاپے ہیں اُن پر مزید تحقیق کا کام سہل ہو گیا ہے۔ اور اس کے لیے محققین یقیناً "نقوش" کے احسان مند ہیں۔

یہ نمبر اپنے اپنے موضوع پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ضخامت کو محدود کرنے کی کوئی شعوری کوشش کی جاتی تو ان کی جامعیت میں فرق آجاتا۔ ضخامت اور مواد کے اعتبار سے یہ

مستقل تصانیف اور تالیفات کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو کام "نقوش" نے کر دکھایا ہے وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ کتاب، انسائیکلو پیڈیا اور مجلّے کو ایک جگہ سمو کر اور اُسے حُسن بخش کر "نقوش" نے مجلّاتی صحافت کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور ثابت کر دکھایا ہے کہ کام کرنے کی نیت ہو، خلوص اور لگن ہو، تو جو کام بڑے بڑے ادارے نہیں کر سکتے وہ فردِ واحد سر انجام دے سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں "نقوش" کے عام نمبر بھی خاص نمبر ہوتے ہیں اور وسیع ضخامت کی وجہ سے اس میں طویل مختصر افسانے، ناولٹ، طویل مقالے اور کلاسیکی شہپارے بغیر کسی تکلّف کے دیئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لکھنے والے تنگ دامانی کی قید سے آزاد ہو کر لکھتے ہیں اور اس طرح اپنے موضوع سے پورا انصاف کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ رسم اب چل نکلی ہے۔ پہلے مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے "ادبی دُنیا" کو بھی رنگ دیا اور اب "اوراق" اور "فنون" بھی اسی خصوصیت کے حامل ہیں۔

"نقوش" کی ایک اور ادا جو مجھے بھاتی ہے، یہ ہے کہ یہ صرف ادب پیش نہیں کرتا۔ علم کے ہر شعبے پر بسیر حاصل مواد پیش کرتا ہے۔ یہ ہماری مجلّاتی صحافت کی کلاسیکی روایت ہے جسے بعد کے ادوار میں بہت سے رسالوں نے ترک کر رکھا تھا۔ حالانکہ نصف صدی قبل کے مقابلے پر آج اس بات کی اور بھی ضرورت ہے کہ مجلّاتی صحافت محض سکّہ بند ادب کی ہو کر نہ رہ جائے بلکہ آج کے زمانے کے اہلِ دانش کی دوسری ذہنی ضروریات کی تکمیل کا بھی سامان فراہم کرے۔

"نقوش" کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ مجلّہ کسی ایک دبستانِ ادب یا دبستانِ خیال سے وابستہ نہیں۔ ہر دبستانِ خیال کا ادیب اور شاعر اس کے صفحات پر اظہارِ خیال کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ "نقوش" کو کلاسیکی روایات عزیز ہیں لیکن یہ تجدّد کا مخالف نہیں۔ لہٰذا یہ کلاسیکی اور جدید روایات کے درمیان ایک پُل کا کام دیتا ہے۔

چونکہ ہمارے ہاں نئی باتیں عام طور پر مغربی ممالک سے درآمد کی جاتی ہیں اس لیے میں نے سوچا شاید "نقوش" نے جو رنگ لے رکھا ہے وہ بھی کسی دوسرے ملک کی تقلید پر مبنی ہو چنانچہ میں نے مقالہ لکھنے سے پہلے مختلف ممالک کی مجلّاتی صحافت پر کتابیں اور مقالے پڑھے اور برطانیہ، امریکہ، سوویت یونین، فرانس اور جرمنی کے بہت سے علمی اور ادبی رسالے دیکھے اور مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنی جامعیت اتنی خصوصیات کے حامل اور اتنی ضخامت کے رسائل دُنیا کے کسی ملک میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ "نقوش" دُنیا بھر میں اپنی قسم کا پہلا مجلّہ ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ میں نے اس مقالے میں دیدہ و دانستہ طفیل صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ اس

کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ بہت شرمیلے ہیں اور تعریف سے اور بھی شرمائیں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جب کسی کی تعریف کی جائے تو وہ "خلیفہ" بن جاتا ہے اور محض ماضی کے سہارے زندہ رہنا چاہتا ہے اور میری خواہش یہ ہے کہ محمدؐ طفیل "خلیفہ" نہ بنیں۔ تیسری وجہ یہ ہے خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے کسی کی تعریف کی جائے لوگ تعریف کرنے والے سے محرکات وابستہ کرتے ہیں اور میری ذات سے پہلے ہی مختلف امور میں اتنے محرکات وابستہ کر دیئے گئے ہیں کہ مزید محرکات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی یہ پرانی ریت ہے کہ ہم کسی شخصیت کی اُس کی زندگی میں تعریف نہیں کرتے۔ مبادا کہ ہماری اپنی عظمت میں فرق آجائے۔ پس ان حالات میں معذرت خواہ ہوں کہ جناب طفیل کی خدمت میں کوئی خراجِ تحسین ادا نہیں کر سکا۔

نقاش و نقوش

ڈاکٹر اختر اورینوی

پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں تو صبا رفتار و برق بہ کنار زندگی کے نقوش رنگ رنگ زمانہ کی راہوں اور منزلوں میں بکھرے ہوئے پاتا ہوں۔ ماضی کو خوابِ خیال کیسے کہہ دوں؟ ماضی سے بڑی حقیقت تو میرے لیے اور کوئی نہیں۔ حال کا زہرِ غم ابھی رگ و پے میں اس طرح سرایت نہیں کر سکا کہ وہ جانِ حزیں کا ایک حصہ بن جائے۔ زندگی کا اہم ترین حصہ عبارت ہے ماضی سے۔

کتنی پیاری ہستیاں، کتنے چاہنے والے لوگ، کیسے ہنستے ہوئے چہرے، کتنے تابناک واقعات، کیسی جان دار صحبتیں، کتنی گرم مجلسیں، کیسی کیسی ادبی محفلیں اور کتنے محبوب جریدے، میری حیاتِ مستعار کا جز بن چکے ہیں!

ماضی کبھی نہیں مٹتا۔ حال ماضی کا پروردہ ہے، ماضی کے نمو کا سرا ہے۔ حیاتِ گذشتہ پنہاں ہونے کے باوجود کسی نہ کسی رنگ و آہنگ سے حال و مستقبل کے لالہ و گل میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔

میرے دل میں اس وقت اُردو جریدوں کی یادیں بیدار ہو رہی ہیں۔ اور ان یادوں کے ساتھ نہ جانے اور کتنی حسین اور پیاری یادیں وابستہ ہیں۔ ماضی سے دُوری کا احساس دل میں ایسا گداز پیدا کر دیتا ہے کہ اُس کے پھول تو پھول کانٹے بھی عزیز ہو جاتے ہیں۔

میرے شباب نے دامنِ نگار میں آنکھیں کھولیں اور پھر نیرنگِ خیال نے اُسے پُرکار بنایا۔ شباب جب اور رسا ہوا تو ساقی اور رومان کو ایمان و آگہی سے دوستی اور تمکین و ہوش کی رہبری کے لیے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ حُسن اور حُسن کاری کے عالمِ رنگ و بو میں میرے ذوق و شوق پل رہے تھے۔ ادب میرا ندیم تھا اور میں ادبِ لطیف کی فضائے معطر میں سانس لیتا تھا۔

جریدے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ سب سے اہم نوع رسالوں کی وہ ہے جو ایک منفرد شخصیت، ایک مخصوص فضا اور ایک استوار روایت رکھتی ہے۔ میں جریدوں کو جیتے جاگتے انسانوں کی طرح پہچانتا اور انھیں یاد رکھتا ہوں۔ پرچے میرے مخلص و محبوب دوستوں کی طرح ہوتے ہیں۔ میں دونوں کو بہت چاہتا ہوں، مگر اظہار وفاداری میں استوار نہیں ہوں۔

شخصیت میں تسلسل روایت کا پرتو بھی ہوتا ہے اور ارتقا کی تبدیلیوں کا عکس بھی۔ آدمی اور جریدے دونوں اس قانون کے دائرے میں آتے ہیں۔ آدمی فوت ہوتے ہیں۔ پرچے بھی مر جاتے ہیں۔ کتنے پیارے لوگ اور کتنے اچھے پرچے وفات پا گئے۔ لیکن میرے دل کی دھڑکنوں میں وہ آج بھی زندہ ہیں۔ رومان (لاہور) کتنا محبوب رسالہ تھا! کوئی میری روح میں جھانک کر اُس کی بہاروں کو دیکھے!

مُلک کی تقسیم کے بعد کئی رسالے ہجرت کر گئے۔ اور میں ہجرِ ساقی میں اپنی تشنہ لبی کو دعائیں دے رہا ہوں۔ دِلّی دُور تھی مگر کراچی بہت دُور ہے، بہت دُور! —— اور لاہور؟ زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا؟ وہ شہرِ نگاراں تو اب میرے لیے صرف ارمانوں کا چاند بن کر رہ گیا ہے۔ ادبِ لطیف میرا دوست، میرا بھائی میرے لیے غیر ملکی ہے۔ میں ادبی دُنیا سے دُور و مجبور ہوں۔ نہ جانے نیرنگِ خیال و ادبی دُنیا فوت ہو گئے یا زندہ ہیں؟

سُنا ہے لاہور میں نئی بہاریں آئی ہیں۔ وہ شہرِ دلبراں ارژنگ چین بن گیا ہے۔ کچھ گُل و یاسمن اور چند نقوش جبین اس صنم خانۂ ہند میں بھی آجاتے ہیں اور کعبہ کے بتانِ دیرینہ گنگ و جمن کے کنارے آ بسے ہیں۔ اہلِ حرم اور اہلِ صنم کدہ میخانۂ اُردو میں آکر ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔

اُردو جریدوں کی ادبی اہمیت تو ہے ہی۔ لیکن موجودہ حالات میں اُن کی جذبی، تہذیبی، سیاسی اور انسانی حیثیتیں بھی کم اہم نہیں۔ اُردو وہ مرہم ہے جو تقسیم کے زخم کے اندمال کا باعث ہے۔ یہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے والی طاقت ہے۔ اُردو تولتے محبت ہے۔ اس بنتِ ایشیا کا پریم ہی سنگار ہے۔ اُردو پرچے سفرائے اُلفت ہیں۔

فی الحال میں گلستانِ اُردو کے ایک گُلِ نو دمیدہ کے متعلق اپنے تاثرات پیش کر رہا ہوں۔ یہ پھول تقسیم کے بعد راوی کے کنارے کھلا۔ اس کے ایامِ غنچگی ندیم کی صحبت میں بسر ور گزرے۔ انہوں نے اپنے خونِ جگر سے اس کی بہاروں کو پروان چڑھایا اور اس کے نقوش اُبھارے۔ دوسرا دَور آیا تو بُرد وقار آیا۔ شباب کا اَلھڑپن اور انقلاب کی سیمابیت دُور ہو چکی تھی۔ متانت آئی۔ شوخ رنگینی اور شگفتگی نے پختگی کی طرف قدم بڑھایا۔ نقوشِ بہار زیادہ رَچ گئے، زیادہ سنور گئے، زیادہ دل نشین ہو گئے اور زیادہ فکر انگیز۔ پھول کھلتا رہا اور کھلتا رہا۔ یہ نکھار گلستان کے فیض سے بھی تھا اور بہار کے طفیل سے بھی۔ ع

قیاس کُن زِ گلستانِ من بہارِ مرا!

تکمیلِ بہار ثمر وری ہے۔ نقوشِ بہار نے نقاشی کی اور نقوشِ گلستان پُر کار و پائندہ ہو گئے۔ اُردو کے گُلِ نو دمیدہ کے تیسرے دَور کو اہلِ تماشہ عہدِ پختگی و ثمر وری کہتے ہیں۔ نقوشِ بہار دیکھیے نے،

بالیدہ ہوئے، ان کی شخصیتیں اُبھریں اور یہ گلستان میں نکہتِ ابدی بن گئے۔ نقاشِ نو نے محض اپنی صلاحیتوں کے طفیل صرف اپنے جوشِ اظہار کے بل بوتے پر نقوشِ بہار کو سنوارا، نکھارا اور تاریخ گلستان بنائی۔ نقوشِ چمن کے تیسرے دَور کے نقاش نے دامانِ بہاراں کو بہت وسیع بنا دیا۔ یہ عہد توسیع و تشخص ہے اور اُردو ادب کی تاریخ میں ایسے ایسے نقوش اُبھرے جنھیں ہم نقوشِ مانی و بہزاد کہہ سکتے ہیں۔

تیسرے دور کا نقاش ساحر ہے۔ یہ اپنے پرایوں کی طرف گلُ و ثمر پھینکتا ہے مگو خانہ بر اندازِ چمن نہیں بلکہ خانہ سازِ بہار ہے۔ یہ ماضی کے رنگ و نکہت کو سمیٹ کر لاتا ہے اور پُرانے نقوشِ بہار کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔ یہ غزل سرا بھی ہے اور داستان گو بھی۔ اس نے شاہرانِ بہاراں کا ایک صنم کدہ بھی تعمیر کیا ہے۔ وہ خارہ شگافی کر کے جوئے شیر بھی لاتا ہے۔ اُس نے ایک دیوارِ قہقہہ بھی بنوائی ہے۔ وہ تصویرِ بتاں اور حسینانِ ادب کے خطوط جمع کرتا رہتا ہے۔ وہ بہروپیا ہے۔ دیکھو گل ہائے منتخب کی ٹوکری سر پر رکھے مالن کا بھیس بدلے چلا آ رہا ہے۔

اے خوشا روز کہ آئی و بہ صد ناز آئی!

نقوش کے خاص نمبر

نثار احمد فاروقی

اُردو میں اخبارات کو نکلتے ہوئے مدّت تو ایک صدی سے بھی زیادہ ہی ہوگئی لیکن رسالوں کا رواج، اور وہ بھی ایسے رسالے جو آج مضامین، افسانے، مقالے، نظمیں اور غزلیں سجا کر نکلتے ہیں، ان کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ ہی ہوا ہے۔ اُردو میں علمی اور ادبی رسالوں کا جو معیار آج ہے وہ رفتہ رفتہ بنا ہے۔ ایک زمانے میں تہذیب الاخلاق، معارف، مخزن، عالمگیر، ہمایوں، ادبی دُنیا، صلائے عام، نیرنگِ خیال، الناظر، نگار، اور ساقی ایسے ادبی رسالے تھے کہ ان میں کسی مضمون کا شائع ہونا ہی ادیب کے ذی شعور اور پختہ کار ہونے کی علامت تھی اور واقعہ یہ ہے کہ ان رسالوں نے اس صدی کے بہت سے لکھنے والوں کو بنایا ہے، روشناس کرایا ہے یا ان کا 'اکتشاف' کیا ہے۔

لیکن ہماری زبان میں بہت سی باتوں کے ساتھ ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ اس کے لکھنے والے اجتہادی فکر سے محروم ہیں اور لکیر کے فقیر بننے میں ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں چنانچہ اسی کی بدولت اب وہ روش جو کبھی بعض رسالوں کا طرۂ امتیاز تھی اتنی عامیانہ ہو چکی ہے کہ عام قاری اس سے متاثر نہیں ہوتا —— یورپ اور امریکہ میں جرنلزم ایک باضابطہ فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، وہاں باقاعدہ صحافت کی تعلیم اور تربیت دی جاتی ہے اُس میں نئی نئی راہیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اخبار، رسالے، میگزین اور صحائف ترتیب دینے کے سلسلے میں غور و فکر کے بعد کتابیں لکھی جاتی ہیں لیکن اُردو میں ایسا کوئی فن یا کوئی کتاب موجود نہیں لطف یہ کہ رسالہ کو ایڈیٹ کرنا سب سے آسان کام سمجھا جاتا ہے، دو چار مقالے، پانچ سات افسانے، دس پندرہ نظمیں، غزلیں اور خطوط —— یہ سب جمع ہوئے تو ایک رسالہ ہو گیا! چنانچہ ہمارے ملک میں یہ ایک روایت بن چکی ہے کہ شاعر، ایڈیٹر اور مولوی "خدا ساز" ہوتا ہے اُسے محنت اور مطالعے کی ضرورت نہیں، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگ سب کچھ کر گزرے ہیں اور علم و ادب کا کوئی گوشہ 'نا موجود' نہیں ہے اب کسی اجتہاد یا تجدید کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسالے اتنی کثرت سے نکلتے ہیں مگر ان میں انفرادیت یا نمایاں فرق بالکل نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ ایک خواندہ جسے ادب سے لگاؤ ہے وہ "فلاں" رسالہ

کیوں خریدے اور "فلاں" کیوں نہ خریدے؟ یعنی کوئی تو خط امتیاز اور وجہ ترجیح ہونا ہی چاہیئے۔ مگر آپ اردو کے دو چار رسالوں کا تقابلی مطالعہ کر دیکھئے کوئی بات تخلیقی یا اجتہادی نہیں ملے گی۔ ادب کے نام پر وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ ادب کی پیروڈی معلوم ہوتا ہے۔

اب پڑھنے والوں کا مذاق بھی بدل چکا ہے۔ اگر کسی کام میں جی جان سے محنت کی جائے تو اس میں کامیابی بھی یقینی ہے اور اس کا کامیاب ہونا بھی مسلّم ہے۔ الہلال کی مثال دیکھئے، مولانا آزاد نے اُسے ایسی شان سے نکالا تھا کہ نصف صدی کا عرصہ گزر جانے پر بھی کوئی اخبار اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکا۔ مولانا کبھی دوسرے درجے کی چیز پر راضی نہ ہوتے، اخبار بھی نکالا تو پہلے پریس لگایا وہ بھی ٹائپ کا جو اس وقت اگرچہ مقبول نہیں تھا لیکن اُسے سائنٹیفک ہونے کی وجہ سے گوارا کیا۔ معیار کے اعتبار سے انگریزی اور عربی کے بہترین مصور اخباروں کو نمونہ بنایا ان کی بھی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول پر عمل کیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ آج اُردو کے اخبارات الہلال کی مقبولیت اور انفرادیت پر رشک کرتے ہیں۔

علمی رسالوں میں معارف، برہان اور نگار آج بھی اپنی اپنی وضع پر نکل رہے ہیں اور انہوں نے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ درجے کے علمی مضامین و مقالات سے اُردو کو سرمایہ دار کر دیا ہے۔

اُردو میں غالباً "نیرنگ خیال" نے خاص نمبروں اور سالناموں کی رسم کو آگے بڑھایا اور اب تو یہ رسم سے زیادہ "وبا" ہو گئی ہے۔ بہت سے رسالے تو خاص نمبر کے بوجھ سے بیٹھ جاتے ہیں، مگر نکالنے سے باز نہیں آتے۔ ان میں عام اشاعتوں سے صرف ضخامت زیادہ ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ گویا اس اچھی بھلی روش کو بھی اتنا فرسودہ اور غیر دلکش بنا دیا ہے کہ اب کسی رسالے کے خاص نمبر کی کوئی اہمیت یا غیر معمولی حیثیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

"نقوش" اُردو کا اعلیٰ ترین ادبی مجلّہ ہے۔ اُردو کے معیاری علمی اور ادبی رسالوں میں اس کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ یہ ۱۹۴۸ء سے نکلنا شروع ہوا اور اب تک جب کہ یہ اپنی زندگی کے بارہ برس طے کر چکا ہے اُس نے بہت سے قابلِ قدر اور عظیم الشان نمبر پیش کیے ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک دس سال کی مدت میں نقوش نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کا مکمل چارٹ اس کے دس سالہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۵۱۷ مضامین، ۴۰۹ افسانے، ۱۲۱۳ خطوط، ۲۱ ڈرامے، ۶ ناولٹ، ۴۴۶ نظمیں، ۱۳۳۷ غزلیں چھاپی ہیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۲۳۷۶

صفحات ہوتی ہے۔ اس کے بعد طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، خاص نمبر اور دو عام شمارے بھی چھپ چکے ہیں۔ ان کے صفحات اور مشمولات بھی شمار میں لائیے تو یہ تعداد کہیں زیادہ بڑھ جائے گی۔

محنت میں برکت ہوتی ہے۔

محمد طفیل نے اپنے زمانۂ ادارت میں نقوش کو زندہ جاوید کر دیا ہے اور اُن کی محنت نے انہیں بھی امر بنا دیا ہے۔ جس طرح نگار کے ساتھ نیاز فتحپوری کا نام، انجمن ترقی اُردو کے ساتھ مولوی عبدالحق کا نام یا صلائے عام کے ساتھ میر ناصر علی کا نام ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو گیا ہے اسی طرح اب نقوش اور محمد طفیل بھی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یہ اُن سے زندہ ہے وہ اس سے ——— عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خاص نمبروں کے میدان میں نقوش کا کوئی حریف ہندوستان یا پاکستان میں موجود نہیں۔

نقوش نے اب تک مجموعی طور پر اکیس نمبر شائع کیے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) آزادی نمبر	(۲) امن نمبر	(۳) آزادی نمبر
(۴) خاص نمبر	(۵) سالنامہ	(۶) ناولٹ نمبر
(۷) افسانہ نمبر ۱	(۸) پنج سالہ نمبر	(۹) افسانہ نمبر ۲
(۱۰) غزل نمبر	(۱۱) شخصیات نمبر ۱	(۱۲) منٹو نمبر
(۱۳) افسانہ نمبر ۳	(۱۴) شخصیات نمبر ۲	(۱۵) سالنامہ
(۱۶) مکاتیب نمبر ۱	(۱۷) مکاتیب نمبر ۲	(۱۸) دہ سالہ نمبر
(۱۹) طنز و مزاح نمبر	(۲۰) پطرس نمبر	(۲۱) خاص نمبر

ان خاص اشاعتوں کے صفحات کی مجموعی تعداد کئی ہزار ہوتی ہے اور ان کی افادیت دوگونہ ہے یعنی ان میں کچھ اشاعتیں تو بعض موضوعات سے مختص ہیں مثلاً افسانہ نمبر، غزل نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، کچھ عمومی افادیت کی حامل ہیں مثلاً سالنامے، خاص نمبر، پنج سالہ نمبر، دہ سالہ نمبر وغیرہ اور دو اشاعتیں ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں: منٹو نمبر اور پطرس نمبر۔

ان نمبروں کا سرسری جائزہ لینے کے لیے بھی کئی ہزار صفحوں کو پڑھنا اور ان کے محاسن یا معائب سے بحث کرنا آسان نہیں، ان پر اُچٹتا ہوا تبصرہ کرنے کے لیے بھی ایک پورا دفتر درکار ہے ——— میں یہاں ان خاص اشاعتوں کے تعارف کی رسم ادا کرتا ہوں۔ طوالت کے خوف سے ایجاز و اختصار کی پناہ گاہ سے قصداً باہر نہیں نکلا ہوں۔ پھر بھی ہزاروں صفحات کو پڑھنے اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنے میں اچھا خاصا وقت صرف ہوا ہے۔

نقوش نے سب سے پہلے اپنا چوتھا شمارہ "آزادی نمبر" کی شکل میں پیش کیا تھا۔ جو اس وقت پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔ اور ساتواں شمارہ "عالمگیر امن نمبر" تھا جسے ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں تمام چیزیں امن کے موضوع پر شامل تھیں۔ ان دنوں امن کانگرس کا سالانہ اجلاس بھی ہوا تھا۔ ہنگامی طور پر یہ موضوع اچھا خاصا "چلتا ہوا" تھا۔ اس وقت نقوش ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا اور لمحاتی سیاست کا نقیب بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے کسی تحریک یا ازم، یا سیاسی عقیدے سے انکار نہیں لیکن ادب کو کسی ایک نظریہ کا پابند کرنا بھی سود مند نہیں سمجھتا۔ اچھا اور بڑا ادب حلقۂ شام و سحر سے آزاد ہوتا ہے اسے وقتی جذبات میں اسیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس نمبر میں جتنی تخلیقات شامل ہیں وہ سب ادب سے زیادہ سیاست کی نمائندہ تھیں۔ انہیں کسی اخبار کے ادارتی کالم میں جگہ دی جاتی تو اچھا ہوتا۔ اس اعتبار سے تحریک نے ہمارے ادب کو بہت نقصان پہنچایا۔ سیاست کو ممکن ہے کچھ فائدہ پہنچ گیا ہو۔ اس نمبر کی منظومات میں سے ایک نمونہ آپ بھی دیکھتے چلیں:

"چین، برما، ملایا، میں اک عہدِ نو آج انگڑائیاں لے رہا ہے ——
ایشیا اپنی کہنہ جکڑ بندیوں کو ——
بحرِ کاہل کے گہرے سیہ پانیوں میں دھکیلے چلا جا رہا ہے
آج جاپان میں انقلابی جنم لے رہے ہیں
کوریا بھی طلسمِ زر و سیم کو توڑنے کے لیے مضطرب ہے ——
ہند میں ایک طوفان سمٹا ہوا ہے
ہند و کشش کی بلندی پہ پرِ تاب اک آگ کی جھلکیاں دے رہے ہیں۔۔۔۔"

خدارا بتائیے کہ یہ نظم ہے یا منصور بن سعدان کی داستان! نظم کے اس بند میں اور کسی اخبار کے گرما گرم اداریے میں آپ کیا فرق و امتیاز کریں گے؟ کیا اسی روش پر ادب کی تخلیق ہوتی رہتی تو "بڑا ادب" پیدا ہو جاتا، اور کیا یہی باتیں اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ جوش و خروش اور طمطراق کے ساتھ نثر میں نہیں لکھی جا سکتیں؟ ان باتوں پر غور کیجئے تو فیصلہ آپ خود ہی کر لیں گے —— وہ زمانہ افراتفری کا تھا۔ پروپیگنڈے کا زور شور تھا۔ اب جذبات میں وہ اُبال نہیں ہے اب تو یہ سب باتیں آسانی سے سوچی جا سکتی ہیں۔ شکر ہے کہ "نقوش" بہت جلد سیاست کے چکر سے نکل گیا اور اب وہ بغیر کسی لیبل کے شائع ہوتا ہے، ہر مکتبِ خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اُردو کے بہترین لکھنے والوں کی بہترین تحریریں پیش کرتا ہے اور کسی سیاسی مسلک کا نمائندہ نہ ہونے

کی وجہ سے تمام حلقوں میں یکساں طور پر مقبول و معروف ہے۔

اس کے بعد پھر نقوش کا آٹھواں شمارہ "آزادی نمبر" تھا۔ اس میں اچھے لکھنے والوں کی اچھی چیزیں سلیقے سے جمع کی گئی تھیں۔ بھلا ایسا کیوں نہ ہوتا۔ احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور جیسے قابل اور سوجھ بوجھ والے مدیر جو تھے۔ وہ تو وقتی کوتاہی تھی۔ جس کی زد میں یہ لوگ آ گئے تھے۔ ورنہ یہ بات نہیں کہ انھیں ادبی تحریروں اور سیاسی تحریروں میں تمیز نہ تھی۔ گیارہواں اور بارہواں شمارہ "خاص نمبر" کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ مئی ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ اس وقت سیّد وقار عظیم اس کے مدیر تھے جو اردو کے اچھے نقاد، مبصر، صحافی اور انشاء پرداز ہیں۔ ان دنوں یہ رسالہ ایک آزمائش سے گزر چکا تھا یعنی حکومت پاکستان نے جولائی ۱۹۴۸ء میں اس پر پابندی لگا دی تھی جو فروری ۱۹۴۹ء تک رہی اس کے بعد پھر کچھ زمانہ ناسازگار حالات رہے جن کی وجہ سے رسالہ وقت پر شائع نہ ہو سکا۔ مگر مدیر اور ناشر کے حوصلے بلند تھے۔ انھوں نے بڑی آن بان سے یہ خاص نمبر پیش کیا۔ قدیم اور جدید لکھنے والوں کی بہترین نمائندہ تحریریں اس میں موجود تھیں جن میں میر ناصر علی مرحوم (صلائے عام) کا بہترین انشائیہ "خطرہ ہائے دل" خاصے کی چیز تھا۔ اس کے علاوہ عبدالرحمٰن چغتائی، مولانا صلاح الدین احمد، نیاز فتحپوری، ممتاز شیریں، وغیرہ کے مضامین موضوع کے اعتبار سے وقیع اور انداز کے لحاظ سے رفیع تھے لیکن سب سے زیادہ محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ قیوم نظر نے اندر سبھا کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا تھا۔

سیّد وقار عظیم کے زمانہ ادارت میں دو نمبر اور بھی نکلے ایک سالنامہ (شمارہ ۱۵-۱۶) دوسرا ناولٹ نمبر (شمارہ ۱۷-۱۸) یہ دونوں بہت ہی مقبول ہوئے۔ خصوصاً "ناولٹ نمبر" کیونکہ تقسیم ہند کے بعد پہلی بار اتنا اچھا ناولٹ نمبر نکالا گیا تھا۔

شمارہ ۱۹-۲۰ سے محمد طفیل کی ادارت کا آغاز ہوا، اور سب سے پہلے اپنے "عہد معدلت مہد" میں انھوں نے اُردو افسانے کے ساتھ انصاف کیا۔ یہ افسانہ نمبر (شمارہ ۲۵-۲۶) موضوع کی نمائندگی کرتا تھا۔ تیسویں شمارے پر "نقوش" کی عمرہ سال ہو چکی تھی اس کی سالگرہ منائی گئی اور "پنج سالہ نمبر" (شمارہ ۲۹-۳۰) شائع کیا گیا۔

"پنج سالہ نمبر" کے بعد پھر ایک افسانہ نمبر (شمارہ ۳۷-۳۸) پیش کیا گیا۔ یہ بھی پچھلے خاص نمبروں کی طرح امتیازی علامت رکھتا تھا۔

لیکن نقوش کی کامیابی اور خاص نمبروں کے میدان میں یکّہ تازی کا آغاز غزل نمبر (شمارہ ۴۱-۴۲) سے ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زمانہ عروج میں غزل کی مخالفت بھی بڑے جوش و خروش سے ہوئی

مخفی۔ لیکن اس کا رشتہ ہماری تہذیب اور ثقافت سے ہزاروں برس پرانا ہے۔ یہ رشتہ ایسا زود شکست نہیں کہ بیک جنبش اسے ختم کر دیا جائے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے "غزل جتنی بدنام ہے اتنی ہی مجھے عزیز ہے۔ شاعری کا نام آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہوتا ہے۔ غزل کو میں فن نہیں، اپنی شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار ایک دوسرے سے حاصل ہوئی ہے اس پر نہ ہنسنا چاہیئے نہ رونا۔ اس کا احترام کرنا چاہیئے" چنانچہ یہ غزل کی قوت ہی ہے جو اب تک نہ صرف یہ کہ مقبول رہی بلکہ کسی مخالف وار کا ہلکا سا اثر بھی اُس نے قبول نہیں کیا۔ جنھوں نے غزل کی مخالفت کی وہ اپنی شاعری کو بھدّا بنا بیٹھے غزل کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ "نقوش" نے غزل نمبر پیش کر کے اس کی مقبولیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ساڑھے چھ سو صفحوں میں بہترین غزلیات کا یہ انتخاب اتنی محنت اور سلیقے سے کیا گیا ہے کہ ہر دَور کے نمائندہ شاعر اور اُن شاعروں کا نمائندہ کلام اس میں آ گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع اور معیار کے اعتبار سے نیز فن اور خیالات کے لحاظ سے غزل کا عہد بہ عہد ارتقا کس طرح ہوا ہے۔ یہ غزل نمبر اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے تین ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں اور چوتھا زیرِ طبع ہے۔ میں یہ تجویز کرنا چاہتا تھا کہ بعض شعرا خصوصاً اساتذہ متقدمین و متوسطین کے کلام کا اچھا اور نمائندہ انتخاب نہیں ہو سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے دواوین یا تو چھپے نہیں یا عام طور سے دستیاب نہیں ہوتے۔ مثلاً قائمؔ چاندپوری، مصحفیؔ، میر حسنؔ، بیانؔ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان کے کلام کا انتخاب مختلف تذکروں اور بیاضوں سے کیا گیا ہوگا۔ اگر ایسے شاعروں کے دواوین سے براہِ راست انتخاب کیا جاتا تو وہ اور زیادہ اچھا ہو سکتا تھا۔

"نقوش" کا شمارہ (۴۷ - ۴۸) ایک ایسا مہتم بالشان کارنامہ تھا جو اُردو زبان میں پہلی بار کسی رسالے نے انجام دیا۔ پہلی کوشش عموماً ناقص اور خامیوں سے پُر ہوا کرتی ہے لیکن یہ اس کے برعکس بڑی ہی جامع، منفرد اور عجیب و غریب تھی جس نے اچانک اُردو والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میری مراد شخصیات نمبر سے ہے۔ اس نمبر کے دو حصّے ہیں۔ دوسرا حصّہ (شمارہ ۵۹ - ۶۰) خطوط نمبر اور افسانہ نمبر کے بعد چھپا تھا۔ شخصیات نمبر کے بارے میں اپنی رائے کسی حد تک پہلے ظاہر کر چکا ہوں (نقوش، شمارہ ۷۳ - ۷۴) یہاں اُن کے تعارف کے طور پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

لہ یہ بھی بہت سے مفید اضافوں کے ساتھ یکم فروری ۱۹۵۸ء کو شائع ہو گیا ہے۔

پہلا حصّہ (شمارہ ۴۷ - ۴۸) چھ سواسی (۶۸۰) صفحوں کو محیط ہے اور اس میں کل جمع چھیاسی ۸۶ شخصیتوں پر خاکے اور مضامین شامل ہیں۔ جن پر خاکے ہیں اُن کے چند نام یہ ہیں: محمد حسین آزاد، شبلی، مرزا رسوا، میر ناصر علی، مرزا فرحت اللہ بیگ، حسرت موہانی، ڈاکٹر عبدالحق، ابوالکلام، رشید احمد صدیقی، اثر لکھنوی، جگر مراد آبادی، چودھری محمد علی وغیرہ۔ ان پر لکھنے والے بھی اتنے ہی بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ایک حصّہ اس میں اور بھی ہے جس میں "لاہور کی چند ادبی شخصیتیں" اسی طرح دلّی، لکھنؤ اور حیدر آباد کی شخصیات کا مختصر اور جامع تذکرہ مہیا کر دیا گیا ہے۔ یہ ہر اعتبار سے دلچسپ ہے اور ان میں بعض نئی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔

دوسرا حصّہ (شمارہ ۵۹ - ۶۰) آٹھ سواسی (۸۸۰) صفحوں کا ہے۔ اس میں بھی ۸۸ مضامین ہیں۔ ان شخصیات میں بڑے لوگ، ادیب، سیاست دان، سماجی ریفارمر، شاعر، طنز نگار، صحافی، لیڈر سبھی آ گئے ہیں۔ ان پر لکھنے والے بھی بیشتر وہ ہیں جو اُن سے بہت قریب رہے ہیں یا ہم عصر ہیں۔ اس نمبر کی قدر و قیمت آج بھی بہت ہے مگر سو دو سو برس کے بعد تو ایک عجیب گراں بہا ماخذ کا کام دے گا۔ اگر بالفرض اس نمبر میں کوئی کام کی بات نہ ہوتی تب بھی ساڑھے سولہ سو صفحوں کا نمبر نکال دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ بڑے دل گردے کا کام ہے۔

یہ نمبر بے حد مقبول ہوا، اس نے 'نقوش' کو زندہ جاوید کر دیا اور اس کے مرتب محمد طفیل کو بھی۔

نقوش کا شمارہ (۴۹ - ۵۰) منٹو کے لیے وقف تھا۔ منٹو اس عہد میں اُردو کا بڑا ذہین افسانہ نگار تھا ہمارے مردہ پرست ملک نے اپنی روایت کے مطابق جیتے جی اس کی قدر نہیں کی۔ لیکن اب اس کا قلم ہمیشہ کے لیے رُک گیا ہے تو دوسروں کے قلم اس پر چلنے شروع ہوئے ہیں۔ منٹو کے انتقال کے بعد بہت سے رسالوں نے "منٹو نمبر" نکالے لیکن یہاں بھی انفرادیت نقوش ہی کی باقی رہی۔ اس میں منٹو کی بیس غیر مطبوعہ کہانیاں چھاپی گئیں جو ایک ایک دن کے وقفے سے لکھی گئی تھیں اور مطبوعہ کہانیوں میں سے بہترین دس کا انتخاب۔ پھر منٹو کے فن پر سات مضامین جن کے لکھنے والے قرۃ العین حیدر، وقار عظیم، حسن عسکری اور ممتاز حسین جیسے سنجیدہ اور دیدہ ور حضرات ہیں۔ چوتھے حصّے میں منٹو کی شخصیت پر بہت ہی دلچسپ مضامین ہیں جو عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، ابو سعید قریشی، حامد جلال، غلام عباس اور محمد طفیل نے لکھے ہیں۔ ان سے منٹو کی شخصیت کے بہت سے نقوش اُبھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ منٹو کے فن پر اب ریسرچ بھی شروع ہو چکی ہے۔ چنانچہ ماسکو میں ایک روسی خاتون جو اُردو کی طالبہ ہیں، منٹو کے فن پر تحقیقی مقالہ لکھ رہی

ہیں۔ وہ اس سلسلے میں ہندوستان بھی آئی تھیں۔ آئندہ بھی ہمارے ناقد اور محقق منٹو کی شخصیت اور فن پر توجہ کریں گے۔ اس وقت ان سب کے لیے منٹو نمبر بہترین اور مستند ماخذ ہوگا۔

۱۹۵۵ء میں نقوش نے ایک شاندار افسانہ نمبر پیش کیا (شمارہ ۵۳-۵۴)۔ یہ ایک ہزار چونسٹھ صفحوں کا ایک ضخیم و بسیط سائیکلو پیڈیا ہے جس میں ۱۸۰۰ء سے ۱۹۵۵ء تک ڈیڑھ سو سال کے افسانوی ادب کا انتخاب آیا ہے۔ ان ڈیڑھ سو برسوں میں اُردو افسانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اس کا اندازہ یہ انتخاب دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے اور اداریے میں محمد طفیل نے بہت ہی لطیف استعارے میں یوں بیان کر دیا ہے:

"کھاتے پیتے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جو بے حد ذہین، موٹا تازہ، اور ساتھ ہی بڑا باتونی تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں جب باتیں کرنے پر آتا تو چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی وہ تمام اکھڑی اکھڑی اور سلسلہ در سلسلہ باتیں آج بھی سب کو یاد آتی ہیں۔

مگر ٹریجڈی یہ کہ شروع ہی سے اس بچے کو اپنی ماں کا دودھ نصیب نہ ہوا۔ جب یہ بچہ کچھ بڑا ہوا اور اس کا شعور بھی کچھ کچھ پختہ ہونے لگا تو اسے اپنے تمدن اور اپنی معاشرت سے بے حد "اُنسیت" پیدا ہوئی شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے قدرے سنبھل کر اپنے مسائل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب اس کی باتوں میں وہ پہلی سی یاوہ گوئی نہ رہی، قدرے اختصار کے ساتھ ایک ٹھہراؤ تھا، ایک تسلسل تھا اور ایک نقطۂ نظر تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا۔

اسی بے منزلی میں اس نے اپنے ملک سے دُور، مغرب کے بچوں سے یارانہ گانٹھا کیوں کہ وہ اس سے زندگی میں کئی قدم آگے تھے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے انھیں اپنا ذہنی امام تصور کر لیا اور اس کی باتوں کو اپنے الفاظ میں دہرا دہرا کر بہت کچھ سیکھا۔

مغربی بچوں کی دیکھا دیکھی جب اُس نے اسی انداز میں یہاں زندہ رہنا چاہا تو اپنی چال بھی بھول گیا۔ نہ ان بچوں والی کوئی بات پیدا ہو سکی اور نہ اپنی ہی انفرادیت باقی رہی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ نہ سکا، کچھ بوکھلا سا گیا۔ بعض کو اس کی یہی بوکھلاہٹ بڑی عزیز ہے۔

تذبذب کی یہ کیفیت اس پر زیادہ عرصہ طاری نہ رہی۔ وہ بچے جن سے وہ بہت زیادہ مرعوب تھا اور جن سے واقعی اس نے بہت کچھ سیکھا تھا ان سے بھی اسے آنکھیں چار کرنے کی ہمت پیدا ہوئی۔ اور اس کا یہ گھمنڈ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا۔

آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بچہ جو بعد کو بالغ ہو کر جوان بھی ہوا، آج نڈھال پڑا زندگی کے دن گزار رہا ہے۔

یہ کہانی اُردو افسانے کی تھی۔" (طلوع افسانہ نمبر)

اتنے شگفتہ پیرائے میں، اتنے مختصر لفظوں میں، ایسے دل نشیں انداز سے، اُردو افسانے کے متعلق اتنی بہت سی باتیں کہہ کر اُردو افسانے کی ابتداء، ترقی، عروج اور موجودہ "تحیر" کا ایسا سماں باندھ دیا ہے کہ شاید ہی اس پر کچھ اضافہ کیا جا سکے۔ اسی لیے باوجود اقتباس کی طوالت کے یہاں میں نے تمام و کمال نقل کر دیا۔

اس میں خصوصیت سے آخری فقرہ بہت ہی "چبھتا ہوا" ہے۔ کیا واقعی ہمارا افسانہ روبہ زوال ہے؟ یہ ایک بڑا سوالیہ نشان ہے جو مسلسل غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ادب میں زوال کا نعرہ لگانا تو کچھ مشکل نہیں لیکن اس کے اسباب و علل پر غور کرنا اور اس کا صحیح حل پیش کرنا بہت مشکل ہے۔

ہمارے افسانے میں بالخصوص اور ادب میں بالعموم اگر زوال آیا ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ باعتبار موضوع ہے یا بلحاظ فن۔ یعنی بات ڈھنگ کی نہیں کی جا رہی ہے یا ڈھنگ سے کہی نہیں جا رہی ہے۔ اس موضوع پر بعد میں محمد طفیل نے ایک سمپوزیم بھی کیا تھا (نقوش خاص نمبر ۱۹۵۹ء) جس میں ملک کے بہت سے لکھنے والوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان خیالات پر ہم اپنا اظہار کسی دوسری جگہ کریں گے۔

بہرحال، افسانہ نمبر میں سب سے پہلے تو اُردو کی پہلی کہانی "رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" مصنفہ انشاء اللہ خاں انشا شامل ہے۔ یہ انشا کا ایک اہم تجربہ تھا جس سے نہ صرف اُردو افسانے کا آغاز ہوتا ہے بلکہ ہندی والے بھی اسے آدی کال کے ہندی کتھا ساہتیہ" میں پہلی جگہ دیتے ہیں۔

اس کے بعد طویل مختصر داستانوں کا دور آتا ہے جس میں طوطا کہانی، آرائش محفل، باغ و بہار، بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، انشائے نورتن، فسانۂ عجائب اور الف لیلہ شامل ہیں۔ پھر ناولوں کا دور آتا ہے۔ یہاں نام ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، شرر، رسوا اور راشد الخیری کے نظر آتے ہیں ایک دور ہمارے ادب میں تراجم کا بھی گزرا ہے اور اس کے بہت سے دور رس فائدے بھی ہوئے ہیں۔ یعنی اُردو افسانے کو کچھ نئے تجربے ملے کچھ راہیں دریافت ہوئیں، طرز ادا میں تنوع

اور سادگی پیدا ہوئی، موضوعات میں بھی اسی اعتبار سے وسعت آئی۔ ظفر علی خاں، عنایت اللہ دہلوی، عبدالرزاق ملیح آبادی، خواجہ منظور حسین، حامد علی خاں، تیرتھ رام فیروزپوری" اور اسی صف کے نو حضرات تراجم کے دَور کی نمائندگی اس نمبر میں کر رہے ہیں۔ لیکن یہ دَور یہیں ختم نہیں ہوا، اب تک جاری ہے اور بعض ادیبوں نے جن میں شاہد احمد دہلوی کا نام سرِ فہرست ہے، غیر زبانوں کے بہترین تراجم پیش کیے ہیں۔ اس فہرست میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، ل۔ احمد اکبر آبادی اور حسن عسکری کے نام بھی شامل ہونا ضروری تھے۔

"افسانوی مضامین" کا دَور خواجہ حسن نظامی سے شروع کیا گیا ہے اس میں ناصر نذیر فراق، آغا حیدر حسین، چراغ حسن حسرت اور اشرف صبوحی بھی شامل ہیں۔ پھر اُردو افسانے کے پانچ دَور کر دیئے ہیں۔ ان میں اسّی افسانہ نگاروں کے نمائندہ افسانے انتخاب کیے گئے ہیں۔

آخر میں مقالات کا حصّہ ہے اور اس میں چار مقالے ہیں۔ ایک مذاکرہ ہے اس میں افسانے کے فن اور موضوعات سے متعلق بہت سے پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔

اُردو افسانے پر اب تک کیا کچھ لکھا گیا ہے اسے دیکھئے تو متفرق چھوٹے چھوٹے مضامین سے قطع نظر دو تین کتابیں ہی سامنے آتی ہیں۔ عبدالقادر سروری کی "دنیائے افسانہ"، وقار عظیم کی "ہمارے افسانے" اور "ہماری داستانیں"، کلیم الدین احمد کی "فن داستان گوئی"۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کی "ناول کیا ہے؟" اور علی عباس حسینی کی "ناول کی تاریخ و تنقید" بھی اسی میں شامل کر لیجئے۔ اللہ اللہ خیر صلّا — ان میں بھی افسانے پر دو ہی کتابیں ہیں۔ باقی داستانوں اور ناولوں سے متعلق ہیں۔ گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں اُردو کا افسانوی ادب اچھا خاصا قد آور اور جاندار ہو گیا ہے۔ یہ ایسا معمولی اور حقیر سرمایہ نہیں کہ اسے بآسانی نظر انداز کیا جا سکے۔ صرف داستانوں ہی کو لیا جائے تو اُردو میں جتنی داستانیں لکھی گئی ہیں انہیں پڑھنے کے لیے عمرِ نوح چاہیئے۔ صرف ایک داستان امیر حمزہ اپنی ضخامت میں انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کے برابر ہے۔ ان داستانوں پر منصفانہ تنقیدی نظر ڈالنے کے لیے تو اور بھی محنت درکار ہوگی۔ اس کے بعد افسانوں کی طرف آیئے تو ہر دَور میں دس پانچ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اچھے افسانہ نگار ملیں گے اور موجودہ زمانے کو تو ایک طرح سے "افسانوں کا عہد" ہی کہا جا سکتا ہے مگر ہماری بے حسی بھی قابلِ داد ہے کہ ہم نے اب تک مغربی نقادوں کے چرائے ہوئے خیالات اور چبائے ہوئے نوالوں سے زیادہ اپنے ادب کے اتنے بڑے سرمائے پر کچھ نہیں لکھا۔ انگریزی ادب میں چار سے پہلے کوئی معقول چیز نہیں ملتی لیکن جو کچھ "نامعقول" تحریریں بھی ملتی ہیں اُن پر بھی تاریخی و تنقیدی نقطہ نظر

سے اتنا لکھا گیا ہے کہ اسے برسوں میں بھی نہیں پڑھا جا سکتا۔ مگر اُردو میں ابتدائی نثر پر توجہ تو خیر کہاں ہوتی، اہم کتابوں کے صحیح متن تک ایڈٹ کر کے نہیں چھاپے گئے اور افسانے جیسی اہم صنف سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ یہ ایک تازیانہ ہے جو ہمارے مردہ احساس پر لگنے کے بجائے کاش "سمندِ ناز" پر لگتا!

ہمارے ناقدوں میں سیّد وقار عظیم نے اُردو افسانے پر کام کیا ہے اور ابتدائی داستانوں سے دورِ حاضر تک تمام سرمائے کو کھنگالا ہے۔ اسی سلسلے میں ان کی دو کتابیں "ہمارے افسانے" اور "ہماری داستانیں" شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن اتنے بڑے سرمائے کا تاریخی و تحقیقی اور تنقیدی جائزہ ایک فرد کا نہیں ایک ادارے کا کام ہے۔ نقوش نے اس میدان میں قدم اُٹھا کر ایک بڑی ضرورت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ کاش اس موضوع کو "بیابانِ خطرناک" سمجھ کر نقشِ قدم کا حسرت زدہ نہ چھوڑ دیا جائے۔

افسانہ نمبر کے بعد نقوش کے "شخصیات نمبر" کا حصہ ۲ شائع ہوا تھا (شمارہ ۵۹ - ۶۰) اس پر مجملاً پچھلی سطور میں لکھ چکا ہوں۔ (شمارہ ۶۱ - ۶۲) سالنامہ کی شکل میں نمودار ہوا اور ایک عام اشاعت کے بعد نقوش نے دوسرا لافانی شمارہ مکاتیب نمبر (شمارہ ۶۵ - ۶۶) پیش کیا۔ اس کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ ۵۰۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس کی ابتدا میں خطوط نگاری کی ابتدا سے متعلق چار پُر مغز مقالے غلام رسول مہر، سیّد عبداللہ، مالک رام اور محمد عبداللہ قریشی کے لکھے ہوئے شامل ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ چار مقالے ہی مل کر اُردو میں مکتوب نگاری پر ایک اچھی تنقیدی کتاب بن سکتے ہیں۔ اس میں ۷۷ مکتوب نگاروں کے خطوط ہیں جن میں سب سے پہلے غالب کے آٹھ غیر مطبوعہ خطوط آتے ہیں۔ دوسرے اہم مکتوب نگاروں میں سر سیّد احمد خاں، محمد حسین آزاد، امیر مینائی، داغ، حالی، شبلی، اکبر، شاد، اقبال، محمد علی جوہر، سلیمان ندوی، حسن نظامی، منشی پریم چند، فانی، محمود شیرانی وغیرہ شامل ہیں۔

مکاتیب نمبر کے دوسرے حصّے میں ۸۰۴ صفحات ہیں اس میں بھی ۷۷ مکتوب نگار ہیں اور ان میں منیر شکوہ آبادی، جسٹس امیر علی، سیّد علی بلگرامی، محمد علی ردولوی، میر ناصر علی اور سیّد حسین بلگرامی جیسے اہم لوگ ہیں۔ اس طرح مکاتیب نمبر کے دونوں حصّوں کی مجموعی ضخامت ایک ہزار اڑتالیس صفحات اور مکتوبات کی کل تعداد تیرہ سو تیرہ (۱۳۱۳) ہوتی ہے۔ اُردو میں آج تک اتنے اہم لکھنے والوں کے خطوط کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں چھاپا گیا تھا۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ چالیس مکتوب نگاروں کے فوٹو اور ۵۸ صفحوں پر خطوط کے عکس بھی دیئے گئے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جن کے مکتوب پہلی بار

سامنے آئے ہیں، اور بہ حیثیت مکتوب نگار ان کا درجہ متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ تقریباً تمام خطوط غیر مطبوعہ، اہم اور معلومات افزا ہیں۔

خطوط بھی کسی شخصیت کو پرکھنے کا عجیب آلہ ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت کئی پہلوؤں سے ہوتی ہے؛ ایک تو یہ کہ مکتوب نگار بے تکلف ہو کر لکھتا ہے اور اس کے سوچنے کا زاویہ، ذہن کی اُفتاد، فطرت کے پیچ وخم، طبیعت کی سادگی یا پُرکاری فوراً معلوم ہو جاتی ہے۔ دوسرے، خطوط سے نجی حالات اور بہت سی وہ باتیں جو انسان عام حالات میں لکھنا یا بیان کرنا پسند نہیں کرتا معلوم ہو جاتی ہیں۔ تیسرے، ان کی بے تکلفی کے باعث استدلال کا انداز، اسلوب کی بے ساختگی اور زبان پر قدرت کا حال کھلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خطوط کی سوانحی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ مرزا غالبؔ نے اگر اپنے خطوط نہ چھوڑے ہوتے تو آج شاید ان کی سوانح عمری اتنی تفصیل اور موشگافی کے ساتھ نہ لکھی جاسکتی۔ چنانچہ مکاتیب نمبر میں بھی ایسے خطوط کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے جن سے مکتوب نگاروں کے بارے میں یا ان کے تعلق سے دوسری ادبی، سیاسی، سماجی یا تاریخی شخصیتوں کے باب میں بہت سی نئی اور اہم معلومات ہمیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً منشی پریم چند کے ۲۸ خطوط اس میں شامل ہیں جن سے اُن کی بعض کتابوں کے زمانۂ تصنیف وطباعت کی تعیین کی جاسکتی ہے۔ بعض افسانے انہوں نے کب لکھے یہ ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جاتا ہے۔ اس معلومات کی اہمیت یوں زیادہ ہوگئی ہے کہ پریم چند کے بہت سے افسانوں کا محرک کوئی سیاسی یا سماجی حادثہ ہے۔ اور اس عہد کی سیاسی کش مکش اُن کی تحریروں میں اہم محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۸ جولائی ۱۹۲۰ء کے خط سے (مکاتیب نمبر ۲ : ۵۸۹) اُن کے چھوٹے بچے کی تاریخ وفات کا علم ہوتا ہے۔ ابتدائی تصانیف کے بارے میں بھی ان خطوں سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

> "ہاں۔ ہم خرما و ہم ثواب، کشنا، وغیرہ میری ابتدائی تصانیف ہیں۔ پہلی
> کتاب تو لکھنؤ کے ناول پریس نے شائع کی تھی دوسری کتاب بنارس کے
> میڈیکل ہال پریس نے۔ یہ غالباً سنہ ۱۹۰۰ء کی تصانیف ہیں"۔ (۲ : ۵۹۲)

پریم چند کی بیوی شیورانی پریم چند نے ایک کتاب بہت سیدھی اور سرل زبان میں لکھی ہے جو ہندی میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا نام ہے "پریم چند گھر میں"۔ اس میں انہوں نے پریم چند کی عادتیں، اُن کے مشاغل، گھریلو معاملوں میں اُن کا رویہ، اُن کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات، عمدہ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ انہوں نے ہی یہ بھی بتایا ہے کہ گاندھی جی کا گورکھپور میں آنا پریم چند کی زندگی

میں ایک انقلاب کا آغاز تھا۔ اسی کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفا دے کر ترک موالات کرنے والوں کی صف میں شمولیت کی۔ وہ ملک کی آزادی کے لیے جی جان سے لڑنا چاہتے تھے اور ہندستان کو آزاد دیکھنے کی تمنا رکھتے تھے۔ لیکن بہت سی مجبوریوں کی وجہ سے وہ کبھی کوئی عملی حصّہ تحریک میں نہ لے سکے۔ ۸ر فروری ۱۹۲۱ء کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی تاریخ کو گاندھی جی گورکھپور گئے تھے (۲: ۵۹۲)۔ اس تاریخ کا معلوم ہو جانا کوئی بڑی دریافت تو نہیں ہے لیکن میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ بعض اتنی جزوی اور بظاہر معمولی باتیں بھی سوانح نگار کو بہت مدد دیتی ہیں اور ان سے سوانح عمری کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک خط میں پریم چند لکھتے ہیں:

"میں بھی ترک موالاتی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں بھی آج کل وہی مسائل
گونجا کرتے ہیں۔ ذہنوں میں بھی وہی خیالات جھلکتے ہیں۔ اور ادبی رسائل میں
ان کی گنجائش نہیں (۲: ۵۹۴)

اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا مصالح اور مواقع پریم چند کے سامنے تھے اور وہ کس انداز سے سوچتے تھے اور کن افکار و حوادث کا عکس ان کی تحریروں میں کس کس طرح ملتا ہے۔

پریم چند پر ہندی میں متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں سوانحی حیثیت کی بھی اور تنقیدی بھی۔ لیکن اُردو میں لے دے کر ایک رسالۂ 'زمانہ' کانپور کا "پریم چند نمبر" ہے۔ دوسری ایک مختصر سی کتاب "پریم سوگ" یا پھر ہنس راج رہبر کی کتاب "پریم چند" جس کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ 'زمانہ' کانپور کا نمبر تو واقعی اہم ہے کیوں کہ یہ ایک معاصر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ پریم چند کے تعلقات دیا نرائن نگم سے جتنے گہرے اور پرانے تھے وہ سب جانتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد کسی نے اُردو میں پریم چند پر لکھنے کا حق ادا نہیں کیا۔ رہبر کی کتاب چونکہ "بلا مقابلہ" ہے اس لیے اُسے غنیمت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اب ڈاکٹر قمر رئیس کا تحقیقی مقالہ "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ" شائع ہونے والا ہے۔ یہ شاید اس موضوع پر پہلی کامیاب کوشش ہوگی۔

پریم چند کے بعض خطوط رسالۂ 'زمانہ' میں چھپے تھے اور متفرق طور سے بھی شائع ہوئے تھے لیکن اتنے اہم اور اتنی تعداد میں کسی ایک جگہ نہیں ملیں گے۔ جتنے نقوش نے پیش کر دیے ہیں۔ اور یہ تو صرف ایک پریم چند کی بات ہوئی جسے میں نے بطور مثال پیش کر دیا تھا۔ اسی طرح کتنے ہی شاعر، ادیب، انشاپرداز، افسانہ نویس، اور اہم سیاسی حیثیت کے بزرگ ایسے ہیں جن کے خطوط نہایت مستند ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے اُن سے استفادہ ناگزیر ہوگا۔

ان خطوں میں جو ضمنی مباحث، علمی، لسانی یا ادبی نکات آ گئے ہیں وہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ مثلاً ایک جگہ لفظ "شہر دعات" کی بحث (۲ : ۵۷۷) یا عبدالرحمن بجنوری کے خط میں اصطلاحات علمیہ کے ترجمے کا مسئلہ (۲ : ۵۸۳)۔ ان سے بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ مجھ سے ایک مشہور عالم اور ادیب نے بر سبیل تذکرہ یہ فرمایا تھا کہ حسرت موہانی مرحوم نے "انتخاب سخن" کے عنوان سے جو سلسلہ قدیم شعرائے اردو کے انتخاب کلام کا چھاپا تھا وہ انتخاب دراصل براہ راست دواوین سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ حسرت کو غالباً پٹنہ سے ایک ایسی قلمی کتاب مل گئی تھی جس میں بہت سے شاعروں کا منتخب کلام کسی باذوق جامع نے ترتیب دیا تھا اور اسی کو انہوں نے باقساط شائع کیا۔ یہ بات کچھ ایسی مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔ مگر حسرت موہانی جیسے ثقہ انسان سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ حوالہ دینے سے گریز کریں اور کتمان حقیقت کے مرتکب ہوں۔ حسرت کے جو خطوط مکاتیب نمبر میں پیش کیے گئے ہیں اُن سے حسرت کے مزاج کی جفاکشی، وفاکیشی، سادگی، استقلال اور حوصلے کا اتنا صحیح اندازہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے ذریعے سے ممکن نہ تھا۔ ان میں بعض خطوط سے ان دواوین کے نام بھی مل جاتے ہیں جن سے حسرت نے یہ انتخاب کرکے چھاپا ہوگا۔ (مثلاً ۲ : ۶۰۹)۔ مولانا حسرت کی زندگی متضاد عناصر کا آمیزہ تھی اور اُن کے یہ خطوط اُن کی نجی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ان خطوں سے بعض اہم باتوں کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً یگانہ چنگیزی نے اپنی زندگی میں "گنجینہ" نئی ترتیب اور اضافے کے ساتھ مرتب کرکے لالہ دوارکا داس شعلہ کے حوالے کر دیا تھا۔ (۲ : ۷۱۵) یا یہ کہ سر آسمان جاہ کی درخواست پر میر محبوب علی خاں، آصف جاہ سادس نے مولوی فضل حق خیرآبادی مرحوم کے فرزند مولوی عبدالحق خیرآبادی کو دو سو روپیہ وظیفہ حین حیات عطا کیا تھا (۲ : ۹۴)

ایک خط اس میں منیر شکوہ آبادی کا بھی شامل ہے (۲ : ۹۸) اس سے پہلے غالباً منیر کا کوئی اُردو خط شائع نہیں ہوا۔ اس خط سے بعض اور امور کے علاوہ منیر کے طرز نگارش کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مکاتیب نمبر کے آخر میں "مشاہیر ادب" کے عنوان سے ان مکتوب نگاروں کے مختصر سوانح بھی ہیں جن کو محمد عبداللہ قریشی صاحب نے لکھا ہے۔ یہ حصہ بھی بہت اہم ہے اور محنت سے لکھا گیا ہے لیکن بعض فروگذاشتیں بھی رہ گئی ہیں مثلاً محمد حسین آزاد کے والد کا نام 'باقر علی' لکھا ہے (۲ : ۹۲۲) مگر صحیح نام محمد باقر ہے (اورنٹیل کالج میگزین فروری ۱۹۳۹ء) یا وقار الملک کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"امروہہ میں کچھ سرکاری خدمات انجام دیں جس کی وجہ پہلے سر رشتہ دار اور پھر منصرم صدر الصدور ہو گئے"

(۲ : ۹۲۵) ان خدمات کا تعلق امروہہ سے نہیں۔

مگر اتنی معمولی فروگذاشتیں قابلِ گرفت نہیں ہوتیں اُن سے بچنے کی سہل ترکیب یہ تھی کہ فاضل مرتب ہر جگہ آخر میں اپنا ماخذ ظاہر کر دیتے۔

جہاں اس نمبر میں بہت سے تاریخی لحاظ سے اہم اور معلومات افزا خطوط ہیں وہیں بعض مکتوبات بہت رنگین، دلچسپ اور پُر بہار بھی ہیں مثلاً عبدالحق کا مکتوب (۲ : ۹۷۱) یا پطرس کا خط عبدالمجید سالک کے نام (۲ : ۹۷۵)

آخر میں فاضل مرتب نے یہ صراحت کر دی ہے کہ اس نمبر میں "زندہ ادیبوں" کے مکتوبات شامل نہیں ہیں (اگرچہ بعض مکتوبات شامل ہیں!) ہمیں اُمید ہے کہ وہ اسی طمطراق اور ساز و یراق کے ساتھ زندہ ادیبوں کے مکاتیب پر مشتمل ایک نمبر نکال کر یہ کمی بھی پوری کر دیں گے۔

۱۹۵۸ء میں نقوش نے اپنی زندگی کے دس سال پورے کر لیے تو "دس سالہ نمبر" نکالا جو ۵۱۴ صفحوں کا تھا اس میں ۱۷ افسانے، ۲ ڈرامے، ۱۱ رپورتاژ، ۲ مزاحیہ مضامین اور دس مقالے شامل تھے۔ ان میں سب سے اچھا تنقیدی مضمون "غالب کی شاعری" پر عطا محمد شعلہ کا ہے۔ انھوں نے غالب کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر بڑی متانت سے گفتگو کی ہے اور لب و لہجہ میں توازن برقرار رکھا ہے۔

داراشکوہ کے دیوان فارسی پر ایک تعارفی مضمون جناب علم الدین سالک کا بھی اسی نمبر میں شامل ہے اور بہت قابلِ قدر ہے۔ "حضرت سید احمد رائے بریلوی کی داستانِ جہاد" پر غلام جیلانی برق اور گل بکاؤلی پر محمد عبداللہ قریشی کے مضامین بھی علمی افادے کے اعتبار سے اہم ہیں۔

اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مدیر نقوش نے آغاز ہی میں ایک چارٹ پیش کیا ہے جس سے بیک نظر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دس برس کے اندر نقوش نے کیا کیا چھاپا ہے۔ چنانچہ میزان یہ ہے :

۵۱۷ مضامین، ۴۹۰ افسانے، ۲۱۳ خطوط، ۶ ناولٹ، ۴۴۳ نظمیں، ۳۲۷ غزلیں اور یہ سب چیزیں بارہ ہزار دو سو چھہتر (۱۲۲۷۶) صفحوں میں سمائی ہوئی ہیں۔ جتنا کچھ نقوش نے دس برس میں پیش کر دیا ہے وہ شاید بہت سے رسالوں کے پچاس برس کے فائلوں میں بھی نہ مل سکے۔ دس سالہ نمبر کے بعد طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، خاص نمبر اور دو عام نمبر بھی نکل چکے ہیں انہیں بھی شامل کر لیں تو یہ تعداد اور بھی بڑھ جائے گی۔

۱۹۵۹ء میں "نقوش" نے تین نمبر بہت قیمتی اور بنیادی اہمیت رکھنے والے پیش کیے ہیں۔ ان میں ایک "طنز و مزاح نمبر" ہے (شمارہ ۷۱، ۷۲) جس کی ضخامت ۹۲۸ صفحات ہے۔ تفصیلی

تبصرے کے لیے بجائے خود اس پر ایک نمبر نکالا جاسکتا ہے۔ سرسری تعارف کے لیے کہا جائے تو اس کی ترتیب پر ایک نظر ڈالیے۔ پہلے حصے میں آٹھ مقالے ہیں۔ لکھنے والوں میں نام ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر کلیم الدین احمد، ڈاکٹر شوکت سبزواری، قاضی ظہور الحسن، ظفر احمد صدیقی اور علم الدین سالک کے ملیں گے اور موضوعات کی ترتیب یہ ہے:

(۱) ہنسنے کی ابتدا اور اس کی اہمیت (۲) طنز و مزاح (۳) مزاح اور مزاح نگاری (۴) اُردو ادب میں طنز و ظرافت (۵) اُردو شاعری میں طنز (۶) ہجو گوئی کی تاریخ (۷) پیروڈی اُردو ادب میں (۸) فارسی ادب میں طنز و مزاح۔

یہ تو گویا طنز و مزاح کا تاریخی، تنقیدی اور تحقیقی جائزہ ہوا، اب دوسرے باب میں "دنیا کی بڑی زبانوں کا طنزیہ و مزاحیہ ادب" پیش کیا گیا ہے اور ان زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی، فارسی، روسی، چینی، عربی، اطالوی، ہسپانوی، ترکی، بنگالی اور ہندی شامل ہیں۔ سب ملا کر گیارہ نمونے ہیں جو ان زبانوں کے ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں سے سب مضامین تو "نمائندہ" نہیں ہیں ان سے بہتر انتخاب ہوسکتا تھا لیکن بہر حال ان سے ایک اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اُردو میں ترجمہ ہو کر بھی بعض چیزیں کچھ کا کچھ ہو جاتی ہیں۔ ایسی مثالیں تو بہت ہی کم ہوں گی کہ اصل کی روح ترجمے میں بھی اسی طرح آجائے۔

تیسرے باب کا عنوان ہے "طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ابتدائی نمونے" ان میں مختلف اخباروں اور جریدوں کی نمائندگی کی گئی ہے خصوصاً "پنچوں کا دور" جس میں رفیق ہند، پنجاب پنچ، دہلی پنچ، لاہور پنچ، بنارس پنچ، آگرہ پنچ، دکن پنچ وغیرہ شامل ہیں۔

پھر اودھ پنچ کا دور آتا ہے اور اس میں وہ تمام مزاح نگار آگئے ہیں جنھوں نے اودھ پنچ سے لکھنا شروع کیا۔ اکبر الٰہ آبادی، منشی سجاد حسین، تربھون ناتھ ہجر، مچھو بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ سرشار، نواب سید محمد آزاد، عبدالغفور شہباز اور حکیم ممتاز حسین عثمانی وغیرہ۔

اودھ پنچ کے بعد "فتنہ اور عطر فتنہ کا دور" ہے۔ اس میں پہلے فتنہ اور عطر فتنہ سے متعلق عقیل احمد جعفری کا ایک اچھا مضمون ہے۔ پھر ان کے انتخابات دیے گئے ہیں جن میں ریاض خیر آبادی کا باغ و بہار اسلوب اپنے شباب پر ہے۔ اس کے بعد "شیرازہ کا دور" ہے جس میں سندباد جہازی کا "جدید جغرافیہ پنجاب"، عبدالمجید سالک کا "منکہ ایک معتبر نائی" بھی شامل ہیں۔

اس کے بعد موضوع کے تاریخی ارتقا کے مطابق طنزیہ و مزاحیہ ادب کے شہ پاروں کا انتخاب

ہے جو بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کیا گیا ہے۔ غالب، سرسید، نذیر احمد، محمد علی جوہر، مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی، ابوالکلام، مولوی عبدالحق، عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالغفار، خواجہ حسن نظامی، فلک پیما اور دورِ حاضر میں تمکین کاظمی تک بہت سے نام اور اُن کی نمائندہ تحریریں آگئی ہیں۔

اسی کے دوسرے حصّہ میں جو طنزیہ و مزاحیہ ادب کے زرّیں دور سے منسوب کیا گیا ہے پطرس، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، ملّا رموزی، کنہیا لال کپور، احمد ندیم قاسمی، شفیق الرحمٰن، ابراہیم جلیس، فرقت کاکوروی اور احمد جمال پاشا تک سب شامل ہیں۔

یہ تو حصّہ نثر تھا۔ اب اُردو کے "طنزیہ و مزاحیہ شاعر" آتے ہیں۔ اس میں پہلے تو شاعری میں طنز و مزاح کی تاریخ و تنقید پر ایک پُر مغز مقالہ محمد عبداللہ قریشی کے قلم سے ہے جس میں سب سے آگے جعفر زٹلی ہیں ان کے بعد سودا، میر، انشا، مصحفی، رنگین، ضاحک، کمترین، بدبد الشعرا، نظیر اکبر آبادی، نازنین، بیگم وغیرہ ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ تو تم بیر بھٹی نہیں ہیں۔ شاعروں میں اور بھی دو چار اچھے نام چھوٹ گئے ہیں۔ پھر دورِ جدید میں اکبر، شبلی، حالی سے لے کر احمق پھپھوندوی، شاد عارفی، مجید لاہوری، سید محمد جعفری، راجہ مہدی علی خاں وغیرہ بہت سے مزاحیہ شاعروں کا کلام آگیا ہے۔ پھر ایک عنوان ہے "مزاحیہ کردار"۔ اُردو میں بعض کیریکٹر اپنی خصوصیات کی وجہ سے زندہ جاوید ہوگئے ہیں مثلاً خوجی، حاجی بغلول، چچا چھکن وغیرہ۔ ان کرداروں کی نمائندگی بھی موجود ہے۔

اخباروں میں بھی مزاحیہ کالم کا رواج ہے۔ "مزاحیہ کالم" کے تحت ہمدرد، زمیندار، انقلاب، صدق، امروز، نوائے وقت، چٹان، نمکدان، کے مزاحیہ کالموں سے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

آخر میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے جمع کیے ہوئے لطائف ہیں جن کا تعلق اُردو کے ادیبوں اور شاعروں سے ہے۔ یہ گویا میں نے سرسری طور پر صرف طنز و مزاح نمبر کی فہرست کا تعارف کرایا ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس میں کیا کچھ موجود ہے۔ ایک ہزار صفحات کے اس نمبر پر "تنقیدی" نظر ڈالنا اتنا آسان نہیں۔ اُردو میں طنز و مزاح پر ابھی بہت کم لکھا گیا ہے، رشید احمد صدیقی کی کتاب "طنزیات و مضحکات" اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش تھی جسے انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی کی فرمائش پر لکھا تھا اور وہیں سے کتاب چھپی تھی۔ اس کا مقصد تحقیق یا تنقید سے زیادہ یہ تھا کہ اُردو میں طنزیات و مضحکات پر جو کچھ سرمایہ ہے اس کا ایک بھرپور تعارف ہو جائے۔ اُس وقت تو یہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ لیکن اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ رشید صاحب

اس پر نظر ثانی کریں۔ اور اضافوں کے ساتھ اس کا نیا ایڈیشن چھاپا جائے۔

رشید احمد صدیقی کے بعد کلیم الدین احمد نے طنز و ظرافت پر ایک طویل مقالہ لکھا اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بعض اہم مسائل کی طرف توجہ کی، نئے انداز سے اُردو کے تمام سرمائے پر ایک نظر ڈالی اور اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دیا۔ غلام احمد فرقت نے بھی پی ایچ ڈی کے لیے اپنا مقالہ اسی موضوع پر لکھ لیا ہے جو لکھنؤ یونیورسٹی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ "طنز و مزاح" کے نام سے اُن کی مرتب کی ہوئی ایک کتاب ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ نے چھاپی ہے جس میں اُردو ادب کے طنز و مزاح کا انتخاب کئی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے۔ اس میں فرقت صاحب نے طنز و مزاح کی تعریف اور تاریخ بیان کی ہے اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیا ہے۔

ابھی پاکستان سے ایک کتاب "اُردو ادب میں طنز و مزاح" ڈاکٹر وزیر آغا کی شائع ہوئی ہے۔ یہ ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا تھیسس ہے۔ اس میں وزیر آغا نے اُردو نظم و نثر میں طنز و مزاح کی رفتار متعین کر کے اس کا تجزیہ کیا ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب ہماری توقعات کے مطابق نہیں ہے۔ اس میں بعض خامیاں ایسی رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب تنقید کے معیار سے گر جاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ نظم و نثر کے جائزے میں تناسب نہیں رکھا جن اشعار یا نثر کے ٹکڑوں کا انتخاب کیا ہے وہ غیر مربوط ہیں اور جس عنوان کے تحت یا جس مثال کی تصدیق کے لیے پیش کیے گئے ہیں ان کی نمائندگی نہیں کرتے۔ نتائج کے استنباط میں بھی وزیر آغا نے غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہ کہیں زیادہ جذباتی ہو گئے ہیں مثلاً اکبر کے معاملے میں اُن کی رائے معروضی OBJECTIVE نہیں ہے۔ انگریزی زبان سے مثالیں اقتباس اور حوالے ضرورت سے زیادہ جمع کر دیئے ہیں جن سے اُردو طنز و مزاح کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی صرف مصنف کی "وسعت مطالعہ" کا علم ہوتا ہے۔

بعض باتیں دلیل کی محتاج رہ گئی ہیں، لکھتے ہیں: "لکھنؤ میں میر حسن نے عظیم، قصاب اور مکان پر بڑی مہذب اور پُر لطف ہجویں تحریر کیں" (۸۲) قطع نظر اس بات سے کہ ان نظموں کے لکھنؤ میں لکھے جانے کی کوئی خاص شہادت موجود نہیں، میر حسن کی یہ ہجویات خصوصاً "قصاب والا لطیفہ" اتنا غیر مہذب اور ناشائستہ ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ وزیر آغا نے قائم چاند پوری کی ہجویات پر بھی توجہ صرف نہیں کی، قائم کی ہجویات سودا سے پہلو مارتی ہیں۔

اُردو کی ابتدائی شاعری میں ہجویات کا اتنا ذخیرہ بآسانی مل سکتا ہے کہ اس پر ایک علیحدہ مقالہ یا کتاب لکھی جا سکے۔ وزیر آغا نے ان ہجویات کو ثانوی درجے میں لائق اعتنا سمجھا ہے۔ انتخاب اشعار

کا معاملہ ذاتی ذوق اور پسند کا ہوتا ہے لیکن جہاں تمثیل کی ضرورت ہو وہاں یہ شرط اتنی کڑی نہیں رہتی۔ دعوے کی دلیل ذاتی پسند یا ذوق سے نہیں حقائق سے اور نظائر سے دی جاتی ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ جو اشعار وزیر آغا نے مثالوں میں نقل کیے ہیں ان میں بیشتر ایسے ہیں جن سے دعوے کا اثبات نہیں ہوتا اور جو برمحل ہیں ان سے بہتر اشعار کا انتخاب کیا جا سکتا تھا۔

بہر حال اس کتاب پر مفصل تبصرہ تو میں پھر لکھوں گا سر دست یہ کہنا چاہتا تھا کہ اُردو میں اب تک طنز و مزاح پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت ناکافی ہے۔ نقوش کے طنز و مزاح نمبر نے اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے اتنا کچھ مواد ایک جگہ فراہم کر دیا ہے کہ اس کے سہارے سے طنز و مزاح کی ایک بھرپور تاریخ لکھی جا سکتی ہے اور نہ بھی لکھی جائے تو یہ نمبر خود اپنی جگہ ایک تاریخ ہے جو طنز و مزاح کے تدریجی ارتقا کو آئینہ کر دیتی ہے۔

مدیر نقوش نے ایک بات اچھی نہیں کی وہ یہ کہ انہوں نے "فحش" اور "غیر فحش" میں امتیاز کرتے ہوئے ہجویہ شاعری کے بہت سے حصے حذف کر دیئے۔ اس معاملے میں کئی پہلوؤں سے سوچنا چاہئے ایک تو یہ کہ طنز و مزاح نمبر کا مقصد عاقبت بخشوانا نہیں ہے دوسرے یہ کہ ہجو میں رکیک اور پھکڑ مضامین کا استعمال رواج زمانہ کے مطابق تھا ان سے آج برأت کا نفرت کا اظہار کرنا ایسا ہی ہے جیسے میر یا سودا سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ مارکسی کیوں نہ ہوئے؟ یا سرسید کی بجائے غالب نے یونیورسٹی قائم کیوں نہ کی۔ تیسرے یہ کہ ان رکیک، مبتذل اور سوقیانہ مضامین سے اس عہد کی معاشرت اور نفسیات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اشعار جن کا مقصد صرف گالی گلوچ یا گندہ ذہنی تھا جیسے میر حسن کا "لطیفۂ قصاب"، یا قائم کی مثنوی جو کسی لاولد بقال کی ہجو میں ہے، انہیں نظر انداز کر دینا مناسب بلکہ واجب ہے۔ لیکن اساتذہ متقدمین کی ہجویات کے ساتھ یہ رویّہ اچھا نہ ہوگا۔ طنز و مزاح کی تاریخ مرتب کرتے وقت جب ہم ریختی کی نمائندگی بھی کر رہے ہیں تو جعفر زٹلی کے ساتھ چرکین، بوم، زاغ وغیرہ خالص پھکڑ کے شاعروں کی نمائندگی بھی ہونی چاہیئے۔ طنز و مزاح کی بہت سی شاخیں ہیں۔ ذہانت، نقطہ آفرینی، مزاح، ٹھٹھول، ضلع جگت، پھکڑ، پھبتی، ہجو وغیرہ ان سب کے بہترین نمونے جمع کرنے کے لیے ہمیں کہیں اخلاق سے معذرت بھی کرنی پڑے گی اور موضوع سے انصاف کرنا ہے تو یہ معذرت بھی کرنی چاہیئے۔

نقوش نے اب تک جو شاندار نمبر پیش کیے وہ زیادہ تر موضوعاتی تھے یعنی ادب کے چند اہم موضوعات مثلاً طنز و مزاح، افسانہ، شخصیات وغیرہ۔ کسی ایک ادبی شخصیت پر پہلی کوشش منٹو نمبر

تھی جس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ دوسرا یہ پطرس نمبر (شمارہ ۷۵، ۷۶) ستمبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔

پطرس کی شخصیت صحیح معنوں میں باغ و بہار ہے۔ اس کی تحریروں میں سب سے زیادہ شگفتگی اور تخلیقی آن ملے گی۔ اردو میں شاید ہی کوئی مثال ایسی ملے کہ ایک شخص چند مضامین کا چھوٹا سا مجموعہ لیکر آیا ہو اور مورخ کے لیے اس عہد تک ناگزیر بن گیا ہو کہ اب اُسے نظرانداز کر کے اُردو میں طنز و مزاح کی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔

پطرس کی شخصیت اور فن کے بہت سے پہلو تھے۔ ان کی انسانیت، شرافت، اخلاق، وضعداری، مشرقی تہذیب سے ذہنی رابطہ، مغربی علوم و افکار کا طبیعت میں رچاؤ، اسلوب کی سادگی اور دل نشینی، مزاج کی واقعیت اور بے ساختگی۔ شخصیت کو دیکھئے تو وہ ایسی پرکشش ہے اور فن پر نظر ڈالیے تو موجودہ ادب کی ساری تاریخ میں کسی مزاح نگار کے یہاں وہ لطافت، شیرینی، سرگوشی کا سا انداز، بے ساختگی، برجستگی (ORGINALILY) بھی نہیں ملے گی جو پطرس کے مضامین کا حاوی عنصر ہے محمد طفیل نے ۶۵۰ صفحوں کا ایسا ضخیم اور شاندار نمبر مرتب کر کے پطرس کو زندہ کر دیا ہے ممکن تھا کہ ہمارا بے غیرت اور بے حس ملک پطرس جیسی شخصیت کو بھی فراموش کر دیتا لیکن اب یہ دھڑکا نہیں رہا۔

اس نمبر میں ۲۴ مضامین تو پطرس کی شخصیت پر ہیں جن کے لکھنے والوں میں ذوالفقار بخاری، سر ظفر اللہ خاں، عبدالمجید سالک، رشید احمد صدیقی، فیض، عصمت، قمر، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور اور محمد طفیل جیسے حضرات ہیں۔ چار مضامین تنقیدی ہیں جو ڈاکٹر احسن فاروقی، تمکین کاظمی، وزیر آغا اور اثر لکھنوی نے لکھے ہیں۔ ان کے بعد پطرس کی تخلیقات ہیں وہ تمام مضامین، افسانے، ڈرامے، خطوط وغیرہ جمع کر دیئے گئے ہیں جو پطرس نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ ان میں منظومات بھی ہیں افسانے، ڈرامے اور ناولٹ بھی۔ مزاحیہ مضامین، فنی مضامین، تنقیدی مضامین، نیاز مندان لاہور کا سلسلہ، ادب لطیف، دیباچے، سفرنامے، بچوں اور عورتوں کے لیے، خطوط، پطرس کے مضامین (مکمل کتاب) اور تقاریر یہ سب چیزیں سمو دی گئی ہیں۔

جب پطرس کی شخصیت پر بیس مضامین ایسے لوگوں کے ہوں جنھوں نے خود پطرس کو دیکھا ہو اور سمجھا ہو، چار مضامین فن کے مختلف پہلوؤں سے سیر حاصل بحث کرتے ہوں۔ پطرس کی کوئی تحریر ایسی نہ ہو جسے تلاش کر کے اس نمبر میں نہ سمو دیا گیا ہو تو اب کیا کہنے کو باقی رہ جاتا ہے کسی کی شخصیت اور فن کے بارے میں اس سے بہتر نمبر آج تک نہیں نکلا جبھی تو نیاز فتحپوری نے یہاں تک لکھ دیا کہ، اگر طفیل صاحب

کیرے لیے بھی ایسا ہی خصوصی نمبر نکال لنے پر آمادہ ہو جائیں تو میں اسی وقت مرنے پر آمادہ ہوں"۔

سنہ ۱۹۵۹ء کا تیسرا خاص نمبر (شمارہ ۷۷، ۷۸) دسمبر میں نکلا ہے۔ اب نقوش کے عام نمبر تو "خاص" طور پر نکلتے ہیں۔ اس نمبر میں بھی پندرہ افسانے، ایک اسکیچ، ساٹھ نظمیں غزلیں، سات مضامین شامل ہیں لیکن یہ خاص نمبر ایک "خصوصیت" کی وجہ سے ہو گیا ہے یعنی اس میں ایک سمپوزیم بھی ہے جس کا عنوان ہے "کیا موجودہ ادب رُوبہ تنزل ہے" اس میں ۲۵ ذی ہوش ادیبوں اور ناقدوں نے اظہار رائے کیا ہے۔ افسانہ، شاعری، تنقید اور طنز و مزاح پر ان موضوعات کے مستند لکھنے والوں کے خیالات ایک جگہ جمع کر دینا معمولی کام نہیں۔ اور آج تک کسی رسالے نے اس نوعیت کا کوئی سمپوزیم پیش بھی نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ حصہ لینے والوں میں منفی اور مثبت، مخالف اور موافق دونوں نظریوں کے لوگ شامل ہیں یعنی کوئی کہتا ہے ادب رُوبہ زوال ہے، کوئی کہتا ہے نہیں ایسی صورت میں ایک عام قاری کو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔ کیا یہ صرف نقطۂ نظر کا ہیر پھیر ہے یعنی ؎

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

یا ادب کی سمت و رفتار کا تعین اور اس کی ترقی یا زوال کا تیقن کسی خاص معیار سے کیا جا سکتا ہے؟ ایسی صورت میں یہ ضروری تھا کہ اس بحث میں ایک حکم بھی مقرر کیا جاتا جو ان سب حضرات کے دلائل و شواہد کو سامنے رکھ کر استنتاج کر سکتا۔

جہاں تک افسانے کا تعلق ہے اس کے فن میں نئے تجربے نہیں ہو رہے ہیں اور موضوعات میں تنوع نہیں انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ شاعری بھی پھر پرانی روش کی طرف رجعت قہقری کر رہی ہے۔ تنقید میں فکر انگیز باتوں کا فقدان ہے اور اس کے اصول و ضوابط آج تک نہیں مدون ہو سکے ہیں۔ تنقیدی نظریات اور عقائد ہم آج تک غیر ممالک سے درآمد کرتے ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ فقدانِ وسائل، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات، نئی اور پرانی قدروں کی کش مکش، نظریات کی فراوانی، کثرتِ تعبیر سے خوابوں کی پریشانی، نئے علوم سے ہماری بیزاری، اور زبان و ادب پر سیاست کا ردِ عمل، یہ سب مجموعی طور پر ہمارے ادب کی ترقی میں مانع ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار علیحدہ کیا ہے۔

یہ سمپوزیم کوئی ناطق فیصلہ نہیں۔ ادب کے موجودہ موقف کی ایک رپورٹ ہے جس پر ہمارے

نئے لکھنے والوں کو، ذہین اور ذی شعور ادیبوں کو سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنا چاہیئے۔

محمد طفیل نے اپنے زمانۂ ادارت میں نقوش کو زندۂ جاوید کر دیا ہے اور اُن کی محنت نے انہیں بھی امر بنا دیا ہے جس طرح نگار کے ساتھ نیاز فتحپوری کا نام، انجمن ترقی اُردو کے ساتھ مولوی عبدالحق کا نام یا صلائے عام کے ساتھ میر ناصر علی کا نام ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو گیا ہے اسی طرح اب نقوش اور محمد طفیل بھی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یہ اُن سے زندہ ہے وہ اس سے ــــــ عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خاص نمبروں کے میدان میں نقوش کا کوئی حریف ہندوستان یا پاکستان میں موجود نہیں۔

بیسویں سالگرہ پر

مسعود مفتی

صدر گرامی قدر ـــــ خواتین و حضرات!

چند روز پہلے جب معلوم ہوا کہ نقوش کی بیسویں سالگرہ پر مجھے بھی کچھ کہنا ہے تو میں بہت پچھتایا۔ کیونکہ میں عادتاً سالگرہ کے ہنگاموں سے گھبراتا ہوں۔ وجہ یہ کہ اس میں عموماً سطحی تعلقات کو رنگین پیکٹ کی شکل دی جاتی ہے ـــــ پھر مصلحت کی ڈوری میں لپیٹ کر چمکیلا تحفہ بنایا جاتا ہے ـــــ اور بالآخر اندیشہ ہائے سود و زیاں کے ہجوم میں پیش کیا جاتا ہے ـــــ لیکن پھر سوچا کہ ایسی سالگرہ تو بڑی باقاعدگی سے ہر سال اور بعض اوقات سال میں دو تین مرتبہ بھی ہوتی ہے اور طفیل صاحب تو غالباً بیس سال میں ایک دفعہ سالگرہ منا رہے ہیں تو کچھ تسلی ہوئی اور میں اپنے وسوسے بھول کر چلا آیا۔ دوسری تسلی یہ تھی کہ غالب کے برعکس طفیل صاحب اپنے ساتھ نوحہ گر رکھنے کے خواہشمند نہیں ہیں۔ اس لیے مجھے غالب کے قصائد کے انداز میں یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ ؏

دفترِ مدحِ جہاں داور کھُلا

اِتنا افسوس البتہ ضرور ہوا کہ طفیل صاحب ذرا لیٹ ہو گئے ہیں اور بیسویں سالگرہ پر پہنچے ہیں۔ ورنہ اُردو ادب سے ان جیسا والہانہ عشق کرنے والا بھول نہیں سکتا کہ اُردو شاعری میں اصل اہمیت سولہ برس کے سن کو ہے۔ اس سے انحراف تبھی ممکن ہے اگر وہ جدید شاعروں کی طرح روایت سے بغاوت کرنا چاہتے ہوں ـــــ ویسے یہ ہے بھی ٹھیک ـــــ آخر اُردو ادب کی کونسی صنف ہے جس پر اُنہوں نے تحقیق و تبصرے کا لاجواب نمبر نہیں نکالا۔ اگر تھوڑی سی جدید شاعروں کی بھی مان لی تو کیا حرج ہے۔ گو یہ ضروری نہیں کہ جدید شاعر بیسویں برس کو کوئی خاص اہمیت دیں۔ وہ تو غالباً ایک سو سولہ برس کے سن کو پوجیں گے ـــــ ذاتی معاملہ جو ہوا ـــــ بہرحال طفیل صاحب نقوش کی بیسویں سالگرہ پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس لیے کہ بیس سال کا یہ سفر مہم جوئی کی کٹھن داستان ہے جس میں کئی ہم سفر دائیں بائیں گر کر ٹھنڈے ہو گئے۔ مگر ان کا سفر جاری رہا ـــــ نہ صرف رہا بلکہ اب بھی ہے اور لمبی مسافت کی تھکن کے باوجود ہر نیا قدم نئے انداز میں اُٹھتا ہے۔

بقول غالب ؎

متانہ طے کروں ہوں رہِ منزلِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

مدیر نقوش کی جواں ہمتی کا وصف ہی یہی ہے کہ سایۂ دیوار میں بیٹھ کر بازگشت پر فخر کرنے کی بجائے مستقبل پر متانہ وار کمندیں ڈالتے جاتے ہیں۔ ایسے سفر کے لیے غالب نے شرط رکھی ہے کہ ؎

شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

ان کے شوق اور جرأت نے جو نقش پا بنائے ہیں وہ ادبی تواریخ بن گئے ہیں۔ نہ صرف انکی مدیرانہ کاوشیں بلکہ "آپ" "جناب" "صاحب" اور "محترم" کی شکل میں ان کی تخلیقی کوششیں بھی تواریخی اعتبار سے اہم تحریریں ہیں۔ خوبصورت اسلوب اور دوسرے محاسن اس کے علاوہ ہیں۔

خواتین و حضرات ــــــ ابھی ابھی میں نقوش کے خاص نمبروں کا ذکر کر رہا تھا کہ وہ اُردو ادب میں ایک لاجواب اضافہ ہیں۔ لیکن بات یہیں تک نہیں رہتی۔ طفیل صاحب کی ادبی دکان ایسی ہے کہ بقول غالب یہاں ؎

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

اور ان کے عام نمبر بھی سنگِ میل سے کم ثابت نہیں ہوتے۔

بار بار غالب کا ذکر کرنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ میں یقیناً غالب کا طرف دار نہیں۔ مگر بدقسمتی سے سخن فہم ہونے کا بھی جواز پیش نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ جدید تر سخن میری فہم سے باہر ہے ــــ غالب کا سہارا اس لیے لیا کہ اس کی بات میں بھی سمجھ جاتا ہوں اور آپ بھی۔ لیکن اگر جدید نمونوں کا سہارا ڈھونڈتا تو سمجھنے سمجھانے والا قصہ ختم ہو جائے گا ــــ ویسے تو ایک دفعہ غالب نے بھی کہا تھا کہ ؎

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

لیکن وہ خامشی کے فائدے کے تعلق سے کہا تھا اور یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔

اس مرحلے پر ایک اور وضاحت بھی کر دوں۔ آپ پوچھیں گے کہ بیسویں سالگرہ تو نقوش کی ہے اور میں بار بار طفیل صاحب کا ذکر کر رہا ہوں ــــ آپ کا اعتراض درست۔ مگر میرا اصرار بھی بجا ہے۔ اس لیے کہ ان برسوں میں طفیل نے اپنی ذات کو نقوش میں اس طرح تحلیل کر دیا ہے

کہ انجمن ترقیٔ اُردو ایک کلاسیکی ضرب المثل میں تبدیلی کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور آئندہ مرغی پہلے یا انڈہ پہلے والی پہیلی کی بجائے طفیل پہلے یا نقوش مستعمل ہو جائے گا۔ اس سے ایک تو پہیلی کی فرسودگی ختم ہو جائے گی اور دوسرے یار لوگوں کو اپنے آپ کو انٹلکچوئیل ظاہر کرنے کا آسان نسخہ مل جائے گا۔

طفیل اور نقوش کے منطبق ہونے میں طفیل صاحب کی محتاط۔ متوازن اور ہموار طبیعت کو بھی بہت دخل ہے۔ نقوش کا سرورق ہو یا پرچے کی خوبصورت طباعت ہو یا مضامین کے انتخاب کا سلیقہ ہو۔ اور یا پھر مدیرانہ پالیسی ہو۔ وہ ایک نپی تلی چال کے قائل ہیں جیسے کوئی تنی ہوئی تار پر دو چھتریاں پکڑ کر چلتا ہے ـــــ گھماتا ـــــ ہلاتا ـــــ اُٹھاتا اور گراتا ہوا ـــــ وہ اتنے محتاط ہیں کہ اُردو ادب کی قدیم روضوں سے عقیدت مندانہ طواف بھی جسم و جاں بچا کر اور نظر بچا کر چلتے ہیں۔

اس معاملے میں میرا اُن سے کبھی اختلاف بھی ہوا ہے۔ کیوں کہ میرا ایمان ہے کہ اس ملک کو سرپھروں کی سخت ضرورت ہے۔ سارتر اور رسل جیسے سرپھروں کی ـــــ یہ علٰحدہ بات ہے کہ میں بھی گفتار کا غازی ہوں اور سرپھرا بننے کی ہمت اپنے بال و پر میں نہیں پاتا۔ کیونکہ "ایں سعادت بزورِ بازو نیست"۔ لیکن اگر کبھی بھولے سے پاسبانِ عقل سو جائے تو طفیل صاحب نقوش کی اوٹ سے نکل کر خضر کے انداز میں ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔

ہم ہوش ترمذی کی آواز میں لاکھ احتجاج کریں کہ ؎

ہر جنبشِ دامانِ جنوں، جانِ ادب ہے
اس راہ میں آداب سکھائے نہیں جاتے

لیکن یہ بھی کمال صبر سے اُسی آواز میں سمجھاتے ہیں ؎

کچھ زخم ہیں ایسے کہ دکھائے نہیں جاتے[1]

اور ساتھ ان کی زیرِ لب مسکراہٹ کہتی ہے کہ میں بھی اپنے زخموں کو نقوش کی موٹی موٹی جلدوں کے نیچے چھپا لیتا ہوں۔ تم بھی یہ گُر سیکھو۔

چھوٹے اپنی لغزش یا سے ٹھوکر کھاتے ہیں تو نانیاں دادیاں "بسم اللہ" پکار اُٹھتی ہیں ـــــ

---

[1] اور آج تو اُنھوں نے اس سلسلے میں ایک حدیث بھی سنا دی۔

اس میں دُعا بھی ہوتی ہے۔ اور تنبیہ بھی ـــــ یہی کردار آج کل کبھی کبھار طفیل صاحب کو ادا کرنا پڑتا ہے ـــــ مصلحت کی ٹھوکروں۔ ادبی لغزشوں اور ذہنی بے راہ روی کے اس دَور میں ایسے بزرگ کی ذات ایک قومی اثاثہ بن جاتی ہے ـــــ

خدا کرے ان کا فیض جاری رہے اور نقوش کی دکان چلتی رہے۔

آج کا حاتم

ڈاکٹر سلیم اختر

کتابوں کی الماریوں کی فصیل پر دو سورما ایک دوسرے پر قلم کے نیزوں سے حملہ آور ہیں نیچے دو ڈھنگرے دانت نکوسے رزم آرا ہیں ایک کے ہاتھ میں قلموں کی تلواریں تو دوسرے نے نقوش کے کسی خاص نمبر جیسی ضخیم اور تگڑی کتاب کو ڈھال بنا رکھا ہے۔ الماریوں کی فصیل کے پیچھے سے دو خوفزدہ چہرے جھانک رہے ہیں جبکہ مینڈکوں جیسی سبز رنگت والے دو چوپایہ مار الماری کے پہلو اور نیچے سے اپنی چھپکلی جیسی گول گول آنکھوں سے میدانِ جنگ کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ ایک نے مارے خوشی کے دانت نکال رکھے ہیں جبکہ دُوسرے کی زبان کسی پیاسے جانور کی طرح منہ سے باہر نکل آئی ہے۔ قلم کی تلوار سے لڑنے والوں کے قدموں میں ان کے قلموں کی لاشیں ہیں جن میں سے ایک قلم کو تو قلم کی تلوار نے دو ٹکڑے کر دیا ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

میں "نقوش" کے "ادبی معرکے نمبر" کا سرورق دیکھتا ہوں اور دیکھتا رہ جاتا ہوں یوں کہ یہ سرورق ایک آئینہ میں تبدیل ہو جاتا ہے ایسا آئینہ جس میں ادبی معرکہ بازوں کے نقوش مسخ مسخ سے نظر آتے ہیں اور محمد طفیل نے بھی ادبی معرکہ بازوں کے رن میں ہی مسخ مسخ نقوش سے "نقوش" کا یہ خصوصی نمبر ترتیب دیا ہے اگرچہ سرورق کی زینت بنے چہروں میں کسی زندہ یا مُردہ ادیب کے نقوش کی جھلک نہیں ملتی لیکن کمال ہے کہ اس کے باوجود ان عام چہروں کے پیچھے کسی نہ کسی معروف جنگجو ادیب کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ میں کوئی نام نہیں لوں گا کہ یہ سرورق بیشتر اصحاب کے لیے جداگانہ انداز کا آئینہ ثابت ہو سکتا ہے اپنا چہرہ دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ ان چہروں میں اپنے دشمنوں کے نقوش کی تلاش کے لیے!

صاحبو! ادیبوں کا بھی عجب معاملہ ہے کہ سوتنوں کی مانند لڑے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کسی نے دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ اس بات کو قرار دیا تھا کہ ایک کمرہ میں دو عورتیں خاموش بیٹھی تھیں۔ لیکن دنیا کی سب سے بڑی سچائی کی طرف کسی کی توجہ نہ گئی کہ ایک ادیب تنہا بھی خاموش نہیں بیٹھتا

کہ ہر دم اپنی ذات سے مکالمہ جاری رکھتا ہے یہ مکالمہ جب الفاظ کے پیکر میں ڈھلتا ہے تو انسانی سائیکی کے اس ڈرامہ کو جنم دیتا ہے جسے ہم تخلیق کا نام دیتے ہیں۔ اسی لیے تو تخلیق ہمیں اپنی خاص فضا میں یوں جذب کر لیتی ہے کہ الفاظ کی تال پر ہمارے اعصاب دل بن کر دھڑکتے ہیں جب تخلیق کی تال پر ہمارے اعصاب دھڑک اٹھتے ہیں تو اس کے اعصاب پر کیا قیامت نہ بیت جاتی ہوگی جیسے بے خواب راتوں کا اجرِ عظیم تخلیقی صورت میں ملتا ہے، تخلیق سے لطف اندوز ہونے والا قاری کیونکہ تخلیق کار کی شخصیت سے غیر متعلق ہوتا ہے اس لیے وہ کبھی بھی اس ہفت خواں کی شدت کا اندازہ نہیں لگا سکتا جسے تخلیق کی تکمیل کے دوران تخلیق کار کی سائیکی طے کرتی ہے، لیکن تخلیق کار تخلیقی عمل کے جبر اور کرب سے آشنا ہوتا ہے اسی لیے تو اسے اپنی تخلیقات اسی طرح پیاری ہوتی ہیں جس طرح ماں کو ناک سڑ سڑاتا اور بھنبھناتی مکھیوں میں گھرا بچہ بھی چاند کا ٹکڑا —— ٹکڑا کیا بلکہ چودھویں کا چاند نظر آتا ہے۔ آپ نے دو پڑوسنوں کو بدتمیز بچوں کی خاطر یقیناً لڑتے دیکھا ہوگا کچھ یہی عالم ادیب کا ہے کہ وہ بھی جگر گوشوں کے لیے ایک عالم سے لڑائی مول لے سکتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو آج محمد طفیل ۱۳۰۰ صفحات پر مشتمل یہ عظیم اور ضخیم نمبر مرتب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا اور وہ بھی اس دعویٰ کے ساتھ:

> "تماشا یہ بھی ہے کہ دنیا کا ہر فرد دوسرے فرد کے خلاف ہے یہ ہماری سرشت کا تقاضا ہے ..... اگر آپ ادیب اور شاعر ہیں تو معاملہ زیادہ سنگین ہوگا لیکن عام آدمی اور ادیب میں فرق ہوتا ہے (بشرطیکہ نیتوں میں بیڑ ھ نہ ہو) عام آدمی غصہ میں آکر اپنا اور دوسروں کا نقصان کرتا ہے، مگر ادیب غصہ میں آکر دوسروں کا بھلا کرتا ہے کیونکہ اس کی کٹار نہیں چلتی قلم چلتا ہے قلم کی انہی جولانیوں سے یہ نمبر آراستہ ہے علمی موشگافیوں کی ضرب تقسیم بلکہ تفریق سے ادب کا بھلا ہوگیا، یہ میرا بیان ہے، یاد رہے کہ ایک اچھا آدمی بھی سارا دن اچھا نہیں رہتا یہ بھی میرا ایقان ہے۔"

واضح رہے کہ یہ سطریں وہ شخص لکھ رہا ہے جسے ہم سب اچھا مرد سمجھتے ہیں بلکہ میں تو اسے ایک اچھا آدمی سمجھ رہا ہوں جو سارا دن ہی اچھا رہتا ہو —— ٹھیک ہے تو پھر اس کے لکھے کی روشنی میں میں اب اپنی رائے تبدیل کیے لیتا ہوں۔ محمد طفیل بظاہر بہت پولا پولا انسان ہے لیکن مزاج آشنا احباب، "نقوش" کے رقیبوں اور جن کی تحریریں مسترد کیں ان ادیبوں کو اس امر کا اندازہ ہے کہ باہر کا یہ پولا انسان اندر سے کیل کی مانند سخت اور نوکیلا ہے۔ اب یہ دوسری

بات ہے کہ یہ بالعموم زبان اور قلم کو قابو میں رکھتا ہے (صرف اپنے اداریوں میں AIRS لیتا ہے)
اس لیے میں یہ سوچتا ہوں کہ کہیں یہ تو نہیں کہ اردو ادب کے عظیم ترین معرکوں اور معرکہ بازوں کے تذکرے سے اس نے اپنی کسی خاص کجرو جبلت کا ارتفاع کر لیا ہو ، ہو سکتا ہے وہ دن کے کسی بھی حصہ میں اچھا نہ رہتا ہو اور شاید اسی لیے اپنے اندر کے چھپے جن کو "نقوش" کے نت نئے نمبروں کی بوتلوں میں بار بار مقید کرنے کے اسی عمل میں گرفتار ہو جس نے سبتی فسیح کرب کو جنم دیا تو حاتم طائی کی سخاوت کو !

محمد طفیل کی شخصیت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اس کی مدیرانہ شخصیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور وہ اتنا اچھا بھی ہے کہ میں اس میں مزید اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور پھر اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا کیا جا سکتا ہے کہ وہ محمد طفیل سے "محمد نقوش" بن گیا اور اس پر خوش بھی ہے 'تو من شدم' کی اس سے بہتر مثال اور کہاں ملے گی ! تاہم "نقوش" کے خاص نمبروں کے سلسلے میں سامنے کی ایک بات کی طرف اشارہ کرتا چلوں کہ محمد طفیل نے خاص نمبر خواہ روایتی موضوعات پر نکالے جیسے افسانہ، غزل ، غالب ، اقبال، میر اور انیس کے بارے میں خاص نمبر یا پھر غیر روایتی نمبروں کی طرح ڈالی جیسے لاہور ، مکاتیب ، آپ بیتی اور یہ تازہ ادبی معرکے نمبر۔ لیکن بہر صورت اس نے ایک کام ضرور کیا اور وہ یہ کہ بہترین مواد کو خوب صورت ترین انداز میں پیش کیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بھی بڑھ کر اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اس تمام مواد کی ترتیب اور پیشکش کے پیچھے بطور محرک ایک خاص سوچ والے ذہن کے خواب اور ان کے ساتھ ساتھ ایک خاص زاویۂ نگاہ بھی زیریں لہروں کی مانند موجیں مارتے نظر آتے ہیں۔ ہر ادبی پرچہ کی انفرادیت اس کے مدیر کی شخصیت اور زاویۂ حیات کا عکس ہوتی ہے اگر یہ نہیں تو پرچہ محض مقالات ، افسانوں اور شاعری کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے ہر قسم کی تخلیقی سوچ سے عاری محض مطبوعہ تحریریں ، بنجر سوچ اور مُردہ تحریروں کا مجموعہ۔

لڑائی جھگڑا کوئی اچھی بات نہیں - اسی لیے تو میر ، سودا ، مصحفی اور انشا جیسے بزرگوں کی معرکہ آرائیوں کا چسکے لے لے کر تذکرہ کرنے کے باوجود قارئین کی اکثریت کا ان کے بارے میں معذرت خواہی پر مبنی رویہ بھی ملتا ہے لیکن یہ سب باتیں تو ہم آپ جیسوں

کے لیے ہیں محمد طفیل کے لیے نہیں جس نے اس نمبر کو یوں مرتب کیا کہ ان ہی معرکوں کے حوالے سے ادب و لسانیات اور تحقیق و تنقید کے دقیق نکات اجاگر کر کے رکھ دیے ہیں۔ چنانچہ اس امر پر پورے وثوق سے زور دیا جا سکتا ہے کہ اس نمبر میں پیش کردہ مواد کی روشنی سے اردو ادب کی تاریخ سے وابستہ لاتعداد اہم گوشے منور ہو گئے ہیں ایسے اہم گوشے جن سے ادبی مورخ صرف نظر نہیں کر سکتا۔ یوں دیکھیں تو اس نمبر کی رُو سے اردو ادب کی ترقی میں ادبی معرکوں نے نہ صرف بحد اہم اور بے حد تعمیری کردار ادا کیا ہے بلکہ میں تو یہاں تک جانے کو تیار ہوں کہ اس نمبر کے ذریعہ محمد طفیل نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ادبی ترقی کے لیے معرکہ آرائی بحد ضروری ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں ادبی معرکہ کے محرک اور معرکہ باز کی نیت میں امتیاز بحد ضروری ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف اپنی ذات کی تشہیر ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر وہ مخالفانہ اندازِ نظر کے حامی کی کردار کشی کے لیے ہے تو یہ کوئی قابلِ ستائش محرک نہیں اور بلاشبہ اس صورت میں ادیب، تخلیق کار کے منصب سے نیچے گر کر اس سطح پر آ جاتا ہے جہاں محلہ کی عورتیں اپنی اپنی دہلیز پر کھڑی ہاتھ ہلا ہلا کر اور حلق پھاڑ پھاڑ کر معرکہ آرا ہوتی ہیں اور یہ بھی سطے کہ اس انداز کے لڑاکوں کی کسی بھی عہد میں کمی نہیں رہی۔ چنانچہ میر، سودا اور بقا کی ہجویات اور مصحفی کے خلاف انشا کے جلوس سے لے کر آج کی معرکہ آرائیوں تک اگرچہ اظہار کی بوقلمونی ملتی ہے، لیکن محرک سب کا ایک ہی ہے یعنی:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اور اس احساس سے جنم لینے والے تفاخر کے احساس کی بنا پر مخالفین کی کردار کشی! اسی نے ہمارے ثقہ بزرگوں سے فحش ہجویات قلم بند کرائیں۔

ہجو گوئی کا نفسیاتی مطالعہ کریں تو اس سے وابستہ محرک میں نرگسیت کے علاوہ احساس کمتری کا پیدا کردہ مریضانہ فخر، عدم تحفظ کا احساس اور اس سے جنم لینے والی بے اعتمادی نمایاں تر نظر آتے ہیں لیکن اس ذاتی محرک کے برعکس شخصی معرکے بھی ملتے ہیں اور یہ ہے اصولوں کی جنگ اور نظریات کی لڑائی۔ یہ دراصل علمی بحث ہوتی ہے ایسی بحث جس کا محرک، ادب سے وابستہ اصول و ضوابط کی توضیح اور ناقص معلومات پر مبنی اغلاط کی نشان دہی ہوتی ہے اور اسی لیے ادب کی صحت مند نشوونما کے لیے یہ بحد ضروری ہوتی ہے ایسے ہی معرکوں سے تحقیق و تنقید کو فروغ ملتا ہے، مسائل کے علمی

خدوخال سنورتے ہیں اور تاریخ ادب کے مختلف ادوار میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ آپ تصور کیجیے اگر ہمارے بزرگوں نے ادب اور لسانیات کے مباحث نہ چھیڑے ہوتے اور پھر دوسرے بزرگوں نے انھیں چیلنج نہ کیا ہوتا تو آج اردو ادب اور زبان کی تاریخ محض "تذکروں" تک ہی محدود ہوتی۔

جہاں تک ادبی معرکے نمبر کا تعلق ہے تو اس میں دراصل محمد طفیل نے ان ادبی، لسانی اور تحقیقی معرکوں کو مدوّن کیا ہے جو خالص علمی تھے جن کا مقصد تحقیقی اغلاط کی نشان دہی تھا اور جن کے ذریعہ اردو تنقید اور تحقیق نے بلند معیار کی سند حاصل کی۔ چنانچہ فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی اردو ادب میں ان معرکوں کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ محمد حسین آزاد سے لے کر علامہ اقبال تک اور پھر اپنے دور میں جوش ملیح آبادی تک اردو ادب کی بیشتر قدآور شخصیات ہاتھ میں قلم کی تلوار تھامے علمی معرکوں میں مصروف نظر آتی ہیں اسی لیے یہ نمبر محمد طفیل کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس نمبر کے ذریعہ اس نے ثابت کر دیا کہ ادبی نظریات کی چھان پھٹک، علمی مسائل کی نوک پلک درست کرنے اور تحقیقات کے نام پر کی جانے والی مُوشگافیوں کو مسلمات بنانے کے لیے علمی معرکہ آرائی کتنی ضروری ہے اتنی کہ اس نمبر کی روشنی میں تو اردو ادب کی ترقی اور لسانی مباحث کا تنوع صرف ادبی معرکوں ہی کا مرہونِ منت قرار پاتا ہے اور اس لیے ہم ان معرکہ آراؤں کے ساتھ ساتھ اس نمبر کے مرتب کو بھی سلام کرنے پر مجبور رہیں۔

جب اس نمبر کے مطالعہ کے بعد میں طفیل صاحب سے ملا تو میں نے اس زبردست نمبر نکالنے پر مبارکباد دیتے ہوئے ان سے کہا،

"طفیل صاحب! آپ نے زبردست کام کر دکھایا آپ نے اپنی ریت کو خوب نبھایا اور نقوش کے باقی نمبروں کی مانند یہ نمبر بھی بلاشبہ حوالہ کی چیز قرار پائے گا۔"

یہ سن کر محمد طفیل کے چہرہ پر خوشی سُرخی بن کر چھا جاتی ہے مگر وہ مسکراہٹ دبا کر میری طرف دیکھتا ہے تو زندگی بھر محنت کرنے والی آنکھیں کچھ یوں کہتی محسوس ہوتی ہیں کہ اگرچہ تعریف اچھی چیز ہے یہ مزید کام کرنے کی لگن پیدا کرتی ہے خواب دیکھنے کی سکت بیدار رکھتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تھکے اعصاب کے لیے توانائی کا باعث بھی بنتی ہے تاہم ہم دونوں کی جب آنکھیں چار ہوتی ہیں تو وہ اپنے مخصوص، نرم اور تھکے تھکے لہجہ میں یوں گویا ہوتا ہے:

اس کے باوجود ـــــــ اس کے باوجود میں خاموشی سے اٹھتا ہوں اور

اپنی ایک اور نیکی کو دریا میں ڈال دیتا ہوں۔"[1]

یوں دیکھیں تو محمد طفیل ادبی جرائد کا حاتم قرار پاتا ہے کہ دنیائے ادب کے سوالوں کے جواب کی تلاش میں ہے اور یہ سب ہم جیسے سست میر شناسوں کے لیے ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ خود حاتم کو شہزادی سے وصل کی کوئی تمنا نہ تھی بس مہم جوئی کا چسکا اور نامعلوم کو معلوم کرنے کا سودا تھا۔ کچھ یہی عالم محمد طفیل کا ہے جس نے نقوش کے مختلف نمبروں کی صورت میں کئی ہفت خواں طے کیے اور ہر مہم میں کامیاب اور سرخرو بھی ہوا۔ یقیناً اس کے پاس کوئی سلیمانی سُرمہ ہے کہ دفینوں جیسے مخطوطے، گم شدہ موتیوں جیسے اشعار اور فراموش کردہ مقالات کھود نکالتا ہے یا پھر کوئی ایسی بُوٹی ہے جسے سُنگھا کر وہ ناقدین کو رام کر کے اپنے نمبروں کے لیے مقالات لکھوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے یقیناً اس کے پاس عمرو عیار کی زنبیل ہے — شاید "نقوش" ہی اس کی زنبیل ہو جس میں سے وہ عجوبے نکال نکال کر آنکھیں خیرہ کرتا جاتا ہے؛ ہو سکتا ہے بچپن میں اسے کسی سفید پوش بزرگ نے بشارت دے کر اسم اعظم سکھا دیا ہو جبھی تو رخشِ کامرانی پر سوار چار آئینے سجائے نقوش کی منزلیں سر کرتا جاتا ہے۔

---

[1] "طلوع" میر تقی میر نمبر (نقوش ۱۹۷۹ء)

سلیوٹ

کرنل محمد خان

طفیل صاحب سے بے تک میرا تعارف نہیں، لیکن نقوش سے میری پرانی واقفیت ہے۔ واقفیت ہی نہیں، خاصا گہرا یارانہ ہے اور بالواسطہ طفیل صاحب سے بھی عقیدت ہے کہ نقوش اور طفیل میں کوئی فرق نہیں۔ نقوش طفیل کی شخصیت کا عملی مظہر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جس شخصیت کا مظہر نقوش ہو وہ بہر حال غیر معمولی اور قابلِ محبت شخصیت ہو گی۔ جسے نقوش پسند ہے اُسے طفیل سے محبت کیے بغیر چارا نہیں۔ آپ نقوش پسندوں کا شمار کر لیں اور آپ کو طفیل پرستوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ ایسی ہمہ گیر محبوبیت ہر کسی کا نصیب نہیں۔

بحیثیتِ سپاہی مجھے نقوش خاص طور پر عزیز ہے کہ اس کے چند واضح سپاہیانہ انداز ہیں۔ فوج میں سپاہی کی ٹرن آؤٹ (TURN OUT) یعنی یونیفارم کے بانکپن اور قد و قامت کی دلآویزی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ سو مجھے نقوش کے ہر شمارے کی آن بان دیکھنے سے یہی احساس ہوتا ہے جیسے ہماری فوج کا کوئی جوانِ رعنا ایک بے عیب وردی میں پریڈ کے میدان میں انسپکشن کے لیے اکھڑا ہو اور کمپنی کمانڈر نے دیکھتے ہی کہہ دیا ہو۔ اے ون۔ کیری آن سرجنٹ میجر

(A. ONE. CARRY ON SEARGENT MAJOR)

رسالے اور بھی ہیں۔ اچھے بھی ہیں۔ لیکن ان میں وہ دوگونہ شانِ دلربائی نہیں جو نقوش سے مخصوص ہے۔ نقوش فقط جمال ہی نہیں جو تقریباً ہر رسالے نے کم از کم سرورق کی حد تک پیدا کر لیا ہے۔ نقوش کا ایک اندازِ جلال بھی ہے جو کسی دوسرے جریدے کو میسّر نہیں۔ نقوش کے نئے شماروں اور خصوصاً خاص نمبروں کی دید سے جہاں جگرِ لالہ کو ٹھنڈک پہنچتی ہے وہاں اُن کی ورق گردانی سے دریاؤں کے دل بھی دہلتے ہیں اور یہ سراسر مجاہدانہ شان ہے۔

مجھے بعض اوقات شبہ ہونے لگتا ہے کہ طفیل صاحب کہیں خفیہ طور پر ہمارے سٹاف کالج کوئٹہ کا کورس تو نہیں کر آئے کیونکہ ان کی تدوینِ نقوش کی پالیسی اُسی جنگی سٹریٹیجی (STRATEGY) سے بے حد مشابہ ہے جس کی تعلیم اس مشہور فوجی درس گاہ میں دی جاتی ہے — ماہرینِ حرب کے نزدیک

جنگ کے آٹھ مسلّمہ اصول ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کوئی جرنیل ان سے انحراف کر کے جنگ نہیں جیت سکتا۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ طفیل صاحب نقوش کی ترتیب میں ان اصولوں کے، کئی جرنیلوں سے بھی زیادہ پابند اور دلدادہ نظر آتے ہیں۔

مثلاً پہلا اصولِ جنگ ہے: MAINTENANCE OF OBJECTIVE یعنی مقصد کے تعین کے بعد اپنی تمام تر توجہ اسی پر مرکوز رکھنا اور کسی دوسرے کام میں نہ اُلجھنا۔ اقبال کی اصطلاح میں آپ اسے جنون کہہ سکتے ہیں۔ میں گزشتہ کئی سال سے دیکھ رہا ہوں کہ طفیل صاحب کے سامنے فقط ایک ہی مقصد ہے یعنی نقوش کو خوب سے خوب تر بنانا۔ مجھے معلوم نہیں؛ انھیں اس جنون میں کس قدر مالی نفع یا نقصان ہوا ہے ــــ اللہ کرے کچھ نفع ہی ہوا ہو ــــ بہر حال اُن کی تگ و دو میں یہ نفع و ضرر محض ضمنی سے حادثے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جس یکسوئی سے وہ تلاشِ خوب تر میں مصروف ہیں وہ اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر ہی ممکن ہے۔ اگر ان کا مقصد پیسہ کمانا بھی ہوتا تو نقوش کے ساتھ ساتھ شاید بناسپتی گھی کی ایجنسی بھی کھول لیتے۔ لیکن یہ شاٹ کا بج کوئٹہ کی تعلیم کے سراسر منافی ہوتا کیونکہ پہلے اصولِ جنگ یعنی MAINTENANCE OF OBJECTIVE کے تحت آپ یا تو گھی بیچ سکتے ہیں یا نقوش جیسا رسالہ چلا سکتے ہیں۔ دونوں کام نہیں کر سکتے۔

فنِ حرب کا دوسرا اصول OFFENSIVE ACTION ہے یعنی جارحانہ کارروائی اور میرے تصور کے مطابق طفیل یقیناً گوشہ نشینی یا سنیٹہ گرہ کے قائل نہیں بلکہ وہ ہر لحظہ مائل بہ پیکار نظر آتے ہیں۔ تکمیلِ نقوش کے سلسلے میں جہاں کسی فتنے نے سر اُٹھایا یہ جملہ اسلحہ سے لیس ہو کر اُس کی سرکوبی کو جا پہنچے۔ میں نے ذاتی طور پر طفیل صاحب کو IN ACTION نہیں دیکھا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہر نئے حملے کی تیاری، کی ابتدا وہ ایک بچے تُلے منصوبے سے کرتے ہیں یعنی بالکل اسی طرح جیسے ایک جرنیل حملے سے پہلے ایک تفصیلی پلین (PLAN) تیار کرتا ہے جس طرح جرنیل اپنی مخالف افواج اور اُن کے کمانڈروں کا جائزہ لیتا ہے اور اُنھیں زیر کرنے کی تدابیر کا خاکہ بناتا ہے، اسی طرح طفیل صاحب بھی جملہ شاعروں اور ادیبوں کا احاطہ کر لیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے ان کو حلقۂ کمند میں لاتے ہیں۔ بلکہ شاید طفیل صاحب کو اپنی خوئے دلنوازی کے طفیل تلوار کو بے نیام ہی نہیں کرنا پڑتا۔ یعنی محض اپنے حسنِ طلب کے طفیل ہی بیک کف بُردنِ صد دل کا عمل کرتے ہیں لیکن چند شاعر اور ادیب بلاشبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تسخیر مسلح افواج کی تسخیر سے بھی مشکل ہوتی ہے۔ ان حالات میں طفیل صاحب کی جارحانہ صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں اور وہ سنگین سے سنگین مہم بھی سر کر کے دم

لیتے ہیں۔ نقوش کے صفحات ایسی کئی فتوحات کے گواہ ہیں۔

جنگ کے چند اصول اور بھی ہیں لیکن میں صرف ایک اور ذکر کروں گا جسے انگریزی میں SURPRISE کہتے ہیں۔ یعنی ناگہانیت۔ ایک جرنیل کے لیے لازم ہے کہ دشمن کو بے خبری میں جا لے۔ جس کمانڈر کے منصوبے کا دشمن کو پیشگی علم ہوگیا، اس کی جرنیلی کچی ہے۔ طفیل صاحب بہت پکے جرنیل معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی سرپرائز کا شکار صرف اُن کے ہمعصر ہی نہیں بلکہ ہم قارئین بھی ہیں۔ ہم ایک شمارے کے طلسم سے سنبھل نہیں پاتے کہ ایک بالکل نئے اور غیر متوقع موضوع پر ایک اور ضخیم نمبر تمکین و ہوش پر ڈاکہ ڈالنے آ وارد ہوتا ہے۔ ان نمبروں میں سے کس کس کا ذکر کیا جائے۔ سب کے سب دامنِ دل کھینچتے ہیں لیکن ایک شمارہ جس نے دِل میں مستقل گھر کر لیا، پطرس نمبر تھا اور اسے ہم نے آج تک حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔ ایک اور شمارے کو جس میں ستمبر ۶۵ء کی جنگ کا احاطہ کیا گیا تھا ہم داستانِ دل سمجھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نقوش آئندہ بھی اسی شانِ یکتائی کے ساتھ کتابِ دل کی تفسیریں پیش کرتا رہے گا اور اپنے جرنیل مدیر کی کمان میں قارئین کے دل و نگاہ کو مسخر کرتا رہے گا۔

ایک عہد آفریں شخص

فتح محمد ملک

صدرِ گرامی!

خواتین و حضرات!!

اس وقت میں دو شخصیتوں کے رُوبرو ہُوں، ایک کا نام محمد طفیل ہے اور دوسرے کو محمد نقوش کہتے ہیں۔ بے شک یہ ایک ہی شخصیت کے دو رُخ ہیں مگر میری ان سے جدا جدا رسم و راہ ہے اور میں انہیں ہمیشہ سے الگ الگ پہچانتا آیا ہوں۔ جب میں ان کا خیال کرتا ہوں تو مجھے اقبال کی نظم "شکوہ و شکایت" یاد آتی ہے۔ اقبال اپنی اس مختصر نظم میں اللہ میاں کے بے پناہ اور بے شمار احسانات پر شکر ادا کرنے کے بعد یہ شکایت کرتے ہیں :

لیکن مجھے پیدا کیا اُس دیس میں تُو نے

جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

آپ جانتے ہیں کہ نہ طفیل صاحب اللہ میاں ہیں اور نہ مجھے اقبال کی گردِ پا ہونے کا مرتبہ نصیب ہے۔ اس کے باوجود مجھے نظم "شکوہ و شکایت" یُوں یاد آتی ہے کہ میں محمد طفیل کے لیے سراپا عقیدت و سپاس ہوں مگر محمد نقوش کا خوگرِ حمد ہوتے ہوئے تھوڑا سا گلا بھی رکھتا ہوں شاید اس لیے کہ محمد نقوش سے میرا تعلق محمد طفیل سے میری نیاز مندی کے مقابلے میں بہت پُرانا ہے۔ محمد نقوش کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب میں گورنمنٹ کالج اٹک میں سالِ اوّل کا طالب علم تھا اُس زمانے میں "نقوش" کا ہر شمارہ ایک واردات بن کر نمودار ہوتا تھا۔ میں اس واردات پر اس قدر فریفتہ تھا کہ جاڑے موزے اور سویٹر کے بغیر گزار سکتا تھا مگر نقوش خریدے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہ کر سکتا تھا۔ میری ادبی تربیت اور میرے مزاج کی تشکیل میں نقوش کی حیثیت ماں کی سی ہے۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ جس زمانے میں میں نقوش کا قاری بنا اُسی زمانے میں محمد طفیل نے نقوش کے صفحات پر خاکہ نگاری کی ابتدا کی۔ خود، شخصی مرقعے کھینچے اور محمد نقوش کو شخصیات نمبر

پیش کرنے پر اُکسایا۔ اب یہ محمد طفیل خاکہ نگاری کے باب میں نصف درجن کتابوں کا مصنف ہے اور یہ کتابیں کیا ہیں ہمارے زمانے کا "آدمی نامہ" ہیں۔ ان کے فنی محاسن کے بیان میں فراقؔ اور نیازؔ سے لے کر یحییٰ امجد تک بزرگ و خورد یکساں رطب اللسان ہیں اور محمد حسن صاحب تو ان کی نثر کی تحسین میں یہاں تک آ گئے ہیں کہ بقول اُن کے :

"محمد طفیل نے نثر میں غزل کے شعر کہنے کی روایت قایم کی ہے۔"

یہ سب فنی محاسن اپنی جگہ پر درست مگر مجھے محمد طفیل کی خاکہ نگاری کا ایک تاریخی اور معاشرتی پہلو بھی نظر آتا ہے۔ محمد طفیل کے خاکے ہماری ادبی دنیا میں آدمی اور آدمیت کے ایک نئے تصور کے ترجمان ہیں۔

خاکہ نگاری کے میدان میں محمد طفیل کے اُترنے سے ذرا پہلے سعادت حسن منٹو کی تصنیف "گنجے فرشتے" کی ہنگامہ خیز اشاعت عمل میں آئی تھی۔ منٹو صاحب نے رشید احمد صدیقی اور مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کے خلاف ردِ عمل پیش کیا تھا۔ یہ بزرگ' عیب پوشی کو شخصی عظمت اُجاگر کرنے کے لیے ضروری سمجھتے تھے جبکہ منٹو عیب جوئی کا خوگر تھا۔ مغربی ہیومنزم کے بوہیمین تصور کے زیر اثر منٹو' کمزوریوں اور خامیوں میں عظمت ڈھونڈتا تھا اور ایک سنسنی خیز انداز میں عیوب کی نمایش کرتا تھا۔ منٹو کے "تین گولے" "عصمت کے "دوزخی" اور احمد بشیر کے "شعبدہ باز" کے سے خاکے معیار بن کر رہ گئے تھے۔ نتیجہ یہ کہ جب تک کسی شخصیت میں فراقؔ کی سی کجروی اور میرا جی کا سا ابتذال دستیاب نہ ہو، عظمت دریافت نہ ہو سکتی تھی۔ بیشک فراقؔ اور میرا جی عظیم شخصیات ہیں مگر ان کی عظمت ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہے' ان کے باعث نہیں ہے بدقسمتی سے "گنجے فرشتے" کی اشاعت کے آس پاس کے زمانے میں یہ غلط فکری عام تھی کہ انسانی عظمت انسانی کمزوریوں سے پھوٹتی ہے اس لیے شخصیت نگار کو عیب پوشی کی بجائے عیوب کی ٹوہ میں رہنا چاہیے اور کمزوریوں کی تشہیر کرنی چاہیے۔ یہ تھی وہ فضا جس میں محمد طفیل نے احترامِ آدمیت کے تمام تر تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھ کر مرقع نگاری شروع کی۔ اُنھوں نے عیب جوئی کی نہ عیب پوشی بلکہ قوتِ مشاہدہ اور احساسِ تناسب کے ساتھ ساتھ خوفِ خدا کو بھی شخصیت نگاری کا لازمہ ٹھہرایا۔ سو محمد طفیل کی خاکہ نگاری اور محمد نقوش کے شخصیات نمبروں کے زیر اثر رفتہ رفتہ یہ تصور رفت گزشت ہوا کہ نیک جذبات سے ادب پیدا نہیں ہو سکتا اور بڑا آدمی وہ ہے جس کی کمزوریاں بڑی ہوں۔

یہ تھا محمد طفیل سے میرا علمی تعارف! شخصی تعارف اور تعلق کی سعادت نصیب ہوئی تو عزم و ہمت کے اس پہاڑ کو جذباتی گہرائی اور تہذیب کی کان پایا۔ ہمارے معاشرے میں محنت، لگن اور مستعدی کی مثالیں وافر ہیں مگر جو انہماکِ کار اور جو نشاطِ کار میں نے طفیل صاحب کی ذات میں دیکھا وہ کم دیکھنے میں آیا ہے۔ دُور کیوں جائیے، اس وقت ہم "نقوش" کے جس شمارے کی رونمائی کی تقریب میں بیٹھے ہیں اس کے "طلوع" کا پہلا جملہ دیکھیے:

"میرے دل میں کاموں کا میلہ سا لگا ہوا ہے"

کاموں کی بھیڑ کو کاموں کا میلہ محمد طفیل ہی کہہ سکتے ہیں۔ ہاں بھئی! سچ ہے STYLE IS THE MAN - یہ طرزِ تحریر ایک مخصوص طرزِ حیات ہی سے پھوٹ سکتا ہے۔ محمد طفیل کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے محمد نقوش کو بھی اسی نشاطِ کار کا رسیا کر لیا۔ چنانچہ محمد نقوش نے ایک ایک سال میں ابدیت کے کئی کئی چراغ جلانے کی ٹھانی ہے۔ غالب نمبروں، اقبال نمبروں اور ادبی معرکہ نمبروں کے بعد اب انیس نمبر طلوع ہوا ہے۔ محمد نقوش کا یہ کارنامہ عہد آفریں ہے، میں اس کارنامے کو سلام کرتا ہوں مگر بعد از سلام ایک اور عرض بھی ہے اور وہ یہ کہ محمد نقوش صاحب! آپ نے ہمیں اپنے عام نمبروں سے محروم کر دینے کا عزم کیوں باندھا ہے؟ ہم نے تو مختار صدیقی مرحوم کی یہ نصیحت پلّے باندھ رکھی ہے کہ:

"خاص بنو پر عام رہو"

اور خاص ہوتے ہوئے عام بننے کی ادا ہمیں نقوش کے عام نمبروں میں نظر آئی تھی۔ محمد نقوش ہمیں اس ادا کا گرویدہ بنا کر کلاسیکی عظمتوں کے مینار دکھانے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ بے شک یہ مینار بہت روشن ہیں مگر ہمیں اپنے عہد کے مینار خود تعمیر کرنے ہیں۔ کیا محمد نقوش اس تعمیری سرگرمی میں ہماری مدد نہیں کریں گے؟

خواتین و حضرات!

اس وقت مجھے وہ "نقوش" یاد آ رہا ہے جس کا مجھے گورنمنٹ کالج اٹک میں انتظار رہتا تھا، جو اُس زمانے کے ادیبوں کی تحریروں کا مخزن تھا۔ جس کی بدولت میرے جیسے طالب علموں میں ادب کا ایک توانا اور متحرک ذوق عام ہو رہا تھا اور جو دنیائے ادب کے لیے عہدِ حاضر کے ادب کی تخلیقی رفتار کا پیمانہ تھا اور جسے اس تقریب میں ہم یُوں بھولے بیٹھے ہیں جیسے بعض امیر لوگ خوشی کی تقریب میں اپنے غریب رشتہ دار کو بلانا بھول جاتے ہیں۔

برادرم محمد نقوش صاحب!

خدارا اپنے اس غریب رشتہ دار کا ساتھ نہ چھوڑیئے۔ بجا کہ آپ وہ فریضہ ادا کر رہے ہیں جو کئی ادارے مل کر بھی ادا نہ کر سکے، مگر اُن فرائض کو بھی یاد رکھیے جو ایک زندہ ادبی رسالے کے ناگزیر فرائض ہیں۔

عجیب و غریب شخص

اشفاق احمد

ادبی معرکے نمبر پڑھ کر مجھے یہ پتا چلا کہ ہمارے بزرگ بفضلِ تعالیٰ ہم سے بہتر نہیں تھے۔ لڑائی جھگڑے، دھینگا مشتی، ڈھول ڈھپے کے فن میں گُنی لوگ تھے اور اپنے علاوہ دوسرے کو احمق اور لکڑ بھرا سمجھتے تھے۔ ان کے چہرے مُہرے، وضع قطع، میلے لباس سے صاف پتا چلتا ہے کہ ان کی ذات کے اندر ایک چیز ایسی ضرور موجود تھی جو خوراک اور غذا کے بغیر اور آکسیجن اور وٹامن استعمال کیے بنا سب سے زیادہ صحت مند، تنومند اور چیرھی تھی اور وہ تھی ان کی انا اور ان کے نفس کی شوکت! حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے۔ ہمارے بھی ایک بہت پیارے، علم دوست مرنجان مرنج اور آزاد مرد قسم کے دوست للیانی میں رہتے ہیں وہ صبح سویرے بس میں بیٹھ کر لاہور آتے ہیں اور سارا دن لائبریری میں گزار کر شام کی بس میں واپس گاؤں چلے جاتے ہیں۔ وہ ہر طرح کی لاگت بازی اور تعصب سے پاک ہیں کیونکہ وہ ہر ایک سے یکساں طور پر نفرت کرتے ہیں اور ان کو کسی کا کوئی کام پسند نہیں آتا۔ میں نے ان کا ذکر اطلاعاً کیا ہے کہ وہ بھی ایک بہت بڑا ادبی معرکہ ہیں گو محمد طفیل کو ابھی ان کی خبر نہیں ملی۔ ان کو یقین ہے کہ جن دو کتابوں کے نوٹس انھوں نے ہیروشیما کے بعد سے لے کر اب تک تیار کیے ہیں ان ہزارہا کتابوں سے بہتر ہیں جو احمق لوگ اب تک چھپوا چکے ہیں اور جن کو جاہل پبلشر بار بار شائع کر رہے ہیں۔

محمد طفیل ایک عجیب و غریب شے ہے جو ہر مرتبہ عجیب و غریب نمبر لے کر آجاتا ہے سوائے اپنے اداریے کے ہر جگہ شرماتا، لجاتا، ٹھٹکتا، بل کھاتا اپنا نمبر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے شرمیلا ٹیگور کا نام سُن کر ہمیشہ محمد طفیل یاد آجاتا ہے۔ لکھنا پڑھنا شانتی نکیتن ٹیگور کا سا اور باقی سب کچھ شرمیلا جیسا —— جن دنوں میری اس کی بول چال تھی بلاواسطہ طور پر بہت کچھ اس سے پوچھ لیتا تھا۔ اب ہم دونوں اپنی اپنی عزت کے مورچے میں اُترے ہوئے ہیں اور لام بندی کے سترہ سال گزارنے کے باوجود خندق سے باہر نہیں نکلتے —— اگر میرا بس چلے تو اس سے پُوچھوں کہ تم یہ نمبر کس طرح سے نکالتے ہو؟ اور لوگ بھی نمبر نکالتے ہیں لیکن ان کے

نمبروں میں وہ کچھ نہیں ہوتا جو تمہارے نمبروں میں ہوتا ہے۔ جیسے سلاجیت اور پہاڑوں سے بھی نکلتی ہے لیکن چلاس کے پہاڑوں کی سلاجیت بیٹھنے ہی نہیں دیتی ـــــ کیا کوئی بہت بڑا ریسرچ سکالر یہ سارا سرمایہ چھوڑ کر مر گیا ہے اور اس کی کوٹھڑی کا بند راستہ اس علی بابا پر وا ہو گیا ہے یا سلیمانی ٹوپی والے جنوں اور مؤکلوں کو اس کام پر لگا دیا گیا ہے کہ وہ اردو کی دنیا سے ایسے دفینے کھود کر لاتے رہیں اور محمد طفیل کے جا نماز تلے جمع کرتے رہیں کہ صبح نمازِ فجر کے بعد جب وہ دایاں کونہ اٹھائے تو کاتب کو فیڈ کرنے کے لیے سات دن کا مواد وہاں رکھا ہو۔ یا پھر یہ سارے نمبر کو اس میں اور محمد طفیل نے اجتماعی نظر بندی کر کے ہم سب کو بھوندو بنا رکھا ہے۔ میں نے اس پر بڑا غور کیا ہے اور یہاں سے جانے کے بعد پھر غور کرنا شروع کر دوں گا لیکن مجھے اس گتھی کا ابھی تک ایک سرا بھی نہیں ملا۔ میں نے ایم۔ اے اردو کے ایک ذہین طالب علم سے بھی پچھلے سال درخواست کی کہ وہ محمد طفیل نمبروں والے کے طریقہ کارکردگی پر ایک مبسوط تھیسس لکھے اور پھر اس کو کتابی صورت میں شائع کرے لیکن اس نوجوان نے یہ کہہ کر معذوری کا اظہار کیا کہ محمد طفیل چونکہ ابھی تک فوت نہیں ہوئے اس لیے ان پر تھیسس نہیں لکھا جا سکتا۔ یونیورسٹی نیم جاں لوگوں پر تھیسس لکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اب آپ ہی بتائیں یہ مشکل مسئلہ کیونکر حل ہو گا۔ محمد طفیل تو اس راز کو اپنے ساتھ ہی فوت کروا کے دم لیں گے۔

یوں تو نقوش کے ہر نمبر نے ایک نیا علم عطا کیا لیکن ادبی معرکے نمبر نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔ پتا یہ چلا کہ لکھائی پڑھائی، ادب اور شاعری، تنقید اور تحقیق بشر کو کسی ارفع سطح پر نہیں لے جاتیں بلکہ وہ بندے اور بشر کے مقام سے گر کر انسان بن جاتا ہے (یاد رہے کہ انسان کو قرآن اچھے معنوں میں یاد نہیں کرتا۔ جہاں بھی انسان کا ذکر آیا ہے توہین آمیز انداز میں ہی آیا ہے)

تو معلوم یہ ہوا کہ اپنے تمام تر علم اور ادب اور فن کے باوجود انسان پتھر اور دھات کے زمانے کے انسان سے آگے نہیں بڑھا۔ وہی حرص وہی طمع ویسی ہی چالاکی وہی عیاری، حسد، جلن، سینہ زوری، وہی چھوٹا پن، کمینہ پن اور خونخواری ـــــ لیکن یہ بھید نہ ہی کھلتا تو اچھا تھا۔ علم ادب شاعری فن کاری کا جو بھرم بنا ہوا تھا بھرم ہی رہتا تو کیا بری بات تھی۔ لیکن طفیل کو تو کسی کا بھرم بھی پسند نہیں اپنے نمبر عزیز ہیں۔

نقوش کے خاص نمبر

خدیجہ مستور

بہت سے ادبی رسائل معرضِ وجود میں آئے اور تھوڑے ہی عرصے میں طرح طرح کی مشکلات جھیل کر ختم ہوگئے۔ ان کا کوئی یاد کرنے والا نہیں رہا اور نہ ہی انھوں نے اپنی چھوٹی سی ادبی زندگی میں کوئی ایسا نقش چھوڑا جس کی بنا پر ان کا تذکرہ ہوتا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں پہلی بار نقوش ہاجرہ مسرور اور ندیم بھائی کی ادارت میں شائع ہوا، اور صرف تین عام نمبروں کے بعد، اس وقت کی ادب نواز حکومت نے اسے منٹو کا افسانہ چھاپنے کے جرم میں چھ مہینے کے لیے بین کر دیا۔ تین عام نمبروں کی اشاعت کسی ساکھ کی ضامن نہیں ہوتی، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ صرف ادیبوں بلکہ عام قاری نے بھی نقوش کی اس قید کو بُری طرح محسوس کیا۔ چھ ماہ کی قید بھگتنے کے بعد جب نقوش دوبارہ شائع ہوا تو چھ سات نمبر مرتب کر کے ندیم بھائی اور ہاجرہ بعض مجبوریوں کی بنا پر ادارت سے دستبردار ہو گئے۔ ان کے بعد ادارت کے فرائض سیّد وقار عظیم صاحب نے سنبھال لیے۔

ایک سال نہیں گزرا کہ وہ بھی یونیورسٹی کی طرف سے اجازت نہ ملنے کی بنا پر نقوش سے الگ ہو گئے۔ وقار صاحب کے جانے کے بعد میں سوچ ہی رہی تھی کہ طفیل بھائی ضرور کوئی بہتر نام تجویز کریں گے مگر اطلاع ملی کہ موصوف اب خود ہی نقوش کے ایڈیٹر بن گئے ہیں۔ دوسروں کی بات نہیں کرتی، اپنی کہتی ہوں کہ اس اطلاع نے مجھے سخت مایوس کیا۔ نقوش جس آن بان سے سامنے آیا تھا اس کی اتنی ہی عبرت ناک موت میری نظروں کے سامنے گھوم گئی اور ساتھ ہی بھائی طفیل کی صورت بھی۔ طفیل بھائی مجھے ہمیشہ سے بہن کہتے ہیں اور میں انھیں اپنا بے حد مخلص بھائی سمجھتی رہی ہوں مگر مدیر سمجھنے کو کسی طرح تیار نہ تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان سے مل کر مجھے عجیب سا احساس ہوتا، بس کچھ ایسا لگتا کہ یہ بیٹھے بیٹھے ایک دم اُٹھیں گے اور میرا آنچل تھام کر کہیں گے "بہن بھوت لدی ہے لوٹی دو"۔ ان کی باتیں صرف جی ہاں اور جی نہیں پر ختم تھیں۔ مجھ سے قسم لے لیجیے جو اس زمانے میں ان کی زبان سے کبھی کوئی ادبی قسم کی بات سُنی ہو۔ اب بھلا بتائیے کہ میں اس کے سوا اور کیا سوچتی کہ یہ ہمارے بھائی طفیل اپنا سرمایہ بھی

ڈبوئیں گے اور بیچارے نقوش کو جانے کیسی کیسی اذیتیں دے دے کر ماریں گے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ حکومت اس غریب رسالے کو پھانسی کی سزا ہی دے دیتی۔

بہرحال چند نمبر تو طفیل بھائی کی جی ہاں جی نہیں قسم کے تھے مگر پھر انہوں نے سب کے ساتھ مجھے بھی حیرت زدہ کر دیا۔ ان نمبروں کے بعد کے پرچے کچھ اس طرح مرتب کیے گئے تھے کہ اعتراض کرتے نہ بن پڑتی۔ ہاں ہر پرچے میں ان کی بعض تحریروں سے اتفاق نہ ہوتا۔ جب وہ ملتے میں کہتی۔ "یہ کیا لکھا ہے آپ نے؟" اور وہ دو چار بڑے اچھے پرچے مرتب کرنے کے غرور میں جل کر کہتے صرف آپ کہتی ہیں اور تو کوئی نہیں کہتا۔ میں جواب میں کیا کچھ کہتی اس کا ذکر اس بھری محفل میں نہ کروں گی۔ ہاں یہ ضرور کہوں گی کہ بھائی طفیل نے میری جا و بیجا باتوں کو اس قدر برداشت کیا ہے کہ شاید اس جگہ میرا سگا بھائی ہوتا تو کبھی میری صورت نہ دیکھتا۔

مگر پھر یہ اختلافات بھی ختم ہو گئے اور وہ اس طرح کہ اُنہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر ایسے ایسے خاص نمبر مرتب کیے کہ میں چکرا کر رہ گئی اور یہی نہیں کہ انہوں نے تو شخصیت نگاری بھی شروع کر دی۔ یا اللہ یہ طفیل بھائی کو اتنی زبردست ذہانت کا مرض کیسے لگ گیا۔ ایک لمحے کو یہ سوچ کر میں نے اپنے تصور کے اس بھوت لدی ہے کہنے والے بھائی کی انگلیوں سے اپنا آنچل چھڑا لیا اور اس کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہی خاص نمبروں سے اپنے علمی و ادبی تجسس کی تسکین پائی۔

آج جب نقوش کی بیسویں سالگرہ منائی جا رہی ہے تو میں بڑے خلوص سے سوچ رہی ہوں کہ نقوش کے لیے کیا کہوں۔ اس وقت میرے سامنے نہ صرف قیمتی خطوط نمبر ہے بلکہ وہ تمام نمبر ہیں جن کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اگر کبھی ادبی رسائل کے نمبروں کی تاریخ مرتب کی گئی تو نقوش کے یہ خاص نمبر سرفہرست ہوں گے۔ یہ وہ نمبر ہیں جنہیں حال نے خوش آمدید کہا اور مستقبل اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لینے کا منتظر ہے۔ نقوش کے یہ نمبر اور ان کے مرتب کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

نقوش کے ان ضخیم علمی و ادبی اور تحقیقی نمبروں کو جب میں دیکھتی ہوں تو مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ان کی ترتیب و تدوین میں بھائی طفیل کو کیا کچھ نہ جھیلنا پڑا ہوگا۔ ان ادبی خزانوں میں ان کی بے شمار راتوں کی نیندیں اور ان گنت دنوں کی بے چینیاں پوشیدہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی ادب سے وہ انتھک محبت اور خلوص بھی شامل ہے جس کے طفیل

اُنھیں صرف اپنے جذبے کی تسکین ملی مگر نفع کبھی نہ کما سکے۔ شاید وہ نفع کی بات سوچتے ہی نہیں۔ اُنھوں نے تو اپنا سکھ نقوش میں اور اپنے قلم میں تلاش کر لیا ہے مصنف طفیل اور ایڈیٹر طفیل کی یہی سب سے بڑی دولت ہے۔

نقوش ــــ منزل بہ منزل

تحسین فراقی

آدھی رات کے وقت دو نقاب پوش ڈاکو ملا نصر الدین کے گھر میں آدھمکے۔ آہٹ سُن کر مُلا تاڑ گئے اور اپنی جان بچانے کی خاطر ایک الماری میں جا چھپے۔ ڈاکو کمرے میں داخل ہو کر سیدھے اس الماری تک جا پہنچے۔ پٹ کھولے تو ملا صاحب وہاں سُکڑے سمٹے اور سہمے ہوئے موجود۔ ایک بولا: "ڈرنے کی کوئی بات نہیں، تم بُوڑھے ہو ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے، چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" ملا نے جواب دیا: "جان بچانے کے لیے نہیں چھپا ہوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے شرفا نے قدم رنجہ فرمایا، مجھے تو دُکھ ہے کہ گھر میں ویرانی ہی ویرانی ہے اسی لیے مُنہ چھپائے کھڑا ہوں۔"

میں سوچتا ہوں کہ اگر ایسا حادثہ جناب محمد طفیل کو پیش آجاتا تو انھیں ان نقاب پوشوں سے مُنہ چھپانے کی ضرورت پیش نہ آتی اور وہ اور کچھ نہیں تو نقوش کے ڈیڑھ دو درجن خاص نمبر بڑے اعتماد سے انھیں کریڈٹ کارڈ کے طور پر پیش کر دیتے جنھیں بھنا کر ان "شرفا" کی ضرورتیں بہ احسن پوری ہو جاتیں، اور اگر وہ آنکھ بچا کر سرحد پار کر کے ہمارے ہمسایہ ملک میں چلے جاتے تو ان نمبروں کو بڑی آسانی سے بلیک کر کے اپنی چاندی کر سکتے تھے۔ لیکن پھر معاً خیال آتا ہے کہ چور آتے تو نقوش کے خاص نمبر ہی کیوں لے جاتے، صاحبِ نقوش کی ٹیوٹا کار ہی کیوں نہ لے مرتے جو کچھ دنوں سے مجھے بھی بہت اچھی لگنے لگی ہے۔

نقوش کا ذکر آیا تو نہ معلوم کیوں مجھے امرا القیس یاد آنے لگا ہے۔ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ موصوف کی جو شامت آئی تو قبیلہ طے کی ایک نہایت حسین عورت امِ جندب سے شادی رچالی۔ امِ جندب بڑے ٹھسّے کی عورت تھی سو خلوت کی پہلی رات امرا القیس کی کارکردگی کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ رہی۔ ابھی رات کا بڑا حصہ باقی تھا کہ وہ امرا القیس کو بیدار کر کے کہنے لگی:

"اے جوانِ رعنا! اب اُٹھ بیٹھ کہ صبح ہو گئی۔"

شاعر بیچارہ اُٹھا، باہر نظر کی تو ابھی آدھی رات باقی تھی۔ اُمِ جندب سے اس حرکت کا سبب پوچھا تو ناچار اس بی بی کو کہنا پڑا: لانک ثقیل الصدر، خفیف العجز، سریع الاراقۃ،

بطئ الافاقۃ۔

لیکن 'نقوش' کے باب میں ام جندب کے مکالمے کو یُوں بولا جا سکتا ہے کہ لانک ثقیل الصدر، ثقیل العجز، سریع الادراقۃ، سریع الافاقۃ۔

یعنی یہ کہ نقوش ہر لحاظ سے بھاری ہے، اس کا نکاس جلد ہوتا ہے اور وہ بحال بھی بہت جلد ہو جاتا ہے، تبھی تو تقریباً تیس بتیس سال سے نمبروں کا یہ تابڑ توڑ سلسلہ جاری ہے۔ رہا جلد نکاس کا مسئلہ تو یہ مردگی خامی ہے لیکن مجلّے کی خُوبی ہے کہ ادھر سٹالوں پر آیا ادھر خرید لیا گیا۔

نقوش نے ادارت کے دو مختصر دَور دیکھے اور تیسرا دَور بھی چل رہا ہے۔ یہ تینوں دَور خاصے متنوع ہیں اور خصوصاً پہلا دَور تو بعد کے دو ادوار سے خاصا مختلف اور متغائر ہے۔ نقوش کا پہلا دَور تو وہ ہے جب احمد ندیم قاسمی اور محترمہ ہاجرہ مسرور کی ادارت میں اس مجلّے نے مارچ ۱۹۴۸ء میں اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے پہلے شمارے کی پیشانی پر رقم تھا:

"زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ"

پیشانی کی یہ تحریر تو اب بھی نقوش کے ماتھے پر بدستور چمکتی ہے لیکن وقار عظیم اور محمد طفیل کی ادارت میں شائع ہونے والے شماروں میں زندگی کا وہ سکہ بند اور محدود مفہوم ہرگز نہیں جو اس کے دورِ اوّل کے مدیران کے پیشِ نظر تھا۔ تیسرے شمارے کے "طلوع" میں احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا:

"ہم یقیناً سرمایہ داری اور جاگیرداری کو جاری نہیں رکھنا چاہتے۔ ہم ملک کے تمام کارخانوں، زمینوں، اداروں حتیٰ کہ پیرانِ عظام کے آستانوں کو بھی قومی ملکیت بنانا چاہتے ہیں۔ ہم طبقاتی تقسیم کے دشمن ہیں۔ جدلیات نے ہم پر یہ حقیقت روشن کر دی ہے کہ نیرو، ہٹلر اور چنگیز اسی تقسیم نے پیدا کیے۔"

نقوش کے پہلے دس شمارے جو ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں شائع ہوئے ایک اعتبار سے ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا آرگن بن گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے طلوع میں وضاحتیں، احتجاج، طعن، کوسنے اور عجیب طرح کی تضاد بیانیاں ملتی ہیں یہاں ارتقا کی فطری یلغار کے گُن بھی گائے گئے ہیں اور اپنی ٹکسال سے باہر کے سکوں کو جعلی بھی قرار دیا گیا۔

نقوش کے دوسرے شمارے میں ترقی پسندوں کے داخلی تضادات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

عبادت بریلوی کے ایک مضمون کے باب میں عصمت چغتائی نے سخن گسترانہ لکھا تھا:

"معاف کیجئے گا جناب کلمہ تو پڑھ جاتے ہیں پھر کہتے ہیں مسلمان نہ ہو۔ سب کچھ تو وہی کہا ہے جو کمیونسٹ کہتے ہیں مگر پھر کہہ دیا کہ کمیونسٹ ہونا ضروری نہیں۔ خود ہی تو کہتے ہیں کہ "میں اشتراکیت کو موجودہ سیاسی کشمکش کا واحد حل سمجھتا ہوں مگر ان کو اشتراکیت کے بعض اصولوں سے اختلاف بھی ہے"۔

ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کے دورِ ادارت کے بیشتر شمارے تقسیم ملک کے بعد کی صورتِ حال کے عکاس تھے اور ترقی پسندی کے پُرجوش وکیل۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان شماروں میں بعض اہم موضوعات پر مستقل سلسلے بھی شائع ہوئے مثلاً ہماری زبان، ہماری دنیا، ہماری فلم اور ہمارا سماج۔ علاوہ ازیں نقوش کے چوتھے شمارے میں اردو نثر، اردو نظم اور وطنی سیاست کے ایک ایک سال پر الگ الگ جائزے بھی لکھوائے گئے۔ غرض یہ کہ ان دس شماروں میں بیشتر جدلیاتی مادیت اور آزادیٔ نسواں کی وکالت ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتی رہیں اور ندیم صاحب اعلان کرتے رہے: ؎

نہ زندگی سے فرار اچھا نہ موت کا انتظار اچھا
سوائے انسان کے لہو کے تمام قدریں ہیں اعتباری

ادھر محمد طفیل کے سے روایت پسند دوستوں کو یقین نہ تھا کہ انسان کے لہو کے علاوہ بھی بہت سی قدریں اصلی، اعلیٰ اور مستقل ہوتی ہیں۔ سو انھوں نے محسوس کیا کہ سیخ، کباب کے اندر ٹوٹ گئی ہے اسے علٰحدہ کرنا عقل اور وجدان دونوں کا تقاضا ہے۔ اب نقوش کی زمامِ ادارت وقار عظیم کے ہاتھ میں تھی۔

گیارھویں شمارے کے "طلوع" میں وقار عظیم صاحب نے کچھ سوال اٹھائے تھے اور یہ سوال اہم تھے:

۱۔ نقوش کی آیندہ پالیسی کیا ہوگی؟

۲۔ نقوش نئے ادب کا علمبردار ہوگا یا پرانے ادب کا؟

۳۔ نقوش ادب برائے ادب کا قائل ہے یا ادب برائے زندگی کا؟

۴۔ کیا نقوش کسی خاص جماعت یا گروہ کا نمائندہ ہوگا؟

یہ سوال اٹھانے کے بعد وقار صاحب نے لکھا تھا کہ ادب کے متعلق نقوش کا نقطۂ نظر

یہ ہے کہ ادب کے سرچشمے زندگی ہی سے پھوٹتے ہیں۔ زندگی سے بے تعلق ہو کر ادب بے معنی ہے لیکن ادب کو زندگی کی مصوری اور ترجمانی کرتے وقت روایتی اور فنی لطافتوں سے بے نیاز نہ ہونا چاہیے۔ نقوش ہر اس جماعت کے ساتھ ہے جو ادب کو ادب سمجھ کر اسے ماضی کی روایتوں کا امین، حال کا آئینہ دار اور مستقبل کا پیامی جان کر اسے اپنے سینے سے لگاتی ہے ....

ادب میں جو کوئی روایتوں کے اس تسلسل کی اہمیت کو کم کرتا ہے وہ ادب کا دشمن ہے اور نئے اور پرانے کا وہ امتیاز جو نئے کو پرانے سے الگ کوئی چیز جانتا ہے اپنے گرانقدر تہذیبی سرمایہ کی طرف سے غفلت کا مجرم ہے۔ نقوش ماضی کے نقوش کا امین اور حال کے تقاضوں کا پاسبان ہے۔"

گویا اب اس دور میں اور اس کے بعد نقوش میں اس قسم کی بیان بازی بند ہو گئی اور یہ ادب اور عوام دونوں کے حق میں اچھا ہوا:

"یہ ایک خالص عوامی ادبی تحریک ہے جو اپنے ملک کے عوام کے علاوہ ساری دُنیا کے عوام کو سرمایہ، جاگیر اور طبقاتی تقسیم کے غیر فطری اور غیر انسانی چنگلوں سے بچانا چاہتی ہے .... ہمارے پاس سب سے بڑا اخلاقی معیار انسانوں کا اقتصادی توازن ہے" ——— ہاجرہ مسرور

——— اب شکاگو کے مزدور مقتولین کے ماتم میں نقوش کے صفحات کبھی سیہ پوش نہ ہوئے۔

گیارھویں شمارے سے لے کر پندرھویں شمارے تک وقارِ عظیم نے نقوش کی ادارت کی۔ یہ دورِ ادارت یکم مئی ۱۹۵۰ء سے مارچ ۱۹۵۱ء تک رہا۔ اس دور میں نقوش کے مشمولات میں واضح طور پر کچھ تبدیلیاں نمایاں ہوئیں۔ اب اس میں ایسے ادیب بھی شائع ہونے لگے جنھیں ترقی پسندوں نے ادبی اچھوت قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ تیرھویں شمارے میں "ادب اور مفید ادب" کے عنوان سے ایک مقالہ چھپا جو شاید پہلے دور کی انتہا پسندی کے ردِ عمل میں لکھا گیا تھا:

"دنیا میں سب سے زیادہ بے مقصد اور بے مصرف چیز ہے تو وہ مقصدی ادب ہے۔ ایک افادی ادب کو چھوڑ کر باقی ہر ادب افادی ہوتا ہے"——— انتظار حسین

اپریل ۱۹۵۱ء سے نقوش کے اس دور کا آغاز ہوا جسے بلا مبالغہ نقوش کا "روشن ترین زمانہ" کہا جا سکتا ہے۔ محمد طفیل اس سے پہلے بھی ایک رسالے کے شریک مدیر رہ چکے تھے۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں جب وہ نقوش کے تنہا مدیر بنے تو ایک پڑھی لکھی ترقی پسندی کا ابتدائی ردِ عمل یہ تھا:

"اطلاع ملی کہ موصوف اب خود ہی نقوش کے ایڈیٹر بن گئے ہیں - دوسروں کی بات نہیں کرتی اپنی بات کہتی ہوں کہ اس اطلاع نے مجھے سخت مایوس کیا۔ نقوش جس آن بان کے ساتھ سامنے آیا تھا اس کی اتنی ہی عبرت ناک موت میری نظروں کے سامنے گھوم گئی اور ساتھ ہی بھائی طفیل کی صورت بھی۔"

ادھر محمد طفیل کے اعلانِ اعتراف میں اعتماد کا روشن منطقہ صاف دکھائی دے رہا تھا:

"سمجھ میں قابلیت اور علمیت دونوں کا فقدان سہی لیکن میں پاکستان و ہند کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے خلوص اور ان کے بھرپور تعاون پر اعتماد رکھتے ہوئے بڑے بول لکھ رہا ہوں کہ انشاءاللہ نقوش کے ادبی معیار کو کبھی ضعف نہیں پہنچے گا۔"

انھوں نے نقوش کی آیندہ پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے لکھا تھا:

"میری یہ دلی خواہش ہوگی کہ نقوش ایک مخصوص قسم کے دائرے کے اندر گھٹ گھٹ کر نہ چلے بلکہ اس کی اڑان وسیع تر اور واضح ہو۔ اسے کرشن چندر احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی کی تخلیقات پر بھی ناز ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اس حقیقت کو بھی نہ بھولے کہ عزیز احمد، ممتاز مفتی اور قرۃ العین کی نگارشات کو بھی اردو ادب میں ایک قابلِ فخر مقام حاصل ہے۔"

چنانچہ ۱۹۵۱ء سے اب تک نقوش اس پالیسی پر عامل رہا ہے اسے ہمیشہ بڑے لکھنے والوں کا تعاون حاصل رہا اور اردو کی چند بہترین تحریریں سب سے پہلے اسی عہد ساز شمارے کی زینت بنیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ محمد طفیل صحتِ کتابت کا خیال رکھتے تھے یا نہیں اور وہ حائے حُطّی کو ہائے دوچشمی لکھ کر اپنی حسرتِ دیدار کا ثبوت فراہم کرتے رہے یا نہیں مگر یہ ضرور ہے کہ انھوں نے نقوش کے عمومی اور خصوصی شمارے شائع کر کے ایک دنیا کو دعوتِ دیدار دی ہے۔

"نقوش میری آرزوؤں کا ماحصل آپ کے سامنے ہے..... مجھے صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ میں نے ہمیشہ نقوش کے نمبر کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے کیونکہ شروع سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ اردو ادب میں معیار کے اعتبار سے نقوش بلند پایہ مقام پیدا کرلے جو کسی دوسرے کو نصیب نہ ہو۔"

اُوپر کی سطور میں محمد طفیل صاحب نے پہلی دفعہ قارئین نقوش کو مخاطب کیا تھا۔ ان سطور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اوّل روز ہی سے صاحبِ نقوش نے اپنی منزل متعین کرلی تھی۔ واقعہ

یہ ہے کہ محمد طفیل کی ادارت میں نقوش نے جتنی تیزی سے منزلیں ماریں وہ ادب اور صحافت کی دُنیا میں یادگار رہیں گی۔ نقوش کو ادبی مجلّوں کی برادری میں نہایت وقیع مقام دلانے میں محمد طفیل صاحب کی اَن تھک علمی لگن، جامع منصوبہ بندی، مہم جوئی، توازنِ فکری اور مشاہیر کے حیرت انگیز قلمی تعاون کو بڑا دخل ہے۔ نقوش کے عام اور خاص شماروں کو جن اکابرِ ادب کا تعاون حاصل رہا اور بیشتر صورتوں میں اب تک ہے ان میں رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریا بادی، اثر لکھنوی، آل احمد سرور، فراق، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قاضی عبدالغفار، محی الدین زور، ڈاکٹر یوسف حسین، خواجہ احمد فاروقی، امتیاز علی عرشی، مالک رام، خورشید الاسلام، ڈاکٹر اکبر حیدری، جگن ناتھ آزاد، فیض، ندیم، جوش، عبدالرحمٰن چغتائی، حفیظ جالندھری، یوسف حسن، غلام رسول مہرؔ، سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، محمد عبداللہ قریشی، میرزا ادیب، کشری منہاس اور بیسیوں دوسرے لکھنے والے شامل ہیں۔

یوں تو اپنی اپنی بساط میں متعدد ادبی مجلّوں نے اپنے اپنے خصوصی نمبر شائع کیے جن میں مخزن، نگار، ہمایوں، عالمگیر، نیرنگِ خیال، ساقی، ادبِ لطیف، ادبی دنیا، فنون، اوراق، سیّارہ، افکار، الزبیر، سیپ کے بعض خاص نمبر حوالے کی چیز ہیں لیکن یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ اس باب میں نقوش کو جو اختصاص حاصل ہے وہ اب تک کسی پرچے کے حصّے میں نہیں آیا۔ نقوش نے خاص نمبروں میں ایسا اور اتنا وقیع لوازمہ یکجا کر دیا ہے کہ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ؎

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

میر تقی میرؔ نمبر کے طلوع میں محمد طفیل نے لکھا ہے:

"میری سوچ ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جو کام دوسرے کر سکتے ہوں اسے ادارۂ نقوش کیوں کرے وہ کیوں نہ کسی نئی مہم پر نکلے کیوں نہ وہ محنتِ دیدہ کا کوئی اور امتحان دے!"

ادارۂ نقوش جب بھی کسی نئی مہم پر نکلا وہ اس سنہری ادن کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جو کسی کسی کا مقدر ہوتی ہے۔ حاتم بادگرد کی خبر لانا ہر ایک کے بس کا روگ کہاں ہوتا ہے؟ طفیل صاحب نے ۱۹۵۲ء سے لے کر ستمبر ۱۹۷۴ء تک نقوش کے چھ افسانہ نمبر نکالے، پنج سالہ نمبر نکالا، مئی ۱۹۵۳ء میں غزل نمبر نکالا جس کا دوسرا ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ ۱۹۵۶ء میں شائع کیا، تیسرا

جنوری ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ دو شخصیات نمبر نکالے، تین خطوط نمبر نکالے، مکاتیب نمبر نکالا، دس سالہ نمبر نکالا، ادب عالیہ نمبر نکالا، لاہور نمبر نکالا، دو جلدوں میں آپ بیتی نمبر نکالا، تین غالب نمبر نکالے۔ طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، شوکت نمبر، منٹو نمبر، اقبال نمبر دو جلدیں، میر تقی میر نمبر ۲ جلدیں، اور حال ہی میں ادبی معرکے نمبر ۲ جلدیں اور انیس نمبر شائع کیے۔ ان میں سے ہر نمبر اپنی جگہ انسائیکلوپیڈیا ہے، قاموس ہے —— ایک سمندر ہے جس کی نیلی پہنائیوں میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے ؏

تجھے دیکھوں کہ تجھ میں ڈوب جاؤں

صرف افسانہ نمبروں ہی کو دیکھیے کہ ان میں کل ۲۰۵ افسانے، رپورتاژ اور ایک ناولٹ شائع ہوئے۔ اور شمولات کے علاوہ پہلے افسانہ نمبر میں محمد حسن عسکری کا ایک اہم مضمون "نئے افسانے اور ہمارا مستقبل" بھی شامل تھا۔ علاوہ ازیں "اردو افسانے میں روایت اور تجربے" کے عنوان سے ایک اہم مذاکرہ بھی شامل کیا گیا تھا جس میں وقار عظیم، منٹو، ہاجرہ، انتظار اور شوکت تھانوی جیسے اہم لکھنے والوں نے حصہ لیا تھا۔ پہلے افسانہ نمبر میں عسکری نے افسانے کے جمود کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا تھا:

"نئے ادب کی تحریک افسانے کو جہاں تک لے آئی ہے وہاں سے آگے بڑھنے کی بجائے افسانہ پھر پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے۔"

خود مدیر نقوش کو اس بات کا احساس تھا، چنانچہ افسانہ نمبر ۲ کے طلوع میں اس کا اظہار یوں ہوا:

"یوں تو پورا ادب ہی انحطاط پذیر ہے لیکن سب سے زیادہ زوال جس صنفِ ادب پر آیا وہ افسانہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے افسانوی ادب پر نظر دوڑائیے تو آپ کو آج کا افسانوی ادب بڑا بے جان اور بے روح نظر آنے لگا۔ گو لکھنے والے آج بھی وہی ہیں لیکن ان سب کے قلم کچھ تھکے تھکے سے ہیں۔"

نقوش کے جن خاص نمبروں نے دنیائے ادب میں بالخصوص غلغلہ پیدا کیا ان میں غزل نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر، لاہور نمبر، طنز و مزاح نمبر، آپ بیتی نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر تقی میر نمبر اور حال میں شائع ہونے والے ادبی معرکے نمبر اور انیس نمبر قابلِ ذکر ہیں۔

غزل نمبر میں طفیل صاحب نے اردو غزل اور متغزلین کے بارے میں سولہ اہم نقادوں

کے مضامین شامل کیے جو حامی، نیاز، سید عبداللہ، آلِ احمد سرور، سردار جعفری اور احتشام حسین وغیرہ کے لکھے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں طفیل صاحب کی نظر عابد علی عابد اور رشید احمد صدیقی سے کیسے چوک گئی جو غزل کے بہت اہم اور منفرد نقاد تھے۔ ان غزل نمبروں کی تدوین میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اور محمد عبداللہ قریشی نے مدیرِ نقوش کا خاص طور پر ہاتھ بٹایا اور ۲۰۷ شعرا کے حالاتِ زندگی اور نہایت اجمالی فنی جائزے بھی مرتب کیے۔

مکاتیب نمبر مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا تو اس سلسلے میں مدیر نقوش کو شدید دقتوں کا سامنا رہا:

"میں نے ان خطوط کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، شہر شہر گھوما، گھر گھر صدا دی، کسی نے میرے شوق کو سینے سے لگایا، کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ یوں امید و بیم کے دوراہے پر چلتا چلتا نیم جان ہو گیا مگر جنون میں کمی واقع نہ ہوئی۔۔۔۔۔ بچپنے میں چوری کی ہو تو کی ہو اس عمر میں تو نہیں کی تھی مگر اس کم بخت شوق میں یہ کام بھی کیا بخدا اپنی خاطر نہیں آپ کی خاطر۔ اگر میں نے چوری اپنی ذات کے لیے کی ہو تو مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو۔"

اس نمبر میں ۲۱۷ اہم لکھنے والوں کے ہزاروں خطوط بھی شامل ہیں اور صنفِ مکتوب نگاری اور اس کی اہمیت پر اہم لکھنے والوں کے مضامین بھی۔ یہ خطوط اس لحاظ سے دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان سے نہ صرف لکھنے والوں کی اپنی شخصیت کی پرتیں کھلتی ہیں بلکہ سو سالہ علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ بھی مرتب کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح تین جلدوں میں خطوط نمبر مرتب ہوئے اور کم و بیش ڈھائی ہزار غیر مطبوعہ خطوط پہلی دفعہ ادبی دنیا کے سامنے لائے گئے۔ ۱۲۸ غیر مطبوعہ خطوط تو صرف سرسید کے تھے۔ علاوہ ازیں خطوط نمبر کی ایک بہت اہم چیز نہرو اور گاندھی کے نام مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے خطوط تھے۔ ان خطوط کے حصول کا اشتیاق بے پایاں صاحبِ نقوش کے دل میں یوں موجزن تھا:

"جمال میاں سے ملاقات ہو گئی۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا ــــــ انھوں نے مجھے خطوط دکھائے۔ آنکھیں کھل گئیں۔ بڑا نادر ذخیرہ تھا۔ معاً اداس ہو گیا۔ اگر انھوں نے یہ خطوط نہ دیے تو کیا ہو گا؟"

لاہور نمبر کی اشاعت نقوش کا ایک اور اہم سنگِ میل تھا۔ یہ نمبر لاہور کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا ایک نہایت مفصل، جاندار اور دلچسپ مرقع ہے۔ اس نمبر میں گزشتہ و موجودہ لاہور کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا تھا۔ لاہور کے باغات، مزارات، مغلیہ عہد، خالصہ عہد، علمائے کرام، دینی مدرسے، مساجد، کتب خانے، دروازے، انگریزی دور کی تعمیرات، مندر، گرجے، کالج، موسیقار، گویے، ہلکی پھلکی موسیقی گانے والے اور گانے والیاں، سارنگی نواز، طبلہ نواز، کلارنٹ نواز، پیانو نواز، نَے نواز، سرود نواز، قوال، میوزک ڈائریکٹر، اکھاڑے، تکیے، میلے، ڈراما، تھیٹر، فلم، اطبا، ادیب، مصنف، مورخ، خوشنویس، ادبی تحاریک، اردو صحافت اور لاہور کے فارسی گو شعرا سب اس نمبر میں بولتے چالتے، گاتے گنگناتے، اُچھلتے پچھاڑتے، پڑھتے پڑھاتے، لڑتے مارتے، گودتے پھاندتے، ہونکتے ہکتے اور لہکتے لہلہاتے دکھائی دیے جاتے ہیں۔

نقوش کا سب سے لذیذ اور فرحت بخش نمبر تو طنز و مزاح نمبر تھا جس میں مقالے بھی تھے۔ دنیا بھر کے مزاحیہ و طنزیہ ادب کا انتخاب بھی تھا۔ طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ابتدائی نمونے بھی تھے، اودھ پنچ فتنہ، عطرِ فتنہ اور شیرازہ کے ادوار بھی شامل تھے اور طنزیہ و مزاحیہ ادب کے زرّیں دَور سے بھی بحث کی گئی تھی۔ یوں یہ نمبر اردو ہی کا نہیں دنیا بھر کے اچھے مزاحیہ و طنزیہ ادب کا بھی اشاریہ بنتا نظر آتا ہے۔

نقوش کا آپ بیتی نمبر ایک اور کرشمہ ہے جو دامنِ دل و نگاہ کھینچتا ہے۔ یہ آپ بیتی نمبر نہ صرف اُردو کی ممتاز شخصیتوں بلکہ ان کے علاوہ بنگالی، فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، ولندیزی، روسی، چینی، گجراتی اور ترکی کے ادیبوں کے بھی تعارف نامو ں پر مشتمل تھا۔ اس نمبر میں ۲۸ ملکوں کے افراد کی نمائندہ تخلیقات شامل کی گئی تھیں۔

طفیل صاحب کا ایک بڑا کارنامہ بیاضِ غالب کی دریافت کا تھا۔ اب تک دیوانِ غالب کے مطبوعہ نسخوں میں نسخہ حمیدیہ ہی کو شہرت حاصل تھی۔ امروہہ میں غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ قدیم ترین نسخہ جس شخص کے پاس تھا اس نے اس کی قیمت مبلغ پچیس روپے لگائی تھی اور کسی توفیق احمد امروہوی نے اسے گیارہ روپے میں خرید کر کم از کم چھ ہزار روپے اس کی قیمت مقرر کی۔ بعد میں عدالتی کارروائیوں اور قانونی موشگافیوں کے چکر میں پڑ کر ہندوستان میں اس کی اشاعت ملتوی ہو گئی اور یہ ریزرو بنک آف انڈیا کے لاکر

میں حبسِ بے دوام کی نذر ہو گیا۔ لیکن ادھر محمد طفیل نے اس کے فوٹو سٹیٹ نہ جانے کیسے حاصل کیے اور اسے غالب صدی کی ایک فخریہ پیشکش کے طور پر چھاپ ڈالا جس سے برِ صغیر پاک و ہند کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک تھرتھری پیدا ہو گئی۔ غالب کے متخصص مالک رام نے لکھا:

"بھائی! بتاؤ کہ آپ کا شائع کردہ دیوان (دیوانِ غالب بخطِ غالب) مجھے کیوں کر اور کب تک پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ یہاں کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے اس لیے ایک کام کے سلسلے میں اس کی اشد فوری ضرورت ہے۔"

اس نمبر میں غالب کی ۲۵ غزلیں اور ۴ رباعیاں غیر مطبوعہ اور ان کے علاوہ ۲۲ غیر مطبوعہ مفرد اشعار تھے۔ گیان چند جین نے اس کی اشاعت پر لکھا تھا کہ "پاکستان کا تو ذکر کیا ہندوستان میں بھی ہر شخص محض نقوش ہی کے طفیل اس نسخے کا مطالعہ کر سکتا ہے۔"

نقوش کا میر تقی میر نمبر کا حصہ اول پاکستان میں حال ہی میں پہلی بار چھاپا گیا۔ طفیل صاحب کو افسوس ہے کہ اگر ڈاکٹر اکبر حیدری اپنے وعدے پر قایم رہتے تو اس نایاب نسخے کو پہلی بار چھاپنے کا شرف ادارۂ نقوش ہی کو حاصل ہوتا۔ تاہم اس نمبر میں بعض ایسی غزلیں بھی شاملِ اشاعت کی گئی ہیں جو ہندوستانی ایڈیشن کے متن میں نہیں تھیں۔ علاوہ ازیں میر کے پورے کلام کا ایک اچھا انتخاب بھی شاملِ اشاعت کر دیا گیا۔

اس نمبر میں میر کی پندرہ غزلیں، ایک مثنوی، دو قصائد، آٹھ رباعیات اور مختلف مخطوطات اور تذکروں سے حاصل کردہ ۹۰ شعر یعنی کل ۴۰۴ غیر مطبوعہ اشعار پاکستان میں پہلی دفعہ منظرِ عام پر لائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نئے متون کی دریافت سے میر شناسی کا ایک نیا رُخ متعین ہو گا۔

نقوش کا تازہ ترکارنامہ "ادبی معرکے نمبر" ہے جس کی گونج ابھی تک لاہور کے ادبی حلقوں میں سنائی دے رہی ہے اور جس پر تفصیل سے اظہارِ خیال کا یہ موقع نہیں۔ میں نے نقوش کے تمام اہم نمبروں کا بھی جائزہ نہیں لیا کہ یہ کام ایک مختصر سے جائزے میں نہیں سما سکتا۔

ایک اور بات جو نقوش کے لیے باعثِ فخر ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس نے تحقیق و تدقیق کے نئے راستے دریافت کیے بلکہ مسائل کی سطح پر بعض مباحث کو بھی جنم دیا۔ بعض سوال بھی اٹھائے۔ چنانچہ قارئینِ نقوش جانتے ہیں کہ نقوش میں ایک مدت تک اسلامی ادب کے سلسلے میں فراق

گورکھپوری، آفتاب احمد، ابواللیث صدیقی، شوکت سبزواری اور نعیم صدیقی جیسے بزرگوں کے بعض اہم افکار کی گونج سنائی دیتی رہی آج جب اسلامی ادب کے باب میں دوبارہ آواز اٹھائی جا رہی ہے تو یہ ایک سطح پر نقوش کے سلسلے سے مربوط ہو جاتی ہے جو تخلیقِ پاکستان کے کچھ عرصہ بعد رونما ہوا تھا۔

نقوش میں محمد طفیل کے لکھے ہوئے شذرات بھی ادب کا ایک قابلِ قدر حصہ ہیں۔ جامعیت اور نکتہ آفرینی ان کا خاصہ ہے۔ نقوش کے ارتقا میں اس نکتہ آفرینی اور تخلیقی جہت کا بھی حصہ ہے۔ طفیل صاحب نے ایک موقع پر لکھا تھا:

"میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا اس لیے کہ جتنی سزا مجھے خاص نمبروں کی ترتیب کے سلسلے میں ملتی ہے وہی میرے گناہوں سے زیادہ ہے۔ گنہ گار ضرور ہوں مگر اتنا بھی نہیں۔"

اگر طفیل کے کچھ گناہ رہ بھی گئے ہیں تو موجودہ رسولؐ نمبر (دس جلدیں) اُن کے اِن گناہوں کو ڈھانپ لے گا۔ اردو ادب کی تاریخ میں نقوش کا ذکر ہمیشہ سنہری لفظوں میں کیا جائے گا۔ رہا اس سنہری اون میں کہیں کہیں کمزور اور گدلے سُوتی ریشوں کی موجودگی کا مسئلہ تو یہ عین تقاضائے بشریت ہے خالص سنہری اُون آج کہاں ملتی ہے۔"

رشید احمد صدیقی افسوس کیا کرتے تھے کہ "لوگ آجکل دُوسروں کی پگڑی اور اپنا نام اُچھالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔" مدیرِ نقوش نے اپنا نام ضرور اُچھالا مگر مقامِ شکر ہے کہ کسی کی پگڑی نہیں اُچھالی۔

دسوں انگلیاں دسوں چراغ (نقوش کے دس سال)

حسن وارثی

مکرمی! سلام مسنون!

۳ ءِ کا کارڈ تو ملا مگر مطلب ہی نہ ملا تو ملا نہ ملا، سب برابر۔ میرے سن و سال کو دیکھئے اور اپنے احتمال کو ملاحظہ فرمائیے۔ نقوش کا شیفتہ مگر فرہاد بن کر ممتاز، شیریں و خسرو، کا درس یوں خیر وہ کشفی و کراماتی ہی ذریعہ سہی۔ یہ مجھ سے اچھوں سے نہ ہو سکا تو میں کیسے ہمت کرتا۔ آپ کو ابن یمین کا قطعہ بند یاد نہیں ؎

نہ چوں فرہاد بود کوہ کنی پیشۂ ما	سنگِ ما، سینۂ ما، ناخنِ ما، تیشۂ ما
بہر یک جرعۂ مے منتِ ساقی نبریم	اشکِ ما، بادۂ ما، دیدۂ ما، شیشۂ ما

سو دیکھئے ان کی بندہ نوازی و کارسازی کہ ؎

یار در خانہ و من گردِ جہاں میگردم!

شمارۂ اولین سے آخرین تک اپنی ہی تحویل سے برآمد ہو کر یکجا ہو گیا۔ اسی میں دیر لگی۔ اپنی بھول بھلیں کے خمیازے میں تھوڑی زحمت اٹھائی تو ضرور پڑی مگر کام بھی بن گیا اور یکسوئی بھی حاصل ہو گئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ!

البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اول فول جو لکھ مارا ہے وہ کسی گت گرامت کا ثابت بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ آپ پر ہے۔ دیکھئے فضول کی مروت نہ فرمائیے گا اور بے جا تکلف روا نہ رکھئے گا جبھی تو بات ہے۔

آپ پوچھتے ہیں کہ: ''خط لکھنے والے کی خرابی ہے یا پڑھنے والے کی'' جواباً عرض ہے کہ اسی کی خرابی ہے جس کا لکھا خراب ہو!

خط لکھتے لکھتے خیال اور طرف بھٹک گیا اور غرق بحر ابجد ہو کر جو ابھرتا ہے تو اے شاباش تحفہ نادر لایا یعنی:۔

''نقوش باب فروغِ اردو''

اس جملے سے جشن دہ سالہ کا سن (۱۹۵۸ء) پورے پور برآمد ہوتا ہے، پسند آئے تو کام میں لائیے لطیفہ سینئے گا۔ اگر میں چار، پانچ، چھ کہہ کر آپ سے پوچھوں کہ کس کو کہتے ہیں۔ تو سب طرح کی فکریں کر کے تھک جائیے گا اور دُر مراد کف دست میں لیے دیئے بھی بتا نہ پائیے گا۔ ابجد کے قاعدہ سے اب ذرا دیکھئے تو۔

۴۵۶ = ۳۰۰ + ۶ + ۱۰۰ + ۵۰

نون کے پچاس، قاف کے سو، واو کے چھ، شین کے تین سو

ہوگیا نا۔ نقوش ؟

ابھی ابھی ایک دو غزلہ ہوگیا تھا۔ جی تو چاہا تھا کہ نذر کر دوں مگر حوصلہ نہ ہوا۔ دو دفعہ آزما لیا۔ پہلی بار دو بدو سنا کر۔ دوسری بار نذر گزران کر۔ دونوں دفعہ منہ کی کھانی پڑی۔ اپنی ہی خوش فہمی کو دوش دیا ورنہ پھر آپ میں تنے لطیف کی کمی ماننی پڑتی جو کسی طرح گوارا نہیں۔

ننگ نام

حسن وارثی

از ۷ء وکٹوریہ مینشنز، وکٹوریہ روڈ۔ کراچی

مورخہ ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۷۸ھ پنجشنبہ ۹ دسمبر ۱۹۵۸ء

جب میں نے مطالعہ شروع کیا تھا، اُس وقت لاہور سے مخزن، کانپور سے زمانہ، دہلی سے زبان، بمبئی سے دکن ریویو اور کلکتہ سے شمس بنگالہ۔ یہی پرچے دیکھنے کے قابل ہوا کرتے تھے۔ ادیب اور العصر الہ آباد سے اور الناظر لکھنؤ سے بعد کو جاری ہوتے گئے تھے۔ اس دور میں افسانے تو دال میں نمک کی مقدار ہوا کرتے تھے۔ مضامین ہی مضامین نظر افروز ہوتے تھے۔ نئی زمانہ اُلٹی گنگا بہنے لگی۔ مضامین رسالوں میں، خون لگا کر شہید ہونے کی نسبت سے اور افسانے الغاروں۔ الناظر لکھنؤ کی نوعیت ہی اور تھی لہٰذا وہ خارج از بحث رکھا گیا۔ میری یادداشت جہاں تک ساتھ دیتی ہے خاص نمبروں کی بدعتِ حسنہ لاہور کے عالمگیر اور نیرنگ خیال کی باہمی چشمکوں سے غریب نظر بنتی چلی گئی تھی۔

تقسیم مملکت کے بعد ہی نقوش نے نکلتے ہی اور ہی نقشہ جمانا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں پرنٹر و پبلشر صاحب نے جوادارت کی مسند پر نزول و اجلال فرمایا تو اس کا ناگوار تاثر گرچہ میری

غلط بینی و قصور فہم پر مبنی تھا مگر بہر حال تھا کچھ اسی طرح کا۔ محمد طفیل صاحب نے مدیر کی ذات و صفت میرے لیے بالکل غیر متعارف تھی لہذا ایسے موقعوں پر عام طور سے جو ہوتا آیا ہے وہی ہوا۔ یعنی میں نے اپنی بدظنی کو شتر بے مہار کی طرح ریگ زار میں خار مغیلاں چرنے پھگنے کے لیے چھوڑ دیا۔ میرے خیال میں یہی آیا کہ طفیل صاحب ہوں نہ ہو کوئی سودے باز سرمایہ دار ہوں گے جو اشتہارات جوڑ توڑ کر اپنی ہمیں بھرنے سے کام رکھیں گے اور نقوش غریب پر بیتا پڑے گی۔ نتیجہ یہ کہ ع

او نیز خر خویش بمنزل برساند

قسم کی کوئی چیز ہو کر رہ جائے گا۔ تازہ اشاعتیں اس کی خریدنا تو اب بھی تھا مگر محرک اس کے لیے جذبۂ خیر سگالی نہیں ہوتا تھا۔ جھوٹ بولنے کا کیا فائدہ۔ سچی بات یہی تھی کہ شعور میں اُبھا کر بدفالی اپنی تسکین چاہتی تھی۔ ہر نئی اشاعت کے ساتھ میری توقع وابستہ رہتی تھی کہ اب کی مدیر صاحب ضرور اپنے اصلی ہو کھنڈے میں نظر آ کر رہیں گے اور میری پیش بینی مستحق داد و آفریں ثابت ہوگی۔ دن بیتتے گئے۔ اشاعتوں پر اشاعتیں مطالعہ میں آتی ہی رہیں مگر ہم اپنی تسکین خاطر کی پذیرائی سے، صرف یہی نہیں کہ محروم کے محروم رہتے چلے گئے بلکہ لاشعوری طریقے پر محمد طفیل صاحب کی کامیابیوں سے خوشی حاصل کرنے کے عادی ہونے لگے۔ مزا یہ کہ اس پر تعجب تک نہ ہوا، شرمندگی کیسی۔ اسی کو کہتے ہیں البغض للہ و الحب للہ!

نقوش نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اشتہاروں کو نظر انداز اور ثقاہت کو سنبھال کر رکھا۔ دوسری بات تعریف کے قابل یہ کر دکھائی کہ عالم گیری و نیرنگ خیالی نقش اوّل کو ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل۔ کا تجربہ دے کر نئے نئے تجربات شروع کر دیے۔ حسن کاری اور سلیقے نے یقین دلایا کہ

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود، گلدستہ گردد

"ہمت مرداں مدد خدا" نے دستگیری کی۔ تیسرا معجزہ یہ کہ انہیں خاص نمبروں کے ذریعہ، ادب نوازوں کو افسانے بغیر مجلات کی طرف رجحان دلا دیا۔ اور یہ کارروائی، بار خاطر بن کر، اس اسلوب احسن سے، انجام پائی کہ کسی کو محسوس بھی نہ ہو سکی، بار خاطر ہوتا کیسا۔ اس سلسلہ میں افسانہ نمبر نے اس طشت از بام، راز بر کھلتے کھلتے بھی رازداری کے گہرے پردے ڈال دیئے۔ تنوع اور جدت طرازیوں نے دلچسپیوں کو استحکام بخشا۔ ہر طرف انتظار خوشگوار ہوتا رہا کہ دیکھیے اب کی نقوش کا خاص نمبر کیسا نکلتا ہے۔ بنیاد کی مضبوطی کی جانچ پڑتال کے لیے قیمتیں بڑھانے چلے گئے اس پر بھی قدر دانوں نے اسی کا مظاہرہ کیا کہ

رکیں گے کب سے کے پینے والے ہزار قیمت گراں ہے گی

تازہ مکاتیب نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے، جو انگریزی روزنامہ ڈان میں اظہار خیال فرمایا گیا ہے، اور خاص نمبروں کو ہدف بنایا گیا ہے اس کو قیاس مع الفارق کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تبصرہ پڑھ کر بے ساختہ مجھے حضرت اکبر الہ آبادی کا فرمودہ یاد آگیا تھا ع

پا پونیر کی پڑے مار، علی گڑھ کے حوالے!

تبصرہ نگار صاحب بہادر کی شان کے خلاف نہ ہو تو ذرا زحمت تو ہو گی مگر آنکھیں کھل جائیں گی اگر ردی فروشوں اور سڑک کنارے رسالوں کو گاجر مولی کے بھاؤ بیچنے والوں کے یہاں کی سیر فرمالیں۔ کون سا رسالہ ہے کہ جس کی اشاعتوں پر اشاعتیں ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کہا جا، بنی بنائی دستیاب نہیں مگر ایک نقوش ہی اس سے مستثنیٰ پایا جائے گا۔ سال چھ مہینوں کی چکھیریوں کے بعد ایک آدھ معمولی اشاعت چلتے پھرتے شاید کسی ایسی دکان پر پڑی مل جائے تو وہ اور بات ہے ورنہ ان بڑی بڑی قیمتوں والے خاص نمبروں کا ان جگہوں کیا مذکور۔ کباڑیوں سے فرمائش بھی کر دیکھئے، غریب ہامی بھی بھر لیں گے مگر نتیجہ میں وہی ڈھاک کے تین پات طرفین کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ لگے ہاتھوں اس کا دھیان بھی کرتے چلئے کہ ان گراں قیمت خاص نمبروں کے کچھ نہ کچھ خریدار ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے اپنی بعض ضرورتوں کا ترک قبول کر کے ہی خریداری فرمائی ہو گی چاہیئے تو یہ تھا کہ ایسے اصحاب ہی بعد مطالعہ اپنے پیسے کھرے کر لیتے۔ یہ بھی نہیں ہوتا تو آخر اس کے کچھ معنی ضرور ہوں گے۔ کتابوں کی دکانوں پر نئی اشاعت، عام ازیں کہ نوعیت اس کی کچھ بھی ہو بس کچھ ہی دنوں سامنے کے تختوں پر نظر آتی رہے گی۔ اسٹاک ختم ہونے پر آیا نہیں کہ نقوش مجلہ تشکیل کر دیا گیا۔ ابھی مل جائے گا مگر کچھ احسان دھر کر۔ اسے لیجئے دیکھئے ہی دیکھتے آپ کو تصحیح خیال کے لیے لغات سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی کہ کہیں آپ کو سہو تو نہیں لاحق ہو گیا ہے۔ کبریت احمر شاید نقوش ہی کو کہتے ہوں تو کیا پتہ۔ ہم کو تو معلوم ہے مگر جو نہیں جانتے ان کو معلوم کرنا چاہیئے کہ نقوش میں کس قسم کے لعل و جواہر لگے ہیں کہ جس کے ہاتھ آجا آ دہی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ باقی رہ گئے ڈان کے تبصرہ نگار صاحب ان کی خدمت عالی در جبت میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ ؎

باکہ گویم سر ایں معنی کہ حسن روئے دوست
در نگاہ ما گل و در چشم موسیٰ آتش است

ادارہ فروغ اُردو نے "نقوش" نکالا ہے، مجھے اس کے نجی معاملات کی معلومات ہیں نہ ان سے مطلب۔ ابتدا میں جناب ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور صاحبہ کی مشترکہ ادارت تھی۔ بیچ میں وقار عظیم نے عزت بخشی۔ آخر میں پرنٹر پبلشر کی ذمہ داری سے غالباً سبکدوش ہو کر ادارت کے بوجھ کو جو کاندھا دیا اب خدا ہی جانے کہ محمد طفیل صاحب کو ادارت نہیں چھوڑتی یا انھوں نے اذا بطشتم بطشتم جبارین کا عمل پڑھنا شروع کر دیا ہے کیونکہ نقوش کے ساتھ لازم ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ مدیران سابقین کا ادارہ فروغ اُردو سے جو بھی سلسلہ رہا ہو اس کی تفتیش سے ہم کو آپ کو دلچسپی ہی کیا ہو سکتی ہے۔ ازیں قبیل محمد طفیل صاحب سے بھی جو سمجھوتا ہو اُس سے بھی کسی کو کیا مطلب۔ البتہ جب سے محمد طفیل صاحب نے بڑے بڑے داموں کی اشاعتیں اور خاص نمبروں کی بنا ڈالی، دیکھا یہی جا رہا ہے کہ "زر می طلبی سخن درین است" والی بات لوگوں کے ذہن سے نکل گئی ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ادارت کی کرسی ہے نہ مسند بلکہ تسبیح، مقصد سے لیس ہو کر عمل حُب جگایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نقوش کی اوّلین اشاعت عجب کدھنگی نکلی تھی۔ سال و ماہ کیا شمارہ کی بھی نشاندہی ادارہ پڑھ کر ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ دوسری اشاعت سے شمارہ دینا رواج پایا۔ کل جمع دس اشاعتیں ندیم ہاجرہ ادارت میں نکل پائیں مگر کس سال کے کس مہینے سے کس سال کے کس مہینے تک یہ دور چلا اس کا پتہ لگانے کی زحمت فضول ہے۔ وقار عظیم صاحب کا انتظار کیجیے۔ وہ آجائیں تو شرح صدر حاصل ہو۔ اس فرصت میں مجھے اپنا جملہ معترضہ پیش کرنا ہے: تین ابتدائی اشاعتیں تو قد و قامت میں یکساں رہیں مگر چوتھی اشاعت؟ "الف منحنی بود ہمزہ" مگر ہمزہ چوب خط یعنی جسامت زیادہ قد کوتاہ۔ بقامت کہتر بقیمت بہتر۔ طفل تسلی کے لیے خاص نمبر۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا، بلا احساس ندامت، اقرار ہے کہ میری قوتِ برداشت قطعی ضعیف ہو چکی ہے۔ عالمگیر و نیرنگ خیال کی مختلف پریشان بھی مجھے اس کا عادی نہ کر سکی کہ عام ازیں کہ حضرت امیر خسرو کے انتساب ہی سے سہی مگر "اہمل بے جوڑ" بات بھی ہو تو اس کی برداشت کروں چہ جائیکہ اہمل بے جوڑ چیز؟ اور اگر ضرورت مجبور کرے کہ ان کو یکجا محفوظ کر لیا جائے تو اب آپ ہی بتائیے کہ جنوری فروری قسموں کی چیزیں لے کر کوئی کسی جلد بند کے پاس جائے تو کس منہ سے جائے؟ جلد ساز کیسا ہی مہذب و متین سہی مگر کیا یہ عرض کرنے سے بھی گیا؟ کہ ع این غلط مجموعہ را شیرازہ بستن خوب نیست۔ "اونٹ کے منہ میں زیرہ" خیر ہو سکتا ہے مگر اونٹ کے گلے میں بلی؟ یہ تو صریح بیوقوف بنانے والی بات ہے۔ میرے نزدیک این قدر،

آں قدر، پرچے چھاپنے والے چپکے سے کہتے یہی ہیں کہ میرے شائع کیے رسالے ردی کی ٹوکری کے لیے ہیں۔ ان کو محفوظ کرنے کے جھگڑوں میں نہ پڑیئے گا۔ آپ ہی غور فرمایئے یہ بات کیا ہوئی؟ وقار عظیم صاحب بھی ایک بار چوک ہی گئے اور ابتدائی نمبر چار کے نمونہ کا ایک پرچہ نکال ہی چھوڑا۔ محمد طفیل صاحب نے اب تک تو اس رسم قبیح کا سہارا لیا نہیں ہے۔ آئندہ اللہ جو چاہے گا وہی ہوگا۔ ہم خدا سے یہی چاہتے ہیں کہ بُری بات کی ان کو توفیق ہی نہ ہو۔ اللھم احفظنا من کل بلاء الدنیا!

آمدم برسرِ مطلب۔ مئی ۱۹۵۰ء کی تاریخ ڈال کر وقار عظیم صاحب نے اپنے اداریہ میں تحریر فرمایا:۔

"...... نقوش سب سے پہلے مارچ ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا تھا۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں حکومت کی طرف سے اس کی اشاعت پر چھ مہینہ کی پابندی لگا دی گئی۔ اس مدت کے اختتام پر نقوش فروری ۱۹۴۹ء میں دوبارہ جاری ہوا۔ دسمبر ۱۹۴۹ء میں بعض ناسازگار حالات کی بنا پر اس کی اشاعت پھر رُک گئی اور اب مئی ۱۹۵۰ء میں پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے...."

اقتباس بالا کے بعد ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی ادارت کے عشرۂ کاملہ کی ماہ وار نشست تو ظاہر ہے کہ ممکن ہی نہیں۔ اسی پر صبر کر لیجیے کہ مارچ ۴۸ء سے نومبر ۱۹۴۹ء تک اکیس مہینوں میں سے چھ مہینے بعد کیجیے جو "حکم حاکم مرگ مفاجات" کے شمار میں متصور ہیں۔ باقی رہ آئیں گے پندرہ مہینے اور ان پندرہ مہینوں میں نکلے دس پرچے۔ نتیجہ یہ کہ ندیم صاحب کی شاہ صاحبیت اپنا کام کرتی نظر آتی ہے یعنی ہر اشاعت کے لیے چلہ کشی کا حساب ٹھیک بیٹھ جاتا ہے۔ ہاجرہ صاحبہ کا نام اس سلسلہ میں نہیں لیا جا سکتا۔ ادب و تہذیب کے خلاف ہے۔

وقار عظیم صاحب کی ادارت ع خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود۔ صرف پانچ ہی اشاعتیں دیگر رخصت۔ مگر گنتی کی یہ پانچ اشاعتیں بھی مئی ۱۹۵۰ء سے مارچ یا فروری ۱۹۵۲ء تک پھیلائی جا سکتی ہیں۔ گیارہویں اشاعت سے اٹھارہویں اشاعت تک کے شمارے انہیں پانچ پرچوں میں پلٹے لپٹائے ہیں۔ اب غور کیجیے تیئس مہینوں میں پانچ پرچے۔ اتنا حساب بھی اس سے ملا کہ محمد طفیل صاحب نے شمارہ ۱۹ - ۲۰ اپنی ادارت میں پہلی بار نکالا۔ دوسرے پرچے پر شمارہ ۲۱ - ۲۲ دیا اور مئی ۵۲ء کا بھی اندراج فرمایا۔ اسی سے فرض کیا گیا کہ شمارہ ۱۹ - ۲۰ مارچ یا اپریل میں نکلا ہوگا۔ اب ۱۹۵۵ء ختم ہو چکا ہے۔ محمد طفیل صاحب کی ادارت کم و بیش اُنتیس مہینے تیر کیے

جیبٹھی ہے اور اس ساری مدت میں کہا جا سکتا ہے کہ سال پیچھے آٹھ اشاعتوں کی کسر بالا کچھ اوسط نکلے گی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کو خوش آئند نہیں کہا جا سکتا مگر اسی وقت تک جب تک حلقے گننے پر اصرار رہے گا۔ غوطے مار کے کف دست پر در شہوار ہے نظر چرائی جائے گی۔ ورنہ مکاتیب نمبر ناتمام تک اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ کہنا پڑے گا کہ طفیل صاحب نے ع

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر

نقوش کی عام اشاعت ہی غضب کی چیز ہوا کرتی ہے پھر خاص نمبروں کا کیا پوچھنا ہے۔ جلّ وعلا۔ ہزار باتوں کی ایک بات اور تمام جہان کے اعتراضوں کا واحد جواب نقوش کی مقبولیت تمام ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

مگر اس عالم اسباب میں ع برتوکل زانوئے اشتر ببند" کا معمول، مسبب قادر و توانا کے انکار پر دلالت نہیں کرتا بلکہ صحت مند ذہنیت کا ثبوت ہے۔ قبول عام واہب العطایا کی طرف سے بندہ نوازی یقینی مگر اس کے ظاہری اسباب پر نگاہ بھی اسی کی قدرتوں کا تماشا ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس مقبولیت کے پس منظر کا بھی جائزہ لے ہی لیا جائے۔ کسی مجلّہ کی کامیابی کے ظاہری اسباب میں اوّلیت اگر دی جا سکتی ہے تو ادارت کو۔ پہلی ادارت ندیم قاسمی صاحب اور ہاجرہ مسرور صاحبہ کے اشتراک میں تھی۔ ان کے بعض رجحانات سے اختلاف کے جملہ حقوق محفوظ رکھ لینے کے بعد بھی کون ہے جو ان کی صلاحیتوں کا منکر ہو سکتا ہے؛ جاری کرنے والے ادارے نے زمانہ کے مخدومان ادب انشا میں سے عمدہ اور البیلا چناؤ کیا تھا کہ ع بیلی پھڑک اٹھی نگہ انتخابات کی۔ اس دور کی اشاعتیں جس معیار کی ہیں وہی ابتدائی مرحلے میں نشان منزل کا کام دینے کی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے ندیم ہاجرہ ادارت کافی وقت باقی تو اپنی مشخصہ منزل پر ہی پہنچا کر چھوڑتی۔ درمیان میں جو ادلا بدلی ہوئی اور وقار عظیم صاحب نے زمام ادارت سنبھالی، ایک حساب سے یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ علمی و ادبی حلقوں میں ان کا ادب لحاظ اور ہی نہج پر ہوتا ہے۔ ممدوح نے اپنے ماحول کو جانچ پڑتال کر نرم روی بجائے گرم روی اختیار کی اور اس میں اپنا سلیقہ دکھانے میں بھی کامیاب ہوئے انکے زمانے میں گنتی کی پانچ اشاعتیں سہی مگر ان کو بھی اگر "پنج گنج" کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کے بعد کیا کہوں بات ہے گستاخی کی نصیحت گوش زد ہے ع ایسی ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو، مگر اب جو بھی ہو ع چل رہے خامہ بسم اللہ۔ شمار کے جس عدد سے محمد طفیل صاحب گنتی میں آتے ہیں اس

کے متعلق کہاوت یہی تو ہے کہ "تیسرے خانے میر دبولنے"۔ "میں اب ایسا دیوانہ تو نہیں کہ ایک سُلجھے ہوئے صاحب علم وعمل معزز شہریٔ پاکستان پر لایعنی پھبتیاں کہوں اور سب کو بدمزہ کروں۔ مگر ؎

صادق ہوں اپنے قول پہ غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اس "نہیں ہاں" کو کوئی کیا سمجھے گا۔ اچھا کھولے دیتا ہوں اس کے اندر والے راز کو۔ حافظ شیراز کا کہا یاد کیجئے ؎

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اس قول کو فعل میں لانے والے کو آپ کیا کہیں گے؟ وہی جو حافظ جی نے کہا ہے۔ اسی کو ہم نے اُردو میں کہہ دیا۔ مگر ہاں کہنے کا طرز اچھا نہیں مجھے منظور۔ یہ بھی مقبولہ کہ اس سے تفاول بُرا نکلنا امکان میں ہے۔ مگر میں کج بحثی نہیں کرتا البتہ کج فہمی ہو تو اس کو نہیں کہہ سکتا۔ وہ بات یہ ہے کہ محمد طفیل صاحب کو یہ نمبر قدرت سے ملا ہے۔ پیشین گوئی کی گئی کہ اگر ادبی دُنیا میں "دیوانہ بکار خویش ہشیار" بن کر اقدامات پا بر جائی کے ساتھ کرتے رہے تو "میری" انہیں کی ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ "عمرے باید کہ یار آید بکنار" مگر مجنون الٰہی کی باتوں کو قیس عامری سے کیا تعلق۔ محمد طفیل صاحب کو ہنیبال، چنگیز یا ہٹلر تصور کرنا تو انتہائی بدمذاقی ہوگی۔ مگر آتے دیر نہ ہوئی کہ انہوں نے وہ جھنڈے نصب کر دیئے جو سربلندی و پہنائی میں عظیم و بسیط نظر آ رہے ہیں۔ حصول تعاون کے لیے ان کا پیچھے چلے جانا بجائے خود ایک کارنامہ ہے اور کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کر کے بھی سر نہ اُٹھانا انہیں کا شاہکار۔ ثبوت کے لیے اِدھر اُدھر کہیں سے دُور کی کوڑی لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فرزندان معنوی اشاعتہائے نقوش کو نظر بھر کر دیکھ لیجئے۔ الولد سرٌ لابیہ!

اس سلسلہ کا دوسرا شرطہ مگر ادارت کے سوال وجواب سے اہمیت میں کہیں بڑھا چڑھا، نمایاں کیا ہے، صفحات مجلہ کی زیب و زینت کے ضامن اہل علم و انشا کا تعاون۔ جن جن اہل قلم پیران و جوانان نظم و نثر نے نقوش کا نقش مزید درست کرنے میں حصے لیے ہیں ان کی فہرست جتنی طولانی ہے اتنی ہی وقیع ہر دو برعظیم کے سرآمد فن کی بیش از بیش نمائندگی کا دعویٰ بلاخوف تردید کیا جا سکتا ہے۔ مدیر مجلہ کی قابلِ رشک کامیابی اسی کو کہتے ہیں۔ غیر متعارف مگر جوہر قابل پسماندگان اور اپنی صلاحیتوں پر خود پورا اعتماد نہ رکھنے والے نوجوانوں کو ڈھونڈ نکالنا اور ان کی تخلیقات کو قدر دانوں میں لا ڈالنا۔ آسان کام نہیں۔ مگر

نقوش اس کارکردگی میں بھی اپنے ہمعصروں سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ "جیسی روح ویسے فرشتے" والی مثل یہاں بھی صادق آتی ہے اور محمد طفیل صاحب کے لیے سرمایۂ افتخار بنتی ہے۔ بہر کیف ان سب درِ منثور و سلک منظوم نذر نقوش کرنے والوں میں جو پیر و جوان اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ان کی مغفرت اور ان پر رحمت کے لیے دعائیں بچشم گریاں۔ باقیوں کی صحت و سلامتی کی آرزوئیں دل سے خدا کے حضور۔

تیسری چیز تہذیب و ترتیب مجلہ کے سلسلہ میں کتابت و طباعت سے متعلق ہے۔ ترتیب پر تو حرف دھرنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ کتابت ضرور اصلاح طلب ہے اس کی طرف انعطاف توجہ ہونا چاہیئے اور جلد ہونا چاہیئے۔ مسودوں میں جو خطوط کشیدہ ملتے ہوا کریں ان کی کتابت بھی اسی انداز سے ہونی چاہیئے جا بجا واوین و قوسین سے جو الفاظ و اسماء احاطے میں لائے گئے ہوں ان کو بجنسہٖ کتابت میں آنا چاہیئے۔ خطوط حسب ضرورت جلی و خفی لکھنے سے گریز اچھی بات نہیں ہے۔ ازیں قبیل چند اصلاحیں اگر کر دی جائیں تو حسن کو چار چاند لگیں گے مانا کہ ع

حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را

آخر میں ادارۂ فروغ اُردو، جناب مدیر گرامی محمد طفیل نامی، معاونین کرام سب کی خدمتوں میں تہنیت و تبریک اور خود بدولت نقوش نوشاہ کے لیے آرزوئیں کہ پنجاہ سالہ و صد سالہ جشن طرب منانا نصیب ہو ع

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

روئیداد

(آپ بیتی نمبر)

لکھنے والے :

مولانا علم الدین سالک — حکیم یوسف حسن

شاہد احمد دہلوی — عادل رشید

حفیظ جالندھری — شمس اللہ تعمتی

مدیر نقوش — محمد یسین وٹو

انسان کا خواب سے رشتہ بڑا پرانا ہے۔

خواب ہی تو ہیں جن سے انسان کی زندگی میں کچھ دلکشی باقی ہے۔ جب یہ آس بھی ٹوٹ جاتی ہے تو انسان یا تو پاگل ہو جاتا ہے یا پھر خودکشی کر لیتا ہے۔

ادب کے سلسلے میں، میں نے آسوں کے ٹوٹنے کے باوجود خودکشی نہیں کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری دیوانگی تک بہت کم لوگ پہنچیں گے۔

سوال یہ ہے کہ میں نے خودکشی بھی نہیں کی اور پاگل بھی نہ ہوا۔ تو کیا میں اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے زندہ ہوں؟

۹ جون ۱۹۶۴ء

یہ دن بھی کیسا خون خشک کر دینے والا دن تھا۔ بلا وجہ لپ لپ کرنا، عادت جو ٹھہری اس تاریخ سے بھی پہلے، مجھے بھائی عشرت رحمانی نے یہ بتایا تھا کہ انجمن ادبی رسائل نقوش کے آپ بیتی نمبر کے سلسلے میں ایک جشن منانا چاہتی ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض؟

"جی ہاں! مجھے اعتراض ہے۔ اس لیے کہ خاکسار انجمن کا نائب صدر ہے۔ اس لیے مناسب نہیں۔"

"آپ نائب صدر ہیں تو ہوا کریں۔ میں سیکرٹری ہوں۔ اس لیے میں بھی معاملات کو سمجھتا ہوں۔ پھر آپ سے بھی بڑے عہدے دار کراچی میں بیٹھے ہیں۔ میں اُن لوگوں سے بھی بات چیت کر چکا ہوں۔"

"بھئی وہ باتیں جو راولپنڈی میں ہوئی تھیں بڑی رسمی تھیں۔ ٹھہرا حضوری میں، ہاں کو رضامندی نہ سمجھا جائے۔ پھر اس نمائش کا فائدہ؟"

"فائدہ آپ کو ہو یا نہ ہو۔ انجمن کو تو ہوگا۔ اس لیے کہ کئی سال سے اس کا کوئی جلسہ نہیں ہوا۔ اس بہانے ایک دفعہ پھر انجمن کی زندگی کا ثبوت مل جائے گا۔"

"بات یہ ہے جناب! مجھے بھی انجمن سے دلچسپی رہی ہے۔ مگر انجمن کی زندگی کے لیے میں قربانی کا بکرا بننا نہیں چاہتا۔"

"تو بھئی! آپ کو قربانی کا بکرا کون بنا رہا ہے۔ ہم تو آپ کو برات کا دُولھا بنا رہے ہیں۔"

"رہنے دو یار دُولھا! زندگی میں جو ایک بار دُولھا بنے تھے، اُس پر آج تک پچھتا رہے ہیں۔"

"ذرا ایک منٹ خاموش رہیے۔ پہلے میرا پروگرام سُن لیجیے۔"

"اچھا صاحب سنائیے۔ ایک منٹ چھوڑ، دو منٹ کے لیے چُپ ہو گیا۔"

"صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اس جشن کا افتتاح کریں گے۔ مرکزی وزیرِ تعلیم اس کی صدارت کریں گے۔ پاکستان اور ہندوستان کے ادیب اور مدیر اس میں شرکت کریں گے۔"

یہ سب کچھ کہہ کر عشرت صاحب نے میری طرف دادطلب نظروں سے دیکھا۔

چونکہ ابھی دو منٹ نہیں گزرے تھے، اس لیے میں خاموش رہا۔ پورے دو منٹ کے بعد میں نے ہنستے ہوئے کہا: "ماشاءاللہ! پروگرام شاندار ہے، مگر جناب نے جو یہ فرض کر لیا ہے کہ آپ کے لکھنے پر سب دوڑے آئیں گے، یہ سب خوش فہمیاں ہیں۔ آسمان پر نہ اُڑیے۔ زمین پر ہی رہا کیجیے۔ میں بھی خواب دیکھنے کا عادی ہوں۔ پر اتنے بھی نہیں۔"

"آپ کو اس سے کیا۔ میں آسمان پر اُڑوں یا زمین پر رہوں۔ آپ بیکار باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں۔ آج میں نے صدرِ پاکستان کو جشنِ نقوش کے افتتاح کے لیے خط بھی لکھ دیا ہے۔"

"خط لکھ دیا ہے؟"

"جی ہاں!"

"بھئی غضب کر دیا۔ پہلے سارے دوستوں کو بلاتے۔ ان سے مشورہ کرتے۔ پھر جو طے ہوتا وہ کرتے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات ٹھیک نہیں۔"

"میں نے سو آپ کے سب سے بات کر لی تھی۔ لہٰذا اب تو یہ بتائیے کہ پروگرام کیسا لگا ہو۔"

"آپ نے پروگرام تو پہلے ہی سے میں بتا دیا تھا۔ اب مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ اب تو میں یہ دُعا کروں گا کہ خدا میری عزت رکھے۔"

"اور ہماری رکھے نہ رکھے۔"

"آپ نے خود ہی تو آ بیل مجھے مار والی بات کی۔"

"بہر حال اب تو قدم اُٹھا دیا ہے، لہٰذا پیچھے نہ ہٹیے گا۔ اگر آپ اس ضمن میں کوئی دلچسپی لینا نہیں چاہتے تو نہ لیں۔ مگر کل کلاں کو کوئی شکایت نہ کیجیے گا کہ یہ بات مناسب نہ ہوئی۔ وہ بات مناسب نہ ہوئی۔"

میں عجیب اُلجھن میں گرفتار تھا۔ کچھ کہتا تو ٹھیک ہوتا۔ چُپ رہتا تو سو خطرے نظر آتے۔ اس لیے مجبوراً بظاہر بے تعلق سا رہ کر، دلچسپی لینے لگا۔ اس لیے پوچھا۔"جناب اتنے شاندار پروگرام کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟"

"آئے گا۔"

"آخر کہاں سے؟"

"بس جو میں کہوں۔ وہ کرتے جائیے۔"

"مثلاً آپ اگر یہ کہہ دیں کہ اتنے ہزار کے نوٹ اپنے پریس میں چھپوا دیجیے تو یہ میں کیسے چھپواؤں گا؟"

"آپ پریس میں نوٹ نہ چھپوائیں۔ مگر اتنا تو کر سکتے ہیں کہ میں جسے کہوں اُسے ٹیلیفون کر دیں۔ باقی میں جانوں اور میرا کام!"

اُس وقت میں نے یوں سوچا کہ عشرت صاحب، جنھیں میں نے ہمیشہ بھائی جانا اب ضرور مجھ سے بلیک میل کریں گے یا کرائیں گے۔ مگر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ اس معاملے میں مخلص تھے۔

چنانچہ عشرت صاحب نے مجھے جو حکم دیا، وہ کیا اور جو نہ کیا وہ سب اُنھوں نے خود کیا۔ رُپے کا بھی انتظام ہوا۔ جلسہ بھی ہوا۔

اب آئیے میں آپ کو پارک لیگژری ہوٹل لیے چلتا ہوں جہاں یہ ہنگامہ ہوگا۔

میں وقتِ مقررہ پر ہوٹل پہنچا۔ دیکھا باہر لان میں بے شمار کرسیاں بچھی ہیں۔ ایک طرف چائے کا انتظام ہے۔ دوسری طرف سُننے سنانے کا، اس وقت تقریباً ساری کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ کچھ آدمی کھڑے ضرور تھے۔ مگر وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس ہوں گے۔ میں ڈر کے مارے ہوٹل کے پورچ ہی میں کھڑا ہو گیا۔ کون بھد اُڑواتا۔

ساڑھے پانچ کا وقت تھا۔ چھ بجے کے قریب احباب آتے دکھائی دیے۔ پھر تو آتے ہی چلے گئے، ڈھارس بندھ گئی۔

میں نے اس خیال سے دیکھا کہ کون کون آن پہنچا تو مجھے ادیبوں میں مولانا صلاح الدین احمد، میاں بشیر احمد، حامد علی خاں، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مولانا علم الدین سالک، ابوالخیر مودودی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، شیخ منظور الٰہی، خدیجہ مستور، حجاب امتیاز علی، مختار مسعود، شاہد احمد دہلوی، امتیاز علی تاج، حکیم یوسف حسن، صادق حسین، مولانا رازق الخیری، ڈاکٹر وحید قریشی، عشرت رحمانی، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، جمیلہ ہاشمی، ظہیر بابر، میرزا ادیب، مسعود مفتی، عادل رشید، قیوم نظر، یوسف ظفر، محمد عبداللہ قریشی، کسریٰ منہاس، حبیب اللہ اوج، ظہور نظر، اشرف صبوحی، قاسم محمود، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مکین احسن کلیم، انتظار حسین، عطا حسین کلیم اور انجم رومانی —— نظر آئے۔ اس کے بعد، میں بھی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد، مجھے کسی نے بتایا "وزیر تعلیم آئے ہیں۔ اس لیے ان کے استقبال کے لیے اُٹھو۔"

میں نے کہا "میرا ان سے شخصی تعارف نہیں ہے۔ اس لیے مجھے کیوں اُٹھاتے ہو۔" مگر تھوڑی سی رد و کد کے بعد مجھے اُٹھنا پڑا۔ موصوف اپنی موٹر سے اُتر کر جلسہ گاہ کی طرف آ رہے تھے۔ "راستے" میں ان سے ملاقات ہوئی۔

"میرا نام محمد طفیل ہے۔"

"بہت خوب، آپ سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔"

"واقعی؟"

"سچ کہہ رہا ہوں۔"

اس کے بعد، اور لوگوں نے بڑھ بڑھ کر، وزیر تعلیم سے مصافحہ کرنا شروع کر دیا اور میں پیچھے ہٹ گیا اور پھر جا کر، اپنی اُسی کونے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

عشرت رحمانی صاحب مائیک کے سامنے آئے۔ اعلان کیا۔ جلسے کی کارروائی شروع کی جاتی ہے۔ میں میاں محمد یٰسین وٹو وزیر تعلیم مغربی پاکستان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کرسیٔ صدارت پر تشریف لائیں۔

جب مسکراتے ہوئے میاں صاحب کرسی پر جاکر بیٹھ گئے تو سیکرٹری صاحب (عشرت صاحب) نے پھر اعلان کیا۔ اب میں جناب علم الدین سالک سے درخواست کروں گا کہ وہ تشریف لاکر خطبۂ استقبالیہ ارشاد فرمائیں۔

سالک صاحب نے فی البدیہہ کہنا شروع کر دیا۔ خوب رواں زبان میں، بڑی معلوماتی اور عالمانہ باتیں کیں۔ خوب خوب بولے۔ خوب خوب برسے، نہیں نہیں۔ خوب خوب ہماری وجہ سے نہ برسے، ورنہ سالک صاحب لگی لپٹی رکھنے والے نہیں۔ وہ جابر سے جابر حاکم کے سامنے بھی کلمۂ حق کہہ گزرنے والوں میں سے ہیں۔

اُنھوں نے بڑے پیار سے وزیر معارف کو سمجھایا کہ آپ جس عہدے پر ہیں۔ اس کی بڑی ذمہ داریاں ہوا کرتی ہیں۔

پھر اُردو رسالوں کے باوا آدم جناب حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال تشریف لائے جو بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ٹھیک سے دکھائی بھی نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے لکھے کو بھی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکتے۔ مجھے ان کی معذوریوں پر دُکھ ہوا۔ اپنا بھی انجام نظر آ گیا۔ اُنھوں نے اپنی جوانی میں ادب کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا مگر آج اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنے پرچے کو کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔ مجبوراً غیر ادبی دھندے کرتے ہیں۔ اس سے جو کچھ کماتے ہیں پرچے کو کھلا دیتے ہیں۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ اُردو ادب کا یہ بوڑھا سپاہی آج اپنی ادبی کارگزاریوں کی بنا پر زندہ بھی نہیں رہ سکتا؟ — اُردو ادب زندہ باد!

اس کے بعد، اُردو کے جیالے ادیب، بڑے ادیب کے پوتے، جناب شاہد احمد دہلوی تشریف لائے۔ دل دھڑک رہا تھا کہ جانے کیا کہہ دیں۔ "سوت" والا معاملہ جو تھا۔ پھر ایک بار قدرے تُھکّم تُھکّا بھی ہو چکی تھی۔ اگر کسی سے انتقام لینا ہو اور اُسے ایسا موقع مل جائے تو اُسے چوکنا بھی نہیں چاہیئے۔ پھر شاہد صاحب کا قلم جتنا بے لگام ہے وہ بھی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ ان کا کلیہ یہ بھی ہے کہ خاکساری برتی جائے تو دُنیا بے وقوف سمجھتی ہے۔ اس لیے یہ زمانہ جوتے مارنے کا ہے۔ مگر اللہ کا شکر کہ اُنھوں نے مجھ سے پیار کا رشتہ نبھایا۔ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور ادبی رسالوں کی حالتِ زار کا جو نقشہ کھینچا۔ وہ بڑا دلدوز تھا۔ شاہد صاحب کی زبان میں جو مٹھاس ہے اُس نے معاملے کی ساری باتوں میں شیرینی گھول دی۔ ہم لاکھ کوشش کر لیں ہماری تحریر دن میں مولوی "مدن والی" بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ خدا کی اس دین سے اُنھوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا

جائز بھی، ناجائز بھی! جائز اصول کی بنا پر، ناجائز تنا تنی کی بنا پر، یہ انجمن تو انہی کی تھی۔ اس لیے سالے حق ادا کر گئے۔

پھر عادل رشید صاحب کچھ کہنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں ان سے بھی چخ پخ ہو چکی تھی۔ لہٰذا پر اسنبھل کے بیٹھنا، قدرتی بات تھی۔ مجھ ایسا ٹھٹر جیا بھی کوئی نہ ہو۔ مگر اُس وقت وہاں، وہ عادل رشید کھڑے نہ تھے جو مشہور ناول نگار ہیں بلکہ ہندوستانی ادیبوں کے نمائندہ عادل رشید کھڑے تھے اور ان دونوں ہستیوں میں فرق تھا۔

مگر صاحب! اُنھوں نے چند بڑی اہم باتیں کہیں اور دُور رس نتائج والی باتیں کہیں۔ جن میں خلوص تھا۔ معاملات کی نزاکت کا احساس تھا۔ اُنھوں نے جو کچھ بھی کہا۔ وہ ایک ہندوستانی ادیب ہی کہہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ ہمارے مسائل مشترکہ ہوتے ہوئے بھی، ملکی فیصلوں کی بنا پر مختلف ہیں، ہندوستان نے اعلانیہ اُردو سے بیزاری کا اعلان کیا۔ ہم نے دانستہ اسے کوئی مقام نہ دیا۔ اسے ختم کرنے کے سو جیلے وہاں بھی ہوئے۔ سو جیلے یہاں بھی ہوتے۔ چونکہ جاندار زبانوں کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے کہ اُنھیں کوئی بھی مٹا نہیں سکے گا۔ اس لیے یہ یہاں بھی لوگوں کے دلوں پر راج کر رہی ہے۔ وہاں بھی لوگوں کے دلوں پر راج کر رہی ہے۔

اکبر الٰہ آبادی بھی کیا مزے کے آدمی تھے۔ وہ ہندی کی "فوقیت" کے سلسلے میں کچھ کہہ گئے ہیں۔ وہ سن لیجیے۔ بے موقع سہی، مگر لطف سے خالی نہیں:

دوستو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو	بعد مرنے کے کھلے گا کہ ہے یہ کام کی بات
بس کہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں	کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فوراً ہی نجات

ویسے ہی یہاں اُردو کے رسم الخط کو تبدیل کر کے اکبر الٰہ آبادی کے فیصلے کی روشنی میں "نجات" کا راستہ ڈھونڈھا جا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا ایک بار رومن رسم الخط کا نعرہ لگا تھا۔ اسی طرح آجکل ایک اور نعرہ ریہرسل کی اسٹیج میں ہے۔

ہاں تو میں بات عادل رشید صاحب کی کر رہا تھا۔ اُن کی سوچوں کو سراہ رہا تھا۔ ایک تو اُنھوں نے میرے خلاف کچھ نہ کہہ کر اپنی بڑائی کا ثبوت دیا۔ دوسرے ہندوستان کے ادیبوں کی طرف سے مجھے قلم تحفتہً دے کر نوازا۔ شیفر کا یہ سیٹ یوں تو تین ساڑھے تین سو روپے کا ہوگا مگر میرے نزدیک اس کی قیمت لاکھوں سے زیادہ ہے۔

بغیر سوچے، بغیر پوچھے، عشرت صاحب نے پروگرام میں خدیجہ بہن کا نام لکھ دیا تھا کہ

وہ اپنی آپ بیتی پڑھیں گی۔ جب پروگرام ان کے پاس پہنچا تو اُنھوں نے مجھے ٹیلیفون کیا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

"کون سی حرکت؟"

"بغیر پوچھے میرا نام کیوں لکھا؟"

"یہ عشرت صاحب سے پوچھیے۔"

"میں عشرت صاحب سے نہیں پوچھوں گی۔ آپ سے انتقام لوں گی اور اب تو میں جلسے میں بھی شریک نہ ہوں گی۔"

"ہاں صاحب انتقام لینے کا اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔ ضرور انتقام لیجیے، میں حاضر ہوں!"

میرے اس جواب پر خدیجہ بہن کھلکھلا کر ہنس دیں، کہنے لگیں "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں طفیل بھائی کے سلسلے میں، جو تقریب منائی جا رہی ہو، اس میں شرکت نہ کروں میں آؤں گی ——— اور اپنی آپ بیتی پڑھوں گی۔"

چنانچہ خدیجہ بہن آئیں۔ اُنھوں نے بڑے ہی پیارے انداز میں اپنی آپ بیتی پڑھی۔ چھا گئیں۔ ایک تو لکھنے کا انداز اچھا، پھر پڑھنے کا انداز اچھا۔ "مشاعرہ" لُوٹ لیا۔

اس کے بعد، میں جوش صاحب کے پاس پہنچا۔ عرض کیا "جناب! یہ لیجیے اپنا مسوّدہ، اب اپنی آپ بیتی پڑھ ڈالیے، اس لیے کہ پروگرام میں یہی لکھا ہے۔"

"بڑے بدمعاش ہو۔ خُوب پھانسا۔"

اعلان ہوا تو اُنھیں اُٹھنا پڑا۔ مائیک پر جا کر کہا "طفیل صاحب نے مجھے پہلے نہیں بتایا تھا کہ مجھے بھی اپنی آپ بیتی کہنا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو اپنے لکھے کو ایک نظر پھر دیکھ لیتا، کہ مجھے اپنی بیتی میں سے کون سا حصّہ پڑھنا ہے، بہر حال عرض کرتا ہوں۔

چنانچہ اُنھوں نے نثر میں شاعری کی۔ لُطف آیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اُکھڑے ہوئے انداز میں پڑھ رہے ہیں جیسے مجھے سمجھا رہے ہوں۔ بچّو! اب تو پھنس گیا ہوں۔ یہاں سے نپٹ لوں۔ پھر تم سے سمجھوں گا۔ مگر میں نے اُنھیں سوچنے سمجھنے کا موقع نہ دیا۔ شام ہو رہی تھی۔ میں نے پاس جا کر کہا "اب آپ کی عبادت کا وقت ہو چلا ہے۔ اس لیے اُٹھیے۔"

"ہاں چلو، ورنہ جان سے مار دوں گا۔"

میں جوش صاحب کو ہوٹل کے ایک کمرے میں بٹھا کر واپس چلا آیا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ بوتل اور جوش آپس میں بڑے یار ہیں۔

مجھے حفیظ جالندھری صاحب نے جوش صاحب کے پڑھنے کے دوران ہی، بلا کر یہ کہہ دیا تھا "اب مجھے بھی جلدی سے پڑھوا لو، مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں جانا ہے۔"

اور یہ بات میں نے سیکرٹری صاحب تک پہنچا دی تھی۔

چنانچہ جوش صاحب کے فوراً بعد حفیظ صاحب کو زحمت دی گئی۔ جوش صاحب کو لے کر میں جا ہی رہا تھا کہ حفیظ صاحب نے ایک دو فقرے جوش صاحب پر کس دیئے۔

جوش صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ بوڑھا بچّہ میرے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے؟"

"نہیں نہیں!"

"سنو تو، وہ کچھ میرے ہی بارے میں کہہ رہے ہیں۔"

"وہ تو کہہ رہے ہیں کہ ہم تو یو۔پی والوں کو اُستاد مانتے ہیں۔ مگر۔ آپ کوئی اُستاد ہیں؟"

"ہاں اُستاد تو ہیں۔"

"پھر تو آپ ہی کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔"

اتنی دیر میں ہم دُور نکل آئے۔ اور پھر یہ رندِ باصفا بھی بہت دُور نکل گئے ہوں گے۔"

جب میں واپس آیا تو حفیظ صاحب کی باتیں، جو وہ تقریر کی صورت میں بیان فرما رہے تھے، جاری تھیں۔ دو ایک فقرے مجھے بھی مخاطب کر کے لڑھکا دیئے۔ میں تو ان کا پرانا نیاز مند ہوں۔ جو بھی کہیں۔ سر آنکھوں پر، پھر وہ میری تعریف ہی تو کر رہے تھے۔ بُرا کیوں لگتا۔

طے کچھ ایسا تھا کہ بیرونی سفارت خانوں کے نمائندے بھی اپنے اپنے ارشادات کا اظہار، بہ سلسلۂ نقوش کریں گے۔ چنانچہ پہلے ایرانی سفارت خانے کے آقائی شمس اللہ صاحب نے چند کلمات فارسی زبان میں کہے۔ جدید فارسی، لہجہ ایرانی، ہم میں سے بیشتر، الفاظ ٹٹول ٹٹول کر رہ گئے۔

پھر متحدہ عرب جمہوریہ کے نمائندے جناب فوزی الخلیل نے بجائے اپنی زبان (عربی) میں کچھ کہنے کے انگریزی میں تقریر کی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں۔ بڑی باٹ دار آواز میں، جو کچھ انھیں کہنا تھا کہا۔ نہ جانے انھیں نقوش کے بارے میں اتنی معلومات کیسے تھیں۔ ضرور انھوں نے یہاں کسی سے دریافت کیا ہوگا۔ انگریزی بولتے بولتے، ایک دم

عربی بولنے لگے۔ ترجمہ کے فرائض پروفیسر محمّد منوّر نے ادا کیے۔ انگریزی میں اُنھوں نے جو کچھ کہا وہ نقوش کے بارے میں تھا۔ عربی میں جو کچھ کہا وہ ان کے اپنے ہاں کے رسائل اور اخبارات کے بارے میں تھا۔

اس کے بعد، اس خاکسار کا نام پکارا گیا تاکہ چند باتیں میں بھی کہوں۔ تحریر و تقریر کا چور اِنگر دھر لیا گیا۔ کوئی بھی تو آلا بالا کام نہ آیا۔ مجبوراً اُٹھنا پڑا اور وہ چند کلمات کہے۔ جو لکھ کر لے گیا تھا۔ اس میں سے بھی ایک پیرا نہ پڑھا۔ کسی اور کو پتہ نہ تھا کہ میں نے کیا پڑھا اور کیا نہ پڑھا۔ چونکہ میری بیوی کو علم تھا۔ اس لیے تن گئیں۔

"جناب نے وہ پیرا نہ پڑھا جو میرے متعلق تھا۔"

"بیکار کی تعریف سے کیا فائدہ؟"

"بیکار کی تعریف؟ —— اگر میرا وجود نہ ہوتا تو آج نقوش بھی اس مقام پر نہ ہوتا۔"

"اچھا جی!"

"جی ہاں!"

"وہ بھئی میں نے تو انتقاماً وہ حصّہ نہ پڑھا۔ اس لیے کہ جب ہم یہاں آرہے تھے تو آپ نے مجھے نروس کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ یہ آپ ہی کے تو الفاظ ہیں کہ آپ کے تو ابھی سے ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔"

پھر، مجھے وزیرِ تعلیم کی وساطت سے، چند قیمتی تحائف دیے گئے۔ جس کے لیے میں اپنے کرم فرماؤں اور سیکرٹری انجمن ادبی رسائل کا شکر گزار ہوں۔

اس کے بعد، فیلڈ مارشل محمّد ایوب خاں صدرِ پاکستان اور وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔

پھر، جناب محمّد یاسین وٹو (وزیرِ تعلیم مغربی پاکستان) نے اپنی صدارتی تقریر، اچھے انداز میں کی۔ جس کی ہمیں امید نہ تھی۔ میرے سارے ہی ساتھی کہتے تھے کہ وزیرِ موصوف کیا کہیں گے۔ مگر اُنھوں نے جو کہا خوب کہا۔ ہر چند کہ ان کی تقریر نے سب سے زیادہ وقت لیا، مگر تقریر میں دلکشی ایسی تھی کہ سبھی قائل ہو گئے۔

اور ہاں یہ تو کہنا بھول ہی گیا کہ اُنھوں نے انجمن سے خوب صورت وعدے بھی کیے تھے۔ مثلاً:

"ہمارے ہاں اُردو میں اچھے لٹریچر کی اشد ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے عمدہ اور معیاری رسائل ہمارے ادب اور معاشرہ کی نہایت بیش قیمت خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ایسے رسائل کی حوصلہ افزائی کی اشد ضرورت ہے اگر ہمارے تعلیمی ادارے اس قسم کے رسائل کو باقاعدگی سے اپنی لائبریری میں منگوا کر طلباء میں اُن کے مطالعہ کا شوق پیدا کریں تو اس سے نہ صرف طلباء و طالبات کو ایسا لٹریچر مہیا ہوگا جو ان کی شخصیت و سیرت کی تشکیل میں ممد ہوگا بلکہ اس سے رسائل و جرائد کو اپنا معیار بلند کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ ایسے رسائل تعلیمی اداروں میں لگائے جائیں چنانچہ اس مطلب کے لیے مناسب لائحہ عمل پر غور کیا جا رہا ہے۔"

اس کے بعد سیکرٹری صاحب نے اعلان کیا کہ جلسے کی پہلی نشست ختم ہوتی ہے۔ اب آپ حضرات چائے کے لیے تشریف لے چلیں ——— اور چائے کے بعد ——— مشاعرہ ہوگا۔

چائے کے لیے بیٹھے تو میں نے چاروں طرف اپنے پیاروں اور اپنے دوستوں کو دیکھا۔ پہلی عرض کی ہوئی فہرست میں ادیبوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اور دوستوں کا بھی، اگر چھوٹے چھوٹے دائروں کی صورت میں بیٹھے ہوئے احباب پر نظریں دوڑاتا جب کہ وہ چائے پی رہے ہوں۔ بھلا نہ لگا۔ غرض خوب رونق تھی۔ جھلا جھل کا سا سماں تھا۔ وہ دن اس اعتبار سے کہ میرے بہت سے دوست، میری نظروں کے سامنے تھے میرے لیے حد درجہ خوشیوں کا باعث تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بعض حضرات نے یہ کہا۔ "ایسا مرتبہ تو کسی کو مرنے کے بعد بھی نہیں ملتا جو طفیل کو اپنی زندگی میں مل گیا۔"

یہ میرا حق تھا یا نہیں۔ اس کا فیصلہ آج کیا ہوگا۔ صحیح فیصلے کے لیے ہمیشہ وقت کا انتظار رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ وقت میری زندگی میں نہ آئے۔

چائے کے بعد مشاعرہ ہوا۔ پہلے ہی سے صرف چند شعراء سے پڑھوانے اور انھیں زیادہ سے زیادہ سننے کا پروگرام تھا۔ چنانچہ ظہور نظر، جو نئے شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان سے بزمِ سخن کا آغاز ہوا۔ پھر قتیل شفائی نے خوش گوئی اور خوش گلوئی سے حاضرین سے داد پائی۔ اس کے بعد احمد ندیم قاسمی نے جی بھر کے سنایا اور سامعین سے بھی جی بھر کے داد پائی۔ آخر میں حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنے کلام سے نوازا۔ سبھی

سرشار ہوئے۔ سبھی جھوم اُٹھے۔

اس جشن کے کوئی پندرہ دن بعد، ریڈیو پاکستان لاہور نے بھی، جشنِ نقوش پر ریکارڈ کی ہوئی تقریروں کے اقتباسات سنائے۔ پیغامات دہرائے اور اس تقریب کی غرض وغایت بیان کی۔ اور اس کے ساتھ وہ مشاعرہ نشر کیا جس کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے۔

لیجیے جلسہ ختم ہو گیا۔ اس کے متعلق باتیں بھی ختم ہوئیں۔

اب میں سوچ رہا ہوں۔

اگر وقت ٹھہر سکتا تو میں اس سے پوچھ لیتا کہ تُو بھلاوے دینے کا عادی کیوں ہے؟۔

اور کیوں تُو بادشاہ سے لے کر، فقیر تک سبھی سے مذاق کرتا ہے؟

بھلاووں کو جیسے زبان مل گئی۔ اگر ہمارا وجود نہ ہوتا تو اس دُنیا میں سوائے مایوسیوں کے اور کچھ نہ ہوتا۔

مَیں بلاوجہ پریشان تھا۔ بھلاووں کا وجود ضروری ہے۔

محمدؐ طفیل

---

(۲)

جشنِ نقوش کے سلسلے میں جو تقاریر ہوئیں یا جو مضامین پڑھے گئے۔ اب ان کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں

مولانا علم الدّین سالکؔ

صدرِ گرامی، خواتین وحضرات!

سب سے پہلے یہ میرا خوش گوار فرض ہے کہ انجمن کی طرف سے میں آپ حضرات کا خیر مقدم کروں۔ یہ میں دل سے کہہ رہا ہوں۔ اس میں کسی قسم کی منافقت نہیں۔ آپ نے زحمت فرمائی، تشریف لائے، وقت دیا اور وقت کو تھوڑا سا برباد بھی کیا اس لیے کہ ہم سب وقت پر کسی چیز کو شروع کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اس کے بعد مجھے چند باتیں کہنی ہیں اور وہ میں نہایت اختصار کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

ادبی جرائد میں نمبروں کا رواج جہاں تک حالات سے معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے

۱۹۰۲ء میں شاید ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی پر "مخزن" نے نکالا تھا اور اس کا حجم تقریباً ڈیوڑھا تھا۔ اُس پرچے سے جو عام طور پہ شائع ہوتا تھا۔ اس کے دو برس بعد رسالہ "زمانہ" نے اکبر اعظم پر ایک خاص نمبر نکالا اور غالباً وہ پہلا موقع تھا جس سے متاثر ہو کر برٹش امپیریلزم نے اس بات کی کوشش کی کہ اکبر کی عزت لوگوں کے دلوں میں ہے اس کے سلسلے میں کچھ ایسا کام ہونا چاہیئے کہ اس پر سب طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ ہو چنانچہ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے کرنل میلیسن کو آمادہ کیا گیا۔ اس نے رولز آف انڈیا سیریز میں ایک مختصر سا مقالہ لکھا اس کے بعد سب سے اہم کام جس کے اندر حکومت نے بہت کچھ مدد کی وہ ولسن سمتھ کی کتاب تھی "اکبر دی گریٹ مغل"۔ حالانکہ انہی ایام کے اندر ایک جرمن کتاب کا بھی ترجمہ ہوا تھا "اکبر دی گریٹ کیزر آ دنیا رکہ"۔ اس کے اندر وہ باتیں نہیں ملتیں جو سمتھ نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالیں۔ تو بہر حال اس پرچے کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ پہلا انقلابی پرچہ تھا جس نے کسی حد تک ہیجان پیدا کیا۔

اس کے بعد جنگِ عظیم شروع ہوتی ہے۔ جنگِ عظیم کے ختم ہونے کے بعد بہت کچھ حالات میں اور کچھ معاشرے میں انقلاب آیا۔ روس کے انقلاب نے لوگوں کو سوچنے پر آمادہ کیا کہ عوام کی بھی قوت ہوا کرتی ہے اور اس کے بعد روس کے اثرات ملک میں پھیلنے شروع ہوئے۔ انھیں ایام کے اندر کچھ رسائل نکلے جن میں میرا خیال ہے کہ غالباً حکیم محمد یوسف حسن کا نیرنگ خیال پہلا رسالہ ہے جس نے خاص نمبروں کو ایک خاص حیثیت دی اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی یہ طرح ہے اور یہ بدعت ہے کہ جس کو بدعتِ حسنہ کہتے ہیں جس پر اکثر رسائل نے آگے چل کر وہی راستہ اختیار کیا جو نیرنگ خیال نے اختیار کیا تھا۔

اس کے بعد دوسرا بڑا انقلاب جو آیا وہ ۱۹۴۷ء کا تھا جب کہ ملک کا بٹوارہ ہوا جب ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کے بعد ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ذہنی انقلاب کے بعد ہی دل کے اندر انقلاب پیدا ہوا کرتا ہے تاکہ دونوں کے اندر ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد کسی قوم کا بام ترقی پر پہنچنا آسان کام ہوا کرتا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے بعد ہمارے ہاں جو روایات پیدا ہوئیں ان پر ہم کبھی بھی فخر نہیں کر سکتے۔ ہم نے اس ملک کے خطہ کو اس واسطے مانگا تھا کہ ہماری کچھ روایات ہیں۔ ہم ان روایات کا تحفظ چاہتے ہیں اور ہم ان روایات کو جاری کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں میں اپنے نوجوان وزیر سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وزیر معارف کے بڑے بڑے فرائض ہوا کرتے تھے۔ ان کی

دریا بخشیوں سے ملک کے اندر انقلاب آیا اور ادب اس مقام پر پہنچا کہ آج ایران طوعاً و کرہاً اس ادب کا اعتراف کرتا ہے کہ جو ہم نے ہندوستان کے اندر پیدا کیا اور آج میں فخر کے ساتھ سر بلند کر کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہ ادب ہے جس کی مثال آپ کو اُس ادب میں نہیں مل سکتی جو ایران کے اندر تھا۔ کیوں کہ اس میں خانخاناں کا ہاتھ ہے، فیضی کا ہاتھ ہے، ابوالفضل کا ہاتھ ہے اور مغلوں میں سب سے اَن پڑھ شہنشاہ اکبر کا ہاتھ ہے اُس نے نہ صرف یہ کہ ادب کی سرپرستی کی بلکہ اُس نے تعلیم کے نئے نئے نظریات پیش کیے۔ اگر اُن کا مطالعہ کیا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج جو انقلاب آپ تعلیم کے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ خاص کر بچوں کی تعلیم کے ضمن میں وہ اکبر کی اُن اصلاحات کی صدائے بازگشت ہے جو اس زمانہ سے تقریباً چار سو برس پہلے ہوا۔

شروع سے آخر تک وزراء کے یہاں، جہاں یہ چیز تھی کہ وہ جنگوں کے اندر بہادری کے کارنامے دکھایا کرتے تھے وہاں ان کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہ ہوا کرتا تھا کہ وہ ادب کی سرپرستی کیا کرتے تھے شعراء کے مکانوں پہ جاتے، ادیبوں سے چیزیں لکھواتے اور معمولی معمولی بات پر لاکھ روپیہ نہیں دیکھا لاکھ روپیہ بخش دیا کرتے تھے۔ آج اُن روایات کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ یہ ملک اس وقت صحرائے اعظم ہے۔ جہاں تک علم کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ نہ یہاں علم ہے نہ ادب ہے نہ اُس کا کوئی معیار ہے۔ آپ شکایت کس بات کی کرتے ہیں کہ صاحب لڑکوں کو یہ معلوم نہیں کہ محمد بن قاسم کس طرف سے آیا۔ جب آپ ٹھیک سے پڑھائیں گے نہیں تو یہی کچھ ہوگا۔ اور یوں محمد بن قاسم بمبئی کے راستے بھی ہندوستان میں داخل ہو سکتا ہے۔

اگر علمی روایات کو زندہ رکھنا ہے تو اس ضمن میں ہمارے رسائل کا بھی یہ فرض تھا اور ہے کہ وہ بھی اس سلسلے میں قدم بڑھاتے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان کے سامنے ایک مسئلہ تھا اور وہ مسئلہ استادِ ازل نے اُن کے دماغوں میں ڈالا اور پھر وہ ان کے اندر جاگزیں ہوا۔ اور وہ مسئلہ سیکس تھا۔ حالانکہ یہ کوئی پرابلم اس ملک کے لیے نہیں ہے۔ لیکن آپ دیکھ لیجیے کہ حشرات الارض کی طرح چیزیں لکھی گئیں۔

سنہ ۱۹۴۸ء کے اندر نقوش نے جنم لیا۔ اُس نے جو کچھ کیا وہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ سولہ برس کی مدت قوموں کی تاریخ میں کوئی مدت نہیں ہوتی لیکن ہمارے ملک کے اندر رسائل اور جرائد کی عمر کے اندر یہ ایک بہت لمبا عرصہ ہے۔ اس عرصے میں اس نے مختلف نمبر نکالے۔

ان میں سے بعض نمبر ایسے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جو کام آپ نے کرنا تھا وہ نقوش نے کر دیا۔ یہ حکومت کے فرائض میں ہونا چاہیے تھا کہ مہاجر جب لٹ پٹ کر آرہے تھے تو اُن سے آپ بیتیاں لکھواتے، اُن کے حالات کا جائزہ لیتے تاکہ وقت کا مورخ جب قلم اٹھاتا تو وہ چیز موجود ہوتی جس سے اُس ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکتا جو آج ہندوستان کے کم و بیش ہر فرد کے اندر کام کر رہی ہے۔

نقوش کا مکاتیب نمبر سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس نمبر کو پڑھنے کے بعد آپ ملک کی اُن سماجی، علمی، ادبی روایات اور اس کے ساتھ ہی سیاسی روایات کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں جو روایات بیسویں صدی کے اندر اس ملک میں قائم ہوتی رہیں۔

اس کے بعد اُنھوں نے شخصیات نمبر نکالا۔ بہت سے لوگ گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے جن کی خدمات موجود تھیں مگر لوگ اُن کو بہت کم جانتے تھے۔ نقوش نے اُن لوگوں کو زندہ کیا۔ یہ اُن کا دوسرا بڑا کارنامہ تھا۔ آپ جب یہاں کے سیاسی انقلاب کی تاریخ لکھیں گے تو یہ نمبر آپ کو کافی مدد دے سکتا ہے۔

غزل ہمارے فنِ سخن کے اندر ایک خاص اہمیت اور خاص مقام رکھتی ہے۔ بدقسمتی سے غلامانہ ذہنیت کی بنا پر انگریز کے ایک اشارے پر اور انگریز مصنفین کے کہنے پر ہم نے اسے بہیمیت کا نمونہ سمجھ لیا کتابیں لکھی گئیں اور لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا وہ خود سراپا غزل ہے۔ ایک پیرے کا دوسرے پیرے کے ساتھ تعلق نہیں۔ ایک بات کا دوسری بات کے ساتھ تعلق نہیں۔ جس چیز کی وہ سب سے زیادہ مذمت کرتے ہیں وہ چیز خود اُن کی تنقیدی کتابوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ نقوش نے غزل نمبر نکالا۔ ایک چیز آپ کے سامنے پیش کر دی۔ اب وہ لوگ جو غزل کی حمایت کر رہے ہیں یا جو غزل کو اپنے کلچر یا ثقافت یا تہذیب کا ایک ایسا جزو سمجھتے ہیں کہ جسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا وہ غزل نمبر کو سامنے رکھ کر کچھ چیزیں تدوین تو کر سکتے ہیں جن سے ان تمام باتوں کا ازالہ ہو سکے جو مغربی مصنفین نے ہمارے ذہنوں میں ڈالی ہیں۔

لاہور جو ایک بہت بڑا مرکز ہے ہمارے علم کا، ہماری تعلیمی سرگرمیوں کا، ہماری ثقافت کا، پاکستان کے اندر یہی ایک شہر ہے جس کا ہماری تاریخ کے ساتھ بہت زیادہ تعلق رہا۔ اس کے بارے میں بھی بڑی مختصر سی چند کتابیں تھیں جو زائد المیعاد ہو چکی تھیں۔ نقوش نے لاہور نمبر نکالا۔ اب میرا خیال ہے کہ آج اس نمبر کو سامنے رکھ کر لاہور کی تاریخ کی تدوین بہ آسانی ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے۔ اگر بلگرام جیسے قصبے، کاکوری جیسے قصبے کی تاریخیں لکھی جا سکتی ہیں تو یقینی طور پر

لاہور کا بہت بڑا حق ہے۔ لاہور نے ہماری فنی تعمیرات میں، ادب میں، ثقافت اور معاشرے میں بڑے بڑے انقلاب دیکھے اور اُن انقلابات کو یکجا کرنا ضروری ہے تاکہ جو نسلیں آ رہی ہیں اُس کو پڑھیں اور اُن کے دل و دماغ میں ایک ذہنی انقلاب پیدا ہو۔

اب وہ آپ کے سامنے آپ بیتی نمبر پیش کر رہے ہیں۔ آپ بیتی دلچسپ چیز ہوا کرتی ہے۔ بسا اوقات سیاسی لوگ اپنی غلط کاریوں کو اسی آپ بیتی کے رنگ کے اندر چھپا لیا کرتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حق و صداقت کہہ دیا کرتے ہیں۔ مثلاً برٹش امپیریلزم کی تاریخ جب آپ لکھیں گے تو بے شک بڑے بڑے گورنر جنرلز کو چھوڑ دیجیے، وہ جو کچھ کہتے ہیں سیاست کے رنگ میں کہتے ہیں۔ معمولی لیفٹیننٹ، سپاہی یا عام آدمی جو ہے، جب وہ اپنی ڈائری لکھتا ہے یا اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے تو اس میں حقیقت نظر آتی ہے اور اس قسم کی چیزیں اکثر مل جایا کرتی ہیں۔ ہمارے علوم و فنون کی تاریخ کے تدوین کرنے میں جو آپ کے ہاں ٹریولرز آئے اُن کی بڑی ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ میں نے ایک واقعہ پڑھا اور دوستوں سے بھی بیان کیا۔ کہ جیکو ماٹن ۱۸۴۱ء کے اندر ہندوستان آتا ہے۔ فرنچ سائنٹسٹ تھا۔ جڑی بوٹی کی تحقیق کے لیے، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی چھٹی لے کر کشمیر جاتا ہے وہاں پر وہ لکھتا ہے کہ آٹھ سو گھرانے ایسے ہیں جن کا ذریعہ معاش کتابت ہے اور ۱۹۳۶ء کے اندر جب ہم نے وہاں مجلسِ میلاد منعقد کرنے کی کوشش کی تو کاتب کو تلاش کرتے تھے اور کاتب نہیں ملتا تھا۔ ایک بوڑھا کاتب ملا۔ اُس نے کہا کہ میرے تو ہاتھ کانپتے ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ قوموں کے تمدّن کو کس طرح مٹایا جاتا ہے اور کس طرح اُن کے دماغوں پر اور ذہنوں پر غلامی کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ آج اس چیز کی ضرورت ہے کہ آپ آپ بیتیوں کو یکجا کر جاتے۔ جو جو کسی پر گزری ہو لکھ ڈالتے اور بے باکی کے ساتھ لکھ ڈالتے۔ بعد میں یہ چیزیں بڑے کام کی ثابت ہوں گی۔ اس واسطے یہ نمبر اہمیت رکھتا ہے۔

اب مجھے ایک چیز کا اعلان کرنا ہے کہ میرے بعد کچھ حضرات اور بھی تقاریر فرمائیں گے۔ غالباً وہ زیادہ مربوط ہوں گی۔ زیادہ کام کی باتیں کہیں گے۔ اُن میں سے سب سے پہلے حکیم یوسف حسن ہوں گے۔ نیرنگِ خیال کے ایڈیٹر۔ پھر اس کے بعد شاہد احمد دہلوی، جن کا تعلق ایک بہت بڑے انسان کے ساتھ اور ایک بہت بڑے گھرانے کے ساتھ ہے۔ جن کی خدمات کو ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد ایرانی اور عرب سفارت خانہ کے نمائندے کچھ فرمائیں گے۔ اس کے بعد ہمارے مہمانِ عزیز جن کے لیے ہمارے دل میں احترام ہے اور وہ عادل رشید ہیں جو ہندوستان

سے تشریف لائے ہیں۔ جو وہاں کے ادبا کی طرف سے طفیل صاحب کی خدمات کو اور نقوش کی خدمات کو سراہیں گے۔ اس کے بعد صاحب صدر تقریر فرمائیں گے۔

حضرات! آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری ژولیدہ بیانی کو سُنا۔

علم الدین سالک

حکیم یوسف حسن

محترم صدر و حاضرین

عہدِ حاضرہ کے معروف ادبی رسالہ نقوش کی سَو نمبری اشاعت کی تقریب پر ہم ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ادب کی تشہیر کے لئے ادیبوں کے قلم اور رسائل کی افادیت مسلمہ ہے۔ چنانچہ فدایانِ ادب کے لئے آج کا اجتماع ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

پاکستان کو جو کچھ ادبی ورثہ ملا ہے وہ وہی ہے جو ہند و پاکستان میں گذشتہ صدی کے اہلِ قلم اور اہلِ دانش کے فہم و تدبر کا نتیجہ ہے۔ اُدبا کی ایک معزز جماعت نے اس میں حصہ لیا۔ چنانچہ اس صدی کے آخری نصف میں مخزن، ہمایوں، عصمت، نیرنگِ خیال، ساقی اور تہذیب نے جو ادب پیش کیا وہ یقینی طور پر بے مثال اور لازوال ہے۔ یہ ادب کسی بھی غیر ملکی زبان کے ادب کے مقابلہ میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گزشتہ سولہ سال میں ہم نے اس ادبی ورثہ کی حفاظت اور ترقی میں کیا کچھ کیا اور ہم کہاں تک پہنچے ہیں۔

گزشتہ پندرہ سولہ سال میں پاکستان میں ادب پر کیا کچھ گزری۔ اس کی داستان ایک المیہ ہے۔ یہ زمانہ ہمارے ادبی انحطاط کا دور ہے۔ اس لئے ہمیں تلاش کرنا ہے کہ موجودہ ادبی انحطاط کے اسباب و علل کیا ہیں۔ اگر ہم اس کو معلوم کر سکیں تو پھر علاج کچھ مشکل نہیں رہ جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج سے ۲۵ - ۳۰ سال قبل اہلِ قلم ادبی مشاغل میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ یہ اصحاب اخبارات اور رسائل میں ایک پاکیزہ جذبہ کے تحت لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھتے تھے۔ ان کی بے لوث سرگرمیوں سے رسائل کے وقار اور ادب کے رجحانات میں اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس جذبہ کے تحت ہمارا قیمتی ادب مرتب ہُوا۔ لیکن دورِ انحطاط میں جو کچھ ہوا ہے وہ مُلکی تقسیم کے نتیجہ میں مسافروں میں ریل پیل، آپا دھاپی، مکان اور معاش کی تلاش میں جدوجہد ہے۔ ملک کے بیشتر مسائل صرف لوٹ کھسوٹ، جلبِ منفعت اور زر اندوزی کی نذر ہو گئے۔

ہماری طبیعت کا تمام رجحان کاروباری ہوگیا اور ادبی قدریں نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

عوام و خواص کی اس نئی مصروفیت کے تحت، ادبی قدریں بھی کاروباری صورت اختیار کرتی چلی گئیں۔ پرانے لکھنے والے جو صرف ذوقِ ادب کے لئے وقف تھے گوشہ نشین ہو گئے۔ ادھر نئے لکھنے والوں نے ادب کو ذریعۂ معاش بنالیا۔ میں اس ذریعۂ معاش کے خلاف نہیں۔ جلد یا بدیر اس نے ہمارے ملک میں جنم لینا تھا اس نے جنم لیا۔ مگر پیش از وقت ہمارے ادیبوں کی خاصی تعداد اس رَو میں بہ گئی جس کی وجہ سے ادب میں انحطاط کے آثار پیدا ہو گئے۔ مضمون ہو یا افسانہ، نظم ہو یا غزل۔ جب معاوضہ کے تحت لکھی جاتی ہے تو اس کا رنگ پھیکا ہوتا ہے وہ گہرائی اور مغز سے خالی ہوتی ہے۔ اس میں سطحیت پائی جاتی ہے۔ آج کل جو ادب ہم پیش کر رہے ہیں وہ تجارتی مصروفیت سے زیادہ کچھ نہیں۔ ادب کا مقصد بہت بلند و بالا ہے۔ آپ نے کبھی کسی بنگلہ کے ملحقہ باغیچہ کے حسن و بناوٹ پر بھی غور فرمایا ہے۔ جس میں صاحبِ خانہ اپنے ہاتھ سے پھولوں، پودوں اور کیاریوں کی تزئین و ترتیب میں مصروف کار نظر آتا ہے۔ اس کا انہماک ایک روحانی مسرت سے لبریز ہوتا ہے جس کے تحت وہ ان کی پرورش کرتا اور ان کی رنگینیوں اور نفاستوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہاں فنونِ لطیفہ قلبی اور روحانی مسرتوں کے لیے کارفرما ہوتا ہے۔ اس سے سودا بازی یا تجارتی مفاد وابستہ نہیں ہوتے۔ یہاں فن برائے فن اور مسرت برائے حقیقت ہوتی ہے۔ یقین کیجئے کہ اہلِ قلم جب ادب کی تخلیق کے لیے لکھتا ہے تو اس کی شان کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

گذشتہ سالہا سال میں ہم ادب اور زبان کی تعمیر و ترقی کے سلسلہ میں بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔ اس کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری دوسری مصروفیات اور دلچسپیوں نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ حکومت تو ملک کی ترقی اور استحکام میں اپنے قابلِ تعریف کارناموں سے مقبول ہو رہی ہے۔ وہ ملک کی فلاح اور ترقی کے کاموں میں بے حد مصروف اور متحرک ہے۔ اس کے باوجود اُس نے ادب کو اپنے دائرہ عمل سے باہر نہیں سمجھا۔ وہ ادیبوں کے مسائل سے بے خبر نہیں رہی۔ لسانی اور ادبی مسائل حکومت کے زیرِ غور ہیں جن پر برابر ہمدردانہ غور کیا جا رہا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اس مسئلہ میں عوام کو دلچسپی لینی چاہیے۔

آج کی مجلس اس سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انحطاط کے اس دور میں بھی ادبی رسائل نے ہمت نہیں ہاری اور وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہے ہیں۔ ادبی رسائل

کی انجمن کے نامور رکن محترم محمد طفیل صاحب مدیر نقوش نے بساطِ ادب پر عظیم نمبروں اور ادبی کارناموں کے انمٹ نشان کندہ کیے ہیں اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ادب کو زندہ اور پُر وقار بنانے کے لیے عوام اپنے اندر بڑا جذبہ رکھتے ہیں جس کا مستند نشان نقوش کا آپ بیتی نمبر ہے۔ اس رسالہ کی کامیابی نے ادبی رسائل میں حیاتِ نو پیدا کر دی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کا جمود اور سکون حرکت اور زندگی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس طرح ہم پھر ایک بار کامیابی کی منزل کی طرف رواں نظر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میں کہوں کہ ــ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا ــ تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے گا۔

الحکیم ابو یوسف حسن

شاہد احمد دہلوی

ہمارے لئے یہ نہایت خوشی کا موقع ہے کہ نقوش اپنے کامیاب سولہ سالہ دورِ حیات کے بعد اپنا ۱۰۰واں شمارہ پیش کر رہا ہے۔ یہ کامیابی دوگونہ ہے۔ ایک تو یہ کہ نقوش پابندیٔ وقت کے ساتھ بڑی آب و تاب سے شائع ہوتا رہا دوسرے یہ کہ جس مقصد سے نقوش جاری کیا گیا تھا اسے پورا کرنے میں بھی اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ میری مراد اس کی اعلیٰ ادبی اور علمی خدمات سے ہے جن کا اعتراف بعض ایسے لوگوں نے بھی کیا ہے جو کسی اچھے کام کو سراہنا اپنے لئے کسرِ شان سمجھتے ہیں۔

قیامِ پاکستان سے پہلے ہمارے ادبی رسالے اپنے عروج پر تھے۔ ہم میں سے بیشتر حضرات کو یاد ہو گا کہ اس زمانے میں عصمت، نگار، ہمایوں، نیرنگِ خیال، عالمگیر، خیالستان، نیرنگ، سب رس، ادبِ لطیف، ادبی دنیا، شاہکار، سویرا اور ساقی شائع ہوتے تھے۔ ان سب رسالوں نے اردو ادب کو ترقی دینے میں معتد بہ حصہ لیا اور سینکڑوں نئے ادیبوں اور شاعروں کو روشناس کرایا۔ مگر تقسیمِ ملک کے وقت جو افراتفری ہوئی اس کی لپیٹ میں ہمارے کئی رسالے آ گئے۔ ادب کے لئے ناسازگار حالات نے ادبی رسالوں کا دھڑ توڑ دیا۔ جو سخت جان تھے سسک سسک کر جیتے رہے مگر ؎

یہ جینا ہے، یہ کوئی زندگی ہے؟

لیکن یہ ادبی رسالوں کے ایڈیٹر بڑے من چلے ہوتے ہیں۔ اپنا رسالہ جاری رکھنے کے لئے تن، من، دھن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہیں لاہور میں ایک بزرگ مدیر ہیں جنھوں نے طے کر لیا ہے کہ اپنا سارا اثاث البیت اپنے رسالے پر لگا دیں گے۔ مگر کون ہے جو ان کے اس جنونِ خدمت

کی قدر کرے؟ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ایک اور بہت پُرانے اڈیٹر ہیں جن کے رسالے نے اب سے چالیس سال پہلے دھوم مچا رکھی تھی، اب بھی اپنا وہی رسالہ شایع کرتے ہیں اور جو کچھ اِدھر اُدھر سے کماتے ہیں رسالے پر لگا دیتے ہیں۔ عمر ستر سے تجاوز کر گئی ہے۔ ایک آنکھ کی بصارت زائل ہو گئی ہے، صحت کو ذیابیطس کا گھن لگ گیا ہے مگر رسالہ کو نہیں چھوڑتے، یا شاید رسالہ انھیں نہیں چھوڑتا۔ بعض دفعہ یہی تو ہوتا ہے نا کہ کمبل آدمی کو نہیں چھوڑتا۔

ہاں تو تقسیمِ ملک کے بعد ادبی رسالوں پر یہی پھیری وقت پڑا تھا کہ اسی شہر کے ایک جیالے سپوت محمد طفیل نے نقوش کے نام سے ایک ادبی رسالہ نکال دیا اور اس شان سے نکالا کہ بے اختیار اس کے لئے درازیٔ عمر کی دعا دل سے نکلی۔ ان محمد طفیل کا نام اس سے پہلے کبھی نہیں سُنا تھا۔ معلوم ہوا کہ لاہور کے اور سینکڑوں چھوٹے ناشروں کی طرح ان کا بھی ایک ادارہ فروغِ اُردو ہے۔ نقوش کی ادارت میں احمد ندیم قاسمی کا نام درج تھا۔ ان کا نام ہی اس کی کافی ضمانت تھا کہ اس رسالے میں کوئی دوسرے درجے کی چیز شائع نہ ہو سکے گی۔ مگر جو کرشمہ دامنِ دل کو پہلی نظر میں اپنی طرف کھینچ لیتا تھا وہ تھا اس کا ظاہری رُوپ۔ صاف ستھری کتابت و طباعت جو آنکھوں میں کھبی جاتی۔ سرورق سادہ و پُرکار جس کے رنگوں کے امتزاج سے خوش ذوقی ٹپکتی تھی۔ غرض نقوش کی ظاہری اور باطنی خوبیوں نے ایک ہی جست میں اسے صفِ اوّل میں پہنچا دیا۔

طفیل صاحب نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا کہ ایسے ناگفتہ بہ معاشی حالات میں ایک عمدہ ادبی رسالہ جاری کر دیا۔ اندیشہ یہی تھا کہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے کے بعد ہی ہمیں شاید یہ کہنا پڑے گا کہ ؎

خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود

مگر شکر ہے کہ ہمارا اندیشہ غلط نکلا اور نقوش دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ پھر ایکا ایکی اسے ایک جھٹکا لگا۔ احمد ندیم قاسمی بعض وجوہ کی بنا پر اس کی ادارت سے علیحدہ ہو گئے۔ ان کی جگہ ادیب شہیر سید وقار عظیم کو سونپ دی گئی۔ پاکستان کی جلد سے جلد بدلنے والی حکومتوں کی طرح اُسی زمانے میں نقوش کی ادارتیں بھی بدلتی رہیں۔ یہاں تک کہ خود محمد طفیل صاحب نے نقوش کی ادارت سنبھال لی۔ ادارتی تبدیلیوں سے نقوش کی آن بان میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ ضخیم خاص نمبر اچھوتے موضوعات پر شائع کر کے نقوش تمام ادبی رسالوں سے بازی لے گیا۔ افسانہ نمبروں کے علاوہ غزل نمبر، شخصیات نمبر

منٹو نمبر، پطرس نمبر، مکتوبات نمبر، ادب عالیہ نمبر اور لاہور نمبر جیسے نمبر شائع کر کے طفیل صاحب نے اپنی دھاک بٹھا دی کہ آن کا اس میدان میں کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔ پطرس مرحوم کا فقرہ نقوش کے ہر نمبر پر اُد بدا کر یاد آتا ہے کہ ان کا ہر پرچہ ایک خاص نمبر ہوتا ہے' اور عام نمبر خاص خاص موقعوں پر شائع ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے ایک اور دوست غلام عباس کا فقرہ بھی اکثر یاد آتا ہے کہ نقوش مٹاپے کا مریض ہو گیا ہے۔ جب اور سارے ادبی رسالے سوکھے کے مریض ہو گئے ہیں تو نقوش کا مٹاپے کا مریض ہو جانا

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

نقوش کی تمام تر ترقی اس کے مالک و مدیر محمد طفیل صاحب کی مرہونِ منت ہے۔ کام کرنے کے معاملے میں وہ جن ہیں۔ اتنی محنت ہم جیسے دو چار ایڈیٹروں سے مل کر بھی نہیں ہو سکتی۔ انہیں بس ایک ہی دھن ہے کہ نقوش زندہ رہے قوت و توانائی کے ساتھ اور اردو ادب کا بول بالا کرنے کے لئے نت نئے خاص نمبر شائع کرتا رہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ صد شمارہ تقریب ہے جس میں "آپ بیتی نمبر" پیش کیا جا رہا ہے۔ اس خاص نمبر کی دستاویزی اور افادی حیثیت اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ ہم سب کو جناب طفیل کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے تنہا وہ کام کیا ہے جو ہمارے حکومت سے بڑی بڑی امدادی رقمیں پانے والے اردو کے ترقیاتی ادارے انجام نہ دے سکے۔

انجمن ادبی رسائل پاکستان کو اس پر فخر ہے کہ نقوش کی صد شمارہ تقریب کا اہتمام اس انجمن نے کیا۔ میں انجمن کے تمام ممبروں کی طرف سے آپ حضرات کی شرکت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ حضرات کی کرم فرمائی سے ہماری عزت افزائی ہوئی۔

شاہد احمد دہلوی

سیکرٹری جنرل، انجمن ادبی رسائل پاکستان

عادل رشید

جناب صدر، معزز خواتین و حضرات!

میں انجمن ادبی رسائل پاکستان کا انتہائی ممنون ہوں کہ اس نے مجھے یہ خوشگوار لمحہ عطا فرمایا ہے کہ میں آپ جیسی معزز اور ادب نواز ہستیوں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے خیالات و جذبات

کا مختصر طور پر اظہار کر سکوں۔

میرے لئے انجمن ادبی رسائل پاکستان کی یہ پُرخلوص دعوت اس بات کا واضح اور کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ادیب ہمیشہ ایک ہوتے ہیں۔ خواہ اُن کا تعلق کسی مُلک، کسی قوم اور کسی نسل سے کیوں نہ ہو۔

ادب خواہ وہ کسی ملک، کسی قوم اور کسی زبان کا ادب کیوں نہ ہو ادب ہوتا ہے اور وہ انسانیت، بھائی چارہ، دوستی، پیار اور اخلاق کی تعلیم ہمیں دیتا ہے۔ اور ادب ہمیں وہ سب کچھ عطا کرتا ہے جو بھلا ہوتا ہے اور بُرا ہرگز نہیں ہوتا۔

انجمن ادبی رسائل پاکستان یقینی طور پر قابلِ ستائش و قابلِ مبارکباد ہے کہ اُس نے اپنے ملک کے ادبی رسائل کی دشواریوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اپنے مُلک کے ادبی رسائل کی دشواریوں اور مشکلات کو اپنی حکومت کے سامنے رکھے اور اپنی حکومت سے اپیل کی کہ وہ ادبی رسائل کے لئے وہ ذرایع پیدا کرے، جس سے کہ وہ پُروقار بنیں اور ادب کی خدمت کے لئے ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں۔

"نقوش" آپ کے ملک کا ایک ایسا ادبی جریدہ ہے جس نے اپنی زندگی کی سیڑھیاں بڑی آب و تاب اور شان و شوکت کے ساتھ طے کر لی ہیں اور آج ہم سب انجمن ادبی رسایل کی قیادت میں "نقوش" کو اس کی اس کامیابی لو ترقی پر کہ اُس نے اپنے سو شماروں کے ذریعہ ادب کی بیش از بیش خدمات انجام دی ہیں دلی مبارکباد دینے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

"نقوش" یقینی طور پر ایک ایسا ادبی ماہنامہ ہے جسے اس کی ادبی خدمات کے صلے میں یہ اعزاز ملنا چاہئے تھا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آج اُسے اس کا یہ اعزاز مل رہا ہے۔

توانا اور زندہ قومیں وہ ہوتی ہیں جن کا ادب معیاری ہو اور جو اپنے ادب کو ٹھوس صلاحیتوں کا مالک بنا سکیں۔

میں ذاتی طور پر ہمیشہ کسی ملک اور کسی قوم کی بلندی اور برتری کو اس کے ادب کے ذریعہ جانچتا اور پرکھتا ہوں۔

آپ کے ملک پاکستان کا ادب یقینی طور پر معیاری، صاف ستھرا اور پُروقار ہے۔ آپ کے ملک سے ایسے ایسے ادبی ماہنامے شایع ہوتے ہیں، جنہیں دیکھ کر ہمیں رشک آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دلی خوشی بھی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ہماری زبان اُردو کے ہوتے ہیں جنہیں ہم ہمیشہ اُردو

ادب کے رسائل ہی کہوں گا۔ اور آپ بھی اُردو ادب کو اُردو ادب ہی کہیے۔ آپ اس ادب کو پاکستانی ادب کا خطاب دے کر اسے پاکستانی اور ہندوستانی ادب کے دو خانوں میں نہ بانٹیے۔ اسے اُردو ادب ہی رہنے دیجیے۔ اُردو ادب اُردو ادب ہے۔ وہ پاکستانی ادب یا ہندوستانی ادب کبھی نہیں بن سکتا۔

آپ کا ملک معیاری اور خوبصورت اخبارات و رسایل کا گہوارہ ہے۔ کوشش کیجیے کہ آپ کے ملک کے یہ اخبارات و رسایل اخوت، بھائی چارہ اور انسان دوستی کے عَلم کو اور مضبوطی کے ساتھ لے کر اس انداز سے آگے بڑھیں کہ ساری دنیا کے انسانوں کو اس سے فائدہ پہنچے اور وہ اپنے سارے اختلافات بھول کر ایک دوسرے سے گلے مل جائیں۔

میں ذاتی طور پر آپ کی حکومت کو بھی خراجِ عقیدت پیش کروں گا جو اپنے ملک کے ادبی رسایل، اپنے ملک کے ادب اور اپنے ملک کے ادیبوں کی سرپرستی اور رہنمائی فرماتی ہے اور انہیں پھولنے پھلنے اور ترقی کرنے کے مواقع بہم پہنچاتی رہتی ہے۔

یقیناً وہ حکومتیں قابلِ صد رشک ہیں اور قابلِ تعریف ہیں جو اپنے ملک کے ادب کو آگے بڑھانے اور اسے تابندگی بخشتے ہیں اپنے یہاں کے ادبی قافلوں کی رہنمائی فرماتی ہیں اور انہیں ادب کے آسمانوں کو چھو لینے میں عملی طور پر مدد دیتی ہیں۔

میں اپنے ملک کے ایک اُردو ادیب کی حیثیت سے "نقوش" اور "ادارۂ نقوش" کو ان کی اس کامیابی اور ان کی اس توانائی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ میری یہ دلی مبارکباد جو کہ "نقوش" کے لیے ہے، محض میری ہی مبارکباد نہیں ہے بلکہ اس میں میرے ملک کے سارے اُردو کے ادیب شامل ہیں۔

سب سے آخر میں، میں اپنے اور اپنے ملک کے تمام اُردو ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے "نقوش" کے مدیرِ محترم جناب طفیل صاحب کی خدمت میں، اُن کی ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ایک ناچیز تحفہ پیش کرنے کی بیحد خوشی حاصل کر رہا ہوں۔

یہ تحفہ بھی ادیبوں کی طرف سے، ایک معیاری ماہنامہ کے مدیر کے لیے ہے اور ادیبوں کے پاس سوائے قلم کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ادب کے ایک نگران اور محافظ کو ہم ہندوستانی ادیبوں کا یہ تحفہ مبارک ہو۔

اگر جناب طفیل صاحب نے ہم ادیبوں کا یہ تحفہ قبول فرمایا تو ہم اسے اپنی سب سے بڑی

خوش قسمتی اور کامیابی سمجھیں گے۔

خدا حافظ۔ السلام علیکم

عادل رشید

حفیظ جالندھری

صاحب صدر! معزز خواتین، میرے دوستو اور بزرگو!

تقریریں ہوئیں۔ میں نے بھی سنیں اور جو مقصد ان تقریروں کا تھا، اسے بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ میرا نام آپ بیتی میں لکھا گیا ہے۔ اس لئے ایک بیتی میں نے بھی لکھ کر اس آپ بیتیوں کے سمندر (نقوش) میں ڈال دی ہے۔ اسے آپ پڑھ لیں۔

سوانح حیات کا بیان کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے جیسے جناب جوش نے ابھی ایک بیتی بیان کی ہے۔ ہر چند کہ میں اور جوش دو مخالف سمتوں میں ہیں۔ لیکن خیال میں ایک ہیں۔ جب بیتی ایک واقعہ کا نام ہوتا ہے تو بہت سی بیتیوں کا مجموعہ؛ بس مجھے یہی کہنا تھا۔

اب مجھے یہ کہنا ہے کہ مجھ پر طفیل کے ذریعے کیا بیتی۔ طفیل میاں سے زیادہ محنت کرنے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہر طرح سے اور ہر قیمت پر، ہر کسی کو پھانس ہی لیا ہے۔ ایک مرتبہ تو میں غزل نمبر میں پھنس گیا۔ غزل چونکہ میرا فن ہے اور میری اپنی جوانی یا وہ برباد جوانی جو یہاں لاہور میں گزری ـــــ اب میں ان حسرتوں کا کیا ذکر کروں۔ ویسے بھی ان حسرتوں میں کوئی تذکرہ ایسا نہیں جو آپ حضرات کو لذت دے۔ وہ محرومیاں میری ہیں، وہ ناکامیاں میری ہیں۔

انہوں نے ابھی تک نظم نمبر نہیں نکالا۔ وہ لوگ جو غزل کہتے ہیں۔ نظم بھی کہتے ہیں۔ اگر انہوں نے کبھی نظم نمبر نکالا تو میں اپنی نظمیں بھی ان کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

ایک انہوں نے لاہور نمبر نکالا تھا۔ میں نے بھی اپنی نیازمندی کا اظہار، ایک نظم لکھ کر کر دیا تھا۔

پھر انہوں نے سیرت یا صورت نمبر نکالا۔ میری نہ صورت اچھی، نہ سیرت اچھی۔

میں نے آپ بیتی نمبر کے لئے، اپنی بیتیوں میں سے وہ بیتی چنی کہ آپ اسے پڑھ کر حیران ہو جائیں گے کہ اچھا یہ اتنا بڑا شاعر اور اس کے ساتھ یہ بھی بیتی۔ چونکہ شاعری میں کچھ پڑھنے لکھنے کے ساتھ اپنے آپ کو منوانا بھی پڑتا ہے اس لیے مشاعروں میں پڑھنا، سہرے کا موقع ہو تو سہرا پڑھ دینا، غرض

ہر اس موقع سے فائدہ اٹھانا جس سے پبلک کے سامنے آنے کا موقع ملے۔ اس سے ہم شاعر لوگ گریز نہیں کرتے۔

اگر کسی تقریب میں بھانڈوں کو بلایا جائے یا طوائف کو بلائیں تو اس پر زیادہ پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ بھانڈ اور طوائفیں مہنگی ہیں۔ شاعر سستے ہیں۔ تو یہ ہم لوگوں کی کچھ ایسی ہی بیتیاں ہیں۔ ان میں سے ہر بیتی کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مجھ پر بھی یہ بیتی ہے کہ ؎

اپنی شب وصال کا الٹا زمانہ تھا
اوپر دری بچھی اور تلے شامیانہ تھا

حضور! اپنی شب وصال کا الٹا زمانہ تھا — اوپر دری بچھی اور تلے شامیانہ تھا

میری زندگی تو اسی طرح کٹی ہے۔ یوں بڑی لمبی داستان ہے' یہ۔

میں داد دیتا ہوں جناب طفیل کو کہ یہ ایک لڑکا سا ہمارے سامنے آیا تھا۔ تپلا' دبلا' چھریرا' میرا خیال ہے کہ یہ بھی جالندھر[1] کا ہے۔ کیونکہ ایسے ہی ہوتے ہیں جو کچھ کام کرتے ہیں نہ مار بھی کھاتے ہیں۔ مگر کام کرتے ہیں۔ سیالکوٹ سے تو ایک ہی آیا[2] اور اس نے ایسی ضرب لگائی کہ ہم سب سر سہلاتے رہ گئے۔ باقی یو۔پی سے بہت سے استاد آئے۔ وہ ہم سب کے استاد ہیں۔ یہ ہم دل سے مانتے ہیں۔

طفیل چاہے تو یہ ہم سے عالم نزع میں بھی مضمون لکھوا لے۔ اب کے اس نے مجھے ایسے وقت میں پھانسا جب کہ میں ایک نہایت ضروری کام میں مشغول تھا۔ شعر تو کہتا ہوں لیکن وہ نقوش میں نہیں آ سکتے۔ وہ پاکستان کی تعمیر کے متعلق ہیں۔ پنجابی میں اسے راجوں اور ترکھانوں والا کام کہنا چاہیے۔ یعنی وہ کام جس سے تعمیر ہو۔

ہر شاعر اور ادیب اپنے اندر ایسی ایسی آپ بیتیوں کو گم کئے بیٹھا ہے کہ اگر وہ سامنے آ جائیں' تو سب کی سٹی گم ہو جائے۔ اس کے باوجود ہم لوگ ایسی ایسی چیزیں دے جاتے ہیں کہ اس کی یہاں کیا ستائش ہوگی۔ لاکھوں روپے نچھاور کر کے بھی اس کا انعام کوئی نہیں دے سکتا۔ البتہ ہم سب موت کے بعد' پھول چڑھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس فراموش کار زمانہ میں یہی بہت

---

[1] میرا جالندھر سے کوئی واسطہ نہیں۔ جہاں تک میرا یا میرے آباؤ اجداد کا تعلق ہے وہ لاہور ہی کے تھے۔

[2] یہاں حفیظ صاحب کی مراد علامہ اقبال سے ہے۔

سمجھا جائے۔

چونکہ اس کے بعد ایک مشاعرہ ہونے والا ہے۔ اور مجھے اپنے ایک مشن کے سلسلے میں جانا ضروری ہے لہذا اجازت دیجئے کہ میں نے جو چند اشعار اس موقع کے لیئے کہے ہیں، وہ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ آج میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ خاکساری برتنے کے برعکس کچھ کہا ہے۔ یہ شعر تعلّی کے ہیں۔ یعنی اپنا قصیدہ آج پہلی مرتبہ کہا ہے۔ سنیئے ؎

یہ رنگ رنگ کی نغمہ طراز تصویریں — مرے ہی خواب کے نیرنگ کی ہیں تعبیریں
مرا قلم — میرے ایمان و جاں سے ہم آہنگ — دکھا رہا ہے یہ سب جلوہ ہائے رنگا رنگ
یہ صنعتیں جو نقوشِ عمل کی ہیں معمول — ہر ایک میں ہے مرے دل کی دھڑکنوں کا نزول
یہ حسن جو صفحۂ قرطاس پر جو چھایا ہے — مرے حسین خیالات ہی کا سایا ہے
یہ جس سے دنگ ہیں آئینہ ہائے خود بینی — ہے میرے ہاتھ کی تخلیق لعبتِ چینی
ادا و ناز جو حوروں سے بھی رہے پنہاں — مری نگاہ تصور نے کر دیئے ہیں عیاں
نقوشِ سادہ و پرکار ہر زمانے کے — ہیں شاہکار مرے ہی نگار خانے کے
حیا و شرم کا ہر پیکر جمال و جلال — عطائے مصطفوی سے ہے آج میرا کمال
جو اہلِ قلب ہیں سب اس پہ صاد رکھیں گے — تمام اہلِ نظر مجھ کو یاد رکھیں گے
مجھے یقین ہے کہ ذوقِ عمل کے نقوش اعلیٰ — پڑھیں گے فرطِ خوشی سے حفیظ کے اشعار

جو کور ذوق ہیں فرمائیں گے تعلّی ہے
مگر نقوش کہے گا۔ یہی تجلّی ہے

شمس اللہ نعمتی

(نمائندۂ سفارتِ ایران)

قبل از این کہ بہ مطالب مربوط بپردازم، اجازہ بفرمائید از جناب آقای یاسین وٹو، وزیر معظم فرہنگ پاکستان غربی کہ ریاست این جلسہ را بہ عہدہ دارند و از مہمانان محترم و ہمچنین از جناب آقای محمد طفیل، مدیر و سرپرست مجلۂ نقوش، تشکر و امتنان نمایم کہ در این جلسہ حضور نمایندہ خانۂ فرہنگی ایران را دعوت فرمودہ مفتخر ساختہ اند۔

فقط سہ روز پیش از طرف جناب آقای محمد طفیل اطلاع دادہ شد کہ چنین جلسہ ای بمناسبت

افتتاح شمارهٔ اختصاصی مجله مزبور تشکیل خواهد یافت واینکه سخنرانی نماینده خانهٔ فرهنگی ایران نیز جزو آن برنامه است۔ موضوع سخنرانی توضیحاتی چند درباره تشریک و مجلات ادبی ایران قرار گرفت۔ البته این یک امر بسیار مشکل بود۔ زیرا که در ظرف دو یا سه روز ممکن نبود که اقدام مناسب تری در این مورد بعمل آورد۔ در هر حال، اطلاعاتی که اختصاراً درباره روزنامه مجلات ایران تهیه گردیده به عرض میرسد۔

تعداد روزنامه‌ها و مجلاتی که اکنون در ایران منتشر میشود اگر از یک هزار تجاوز نکرده باشد کمتر هم نیست۔ مشهورترین این جرائد عبارتند از: اطلاعات روزانه، اطلاعات هفتگی، اطلاعات ماهانه، اطلاعات بانوان، اطلاعات جوانان، اطلاعات کودکان، تهران جورنال (انگلیسی)، ژورنال دو تهران (فرانسه) اطلاعات (عربی)، کیهان روزانه، کیهان هفتگی، کتاب ماه کیهان، کیهان ورزشی، کیهان بچه‌ها، کیهان ژورنال (انگلیسی) و علاوه بر روزنامه‌های مستقل، خدنگ، اقدام، طلوع، پارس وغیره، مجلات سپید و سیاه، روشنفکر، تهران مصور، خواندنیها، و مجلات معروف ادبی مانند سخن۔ یغما، ارمغان، راهنمای کتاب، اندیشه و هنر، مجله دانشکدهٔ ادبیات تهران، مجله دانشکدهٔ ادبیات تبریز، مجله دانشکدهٔ اصفهان، و مجلات علمی و ادبی و فرهنگی دیگر نیز پخش میشود که اغلب آنها در پیشرفت زبان و ادبیات فارسی و فرهنگ ایران خدمات بزرگ و نمایانی انجام داده و می دهند۔ ایران مخصوصاً به سرپرستی و راهنمائی شاهنشاه جلیل و ادب دوست اعلیحضرت همایون، محمد رضا شاه پهلوی۔ پیشرفت نمایانی در فرهنگ و ادبیات زبان فارسی کرده و این پیشرفت با وسایل بیشتر و جدید و با فزایش روز بروز ادامه دارد۔

درباره مجلهٔ نقوش، حضار محترم این جلسه اطلاعات بیشتری دارند و از بنده بهتر می دانند که این مجله در ظرف پانزده سال انتشار خود به چه مقام نائل گردیده و چگونه خدمات شایسته و با ارزشی به زبان و ادبیات اردو انجام داده است۔ شماره‌های اختصاصی این مجله از هر حیث بی مانند بوده است و امید است که شمارهٔ مخصوص مجلهٔ نقوش که دارای شرح احوال بزرگان و معاریف معاصر جهان است به عنوان یک صحیفهٔ تاریخی محفوظ و مورد استفادهٔ علاقمندان و ادب دوستان قرار گیرد۔ در تنظیم و ترتیب این مجله و جمع آوری شرح احوال بزرگان و معاریف جهان، مساعی جناب آقای محمد طفیل قابل تمجید و توصیف است۔ بنده از طرف خانهٔ فرهنگی ایران خدمت آقای محمد طفیل هدیهٔ تبریک و تشکر تقدیم میکنم۔

(شمس الله نعمتی)

مُدیرِ نقوش

صاحبِ صدر، دوستو، بہنو اور ——— اور بیگم صاحبہ!

اللہ کی اِس دُنیا میں سبھی طرح کے لوگ ہیں۔ ایک سے ایک جی ٹی ایس، ایک سے ایک علامہ، ایک سے ایک بقراط!

پھر ان لوگوں کی بھی قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو صرف باتیں کر کر کے اپنے آپ کو علامہ اور بقراط منوا لیتی ہے اور ایک قسم وہ ہے جو سر جھکائے، مخالفتوں کے تیر، اپنے دل و دماغ پر روکتے ہوئے کچھ نہ کچھ کر گزرتے ہیں۔

مَیں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میرا شمار صرف باتیں کرنے والوں میں ہو۔

مَیں ابھی اپنے ایک دوست کے ساتھ باہر گیا تھا۔ ایک بڑے معقول قسم کے افسر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے جانچتے ہوئے کہا ——— "مَیں آپ سے بڑا متاثر تھا۔ مگر آپ کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی ——— باتیں بھی آپ کی متاثر کرنے والی نہیں ——— پھر آپ کی پرسنیلٹی[1] بھی کچھ نہیں کچھ داڑھی ہوتی، کچھ سوٹے تازے ہوتے، کچھ عمر رسیدہ ہوتے ——— وغیرہ وغیرہ! ——— اُن کے ان ریمارکس پر مَیں بہت ہنسا، اللہ سے شکوہ بھی کیا کہ جہاں تُو نے اتنا کچھ دے رکھا ہے۔ وہاں تھوڑی سی پرسنیلٹی بھی دے دیتا تو تیرا کیا بگڑتا۔ مگر ساتھ ہی شکر بھی ادا کیا کہ میرا شمار کبھی بھی باتیں کرنے والوں میں نہ ہو گا۔

جناب! مَیں تو آج باتیں سننے آیا ہوں۔ سنانے نہیں آیا۔ اس لئے کہ مَیں نے ایک طرح سے آپ سے بہت باتیں کی ہیں۔ غزل کی زبان میں، مَیں نے باتیں کیں، افسانوی رنگ میں، مَیں نے باتیں کیں۔ خطوط کی شکل میں، مَیں نے باتیں کیں۔ شخصیات کی آڑ میں، مَیں نے باتیں کیں ——— ——— طنز و مزاح کا لبادہ مَیں نے اوڑھا۔ اپنی جنم بھومی لاہور کے بارے میں سلسلے اتنے پتے میں نے دیئے۔ اب دوسروں کی آپ بیتیوں کے پس پردہ، اپنی بھی آپ بیتی لکھ دی ہے۔ غرض مَیں نے آپ سے باتیں کرنے کی ہر صورت کو اختیار کیا۔ اگر مَیں آپ سے باتیں کرنے کے اتنے انداز اختیار نہ کرتا تو آج آپ مجھ سے اتنے واقف نہ ہوتے۔ اتنے قریب نہ ہوتے۔

---

[1] PERSONALITY

میں اپنی زندگی کے اُن لمحات کو بڑا قیمتی جانتا ہوں جو ادب کی خدمت کے سلسلے میں قدرت مجھ سے وصول کرتی ہے۔ یقین کیجئے۔ میں نے آج تک جو کچھ بھی کیا۔ یا مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکا۔ اُس کے بارے میں اپنے آپ کو داد کا مستحق نہیں سمجھتا۔ بلکہ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اور طاقت ہے جو مجھ سے یہ کام لے رہی ہے۔

اپنے ذہنی رُخ کی نشاندہی کے سلسلے میں، میں نے اسی پرچے میں لکھا ہے:-

میں نے چیونٹیوں کو دیکھا کہ وہ ایک قطار میں، ایک دوسرے کے پیچھے چلی جا رہی ہیں اور چلی ہی جا رہی ہیں۔ یوں قطار میں چلنے والی چیونٹیوں سے مجھے کبھی بھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی بلکہ اُن اکّا دکّا چیونٹیوں سے دلچسپی رہی۔ جو قطار سے الگ، مخالف سمت چلی جا رہی ہوں۔

میں نے اپنی ادارتی ذمہ داریوں کے باب میں قطار میں چلنے والی چیونٹیوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اُن اکّا دکّا، اور اس پریشان اگر حالات سے نبرد آزما ہونے والی چیونٹیوں کا ساتھ دیا جو انجام سے بے خبر ہوں تو ہوں مگر اس بات سے بے خبر نہیں کہ نئی منزلوں کا سراغ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ نا معلوم وادیوں کا رُخ کیا جائے۔

واقعی اللہ کی اس دنیا میں، سبھی قسم کے لوگ ہیں۔ جی۔ پی۔ ایس بھی، علامہ بھی، بقراط بھی اور مجھ ایسے پاگل بھی!

اب میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ اپنے پاگل پن کا ایک اور ثبوت وزیرِ معارف کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

محمد طفیل

محمد یٰسین وٹو، وزیر تعلیم مغربی پاکستان

جناب طفیل صاحب، انجمن کے عہدے دار صاحبان، خواتین و حضرات۔

اہلِ قلم، اہلِ علم، اہلِ فکر، اہلِ نظر بلکہ صاف لفظوں میں یہ کہ اہلِ اہمیت لوگوں کی محفل میں اگر کسے خوشی نہ ہوگی۔ مجھے بھی اسی حیثیت سے یہاں آکر خوشی ہوئی۔

یہاں آتے ہی ذہن نے ایک سوال کر دیا وہ کئی لمحات کے لئے میرے لئے الجھن کا باعث بنا، کہ یہاں جہاں سبھی اہل لوگ موجود ہیں۔ جہاں اہلِ قلم ہیں، اہلِ علم ہیں، اہلِ فکر ہیں، اہلِ نظر ہیں۔ وہاں تم کس اہلیت کی بنا پر آگئے۔ پہلا جواب ذہن میں یہ آیا کہ شاید اہلِ وزارت کی حیثیت سے، مگر تھوڑی دیر

کے بعد یہاں آ کے میری فکر نے بھی کچھ کام کیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ نہیں اہلِ جرأت کی حیثیت سے، اس لیے کہ اتنے عالموں، اتنے فاضلوں اور اتنے اہلِ فن حضرات کے پاس آ کر اور پھر ایسی تقریب میں آ کر جہاں یہ تحریر ہو کہ "خطبۂ صدارت، فلاں شخص کر دیتا ہے"۔ جو ان ساری اہلیتوں سے خود کو اس حیثیت سے نااہل پاتا ہے کہ وہ سوچ اور فکر کے میدان میں ان کے مقابلے میں جا کر کھڑا ہو سکے کہ جس میدان میں ان لوگوں نے زندگیاں کھپائی ہیں اور جو میدان اتنے عظیم اور اتنے اہم ہیں کہ جن کے مقابلے میں دنیا کی کوئی اور چیز نہیں لائی جا سکتی۔

مجھے ایسی تقاریب پر اکثر ایک گلہ بلکہ منتظمین سے شکوہ رہا ہے کہ مجھے تقریر کرنے کا موقع اُس وقت دیا جاتا ہے جب آنا وقت صرف کیا جا چکا ہوتا ہے کہ سامعین کسی لمبی تقریر کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے مگر آج مجھے کچھ اُس شکوے کے لیے شکوہ نہیں۔ اگرچہ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ بے شک یہ مجلس اور یہ محفل اس سے بھی لمبی ہو جاتی اور مجھے اس سے بھی تھوڑا وقت ملتا جو مجھے اب اس تقریر کے لیے ملے گا کیونکہ یہاں بہت قیمتی باتیں ہوئیں اور ان لوگوں کی طرف سے جن کو میں بہت قیمتی سمجھتا ہوں۔ اگر میری طرف سے ایسے موقع پر کوئی خاص بات نہ کی جائے تو یقین جانئے کہ آپ کسی محرومی کے بغیر مطمئن طور پر تشریف لے جا سکیں گے۔

خواتین و حضرات! کل ہی اسمبلی کے ایر کنڈیشنڈ ہال سے باہر نکلتے ہوئے میں ایک خواہ مخواہ قسم کی سوچ میں پڑ گیا کہ انسان نے کتنی کتنی عظیم ایجادات کی ہیں۔ مگر ان سب میں بڑی ایجاد کیا ہے؟ اور پھر جب میں اپنے دفتر کے کمرے میں گیا تو میں کبھی حیدر آباد ٹیلیفون کر رہا تھا، کبھی پشاور بات کر رہا تھا اور کبھی لاہور کے ہی دفتر میں بیٹھے ہوئے کسی دوست سے گفتگو کر رہا تھا تو وہ سوال میرے ذہن میں اور اُبھر آیا اور پھر یہ سوال کچھ یوں سوار ہو گیا کہ پھر ہر بات پر اُبھرتا رہا۔ جب میں نے بجلی کے قمقموں کو دیکھا تو اس سوال نے پھر مجھے پکارا کہ جواب دو کہ سب سے زیادہ اہم ایجاد انسان نے کیا کی ہے۔ میں خاصے عرصے تک اس سوال کے بارے میں سوچتا رہا اور آج جب میں آپ حضرات کی محفل میں آنے ہی والا تھا کہ میرے ذہن نے یہ جواب دیا ہے اور اس سے میں مطمئن ہوا ہوں کہ انسان کی سب سے بڑی ایجاد "قلم" ہے۔ اس لیے کہ اگر قلم نہ ہوتا اور اگر انسان قلم ایجاد نہ کر لیتا تو آج انسان کی زندگی کتنی ایجادوں سے محروم ہوتی اور اگر انسان اپنی فکر کے نتائج کو اس ایجاد کے ذریعے انسان کی مستقل میراث نہ بنا دیتا تو زندگی کتنی غریب ہوتی۔ کتنی کم مایہ ہوتی۔ اس سوچ نے مجھے یقین سا دلا دیا ہے کہ شاید میرا جواب درست ہے اور مجھے اُمید

ہے کہ اہلِ قلم حضرات بھی اس بات سے متفق ہوں گے کہ میرا یہ جواب ایجاداتِ انسانی کے بارے میں درست ہے۔

جو باتیں بھی دنیا میں سوچی جاتی ہیں، جو باتیں بھی دنیا میں کہی جاتی ہیں اُن باتوں کے سوچنے کا، ان باتوں کے کہنے کا، وہ اثر کبھی نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ اُن سوچی ہوئی باتوں کے پھولوں کو قلم کے سپرد کر کے اُسے ایسی مستقل حیثیت نہیں دے دیتے کہ جب جو چاہے آپ کے فکر کے موتیوں سے استفادہ کر لے۔ اُس وقت تک فکری ارتقا کا سلسلہ نہیں چلتا اور وہ باتیں جو آج یہاں کہی جائیں گی وہ کچھ عرصے کے بعد کسی کو یاد نہیں رہیں گی۔ دنیا میں کتنے بڑے لوگ ہوئے ہوں گے۔ دنیا میں کتنے لوگوں نے کتنی عظیم باتیں کہی ہوں گی۔ لیکن جن عظیم باتوں کو، جن عظیم کارناموں کو، جن عظیم انسانوں کو، جن عظیم واقعات کو، عظیم قلم نہیں ملے وہ باتیں عظمت کے بلند میناروں سے نیچے گر گئیں۔ ایسی بھی ان گنت باتیں ہوں گی جن باتوں کو آپ نہیں جانتے، میں نہیں جانتا اور شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس لئے کہ قلم کا منہ ان کے بارے میں خاموش رہا۔ میں نے دیہات میں متعدد ایسی خواتین و حضرات کو دیکھا ہے اور ایسے بھی اَن پڑھ بھائیوں سے ملا ہوں جن کی باتیں کوئی نہیں لکھے گا مگر ان کی باتیں یقیناً جلی لکھے کہ سنہری الفاظ میں لکھنے والی ہیں کیونکہ سوچنا کسی کی میراث نہیں۔ فکر کسی کی میراث نہیں۔

حضرات میں اکثر اس بات کو یاد کرتا ہوں کہ میرے ایک پروفیسر نے ایک زمانے میں مجھے یہ حکم دیا تھا کہ "تم لکھتے رہنا" مجھے افسوس ہے کہ میں اُن کا نااہل شاگرد ثابت ہوا کہ میں اس میدان میں بالکل کورا رہ گیا۔ مگر اس کے باوجود کہ میں اپنے خیالات کو لکھ نہیں سکا اور نہ ہی زیادہ وقت ان علمی، ادبی محفلوں میں گزار سکا جن سے آپ ہر روز محظوظ ہوتے ہیں، لطف اٹھاتے ہیں، علم حاصل کرتے ہیں۔ پھر بھی میں نے ان نقوش کو ہمیشہ پڑھنے کی کوشش کی ہے جو نقوش ہمارے سامنے آج کے رسالے نقوش سے کہیں بڑی بڑی کتابوں کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں جن کا ایک ایک تاثر، ایک ایک ادا، ایک ایک بات، ایک ایک ناراضی، ایک ایک خوشی، ایک ایک مطالبہ، اپنی جگہ پر کتنی کتنی کتابیں لئے ہوئے ہے اور جب میں اُن نقوش کو پڑھتا ہوں تو مجھے کئی اور کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے باوجود جب میں وہ باتیں جو ان نقوش سے پڑھوں ان نقوش میں دیکھوں جب تک وہ باتیں صفحۂ قرطاس پر نہ آ جائیں اُن باتوں کا کوئی فائدہ نہیں جو سوچوں گا جو پڑھوں گا اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ اس کا کسی کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کوئی استفادہ نہ کر سکے گا۔

میں طفیل صاحب کے نقوش کا اس لئے مداح ہوں کہ اس نقوش میں اُن نقوش کے متعلق باتیں ہوں گی وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ لوگ جان سکیں گے، لوگ پڑھ سکیں گے۔ میں تو کبھی کبھی یوں سوچتا ہوں کہ سقراط اس لئے عظیم ہے کہ اس کی باتیں قلم کے ذریعے ہم تک پہنچ گئیں۔ دوسرے موجد اس لیئے عظیم ہیں کہ قلم کے ذریعے اُن کی بڑی بڑی باتیں، اچھی اچھی باتیں ہماری میراث بن گئی ہیں۔ ہم اپنے خیالات کو نئے ولولے دے سکتے ہیں، نئے انسپریشن دے سکتے ہیں اور اپنے خیالات کو اُن کی روشنی میں اس حیثیت سے فائدہ پہنچا سکتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کی راہیں متعین کریں۔

میں آج بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وقت کی کمی بار بار احساس دلا رہی ہے کہ جتنا کم کہوں شاید اتنا ہی اچھا ہو مگر طفیل صاحب کے متعلق چند باتیں کہے بغیر بات ختم کر دینا بھی مناسب نہ ہوگا۔

وہ چیونٹی یقیناً قابلِ قدر ہے ایسی چیونٹیوں سے جو ایک ہی راہ پر چل رہی ہیں۔ بغیر سوچے، بغیر سمجھے کہ اُن کی منزل کیا اور کہاں ہے اور بغیر یہ جانے کہ جس طرف وہ جا رہی ہیں وہ کیا پائیں گی کیا کھوئیں گی۔ یقیناً وہ چیونٹی قابلِ قدر ہے جو نئی راہیں تلاش کرتی ہے .... لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ شاید ہر چیونٹی کے لیے علیحدہ راہ تلاش کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ وہ چیونٹیاں یقیناً قابلِ قدر ہیں جو نئی راہیں تلاش کرتی ہیں اس لئے کہ جب وہ جوشِ عمل کے سہارے اُس میدان میں کود پڑتی ہیں تو اس کے بعد وہ کتنی ایسی نئی راہیں، دوسری چیونٹیوں کے لئے تلاش کر لیتی ہیں.....

ان راہوں پر دوسری چیونٹیاں بغیر سوچے سمجھے چل سکتی ہیں اور یوں کئی صدیوں کے لئے، یا ایک لمبے عرصے کے لئے وہی راہیں متعین ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد ایک اور چیونٹی اٹھتی ہے اور وہ بھی ایک اور راہ تلاش کر لیتی ہے اور اس طرح بتدریج ارتقا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

طفیل صاحب نے اس سلسلے میں نئے تجربات کئے ہیں۔ نئے عمل کی راہیں تلاش کی ہیں اور ایسے کام کی ابتدا کی ہے جس سے واقعی ادبی میدان میں بہت فائدہ پہنچا ہے۔ اگرچہ طفیل صاحب سے میری ملاقات آج زندگی میں پہلی مرتبہ ہوئی ہے مگر ان کے نقوش سے میری ملاقات بڑی پرانی ہے اور پھر اُن کی ذات کے متعلق مجھے آج یہاں آنے سے بہت پہلے ایک ایسے دوست سے، جن کی رائے کو میں بہت اہمیت دیتا ہوں، بہت سی معلومات ہوئی تھیں۔ جن پر میں نے انہیں پورا پایا۔ میں ان کے اُن افسردہ دوست سے متفق نہیں ہوں جس نے یہ فرمایا تھا کہ ان کی شخصیت میں کوئی کمی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اُن پر خاص عنایت فرمائی ہے۔ جس طرح انہوں نے اپنے طلوع میں ارشاد فرمایا ہے کہ خداوند تعالیٰ سے بھی ان کا مضمون لکھوانے کا خیال تھا پھر اسکے بعد انھوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انہیں اس معاملے میں بھی کامیابی عطا فرمائی ہے اور ابھی ابھی انہوں نے دعا مانگی تھی کہ خداوند تعالیٰ

اگر انہیں شخصیت کے بارے میں بھی تھوڑا سا حصہ دے دیتا تو وہ کتنی اچھی بات ہوتی۔ میں طفیل صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ نے ان سے شخصیت کے بارے میں بھی بخل نہیں برتا۔ یہاں آکر آپ کو دیکھ کر، آپ کے خلوص کو دیکھ کر یقینی طور پر، میں بھی متأثر ہوا ہوں اور دوسرے دوستوں کی زبانی جو کچھ سنا ہے۔ اس سے بھی بڑی خوشی ہوئی ہے۔

آپ نے جس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ باتیں کرنے والے تو ہزاروں لوگ ہیں، کمی اگر ہے تو کام کرنے والوں کی۔ ہماری سوسائٹی میں ایک ایسی غلط بات رواج پا رہی ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہم نے ایک شخص پر، ایک کام کرنے والے شخص پر اعتراض کر دیا ہے۔ اس لئے ہم اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو گئے ہیں۔ شاید اعتراض کرنا بجائے خود وہ کوئی کام سمجھتے ہیں حالانکہ اعتراض کرنا بجائے خود نہ صرف کام نہیں ہے بلکہ ایک ایسی چیز ہے جو کام کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اور اعتراض کرنے والے کو بھی بے عمل بناتی ہے۔ اعتراضات ہمیشہ کام کرنے والے لوگوں پر ہوئے ہیں۔ مجھے ہمیشہ ہی یہ بات یاد آتی ہے کہ ایک وقت میں سر سید احمد خاں پر کتنے اعتراضات ہوئے تھے کتنی باتیں اس کے خلاف ہوتی تھیں لیکن آج وہ باتیں کسی کو یاد نہیں۔ سر سید بھی یاد ہے، سر سید کا کام بھی یاد ہے اور اعتراض کرنے والوں میں سے کوئی یاد نہیں اور اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات بھی کسی کو یاد نہیں۔ چند سال اور گذر جانے کے بعد صرف سر سید اور صرف سر سید کا کام یاد رہ جائے گا اور اعتراض کرنے والوں کے متعلق دنیا بھول جائے گی۔ صرف آپ جیسے مفکرین کبھی پرانی کتابیں پڑھیں گے تو ان کی بات کر لیا کریں گے۔ ورنہ دنیا میں کام یاد رہتا ہے۔ اعتراض یاد نہیں رہتا۔ آپ نے کام کیا ہے اگر آپ زیادہ باتیں کرنا نہیں جانتے تو میں آپ کا اور بھی زیادہ قائل ہو گیا ہوں کیونکہ زیادہ باتیں کرنے والے لوگ اکثر عمل کے میدان میں کمزور پائے گئے ہیں اور آج دنیا کو ضرورت پہلے ملک کو ضرورت اس بات کی ہے کہ کام کرنے والے لوگ میسر آئیں۔

میں تھوڑا سا وقت آپ کا اس سلسلے میں اور لوں گا کہ مفکرین کے بارے میں اہل قلم کے بارے میں، میں کیا خیالات رکھتا ہوں۔ میرے خیال میں مفکرین اور اہل قلم وہ لوگ ہیں، چاہے وہ کسی زبان میں لکھتے ہوں، کسی ملک میں رہتے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فکر کی بلندی کی وجہ سے ساری انسانیت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ جیسا کہ عادل رشید صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ کسی ملک کے حالات کا اور اس کی عظمت کا جائزہ اس ملک کے ادب سے لیتے ہیں۔ یقیناً مفکرین کی سوچ کی جو عظمت ہے وہ انسانیت کی بلندی کے لئے بھی نہ صرف اہم ہے بلکہ ایک پیمانہ بھی ہے۔ یہ ایک ایسا منصب ہے جس کے

لئے آپ کی ذمہ داریاں باقی انسانوں سے بڑھ جاتی ہیں کیونکہ جتنا بڑا کام کسی شخص کے سپرد ہوتا ہے، اتنی ہی بڑی ذمہ داری اس سے وابستہ ہوتی ہے۔ آپ جو چاہیں گے جس طرح سوچیں گے، اس کے مطابق ملک کو قوم کو اور پوری انسانیت کو ویسی سوچ دیں گے اس لئے جس طرح علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ اگر ہمیں کوئی نئی راہ اختیار کرنی ہو، کسی کام کی ابتدا کرنی ہو، کوئی خاص رنگ کسی خاص سوسائٹی میں لانا ہو تو اس کے لئے آپ کو کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کے ذہنوں کو بدلنے کی ضرورت ہے جیسے کہ فرمایا ہے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اور افکارِ تازہ آپ مفکر لوگ پیدا کر سکتے ہیں اور اس کے لئے آپ پر بے پناہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

میرے دوستوں نے حکومت اور ادیبوں کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرمایا۔ آپ میرے ساتھ اس بات میں متفق ہوں گے کہ ہمارے محبوب صدر نے جب سے حکومت سنبھالی ہے انہوں نے ادیبوں کو کہیں نظر انداز نہیں کیا بلکہ ہمارے معاشرے میں اس وقت جو مقام ادیب کو حاصل ہے وہ اس سے پہلے (آزادی کے بعد) کبھی حاصل نہیں رہا۔ آج کا صدر ایوب کا پیغام بھی اس بات کا شاہد ہے اور پھر ان سب باتوں سے بڑھ کر میرے دوست جنہیں اب میں دوست کہنے کا حق حاصل کر رہا ہوں اگرچہ آج پہلی ملاقات ہے ان کے ارشادات بھی آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ میری مراد طفیل صاحب سے ہے جنہوں نے یہ فرمایا ہے کہ:

"اب میں اپنے ملک کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود میری درخواست کی آبرو رکھی اور یوں عملی تعاون فرما کر اس نمبر کی قدر و قیمت بڑھائی۔ یہ فخر بھی شاید کسی رسالے کو حاصل نہیں ہوا کہ خود انہوں نے کسی رسالے کو اپنا مضمون مرحمت فرمایا ہو۔ اہلِ قلم کے ساتھ جو ان کا واسطہ ہے، وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔"

ہماری اپنی حکومت اور ہمارے اپنے صدر ایوب کا یہ احساس ہے کہ اہلِ قلم کی اور اہلِ فکر کی سوسائٹی میں اور ملک میں کیا اہمیت ہے۔ یہی وہ احساس ہے جس کی بنا پر وہ ہمیشہ مفکرین اہلِ قلم اور ادیبوں کو اہمیت دیتے ہیں اور جہاں کہیں ممکن ہو گا (انشاء اللہ) حکومت ہر میدان میں آپ حضرات کے ساتھ تعاون کرتی رہے گی۔

اب مجھے آپ کے رسالوں کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے کہ ایسے ادبی رسالوں کی جو ہماری

سوسائٹی میں ہمارے ادب میں اہمیت رکھتے ہیں اُن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف حکومت کا، بلکہ معاشرے کے ہر پڑھے لکھے فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے رسالوں کو جو معیاری رسالے ہیں ہر دلعزیز بھی بنائیں اور جہاں کہیں ممکن ہو وہ انہیں لائبریریوں میں، اور جہاں کہیں اُن کی دسترس ہو اُن کو خرید کر وہاں پہنچائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُن سے استفادہ کر سکیں۔ ہمارے ہاں اُردو میں اچھے لٹریچر کی اشد ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے عمدہ اور معیاری رسائل ہمارے ادب اور معاشرے کی نہایت بیش قیمت خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ایسے رسائل کی حوصلہ افزائی کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ہمارے تعلیمی ادارے اس قسم کے رسائل کو باقاعدگی سے منگوا کر طلبا میں ان کے مطالعہ کا شوق پیدا کریں، تو اس سے نہ صرف طلبا اور طالبات کو ایسا لٹریچر میسر ہوگا جو ان کی شخصیت اور سیرت کی تشکیل میں ممد ہوگا بلکہ اس سے رسائل اور جرائد کو بھی اپنے معیار بلند کرنے کا موقع ملے گا۔ ہماری یہ پوری کوشش ہوگی کہ ایسے رسائل تعلیمی اداروں میں لگائے جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے مناسب لائحہ عمل پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔

خواتین و حضرات!

میں اب یہ سمجھتا ہوں کہ وقت اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ آپ حضرات کو اور کچھ عرصہ کے لیے یہاں بٹھائے رکھنا زیادتی ہے جب کہ آپ چائے کا بھی انتظار فرما رہے ہوں گے پھر اس کے بعد اس شاعرانہ محفل کا بھی بے تابی سے انتظار فرما رہے ہوں گے جو چائے کے بعد منعقد ہونے والی ہے۔

میں آخر میں طفیل صاحب کا اور باقی منتظمین انجمن کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خاص طور سے منظور الٰہی صاحب کا، کہ انہوں نے مجھے طفیل صاحب سے بھی متعارف کرایا اور پھر اتنے دانشوروں سے بھی بیک وقت ملنے کا موقع ملا۔

میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ اس کے باوجود آپ نے میری باتوں کو نہایت محبت اور خلوص سے (جو آپ کے چہروں سے پڑھ رہا ہوں) سُنا۔ اب میں آپ حضرات سے اجازت چاہتا ہوں۔ شکریہ!

محمد یاسین وٹو

لیجئے وہ تقریریں بھی ختم ہو گئیں جن کے سننے کے لئے پارک لگژری ہوٹل میں سینکڑوں دوست جمع تھے۔ اور یوں انجمن ادبی رسائل کی مساعی بھی سامنے آگئیں — واہ واہ بھی ہو گئی۔

ذاتی طور پر مجھے سامعین کا اور اب قارئین کا بھی اور اراکینِ انجمن کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے بڑے حوصلے کے ساتھ کارروائی کو سُنا اور اب پڑھا، اس لئے کہ یہ حکایت کسی کے لئے بھی "لذیذ" نہ تھی۔ آپ کہیں گے: "یہ حکایت میرے لئے تو لذیذ ہو گی" ——— یقین جانیے یہ حکایت میرے لئے بھی لذیذ نہ تھی۔ کیوں؟ وجہ یوں کہ میں نے اس نمبر پر پورا ایک برس صرف کیا (یا ضائع کیا) دن رات پاگلوں کی طرح کام کیا۔ احباب کو بھی تنگ کیا۔ ہزار ہا روپیہ لگایا۔ بیوی کے زیور تک بیچے ——— اور انعام کے طور پر ۲۹۲۸ – ۱ روپے کا نقصان اٹھایا۔

ابھی تک مجھ سے بینک والے پوچھتے ہیں ——— آپ تو کہتے تھے کہ آپ بیتی نمبر چھپ گیا تو سارا روپیہ لوٹا دوں گا ——— کیا ابھی تک آپ بیتی نمبر نہیں چھپا؟ انہیں کیا جواب دوں! یہی دن رات سوچتا رہتا ہوں ——— مگر اس سے آپ کو کیا!

پرچہ چھپا تو خوب بکا۔ بیس روپے بھی قاری کے لئے امتحان کا درجہ رکھتے تھے مگر اس کی قیمت لاگت سے کم تھی۔ کوئی کیا کرتا۔

میں نے نقوش کے سلسلے میں کبھی بھی نقصان کی پروا نہیں کی۔ اگر نفع نقصان کی بنیادوں پر سوچتا تو پرچہ کبھی کا بند ہو چکا ہوتا۔ یہ تو میں نے اس وقت بھی نہیں سوچا تھا، جب مجھے مکاتیب نمبر میں ساڑھے آٹھ ہزار روپے کا نقصان ہوا تھا اور یہ میں نے اس وقت بھی نہیں سوچا تھا جب مجھے لاہور نمبر میں سات ہزار روپے کا نقصان ہوا تھا اور یہ بھی میں نے اس وقت بھی نہیں سوچا تھا جب مجھے شخصیات نمبر حصہ دوم میں تیس ہزار روپے کا نقصان ہوا تھا ——— البتہ یہ ہے کہ جتنی اہم دستاویز پیش کیجئے اتنا ہی زیادہ منافع لیجئے۔

میری نفع نقصان کی میزان اور ہے۔ وہ یہ کہ میں نے جو کام کیا ہے، اگر اس کی ادب میں کوئی وقعت ہے تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ فائدہ ہو گیا۔ اگر کسی ادبی مہم میں، میری کوششیں بار آور نہیں ہوتیں تو سمجھ لیتا ہوں کہ نقصان ہو گیا۔

نفع نقصان کے بارے میں، میرا یوں سوچنا، مجھے بڑا بھلا لگتا ہے۔

میں یہ باتیں مدیر نقوش کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ محمد طفیل کی حیثیت سے نہیں۔ اس لئے کہ محمد طفیل کے اور بھی سو ذاتی مسائل ہیں۔ مگر مدیر نقوش کا صرف ایک مسئلہ ہے وہ یہ کہ ——— گرہ سے لگائیے۔ اُدھار لیجیے۔ چوری کیجیے مگر پرچہ ٹھاٹ دار چھاپیے۔

کبھی کبھی یہ "دونوں شخص" آپس میں الجھ بھی پڑتے ہیں۔ سوچیں گتھم گتھا، اندیشے دست و گریباں، سود و زیاں ہم عناں! ——— غرض کبھی مدیر نقوش مستقبل کے گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور کبھی

محمد طفیل کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔

نتیجہ؛ ـــــ "نتیجہ" محمد طفیل ہار جاتا ہے اور جان بوجھ کر ہارتا ہے ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں۔

خاکہ نگاری :

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی
مجنوں گورکھپوری
ڈاکٹر احسن فاروقی
ڈاکٹر صابرہ سعید
ڈاکٹر انور سدید
ڈاکٹر سید محمد عقیل
جوگندر پال
شوکت تھانوی
سید ضمیر جعفری

محمد طفیل کے خاکے اور فنِ خاکہ نگاری

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی

اس وقت میری میز پر نیلی روشنائی کی ایک دوات اور پانی کا ایک گلاس رکھا ہے۔ میں روشنائی کا ایک قطرہ پانی کے گلاس میں ٹپکا دیتا ہوں پانی نیلا ہو جاتا ہے، پھر ایک قطرہ اور ٹپکا دیتا ہوں، لیجئے نیلے رنگ کا ایک اور شیڈ وجود میں آگیا۔ اس طرح پانی کے ایک گلاس اور نیلی روشنائی کی ایک دوات سے نیلے رنگ کے ایک ہزار آٹھ سو شیڈ وجود میں آسکتے ہیں اور اگر کسری ترکیبات کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو انہی دو چیزوں سے نیلے رنگ کے لاتعداد شیڈ وجود میں آجائیں گے۔ یہ صرف دو اجزا کی ہیئت ہائے ترکیبی کا حال ہے۔ شخصیت کے اجزائے ترکیبی تو ہزاروں اور اہم اجزائے ترکیبی بھی سیکڑوں ہو سکتے ہیں اس لیے ان کی ترکیب سے وجود میں آنے والی ہیئت ہائے ترکیبی کا حصر و شمار تو ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک دنیا میں کوئی دو آدمی ایسے نہیں ہوئے جنھیں شخصیت کے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے بالکل یکساں قرار دیا جا سکے۔ محمد طفیل نے یہی بات ان لفظوں میں کہی ہے:

"پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً گلاب کا پھول، اس کے سو رنگ ہیں۔
یہی حال شخصیتوں کا ہے۔ انسان ایک ہے مگر اس کے رُوپ سو۔
کہاں کہاں انسان ایک دُوسرے سے مختلف ہے۔ بس اسی نازک سے
فرق کے اظہار کے لیے کبھی کبھار قلم اٹھا لیتا ہوں۔" (مجتبیٰ ص ۵۱)

جی ہاں۔ یہی اس صنف کا جواز ہے جسے خاکہ کہتے ہیں۔ اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خاکے کی غایت محمد طفیل کے ذہن میں پُوری طرح واضح ہے۔ اس لیے اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہو گیا کہ خاکے کے قواعد و شرائط، حدود و قیود —— اس صنف کے خدشات و ممکنات، مشکلات و موانع اور خود خاکہ نگار کی مجبوریوں اور معذوریوں پر ان کی نظر کتنی گہری ہے۔

فرمان فتح پوری محمد طفیل سے نیاز فتحپوری کا خاکہ لکھوانا چاہتے ہیں۔ محمد طفیل جواب میں

کہتے ہیں :

"نیاز صاحب کے بارے میں میری معلومات ناقص نہ سہی محدود ضرور ہیں۔ اتنی مختصر یادوں کے سہارے مجھ سے اتنی بڑی شخصیت کا جھٹکا نہ کرائیں۔" (آپ ص ۲۳)

گویا طفیل صاحب کے نزدیک ضروری ہے کہ خاکہ نگار صرف اس شخصیت پر قلم اٹھائے جس کے بارے میں اس کی معلومات معیاری بھی ہوں اور وافر بھی۔

"میں نقاد نہیں ہوں کہ جہاں چاہوں ڈنڈی مار دوں۔ میرا موضوع شخصیتوں کا مطالعہ ہے جس میں جھوٹ نہیں چلتا۔" (آپ ص ۲۴)

جھوٹ تو تنقید کے میدان میں بھی نہیں چلتا اور شخصیت نگاری میں بھی لوگ ڈنڈی مار جاتے ہیں لیکن اس وقت یہ باتیں ہمارے دائرۂ بحث سے باہر ہیں۔ اس اقتباس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ طفیل صاحب کے نزدیک صداقت اور غیر جانبداری خاکہ نگاری کے اہم تقاضے ہیں۔

"یہ چار مضمون میں نے سات برس میں لکھے ہیں۔ ایک لحاظ سے پہلے دو مضمون میں نے بیس برس سے زائد عرصے میں لکھے ہیں، اس لیے کہ نیاز صاحب اور جوش صاحب کو میں ایک مدت سے پڑھ رہا تھا۔" (تمہید بہ 'آپ')

"اللہ کا شکر ہے کہ بعد میں بھی جوش صاحب سے ملنا جلنا رہا، ورنہ میری بھی ان کے بارے میں وہی رائے ہوتی جو اس وقت آپ کی ہے، یہی کہ بدتمیزی کی حد تک مذہب دشمن ہیں۔" (آپ ص ۷۰)

گویا خاکہ نگاری میں تعلقات کی عمر بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ دو چار سرسری سی ملاقاتوں کے بعد کسی شخص کا خاکہ لکھنے بیٹھ جانا خاکہ نگاری کے تقاضوں کے منافی ہے۔ اس قسم کی سہل انگاری کے نتیجے میں شخصیت کی جو تصویر بنے گی وہ مکمل ہو گی نہ قابلِ اعتماد۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ نہ دل مطمئن ہے نہ دماغ، اس لیے کہ یہ مضمون مجھ سے زبردستی لکھوائے گئے ہیں۔" (تمہید بہ 'آپ')

کسی مجبوری، کسی لالچ، فرمائش یا دباؤ کے تحت لکھے ہوئے خاکے قابلِ اعتماد اور معیاری نہیں ہو سکتے، چنانچہ خاکہ لکھنے کے لیے اس وقت تک قلم ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے جب تک

اس کی چٹنک دل کو نہ لگی ہو۔ حالی نے یہ بات شعر کے بارے میں کہی تھی، یہاں مجھے یاد آیا کہ نقادوں نے "ایک وصیت کی تعمیل" کی تعریف کی ہے۔ اس خاکے پر محنت ضرور ہوئی ہے اور فرحت اللہ بیگ کی محنت رائیگاں بھی نہیں گئی۔ لیکن "نذیر احمد کی کہانی" والی بات پیدا نہیں ہو سکی کیونکہ یہ بہرحال ایک فرمائشی چیز ہے۔

"مجھے اپنی مضمون آرائی سے زیادہ شخصیت کی باطنی عصمت سے بھی غرض ہے۔"
(مجتبیٰ ص ۳۶)

"مجھے کبھی بھی اپنے مضمون کی بہتری کا خیال نہیں رہا۔ مگر یہ خیال ضرور رہا کہ جس کے بارے میں لکھ رہا ہوں وہ ہر طرح سے سامنے آئے، ہر رنگ میں سامنے آئے۔" (معظم ص ۴۲)

جس طرح رعایت لفظی کا التزام بسا اوقات معانی کا خون کر دیتا ہے اسی طرح انشا پردازی کے جوہر دکھانے کی خواہش بعض اوقات شخصیت کی تصویر کو مسخ کر دیتی ہے اس لیے خاکے میں انشا پردازی کی چکا چوند کو نہیں موضوعِ خاکہ کو اہمیت دینی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ شخصیت کے صرف ایک پہلو پر انحصار و اکتفا نہ کیا جائے کیونکہ اس صورت میں جو تصویر بنے گی وہ بھی صرف ایک ہی پہلو کی تصویر ہو گی۔

"ماحول اور تربیت کے اثر سے بھی شخصیت کے پرت کھلتے ہیں۔" (معظم ص ۱۰۵)

چنانچہ شخصیت کی تلاش میں ماحول اور تربیت کا بھی جائزہ لینا ہو گا۔ بسا اوقات مظاہر شخصیت کی جڑیں انھی زمینوں میں پیوست ملیں گی۔

"یہ مضمون کتاب (آوازِ دوست) پر کم اور صاحبِ کتاب (مختار مسعود) پر زیادہ تر ہے، کیونکہ میرے نزدیک فساد کی نہیں، بنائے فساد کی اہمیت ہے۔" (معظم ص ۱۰۰)

یہی خاکہ نگاری کا اصول ہے۔ موضوع ایک شخصیت ہے کوئی تحریر نہیں، البتہ اس شخصیت کو سمجھنے سمجھانے کے لیے ضرورت پڑے تو تحریر سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

"حرکات و سکنات، عادات و اطوار، کرامات و انکشافات کے ذکر سے پہلے ضروری یہ ہے کہ ہم ممدوح کی سوچوں کو پکڑیں۔ اگر یوں نہ ہو گا تو

اس مضمون میں صرف شخصیت کا خول نظر آئے گا، شخصیت کی روح نظر نہیں آئے گی۔" (معظم ص ۱۱۱)

حرکات و سکنات، عادات و اطوار، کرامات و انکشافات تو مظاہر شخصیت ہیں، ان کے پیچھے کہیں وہ فکری رُوح بھی موجود ہوتی ہے جسے گرفت میں لانا خاکہ نگار کا مقصود ہے۔

"جس کسی کا خاکہ لکھا یہ جان کر لکھا کہ دوست ہے۔" (مجتبیٰ ص ۵۲)

"میرا قلم تو صرف اسی "دشمن" کے لیے رواں ہوتا ہے جس سے مجھے تعلق خاطر ہو۔" (مجتبیٰ ص ۵۰)

تضاد؟ جی نہیں۔ دشمن کے گرد جو واوین لگے ہیں ان پر نظر رکھیے۔ خاکہ اسی شخص کا لکھا جاتا ہے جس سے تعلق خاطر ہو۔ اگر خاکے کا محرک تعلقِ خاطر نہیں کوئی اور چیز ہے مثلاً انتقام یا خوشامد تو ایسی تحریر میں خاکے کی صفات پیدا ہی نہیں ہو سکتیں۔

"جو کسی کو ایک حال میں دیکھتا ہے وہ سبھی طرح کے مضامین لکھ سکتا ہے خاکہ نہیں لکھ سکتا۔" (مجتبیٰ ص ۱۶۶)

خاکہ نگار کو چاہیے کہ صبر و سکون سے شخصیت کا مطالعہ کرتا رہے حتیٰ کہ افعال و صادرات کے ذریعے موضوع خاکہ کے بیشتر یا تمام تر اہم پہلو اس کے سامنے آجائیں۔

"میرے نزدیک خاکہ نگاری خدائی حدود میں قدم رکھنے کے مترادف ہے یعنی جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہو، اس کے عین مین اظہار کا نام خاکہ نگاری ہے۔" (مجتبیٰ ص ۷)

یہ ایک عینی تصور ہے۔ خاکہ نگار کی کوشش بہر حال یہی ہونی چاہیے۔

"دوسری طرف مراسم کا پھندا کوئی کیا کرے کیا نہ کرے۔" (مجتبیٰ ص ۵۳)

جی ہاں یہ مجبوری ضرور لاحق ہوتی ہے۔

"میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ حرف بہ حرف سچ ہوتا ہے۔ شخصی تحریروں میں یادوں کے سہارے چلنا پڑتا ہے۔ یادیں دُھندلی ہوتے ہوتے معدوم بھی ہو سکتی ہیں۔" (جناب ص ۱۴۱)

یعنی تمام تر احتیاط کے باوجود سو فیصد صداقت کا دعویٰ بہت مشکل ہے۔

"انسان بڑا ہی عاجز اور بے بس ہے وُہ ایک چیونٹی اور ایک پتے کی ماہیت کا

بھی اندازہ نہیں لگا سکتا چہ جائیکہ وہ انسان کو سمجھنے کا دعویٰ کرے۔ بہر حال میرا دل چاہتا ہے کہ ایسی نارسائیوں کے باوجود، میں چند باتیں بشیر کے بارے میں کروں اور چند باتیں موجد کے بارے میں۔" (مجتبیٰ ص ۱۴۴)

انسان کے اندر ایک دُنیا آباد ہے۔ ہر انسان بجائے خود ایک کائناتِ صغریٰ ہے۔ علمائے نفسیات ہوں یا ماہرینِ اخلاقیات، اہلِ خانقاہ ہوں یا اہلِ مدرسہ، انسان کو پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہم انسان کو سمجھنے کی کوشش ہی ترک کر دیں۔ مکمل کامیابی تو ممکن نہیں لیکن جس حد تک ہمارے احاطہ امکان میں ہے، اس حد تک اس گورکھ دھندے کو سمجھنے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ سماجی اور باطنی علوم کے علماء و ماہرین کی کوششوں سے انسان کے ذہنی، نفسی اور باطنی کوائف کے بارے میں بعض باتیں معلوم بھی ہو چکی ہیں مگر ان انکشافات سے انسان کو سمجھنا آسان نہیں ہوا۔ کیونکہ ان انکشافات کے بعد انسان اپنے بارے میں اور زیادہ چوکنا ہو گیا ہے، اس ڈر سے کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے، اس نے اپنے خول کو اور زیادہ دبیز کر لیا ہے، وہ اپنے آپ سے بھی چھپنے لگا ہے۔ ماہرینِ نفسیات تو کیا، وہ دوستوں کو بھی اپنے اندر جھانکنے کا موقع نہیں دیتا۔ کیمرہ وجود میں آیا تو انسان کیمرہ کانشس ہو گیا۔ اب تصویر میں اصل چہرہ ذرا مشکل ہی سے ملتا ہے۔

"یہ دنیا اتنی نا اعتباری ہو گئی ہے کہ انسان کو کمپیوٹر کے ذریعہ بھی پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ صورت حرام لوگ تو تھے ہی، اب تکلم حرام بھی ہو گئے۔ پہلے لوگ کہا کرتے تھے کہ زبان سے نکلے ہوئے دو جملے بھی انسان کو پہچاننے میں مدد دے سکتے ہیں۔ اب تو لوگ گفتگو کریں گے تو ایسی پیاری کہ دل جھوم اُٹھے۔ عمل سامنے آئے گا تو شیطان بھی شرمندہ ہو گا۔ اب تو یہ حال ہے کہ دل کا حال اللہ ہی جانے تو جانے۔ یہ دنیا تو آرٹسٹ ہو گئی۔"
(مجتبیٰ ص ۱۶۲)

خاکہ نگار کا اصل کام ہی یہ ہے کہ ستر پردوں میں چھپی ہوئی "شخصیت" کو ڈھونڈ نکالے۔

"درخت کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ درخت جتنا اونچا ہو گا اتنی ہی جڑیں گہری ہوں گی۔ اصل درخت تو زمین کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔ یہی حال اشخاص کا ہے۔ جو شخص جیسا ہے، وہ دیسا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر

بہت کچھ چھپا ہوتا ہے۔ شخصیت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اسے
صرف زمین پر چلتے پھرتے دیکھ لینا شخصیت سے آگاہی کی ذیل میں نہیں آتا۔
شخصیت سے آگاہی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی دبے پاؤں چھپی
ہوئی شخصیت میں اُتر جائے۔" (آپ ص ۱۲۸)

گویا شخصیت کے ظاہر پہ اکتفا کر لینا محض سہل انگاری ہے۔ اصل شخصیت تو انسان کا باطن ہے
اگر انسان کی باطنی کیفیات تک رسائی حاصل نہ ہو سکے تو سمجھیے کہ خاکہ ناکام ہو گیا۔

"جو شخص جس شیشے میں اُتر سکتا تھا، میں نے اُسے اسی شیشے میں اتارا۔"
(حرفے چند 'معظم')

پہلے سے کوئی معیار مقرر کر کے چلنا خاکہ نگاری میں ممکن نہیں، کوئی بنا بنایا فارمولا یا کوئی معیار ایسا نہیں جس کے ذریعے ہر شخصیت کو سمجھا جا سکے۔ مختلف شخصیتوں کے لیے مختلف شیشوں کی ضرورت ہو گی۔

میرے پاس ایک قیمتی تالا تھا۔ سوءِ اتفاق سے اس کی چابی کھو گئی۔ میں نے کنجیاں بنانے والے ایک کاریگر سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے پاس کم از کم اڑھائی ہزار چابیاں ضرور ہوں گی۔ اس نے تالے کا بغور جائزہ لیا پھر تالے کی مجموعی ہیئت اور سوراخ کی نوعیت سے مطابقت رکھنے والی پندرہ بیس چابیاں یکے بعد دیگرے آزمائیں مگر کوئی چابی نہ لگی۔ تب اس نے خاصی احتیاط اور غور و خوض کے بعد ایک چابی منتخب کی۔ پھر اس کے تین دندانوں میں سے ایک دندانہ تین مختلف زاویوں سے گھسا کر دیکھا۔ بات نہ بنی۔ پھر اسی چابی کا دوسرا دندانہ مختلف زاویوں سے رگڑ کر دیکھا۔ اب بھی بات نہ بنی۔ تب وہ صحیح نتیجے پر پہنچ گیا اور تیسرا دندانہ ایک خاص زاویے سے گھسا کر چابی لگا دی۔ شخصیت کے لیے بھی بنی بنائی چابیاں نہیں ملتیں، بنے بنائے سانچے یہاں کام نہیں دیتے۔ مجھے یقین ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جو میری یا آپ کی شخصیت کو پوری طرح احاطہ کر سکے۔ میں بزدل ہوں اور فرض کیجیے آپ بھی بزدل ہیں۔ دنیا میں لاکھوں لوگ بزدل ہیں۔ ان لاکھوں لوگوں میں میری اور آپ کی شناخت کیسے ہو گی۔ بزدلی کی بیسیوں سطحیں اور درجے ہو سکتے ہیں۔ بزدلی کے سیکڑوں اسباب ہو سکتے ہیں اور بزدلی کے مظاہر تو ہزاروں سے بھی بڑھ سکتے ہیں۔ میری بزدلی شخصیت کے دوسرے عناصر کے ساتھ مل کر ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اور آپ کی بزدلی آپ کی شخصیت کے

دوسرے عناصر کے ساتھ ترتیب پا کر ایک بالکل مختلف صورت اختیار کر جاتی ہے۔ خاکے کی دنیا میں کوئی MASTER-KEY نہیں ہوتی۔ یہاں شخصیتوں کے قفل کھولنے کے لیے الگ الگ چابیوں کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات چابی بنانی پڑتی ہے۔

"صرف عیب جوئی شخصیت نگاری نہیں اور نہ ہی عیب پوشی کا نام شخصیت نگاری ہے۔ میرے نزدیک تو خوفِ خدا کے ساتھ فن کارانہ عکاسی کا نام شخصیت نگاری ہے۔"

(مکرم ص ۱۵)

زیرِ نظر شخصیت، اس کے احباب واعزہ، اس کے اغیار و اعدا اور ناقدینِ فن کی راستے تحسین یا خفگی سے بھی زیادہ اہم چیز خوفِ خدا ہے۔ خاکہ نگار خدا کے سامنے بھی جواب دہ ہے، اور خدا علیم و خبیر ہے۔

"کچھ دوست بڑے دلچسپ سوال کرتے ہیں۔ مثلاً فلاں مضمون اچھا ہے اور فلاں مضمون اتنا اچھا نہیں۔ اسکیچ نگاری میں اچھا مضمون ہونا یا اچھا مضمون نہ ہونا، بڑی حد تک، زیرِ بحث شخصیت پر منحصر ہوتا ہے۔" (مکرم ص ۱۴)

عام لوگ اچھا خاکہ اسے کہتے ہیں جو دلچسپ ہو اور عام لوگوں کے نزدیک دلچسپ آدمی وہ ہوتا ہے جو بزم آرائی کا فن جانتا ہو، خواہ اس کی بزم آرائی، یاوہ گوئی اور مسخرگی تک محدود ہو۔ یا وہ شخص دلچسپ سمجھا جاتا ہے جو نمایاں طور پر ابنارمل یا ECCENTRIC ہو۔ میرا جی نمایاں طور پر ECCENTRIC تھے۔ چنانچہ ان کے غیر معمولی عادات و اطوار کا تذکرہ خواہ مخواہ دلچسپ ہو جاتا ہے اور اس میں کچھ زیادہ فنکارانہ سلیقے یا صناعی کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ فنکارانہ کمال اس بات میں ہے کہ نارمل یا بظاہر نارمل شخصیت کی دلکشی کو سلیقے سے اُجاگر کیا جائے۔ جو شخص پہلے ہی سر کے بل کھڑا ہو، اس کی طرف تو صرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے لوگ اس میں دلچسپی لینے لگیں گے کیونکہ ابنارملیٹی بجائے خود پُرکشش چیز ہے لیکن نارمل آدمی کی شخصیت کو پُرکشش اور جاذبِ توجہ (یا فکر انگیز، اگرچہ یہ ضروری نہیں) بنانے کے لیے محنت، نفسیاتی بصیرت، گہرے مشاہدے اور فنی سلیقے کی ضرورت ہے۔ اس شخص کا خاکہ لکھنا بھی بہت آسان ہے جس کی انفرادیت کسی غیر معمولی خصوصیت تک محدود ہو اور وہ غیر معمولی خصوصیت اس درجہ نمایاں ہو کہ اس کی شخصیت کی کلید بن جائے مثلاً حد سے بڑھی ہوئی انانیت، دولت سے جنون کی حد تک پہنچی ہوئی محبت، ہڈیوں میں اترا ہوا اور شخصیت کے

تمام مظاہر میں جھلکنے والا خوف، شرافت، دیانت، مروّت سب کو ہڑپ کر جانے والی خود غرضی ـــــــ کیونکہ ایک خصوصیت کو گرفت میں لینا اور شخصیت کے تمام مظاہر میں اس کا سراغ لگا لینا کسی خاص فنّی مہارت یا نفسیاتی بصیرت کا تقاضا نہیں کرتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ شارٹ کٹ صحیح نتائج تک ہماری رہنمائی کر بھی سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب اثبات میں بھی دیا جا سکتا ہے اور نفی میں بھی۔ اگر خاکہ نگار نے شخصیت کی صحیح کلید دریافت کر لی ہے یعنی شخصیت کی کلید کے طور پر اس خصوصیت کو اہمیت دی ہے جو حقیقتاً اس کے تمام عواطف و جذبات، رجحانات میلانات اور مظاہر شخصیت کا منبع و مصدر ہے تو خاکہ صحیح نتائج تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے اور اگر خاکہ نگار نے کسی ایسی خصوصیت کو جو درحقیقت ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور کسی دوسری خصوصیت کا محض ایک نتیجہ یا مظہر ہے، بنیادی اہمیت دے کر اسے کلید کا درجہ عطا کر دیا ہے تو شخصیت کی تصویر مسخ ہو کر رہ جائے گی اور خاکہ صحیح نتائج تک ہماری رہبری نہیں کر سکے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کسی شخص کے جذبۂ خدمت کو اس کی شخصیت کی کلید قرار دے کر اس کی پوری زندگی کو جذبۂ خدمت کا نمونہ بنا کر رکھ دیں جبکہ اس کا جذبۂ خدمت محض ہوسِ شہرت یا تمنائے خود فراموشی کا ایک مظہر ہو۔ آپ خوف کو غیر مشروط طور پر کسی شخصیت کی کلید کیسے قرار دے سکتے ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ خوف حبِ ذات سے پیدا ہوتا ہے۔ جنونِ مطالعہ شوقِ علم سے بھی جنم لے سکتا ہے اور یہ تلخ حقائق سے گریز کی بھی ایک صورت ہو سکتی ہے اوّل الذکر صورت میں جنونِ مطالعہ کو نہیں شوقِ علم کو شخصیت کی کلید قرار دینا ہو گا اور موخر الذکر صورت میں اس آزردگی کو جو ناکامیوں کے باعث شخصیت میں گھر کر رہ گئی۔ شوقِ علم بھی ہوا میں جنم نہیں لیتا اور آزردگی یا اُسے جنم دینے والی ناکامیوں کے اسباب بھی موضوعِ خاکہ کی شخصیت اور اس کے خارجی عالم میں ڈھونڈنے پڑیں گے۔

کرداری افسانے میں یہ سہولت ہے کہ آپ اپنے موضوع کے تخئیلی پیکر میں حسبِ ضرورت ترمیم کر سکتے ہیں۔ کردار پاکستان کے پس منظر میں پوری طرح نہیں اُبھرتا تو اُسے ایران یا افغانستان یا فرانس کے پس منظر میں پیش کر سکتے ہیں۔ ایک خصوصیت پوری طرح شخصیت سے مطابقت نہیں رکھتی تو آپ اس شخصیت کی ہیئتِ ترکیبی بدل سکتے ہیں۔ اس خصوصیت میں کتر بیونت کر سکتے ہیں، اس خصوصیت کا جواز اس کے خاندانی حالات یا بچپن کے کسی مفروضہ واقعے سے پیدا کر سکتے ہیں کیونکہ کسی اصل کی مطابقت آپ کے لیے لازم نہیں،

فرضی شخصیت (کردار) دلچسپ، خوبصورت اور قرینِ قیاس ہوگئی تو کافی ہے جبکہ خاکے میں دلچسپ، خوبصورت اور قرینِ قیاس ہونے سے بھی پہلے اصل سے مطابقت شرط ہے کیونکہ ایک شخص معین آپ کا موضوع ہے۔ اگر آپ کی بنائی ہوئی تصویر اصل سے ذرا بھی مختلف ہوگئی تو اسی نسبت سے خاکہ بھی ناقص قرار پائے گا۔

"میرے خام خیال میں ضروری ہے کہ لکھنے والا شخصیت میں گھسا ہوا نظر نہ آئے بلکہ شخصیت ہی رواں دواں نظر آئے۔ اگر مصنف خود کو لانے پر مجبور ہی ہو تو ایسے جیسے قمیص میں بٹن نہ کہ بٹن میں قمیص۔" (دیباچہ بعنوان اعترافِ جرم 'صاحب')

چونکہ خاکہ ہمیشہ ذاتی واقفیت کے سہارے لکھا جاتا ہے اس لیے ضمیر واحد متکلم کا استعمال تو ناگزیر ہو جاتا ہے مگر لوگ ضمیر واحد متکلم کے استعمال سے ناجائز فائدہ بھی تو اٹھاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خاکہ موضوع خاکہ سے مصنف کے تعلقات کا اشتہار اور خود اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کی ادبی بددیانتی ہے کہ پہلے تو لوگوں کو یہ کہہ کر متوجہ کیا جائے کہ صاحبان! آئیے میں آپ کو فلاں صاحب سے ملواؤں اور جب لوگ فلاں صاحب سے ملنے کے اشتیاق میں بھاگے بھاگے آئیں تو تعارف کرانے والا فلاں صاحب کی طرف پشت کرکے کھڑا ہو جائے اور گردان کرنے لگے "یہ صاحب میرے دوست ہیں، میرا..... میرے.....، میری.....، مجھے.....، مجھ سے.....، میں نے....."

"بھائی! میں نیاز صاحب کی تحریر کا تو عاشق ہوں مگر شخصیت کا نہیں، بالکل نہیں۔ اس لیے اب بھی سوچ لیجئے کہ مجھ سے کچھ لکھوانا مناسب بھی ہوگا یا نہیں۔" (آپ ص ۴۴)

گویا اگر آپ کسی کی تحریر کے عاشق ہیں مگر اس کی شخصیت میں آپ کو کوئی دلکشی نظر نہیں آتی تو آپ کو اس شخص کا خاکہ نہیں لکھنا چاہیے۔ البتہ آپ تنقیدی مضمون لکھ سکتے ہیں اور اس میں شخصیت سے بھی حسبِ ضرورت اعتنا کر سکتے ہیں مگر مرکزی اہمیت تحریر کے خصائص ہی کو حاصل ہوگی۔ اور اگر آپ کسی شخص کی شخصیت کے عاشق ہیں یا اس شخصیت میں کوئی دلکشی پاتے ہیں تو آپ کو خاکہ نگار بن کر سامنے آنا چاہیے۔ اس صورت میں اس کی تحریروں سے بھی اعتنا کیا جا سکتا ہے مگر مرکزی اہمیت اس کے کلام یا تحریر کو نہیں، اس کی شخصیت ہی کو

حاصل ہوگی۔ نقاد کا موضوع ہے: تحریر (= کلام، کتاب، کلیات)۔ اور خاکہ نگار کا موضوع ہے: شخصیت۔ نقاد تحریر کو سمجھنے سمجھانے کے لیے شخصیت سے مدد لے سکتا ہے اور خاکہ نگار شخصیت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تحریر سے مدد لے سکتا ہے۔ ایسی تنقید ممکن ہے جس میں شخصیت کا حوالہ سرے سے موجود ہی نہ ہو اور ایسا خاکہ بھی ممکن ہے جس میں موضوعِ خاکہ کی کسی تحریر سے مطلق مدد نہ لی گئی ہو بلکہ خاکہ تو ایسے شخص کا بھی لکھا جا سکتا ہے جو سرے سے ادیب ہی نہ ہو۔ نام دیو مالی اور نور خاں ادیب نہ تھے لیکن شخصیت رکھتے تھے اور ان کی شخصیتوں میں ایک خاص نوع کی دلکشی بھی موجود تھی۔ چنانچہ ان کی شخصیتوں سے عبدالحق کی دلچسپی ان لازوال خاکوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ "ایوب" کو رشید احمد صدیقی کا بہترین خاکہ سمجھا جاتا ہے۔ ایوب شاعر نہ تھے ادیب نہ تھے عالم نہ تھے لیکن شخصیت کے اعتبار سے وہ خاکہ نگار کا موضوع بن سکتے تھے۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی نے شخصیت نگاری کے لیے ان کا انتخاب کیا اور کمال کر دکھایا۔ بات شاید یوں ہے کہ خاکہ نگار کا موضوع شخصیت ہے اور شخصیت اظہار پاتی ہے بات چیت میں، افعال و اعمال میں، اوہام و عقاید میں، افکار و تصورات میں، عزائم اور امنگوں میں، اسلوبِ حیات میں ——— اور خاکہ نگار شخصیت کو مظاہرِ شخصیت ہی کے وسیلے سے دیکھ اور دکھا سکتا ہے۔

چونکہ ادب بھی کسی نہ کسی رنگ میں شخصیت کا مظہر ہے اس لیے اس سے بھی مدد لی جا سکتی ہے لیکن صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ اس خاص شخص کی حد تک شخصیت اور ادب میں کس قسم کا تعلق ہے اور کس درجے کا تعلق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جسے ہم شجاعت سمجھ رہے ہوں وہ محض بزدلی کا پردہ ہو۔ ادعائے تقدیس کے پیچھے خواہشِ تکریم بھی کارفرما ہو سکتی ہے۔ اور یہ بات تو ادب اور نفسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ برتری کا الجھاؤ احساسِ کمتری کا نتیجہ ہوتا ہے۔

"آپ" میں ایک خطبۂ صدارت بھی شامل ہے۔ اس تحریر کو کسی بھی پہلو سے خاکہ نہیں کہا جا سکتا۔ خود محمد طفیل نے اسے غیر متعلق سی تحریر قرار دیا ہے۔ لیکن خاکوں کے مجموعے میں اس تحریر کا شمول بلا جواز بھی نہیں۔ لکھتے ہیں:

> "یہ ایک صدارتی تحریر ہے جسے میں نے خطبۂ صدارت کی بجائے خطبۂ جسارت کا نام دیا تھا۔ اس نشست کا موضوع تھا ——— "کیا ادیب کے لیے صاحبِ کردار ہونا ضروری ہے؟" اس خطبۂ جسارت کو یہاں بطور دیباچہ پیش کر رہا ہوں۔

اس لیے کہ میرا موضوع بھی تو شخصیتوں کا مطالعہ ہے۔ یُوں یہ غیر متعلق سی تحریر بھی کچھ زیادہ غیر متعلق نظر نہیں آتی۔"

یہ ایک دلچسپ اور فکر انگیز مضمون ہے جس میں محمد طفیل نے ادب اردو کی تاریخ سے بہت سی مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ضروری نہیں کہ بڑے ادب کا خالق اپنے شخصی کردار کے اعتبار سے ایک بڑا آدمی بھی ہو۔ ضروری نہیں کہ تحریر سے اُبھرنے والی شخصیت خالق کے کردار کی سچی تصویر ہو۔ بالفاظِ دیگر کسی شخص کے شخصی کردار اور اس کے تخلیق کردہ ادب میں ریاضی کے کسی فارمولے کا ساحتمی تعلق نہیں ہوتا۔ اس مضمون کا خلاصہ طفیل صاحب کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"غالب شراب پیتے تھے، جوا کھیلتے تھے، کسی ڈومنی سے عشق کرتے تھے مگر ان میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ بذلہ سنج تھے، خوددار تھے، حساس تھے ..... ادب میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کہنے والا تو خود بڑا متقی اور پرہیزگار تھا مگر ان کی شاعری اور تحریروں سے ان کی شرافت کا زیادہ پتہ نہیں چلتا۔ مثلاً ریاض خیر آبادی بڑے دیندار بزرگ تھے مگر وہ زندگی بھر شراب شراب بکتے رہے۔ نظیر اکبر آبادی کا بیشتر کلام ایسا ہے کہ وہ کسی شریفانہ مجلس میں نہیں پڑھا جا سکتا مگر وہ خود اتنے بڑے بدمعاش نہ تھے ..... اگر ان ادباء شعراء کی فہرست بنائی جائے جو صاحب کردار تھے تو تعداد سیکڑے چھوڑ بمشکل دہائیوں تک پہنچے گی ..... صاحب کردار اور بے کردار لوگ ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں؛ ڈاکٹروں میں بھی، وکیلوں میں بھی، استادوں میں بھی، افسروں میں بھی ——— اور ادیب بھی تو عام انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں فرشتے نہیں ہوتے۔"

یہ فکر انگیز سطور خاکہ نگاروں کو یہ بصیرت مہیا کرتی ہیں کہ بھائیو! اگر کسی شخص کا ادب عظیم ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ شخص اپنے شخصی کردار کے اعتبار سے بھی اتنا ہی عظیم آدمی ہے۔ اس عالمگیر مغالطے سے دھوکا نہ کھاؤ کہ "ادب شخصیت کا اظہار ہے" کیونکہ شخصیت دو لخت بھی ہو سکتی ہے، نقاب پوش بھی ہو سکتی ہے، ادب محض صدائے تمنا بھی ہو سکتا ہے، ادب اس شخصیت کا اظہار بھی ہو سکتا ہے جو ادیب کو عملاً میسر نہیں بلکہ محض ایک نصب العین کے

طور پر اس کے خوابوں پر محیط ہے۔ اس لیے ادب پارے کو اس کے خالق کا مترادف اور ادب پارے کی عظمت کو مصنف کی عظمتِ کردار کا ثبوت نہ جانو۔ شخصیت کی تہیں کھولنے کی کوشش کرو، ادیب کو سمجھو، اس کی نفسیات کو سمجھو، اس کے ادب سے مدد ضرور لو مگر چوکتے رہو۔ آدمی وہی کچھ نہیں ہوتا جو وہ کہتا ہے۔ الحاد کی باتیں کہنے والا بباطن عابد بھی ہو سکتا ہے، زندگی بھر خمریات سے دلچسپی رکھنے والا شاعر متقی اور پرہیزگار بھی ہو سکتا ہے۔ کلام کی روشنی میں شخصیت پر حکم لگانے کے لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

"اچھی باتیں تو سب کے منہ سے اچھی لگتی ہیں۔ بُری باتوں کو اچھے انداز میں کہہ دینا ہی تو فن کہلاتا ہے۔" (آپ ص ۱۵۹)

گویا محمد طفیل شخصیت کے کمزور پہلوؤں کا تذکرہ ایسے انداز میں کرنا چاہتے ہیں کہ کمزوریاں نفرت کا سبب نہ بنیں۔ یا اگر وہ نفرت انگیز ہیں تو خاکے کے آئینے میں نفرت انگیز نہ رہیں۔ بلکہ ہم ان کمزوریوں کو تقاضائے بشریت سمجھ کر درگزر کرنے پر تیار ہو جائیں۔ خاکہ نفرتوں کا نہیں محبتوں کا کاروبار ہے کیونکہ یہ صرف محب کی نظر ہے جو کمزوریوں کو جاننے اور ماننے کے باوجود نفرت نہیں کرتی، محبت ہی کیے جاتی ہے۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

"فلاں صاحب بہت خود غرض ہیں۔"

"جی ہاں! ہیں وہ خود غرض، اور ہر شخص کسی نہ کسی حد تک خود غرض ہوتا ہے۔"

"سنا ہے وہ شاہد باز بھی ہیں۔"

"سنا تو میں نے بھی ہے۔ لیکن ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔"

"وہ کچھ زیادہ ہی گھمنڈی واقع ہوئے ہیں۔"

"یہ بھی درست ہے، عزتِ نفس کی حفاظت میں ان کا رویّہ خاصا جارحانہ ہو جاتا ہے۔"

"آپ ایسے گھٹیا آدمی کا خاکہ کیوں لکھ رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ گھٹیا آدمی نہیں، وہ خود غرض، شاہد باز اور گھمنڈی ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں، کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں، ان کمزوریوں کے باوجود مجھے ان کی خوبیاں عزیز ہیں۔ اگر آپ کی نظر بھی میری طرح ان کی شخصیت کی گہرائیوں تک پہنچنے لگے تو شخصیت کی دلکش تصویر میں لگی ہوئی یہ بدرنگ لکیریں بھی آپ کو اتنی بُری نہیں لگیں گی۔"

حقیقت نگاری کے تقاضوں کے تحت یہ بد رنگ لکیریں ہیں بھی ضروری مگر ذہانت اور فنی کمال اس میں ہے کہ انھیں ایسے سلیقے سے لگایا جائے کہ تصویر کی دلکشی میں اضافہ نہ ہو سکے تو کم از کم وہ دلکشی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔

"حقیقت نگاری کی ایک مثال اور بھی ہے۔ وہ ہے عصمت کا مضمون "دوزخی" اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں۔ شخصیت نگاری میں اس مضمون کو بھی اونچا درجہ حاصل ہے اس کے باوجود میں یہ کہتا ہوں کہ اگر عصمت یہی مضمون عظیم بیگ کی زندگی میں لکھ دیتی تو وہ عصمت کا گلا گھونٹ دیتے۔" (آپ ص ۱۶۰)

گویا حقیقت نگاری میں اتنا غلو کہ ہر بات منفی انداز میں کہی جائے غصہ دلانے والی بات ہے جب حقیقت نگاری غصہ دلائے بغیر بھی ممکن ہو تو غصہ دلانے والی بات کیوں کہی جائے۔

"جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ خاکہ نگاری میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہی آپ کے ہاں کم ہے (صرف چند مضامین میں) میری مراد توازن سے ہے۔" (آپ ص ۱۶۰)

توازن سے یہاں کیا مراد ہے؟ یہ سطور ایک خط سے لی گئی ہیں جو شاہد احمد دہلوی کے نام ہے، بالفاظِ دیگر گنجینۂ گوہر کے بعض مضامین میں توازن کی کمی کا شکوہ کیا گیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں نے اردو میں خاکہ نگاری کے فن کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ گنجینۂ گوہر میری پسندیدہ کتابوں میں سے ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بعض عبارتوں میں موضوعِ خاکہ کے بارے میں مصنف کا رویہ ہمدردانہ اور دوستانہ نہیں رہا۔ اس بحث کو طول دینا مناسب نہیں۔ اگر آپ طفیل صاحب کے اعتراض کو پوری طرح سمجھ گئے ہیں تو ان کا تصورِ توازن بھی آپ پر روشن ہو گیا ہوگا۔ محمد طفیل کے ہاں توازن کے معنی یہ ہیں کہ کمزور پہلوؤں کا تذکرہ تو کیجئے مگر پگڑی نہ اچھالیے، منتقمانہ رویہ نہ اپنائیے، خاکے کو ہجو نہ بننے دیجئے، کمزوریوں کے اظہار میں نفرت و حقارت، چڑچڑے پن اور جھلاہٹ، طنز اور زہرناکی سے کام نہ لیجئے۔ انصاف کے ساتھ عفو و احسان کے جذبوں سے بھی کام لیجئے۔ آپ محتسب نہیں اس لیے درّہ نہ پھٹکاریئے، پیار کیجئے۔ اور اگر یہ ممکن نہیں تو کم از کم ترس تو کھائیے۔

متاب ای پارساروی از گنہگار — بہ بخشایندگی در وی نظر کن

کمزوریوں پر قلم اٹھاتے ہوئے اپنے جذبات پر بھی قابو رکھیے ۔ جذباتی توازن بڑی چیز ہے ۔

"اگر میں کسی شخصیت کا کوئی پہلو چھپاتا ہوں تو میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس شخصیت کی ناک کاٹ لی یا اس کے کان کاٹ ڈالے ۔"

حکیم صاحب (مکرم)

اختر صاحب کے خاکے میں فٹ نوٹ کے طور پر درج ہے :

"اس ناگفتنی کا بھی کچھ حال مجھے معلوم ہے مگر جو باتیں یہ خود چھپانا چاہتے ہیں ان کے لکھنے میں لطف بھی کیا ۔" (آپ ص ۱۸۶)

اور اگر وہ ناگفتنی بات شخصیت کا ایک اہم پہلو ہو تو ؟

گویا یہ بات متنازعہ فیہ ہے تاہم اسے محمد طفیل کی ایک اور عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھیے :

"کھٹکتی ہوئی باتیں صاحبِ تذکرہ ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہیں ۔ اہلِ حیا کے لیے واجب ہے کہ وہ اس ضمن میں اگر اشاروں سے کام چلا سکیں تو دریغ نہ کریں اس لیے یہاں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ابو الکلام کی جوانی کو حکیم (یوسف حسن) کی جوانی کا دیباچہ سمجھیں ۔" (مکرم، ص ۱۱۸)

یہ توقع درست نہیں کہ خاکہ نگار وہ سب کچھ لکھ دے جو اس کے علم میں ہے ۔ خاکہ کوئی مفصل سوانح عمری نہیں بلکہ سوانح میں شخصیت کی تلاش ہے ۔ پھر خاکہ نگار کے پاس افسانہ نگار کا کینوس ہے ناول نگار کا نہیں ۔ چنانچہ خاکہ نگار کو صرف وہ باتیں منتخب کرنی ہیں جو شخصیت کو روشنی میں لا سکیں ۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہر حرکت ، ہر بات اور گفتگو کا ہر جملہ شخصیت ہی کا مظہر ہوتا ہے ۔ اصولی طور پر یہ بات بھی درست ہے لیکن شخصیت پر روشنی ڈالنے والی ان حرکتوں ، ان باتوں اور ان گفتگوؤں میں سے کچھ ایسی بھی ہوں گی جو شخصیت پر نسبتاً بہتر اور تیز تر روشنی ڈالتی ہوں گی ۔ ایک نمائندہ واقعہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ذکر کرنے کے بعد اسی نوعیت کے دوسرے پانچ واقعات بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے ۔ گویا واقعات میں حسنِ انتخاب بھی ایک اہم مسئلہ ہے ۔ فنی ضرورتوں کے تحت بعض باتوں کو چھوڑنا پڑے گا لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں فنی ضرورتوں کے تحت نہیں بلکہ مصلحتوں کے تحت چھوڑنا پڑتا ہے ۔ مثلاً :

۱۔ قانونی تقاضوں کے تحت بعض باتیں چھوڑنی ضروری ہو جاتی ہیں ۔

۲۔ بعض باتیں اس لیے چھوڑنی پڑتی ہیں کہ وہ شائستگی کے منافی ہیں۔

۳۔ بعض باتیں اس خوف کے تحت چھوڑ دی جاتی ہیں کہ ان کا تذکرہ زیرِ بحث شخصیت اور اس کے احباب و اعزّہ کی شدید خفگی یا آزردگی کا موجب ہوگا۔ خاکہ نگاری میں یہی بات ادبی تنازعے کا باعث بنتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں مروّت، رواداری اور بخشائندگی کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ بعض برائیوں کو مغرب میں ایسی عام بشری کمزوریاں سمجھا جاتا ہے کہ کوئی بھی عظیم المرتبت شخص جگ ہنسائی، رُسوائی یا تخفیفِ عظمت کے کسی خطرے کے بغیر ان برائیوں کا برملا اعتراف کرسکتا ہے اور خاکہ نگار ان برائیوں کو ذرا نمک مرچ لگاکر بھی بیان کردے تو موضوعِ خاکہ اور اس کے احباب و اعزّہ فقط مسکرانے پر اکتفا کرتے ہیں اور ایسے معاشرے بھی موجود ہیں جن میں فلم دیکھنا بھی اتنی بڑی بُرائی ہے کہ اس کے مجرم کے لیے بخشائندگی کا رویّہ اپنانا مشکل ہوجاتا ہے۔ خاکہ نگار تو ایک دوست کا تعارف کرا رہا ہے۔ وہ یہ بات کیسے گوارا کرسکتا ہے کہ لوگ اس تعارف کی روشنی میں اس کے دوست سے نفرت کرنے لگیں یا خود اس کا عزیز دوست ہی اس سے خفا ہوجائے یا اس کے احباب و اعزّہ چیں بجبیں ہوں۔ اس لیے سماجی اقدار کی روشنی میں جتنی حق گوئی ممکن ہو، خاکہ نگار سے اس سے زیادہ کی توقع ہی نہیں کرنی چاہیے۔ معائب کا تذکرہ سماجی اقدار اور معاشرے میں مروّج معیارِ بخشائندگی کے ساتھ مشروط ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے سماجی اخلاقی بندھن اتنے کڑے ہیں کہ چھوٹی بڑی ہر اخلاقی بُرائی منافیِ عظمت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں محتاط اور درست رویّہ وہی ہے جو محمد طفیل نے اختیار کیا ہے۔ یعنی ایسی صورتِ حال میں اشاروں سے کام چلانا چاہیے تاکہ شخصیت کا وہ خاص پہلو اگر پوری طرح سامنے نہ آسکے تو یکسر تشنہ بھی نہ رہے۔ محمد طفیل نے ممتاز مفتی کا جو خاکہ لکھا ہے اس میں یہ سطور بھی شامل ہیں:

"ممتاز مفتی خطرناک حد تک سچے آدمی ہیں مجھے کہتے ہیں تو بزدل ہے۔ تو کسی پر مضمون لکھتا ہے تو اس کے ساتھ رعایتیں کرتا ہے۔ زیادہ تر اس کی شرافت کے ڈنکے پیٹتا ہے، خباثتوں کے پردے چاک نہیں کرتا۔ تم ہمیں یہی بتاتے ہو کہ دیکھو یہ شخص آدمی نہیں فرشتہ ہے، خواہ وہ کتنا ہی رذیل کیوں نہ ہو۔"

محمد طفیل نے جواب دیا:

"میں جس حد تک بھی جاکر لکھتا ہوں، اگر اسی قدر ہی برداشت کرلیا جائے تو غنیمت ہے۔"

سعدی نے کہا تھا:

دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز

لیکن خاکے میں نہ دروغ مصلحت آمیز کی گنجائش ہے نہ راستیٔ فتنہ انگیز کی۔ اگر آپ کو کسی شخصیت کی تصویر کشی میں جھوٹ بولنے کی ضرورت پڑتی ہے تو شعر گفتن چہ ضرور۔ آپ اس شخصیت پر قلم نہ اٹھائیں۔ باقی رہا راستیٔ فتنہ انگیز کا معاملہ، تو اگر آپ کسی شخصیت کے بارے میں بہت سے سچ بول سکتے ہیں البتہ اکا دکا بات سچ ہونے کے باوجود فتنہ انگیز ہے تو راستی کے اظہار میں "ٹن ٹن" والا انداز نہ اپنایئے۔ اشارہ، بلکہ اگر اشارہ بھی فتنہ انگیز ہو تو اشارہ سا کیجیے اور آگے بڑھ جائیے۔ کیونکہ اس طرح بھی:

جان جائیں گے جاننے والے

یہاں مناسب ہوگا کہ ہم چلتے چلتے یہ بھی دیکھ لیں کہ طفیل صاحب میں کمزور پہلوؤں کے بارے میں سچ بولنے کی کتنی ہمت ہے اور سچ کو قابلِ برداشت یا گوارا بنانے کا کتنا سلیقہ ہے۔

"میرے ایک دوست ہیں، انھوں نے نیاز صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ یہ بڑے خود غرض ہیں۔ یہ بات سخن گسترانہ سہی، یکسر غلط بھی نہیں۔ ویسے خود غرض تو ہر آدمی ہوتا ہے۔" (آپ ص ۳۹)

آخری جملے نے سچ کی تلخی کو خاصا کم کر دیا ہے۔ یہ بات ہمدردانہ نقطۂ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔

"ہر نام کے پردے میں خود نیاز صاحب ہی ہوں گے اس لیے کہ بی جمالو والا کام یہ خوب جانتے ہیں۔" (آپ ص ۲۷)

قیوم نظر کے بارے میں:

"ان کا کلام سمجھنے کے لیے مجھے کئی کئی ہفتے خمیرہ گاؤ زبان کھانا پڑا مگر شعر پھر بھی سمجھ میں نہ آئے۔" (جناب)

مزاح نے سچ کی تلخی کو خاصا کم کر دیا ہے۔ پھر انداز ایسا ہے جیسے ابلاغ کی ناکامی کا نہیں اپنے قصورِ فہم کا رونا ہے۔

"میں نے یہ بھی سُن رکھا ہے کہ مولوی (عبدالحق) صاحب کانوں کے بڑے کچے ہیں۔ عین ممکن ہے کسی بھلے مانس نے کان بھر دیے ہوں۔" (جناب ص ۱۱)

اوّل تو یہ کہ مولوی صاحب کی خامی کو شنید کی حیثیت دی۔ دُوسرے یہ کہ اس خامی کی ذمہ داری خاصی بڑی حد تک کان بھرنے والے بھلے مانسوں کے کندھوں پر ڈال دی۔

"جلیس صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں، بس اتنا چاہتے ہیں کہ سب لوگ مجھے بڑا لکھنے والا مانیں اور میری جھوٹی باتوں پر بھی یقین کر لیں۔" (جناب ص ۱۸۶)

اچھے آدمی کہہ کر بات شروع کی اور معصومانہ انداز میں کمزوری کی طرف اشارہ کر دیا۔ غرضیکہ کمزوریوں کا سلیقہ مندانہ، ہمدردانہ اور محتاط تذکرہ کرنے میں محمد طفیل کو خاصی دسترس حاصل ہے مگر اس سے بھی زیادہ قابلِ ستائش بات یہ ہے کہ انھوں نے فرحت اللہ بیگ کی طرح کمزوریوں کے اسباب بھی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ کسی شخص کی کمزوریوں کے اسباب بھی معلوم ہوں تو قاری کو عفو و درگزر کا رویہ اپنانے میں خاصی آسانی ہو جاتی ہے۔ جوش کے ملحدانہ افکار کا تذکرہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ادب کا ہر طالب علم اس سے آگاہ ہے۔ خاکہ نگار کا کام یہ تھا کہ ان اسباب و عوامل تک رسائی حاصل کرے جو شخصیت کے اس تاریک پہلو کا باعث بنے۔ محمد طفیل نے یہ کام بحسن و خُوبی انجام دیا ہے۔

اسباب و عوامل کی جستجو صرف معائب ہی کے سلسلے میں ضروری نہیں، محاسن کے اسباب و عوامل تلاش کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ایک ہی خُوبی دو دو مختلف صورتوں میں دو مختلف معنی رکھتی ہے۔ ایک شخص کسی معزز، ذی علم اور خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا، زندگی کی ہر آسائش اور تعلیم و تربیت کی ہر سہولت اُسے حاصل رہی۔ وہ شخص مساعد حالات اور سازگار ماحول کے باعث عظمت کے ایک مقامِ بلند تک جا پہنچا۔ عظمت کے اسی بلند مقام پر ایک اور شخص بھی متمکن ہے، جو کسی غریب، بے رُسوخ اور کم علم گھرانے میں پیدا ہوا۔ زندگی کی کوئی آسائش اور تعلیم و تربیت کی کوئی قابلِ ذکر سہولت اسے ورثے میں نہ ملی مگر اس نے غیر معمولی محنت، لگن اور عزم و استقلال سے غیر مساعد حالات کا مقابلہ کر کے وہ مقام حاصل کر لیا۔ ان دو آدمیوں کو برابر نہیں سمجھا جا سکتا۔ موخر الذکر کی عظمت وقیع تر ہے۔ اس کی خوبی دوسری بہت سی خوبیوں کو بھی جلو میں لیے ہوئے ہے۔ اس کی کامیابی اوّل الذکر شخص کے مقابلے میں کثیر الجہات، زیادہ بھرپور اور زیادہ لائق ستائش ہے۔ میری اس عبارت سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ شاید میرے نزدیک خاکے میں وراثت، ماحول، بچپن اور تعلیم و تربیت کی سوانحی تفصیلات کا تذکرہ بھی ضروری ہے تاکہ شخصیت کا عہد بہ عہد ارتقا پوری وضاحت اور قطعیت کے ساتھ سامنے آ سکے۔ جی نہیں۔ اس قسم کی تفصیلات کا تذکرہ اور عہد بہ عہد

ارتقا کی تصویر کشی سوانح عمری کے دائرے کی چیزیں ہیں۔ خاکہ اس قسم کی سوانحی جزئیات اور تفصیل و طوالت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن شخصیت کی وہ جیتی جاگتی تصویر جو خاکہ نگار کا مقصود ہے اس قسم کی تفصیلات سے آشنا ہوئے بغیر کھینچی نہیں جا سکتی۔ یہ تفصیلات مذکور تو نہیں ہوں گی لیکن خاکہ نگار کے ذہن میں ضرور ہونی چاہییں اور اگر اشد ضرورت پڑے تو ایجاز و اختصار کے ساتھ خاکے میں ان کا شمول بھی خلافِ مصلحت نہ ہوگا۔ محمد طفیل کے اکثر کامیاب خاکے وہی ہیں جنھیں اس قسم کی وافر معلومات کا پس منظر میسر ہے۔ اکا دکا خاکوں میں بعض سوانحی تفصیلات باقاعدہ خاکے کے متن میں شامل کر دی گئی ہیں اور ان کے شمول کا جواز بھی موجود ہے یعنی کہ بعض خوبیوں یا خامیوں کے اسباب و عوامل کی حیثیت سے ان کا تذکرہ لازم سا ہو گیا ہے لیکن اختر اورینوی کے خاکے میں بعض ایسی تفصیلات بھی موجود ہیں جن کا شمول کم از کم مجھے بے جواز معلوم ہوتا ہے۔ یہ تفصیلات زیادہ "باخبر" ہونے کا ثبوت دینے کے لیے شامل کی گئی ہیں مگر وہ خاکہ نگار کے عجزِ فن کا ثبوت بن کر رہ گئی ہیں۔ خیال رہے کہ اس خاکے کے بارے میں محمد طفیل کا اپنا اعتراف موجود ہے کہ یہ مضمون محض حقِ دوستی ادا کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔

محمد طفیل کی ایک عبارت سے کچھ ایسا تاثر ملتا ہے جیسے محمد طفیل کے نزدیک شخصیت کو سمجھنے کا عمل کشتی لڑنے کے عمل سے مماثل ہو۔ لکھتے ہیں:

"اگر شخصیت اور شخصیت نگار دونوں ہی قد آور ہوں گے تو پھر بے چاری شخصیت دم توڑ دے گی، شخصیت نگار اُسے پچھاڑ دے گا۔" (جناب ص ۷)

میرا خیال ہے کہ یہ تمثیل غلط ہے۔ انٹرویو لینے والے چالاک صحافیوں کو بعض اوقات شاطر سیاستدانوں سے سچ اگلوانے، جھوٹ بلوانے یا انھیں غصہ دلانے کے لیے یہ تکنیک اختیار کرنی پڑتی ہے خاص طور پر اگر سیاستدان مخالف کیمپ سے تعلق رکھتا ہو تو صحافی پینترے بدل بدل کر حملہ آور ہوتا ہے۔ شاطر سیاستدان کبھی جھکائی دے کر، کبھی تجاہل سے کام لے کر، کبھی قہقہہ لگا کر، کبھی فقرہ بازی کر کے وار کر دیتا ہے اور موقع موقع سے جوابی حملے بھی کرتا رہتا ہے۔ انٹرویو ختم ہوتا ہے تو سیاستدان اپنے کسی قریبی ساتھی سے پوچھتا ہے، "اس بدزبان صحافی کا تعلق فلاں جماعت سے ہے نا؟" گویا سیاستدان سمجھتا ہے کہ اس سے انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ادھر صحافی اپنے کسی ساتھی سے محوِ گفتگو ہے

"بڑا بنتا تھا، آج تو میں نے اسے چت کر دیا۔"

"ہاں یار خوب پچھاڑا، آخر میں تو غصہ کھانے لگا تھا۔"

"اسے تاؤ دلا کر بدمزاجی اور دروغ گوئی پر مجبور کرنا ضروری تھا۔"

اس قسم کے انٹرویو نہ صداقت کے ترجمان ہو سکتے ہیں نہ ان میں شخصیت ڈھونڈی جا سکتی ہے اس لیے میں اکہری ملاقات پر مبنی مضمون کو خاکہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ اگر پچھاڑنے کا خیال بھی ذہن میں ہو تو خاکہ بھی لگ بھگ اسی قسم کا ہوگا جس قسم کے انٹرویو کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے، یعنی حد درجہ ناقابلِ اعتماد۔ مکالمات میں شخصیت موجود ہوتی ہے لیکن اگر متکلم کو یہ احساس ہو جائے کہ اس گفتگو سے اس کی شخصیت پر استدلال کیا جائے گا یا یہ مواد اس کے خلاف استعمال کیا جائے گا یا یہ کہ اسے اپنی شخصیت کا بھرپور اور صحیح تاثر انہی مکالمات سے دینا ہے تو مکالمے میں سے شخصیت غائب ہو جاتی ہے اور شخصیت کا خول یا نقاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے اور اگر شخصیت نگار گفتگو میں کشتی لڑنے کی تکنیک استعمال کرے گا تو مخاطب کے ذہن میں پیدا ہونے والے ردِ عمل کی جوابی لہر صحیح نتائج کی راہ میں یقیناً رکاوٹ بنے گی۔

بچوں کی ایک کہانی میں بتایا گیا ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے ہوا اور سورج میں جھگڑا ہو گیا۔ ہوا کہتی تھی میں طاقتور ہوں۔ سورج کہتا تھا میں طاقتور ہوں۔ طے یہ ہوا کہ سامنے سڑک پر جو آدمی جا رہا ہے اس کے کپڑے اتروانے کی کوشش کی جائے۔ جو اس کوشش میں کامیاب ہو جائے اسے زیادہ طاقتور مان لیا جائے۔ سخت سردی کے دن تھے اور صبح کا وقت تھا۔ غریب آدمی دگلا پہنے، سر پر بڑی سی پگڑی باندھے، ایک موٹے سے کمبل میں لپٹا لپٹایا گدھے کو ہانکتے ہوئے چل رہا تھا۔ پہلے ہوا میدان میں آئی، اس نے تیز تیز چلنا اور مسافر کے جسم پر حملے کرنا شروع کیا۔ مسافر نے دانت بھینچ لیے، کمبل کو زیادہ احتیاط سے اوڑھ لیا اور اسی طرح لپٹا لپٹایا چلتا رہا۔ ہوا کو اپنی ناکامی پر غصہ آیا تو اس نے آندھی کی شکل اختیار کر کے مسافر پر بڑا زوردار حملہ کیا اور اس کے کپڑے پھاڑنے اتارنے کی کوشش کی۔ پگڑی کا شملہ اُڑنے لگا، کمبل پھڑپھڑایا۔ مگر مسافر نے پگڑی کو مضبوطی سے سر پر جما لیا۔ دگلے کی گھنڈیاں کس لیں اور کمبل کو زیادہ مضبوطی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا اور چلتا رہا۔ سورج کبھی کبھی بدلی کی اوٹ سے جھانک کر ہوا کی بے بسی کا تماشا دیکھ لیتا۔ آخر ہوا نے ہار مان لی اور بولی، "سورج بھیا! لو ہم تو ہار گئے، اب تم کوشش کر دیکھو۔" سورج مسکراتا ہوا

بدلی کی اوٹ سے نکلا، اپنی زندگی بخش شعاعوں کے ذریعے اس نے مسافر کو سلام کیا۔ مسافر نے مسکرا کر سورج کو دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ظالم گستاخ اور دلآزار ہوا رُک گئی ہے اور مہربان سُورج نکل آیا ہے۔ اس نے کمبل پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ سورج کی مہربان حرارت نے اس کے جسم اور رُوح کو آسُودگی کا احساس بخشا۔ ہڈیوں میں سرایت کرتی ہوئی سردی کی لہر کو سورج کی مہربان شعاعوں نے نکال باہر کیا۔ تب مسافر نے محسوس کیا کہ کمبل کی ضرورت نہیں رہی۔ سورج کی موجودگی میں کمبل کی کیا ضرورت! چنانچہ اس نے کمبل اتار کر گدھے کی پیٹھ پر رکھ دیا اور ہلکے سُروں میں گانے لگا۔ سُورج نے خلوص، محبت، دوستی اور دلآسائی کا رویہ جاری رکھا۔ تھوڑی دیر بعد مسافر نے محسوس کیا کہ اب تو حیات بخش حرارت جسم کے روئیں روئیں میں سرایت کرنے لگی ہے۔ چنانچہ اس نے پگڑی اتار کر گدھے کی پیٹھ پر رکھی اور اپنا سر سورج کی شعاعوں کے حوالے کر دیا۔ پھر دگلے کی گھنڈیاں کھولیں اور مزید تھوڑا سا سفر طے کرنے کے بعد دگلہ بھی اتار ڈالا اور اونچے سُروں میں گانے لگا۔

تو جنابِ والا! اگر آپ شخصیت کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں تو آندھی یا جھکڑ کی طرح حملہ آور ہونے سے پہلے آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ سورج کی طرح خلوص، محبت، دوستی اور دلآسائی کا رویہ اپنائیے۔ اس طرح مسافر نہ صرف یہ کہ اپنا خول اتار دے گا بلکہ اپنی باطنی کیفیات کے اظہار کے لیے نغمہ سرا بھی ہوگا۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شخصیت نگاری کے سلسلے میں اس بنیادی غلطی کے باوجود محمد طفیل کے خاکے اس تکنیک کی مضرتوں سے کیسے محفوظ رہ گئے۔ تو بات دراصل یہ ہے کہ جہاں تک محمد طفیل کے ذاتی عمل اور طریق کار کا تعلق ہے، اُنھوں نے پچھاڑنے کے قائل ہونے کے باوجود شروع ہی میں یہ فرض کر لیا ہے کہ "میں ایک بونا ہوں"؛ یعنی میں کسی شخصیت کو پچھاڑ نہیں سکتا اس لیے پچھاڑنے کا خیال بھی ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ البتہ شوخی، فقرہ بازی اور ذہانت کی پھلجڑیاں وہ چلاتے رہتے ہیں ــــ یُوں جیسے کوئی بونا کسی قدآور اور متین شخص کو گُدگُدی کر رہا ہو۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا، اگرچہ مثال ذرا طویل ہے۔

ذکر ہے ریلوے سٹیشن لاہور کے ویٹنگ روم میں محمد طفیل اور جوش ملیح آبادی کی ایک اتفاقیہ ملاقات کا۔ لکھتے ہیں:

"میں نے شکایت کی کہ آپ نے اپنے آنے کی اطلاع مجھے نہ دی۔ آج تو میں حیدر آباد جانے کے لیے ادھر آ نکلا، ورنہ ملاقات بھی نہ ہوتی۔ کیا بالا ہی بالا نکل جانے کا پروگرام تھا؟"

"ہاں صورت تو ایسی ہی ہے۔ ام الشعراء بھی ساتھ ہیں۔ مگر میں نے تو میر صاحب کو لکھا تھا کہ طفیل کو اطلاع دے دینا۔"

اس پر میں نے کہا: "میر صاحب نے تو کوئی اطلاع نہ دی۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں اب کے آپ کا کوئی ناجائز استعمال ہو۔ ورنہ کیوں چھپاتے؟"

"سچ کہا، نیتوں کا حال اللہ جانے!"

"بہت ہی اچھا ہوا کہ آپ سے ملاقات ہو گئی ورنہ شیعہ سُنی فساد ہو جاتا۔"

میر صاحب شیعہ ہیں اس لیے جوش صاحب خُوب ہنسے۔" (محترم ص ۱۳)

گدگدی کے اسی انداز کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے "اپنائیت، مخصوص بے تکلفی، ہلکی میٹھی ظرافت اور معصوم شوخی" جیسے الفاظ و تراکیب سے گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ مجنون گورکھپوری کے نزدیک یہ مزاح کا ایک میلان ہے جو مہذب شوخی سے آگے نہیں بڑھتا، اور سید احتشام حسین نے اس خصوصیت کو "سادگی و پرکاری" سے تعبیر کیا ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ محمد طفیل کے ہاں یہ "مہذب شوخی" محض بے تکلفی اور حفظِ مراتب کی جمع و تفریق کا کھیل نہیں بلکہ یہ احساسِ یگانگت اور خلوص جیسے جذبوں سے پیدا ہوتی ہے اور ایک بشاشت آگیں فضا کا باعث بنتی ہے۔

"جناب" میں بائیس شخصیات پر مضامین شامل ہیں جنھیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں صرف پانچ مضامین ہیں جو نسبتاً طویل تر ہیں۔ اس حصے میں سب سے چھوٹا مضمون مولوی عبدالحق پر ہے جو گیارہ صفحات پر محیط ہے۔

دوسرے حصے میں سترہ مضامین ہیں جو سب کے سب تین تین یا چار چار صفحات پر مشتمل ہیں (ناصر کاظمی پر جو مضمون ہے وہ بھی تین صفحات کا ہے آخری حصہ شاعری پر تبصرہ ہے) گویا مصنف نے ان مضامین کو ان کی طوالت کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پہلے حصے کے مضامین تو باقاعدہ خاکے ہیں، دوسرے حصے کے مضامین محض مختصر خاکے ——— "سرسری سے جا ترے" ——— ہیں، جن سے خاکے کی

توقعات وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔

اگرچہ کسی خاکے کے خاکہ ہونے کا معیار اس کی طوالت نہیں، اس کی فنی حدود و شرائط ہیں مگر ان فنی حدود و شرائط کو نبھانے کے لیے ایک خاص حد تک طوالت بھی ضروری ہے۔ چونکہ خاکہ نگار کا مقصد ہے شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر بنانا، اس لیے کسی نہ کسی حد تک تفصیل میں اترنا یعنی مظاہر شخصیت (واقعات وغیرہ) سے دلچسپی لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ ریاضی میں مختلف اعداد کا مجموعہ ایک قطعی تاثر دے سکتا ہے لیکن شخصیت نگاری میں خصوصیات کی میزان نہیں بن سکتی۔ ۲ + ۳ + ۴ = ۹ میں معنوی قطعیت موجود ہے۔ لیکن علم + حلم + خود غرضی = شخص علم معنوی قطعیت سے عاری ہے۔ چنانچہ یہاں علم کی تھوڑی سی تفصیل اور حلم اور خود غرضی کے چند مظاہر کا تذکرہ ہی شخصیت کی تصویر بنا سکتا ہے۔ گویا شخصیت نگاری کے لیے ریاضی کے جملے کا سا حد درجہ اختصار کام نہیں دیتا۔ یہاں تفصیل میں جانا پڑتا ہے۔ کچھ نہ کچھ طوالت لازمی ہے۔ شوکت تھانوی کا 'شیش محل' ہو یا طفیل کی "جناب" کا دوسرا حصہ۔ یہ سرسری جائزے دلچسپ ضرور ہیں لیکن انھیں خاکے نہیں کہا جا سکتا۔ 'جناب' میں شامل ان سترہ مضامین میں سے بعض تو محض کسی اکہری ملاقات پر مبنی سرسری سے تاثر کی بازآفرینی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ محض اکہری ملاقاتوں کا حاصل ہیں۔ قاضی عبدالغفار اور یگانہ چنگیزی کے مختصر خاکے اسی ذیل میں آتے ہیں۔ البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جہاں تک شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر بنانے کا تعلق ہے۔ محمد طفیل بعض مختصر خاکوں میں بھی خاصے کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً میرزا ادیب مختصر خاکہ ہے مگر میرزا ادیب اس میں موجود ہیں (بعد میں محمد طفیل نے میرزا ادیب کے بارے میں ایک باقاعدہ خاکہ بھی لکھا جو 'محبی' میں شامل ہے) یہی حال ظہیر کاشمیری، ابراہیم جلیس اور بلونت سنگھ پر لکھے ہوئے مختصر خاکوں کا ہے۔ ان مختصر خاکوں میں جامعیت نہیں البتہ جامع تاثر پیدا کرنے کی کوشش ضرور ملتی ہے اور خاکہ نگار کے بس میں ہے بھی اسی قدر۔ جامع خاکہ تو آج تک لکھا ہی نہیں گیا۔

اختصار و طوالت کے باب میں محمد طفیل نے 'معظم' کے دیباچے میں ایک معنی خیز بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس کتاب کے کچھ مضامین طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ طویل مضامین کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جامع ہیں اور مختصر مضامین کے معنی یہ نہیں کہ وہ نامکمل ہیں۔ میری گرفت میں جو شخصیت جتنے صفحات میں آئی میں نے اُتنے ہی صفحات لکھ ڈالے۔"

یہ درست ہے کہ طویل ترین مضمون بھی جامع کہلانے کا مستحق نہیں۔ شخصیت تو ناظورۂ ہزار شیوہ ہے۔ اسے کما حقہٗ گرفت میں لینا ممکن نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ضروری نہیں کہ مختصر خاکے لازماً نامکمل ہی سمجھے جائیں۔ اگر مختصر خاکہ بھی شخصیت کا جامع تاثر دینے میں کامیاب ہو جائے تو اسے نامکمل نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ ہاں بعض صورتوں میں یہ ممکن ہے۔ رہی تیسری بات کہ "میری گرفت میں جو شخصیت جتنے صفحات میں آئی میں نے اتنے ہی صفحات لکھ ڈالے"۔ اصولی طور پر یہ بات درست ہے۔ اگر شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پانچ ہی صفحے میں بن جائے تو زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ اگر تیس چالیس صفحے میں بنتی نظر آئے تو تیس چالیس صفحے تک اسے پھیلانا ہی ضروری ہے لیکن خاکہ براہِ راست اور بلا واسطہ مشاہدے سے حاصل کی ہوئی معلومات —— FIRST HAND INFORMATION —— کا متقضی ہے۔ موضوعِ خاکہ کے بارے میں دوسروں کی آرا یا تحریروں سے، اس کے اپنے خطوط یا نگارشات سے، حتیٰ کہ سنی سنائی باتوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے، مگر ان سب کی حیثیت ثانوی اور تائیدی مواد کی سی ہوتی ہے۔ یہ معاونات ہیں۔ بنیادی اہمیت فرسٹ ہینڈ انفرمیشن ہی کو حاصل رہے گی اس کے بغیر کوئی مضمون خاکہ کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا۔ ایک فرضی خاکہ دیکھیے:

"میں نے ایک دفعہ علامہ اقبال کو انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں نظم سناتے دیکھا تھا وہ بڑے آدمی تھے جسٹس جاوید اقبال کا بیان ہے —— عبدالمجید سالک نے ان کے بارے میں لکھا ہے —— عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں —— چراغ حسن حسرت کی رائے ہے —— خود علامہ اقبال بالِ جبریل میں فرماتے ہیں —— سننے میں آیا ہے کہ علامہ اقبال —— اس کی تائید خلیفہ عبدالحکیم کے بیان سے بھی ہوتی ہے ——"

اس طرح ایک اچھا سوانحی مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ تنقیدی مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ مکمل سوانح عمری ترتیب دی جا سکتی ہے۔ لیکن براہِ راست مشاہدے سے حاصل ہوئی معلومات کی کمی کی وجہ سے اسے خاکہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کسی خاکہ نگار نے براہِ راست مشاہدے سے حاصل کی ہوئی معلومات کے سہارے نہایت اختصار کے ساتھ چند صفحوں میں شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر بنا دی ہے تو اُسے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ جب میں نے اس شخصیت کو اتنے ہی صفحات میں گرفت میں لے لیا ہے تو اب مزید صفحات لکھنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن اگر کسی مضمون

میں براہِ راست مشاہدے سے حاصل کی ہوئی معلومات بہت کم ہیں یا سرے سے موجود ہی نہیں تو اختصار کے حق میں کہا ہوا یہ جملہ فرسٹ ہینڈ انفرمیشن کی کمی کو چھپانے کے لیے محض ایک حیلہ قرار دیا جائے گا۔

مولوی عبدالحق کا خاکہ 'جناب' میں شامل ہے اور مصطفیٰ زیدی کا خاکہ 'مکرم' میں۔ ان خاکوں میں بڑی حد تک تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ زیدی مرحوم کے خاکے میں پونے تین صفحے کی عظیم الشان تمہید صرف یہ بتانے کے لیے لکھی ہے کہ زیدی صاحب شاعر کی حیثیت سے انا و لا غیری کا دعویٰ نہیں کرتے۔ مجھے یہ تمہید غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پطرس بخاری کا خاکہ بھی تشنہ ہے:

'اس بندہ پر تقصیر نے مرحوم کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔ ان سے خط و کتابت ضرور تھی وہ بھی مختصر۔ دو تین خط میرے نام آئے تھے اور بس۔' (جناب ص ۲۲)

ظاہر ہے اتنے قلیل مواد کے سہارے خاکہ نہیں لکھا جا سکتا۔ خود محمد طفیل نے اس خاکے کو گھاس کاٹنے سے تعبیر کیا ہے اور آخر میں یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ یہ مانگے تانگے کا مضمون ہے۔ لیکن یہ "مضمون" مولوی عبدالحق اور مصطفیٰ زیدی کے خاکوں کے مقابلے میں یقیناً بہتر ہے۔

محمد طفیل کا طویل ترین خاکہ وہ ہے جو حکیم یوسف حسن کے بارے میں ہے۔ یہ خاکہ ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے اور 'مکرم' میں شامل ہے۔ جس طرح دنیائے ادب میں محمد طفیل کی عظمت بڑی حد تک نقوش کی مرہونِ منت ہے۔ نقوش سے محمد طفیل کا اور محمد طفیل سے فوراً نقوش کا خیال آتا ہے۔ اسی طرح حکیم یوسف حسن خاں 'نیرنگ خیال' کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ محمد طفیل کی عظمت میں سے نقوش کو منہا کر دیا جائے تو بھی یہ دنیائے ادب میں اپنے خاکوں کے طفیل کھڑے رہیں گے لیکن حکیم یوسف حسن کی عظمت میں سے نیرنگِ خیال کو منہا کر دیا جائے تو بہت کچھ ہونے کے باوجود شاید آج کچھ باقی نہ بچے۔

اتنے مفصل اور طویل مضمون کو دیکھ کر پہلا سوال معاً یہ ذہن میں اُبھرا کہ کیا یہ خاکہ ہے؟ کہیں محمد طفیل نے خاکے کے بہانے سوانحِ عمری تو نہیں لکھ دی۔ مگر مضمون پڑھ کر اطمینان ہو گیا کہ یہ خاکہ ہی ہے۔ اب دوسرا سوال یہ اُبھرا کہ محمد طفیل نے خلافِ معمول اتنا طویل خاکہ کیوں لکھا؟ میں نے اپنے طور پر اس کا ایک جواب فرض کر لیا ہے اور وہ یہ کہ محمد طفیل نے حکیم یوسف حسن میں اپنی ذات کا عکس دیکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ محمد طفیل نے

حکیم یوسف حسن میں اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ 'نیرنگِ خیال' کو بھی شخصیت" قرار دیتے ہیں:

"آپ کہہ سکتے ہیں نیرنگِ خیال بھی شخصیت ٹھہری؟ میں عرض کروں گا کیوں نہیں، جس نے ذہنوں کو نکھارا ہو، شخصیتوں کو جلابخشی ہو، وہ شخصیت ہی نہیں، اس سے بھی بڑی کوئی بلا ہے۔"

یہی بات نقوش کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

"یہ خدا کی دین ہے کسے معلوم تھا کہ ریلوے کا گڈز کلرک یوسف حسن کبھی نیرنگِ خیال ایسے عظیم رسالے کا خالق ہوگا جو ایک کارِ بلند انجام دے گا اور وہ صاحبِ روایت شخصیت بنے گا، ورنہ ادبی پرچوں کی کہانی تو صرف اتنی ہوتی ہے کہ زن سے نکلے چھن سے غائب۔"

یہی خراجِ تحسین محمد طفیل اور نقوش کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

حکیم یوسف حسن کو احباب نے مشورہ دیا تھا کہ پرچہ نہ نکالنا، یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ تو حکیم صاحب نے جواب دیا تھا:

"اب میں نے جو ارادہ کرلیا ہے اس میں تباہی ہو یا بربادی، اپنے ارادے سے باز نہ آؤں گا اور یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ پرچہ ایسا نکالوں گا کہ اس سے پہلے کے سارے پرچے گرد ہوجائیں گے۔"

محمد طفیل کے عزائم کی کہانی بھی یہی ہے۔

"نیرنگِ خیال کی دھوم زیادہ تر ان کے سالناموں کی وجہ سے تھی۔ ظاہری شان و شوکت بھی ایسی ہوتی تھی کہ دل کھنچتا تھا۔ خوب صورت ٹائیٹل کے ساتھ متعدد رنگین تصویریں ہوتی تھیں۔"

نقوش کی دھوم بھی اس کے خاص نمبروں کی بدولت ہوئی اور ظاہری شان و شوکت میں بھی نقوش نے نیرنگِ خیال کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس طرح کی بہت سی مشترک باتیں اور بھی ہیں جن کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے اور موجبِ طوالت بھی۔

محمد طفیل نے اپنا خاکہ بھی لکھا ہے، جو ان کا ناکام خاکہ ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے جو محمد طفیل کی خاکہ نگاری کے مداح اور معترف ہیں، کہیں اس خاکے پر گرفت کی ہوگی۔ جب

گنجینۂ گوہر محمد طفیل کی نظر سے گزری تو دیکھا کہ اس میں ایک مضمون شاہد احمد دہلوی نے اپنے بارے میں لکھا ہے چنانچہ محمد طفیل نے فوراً بدلہ چکا دیا کہ یہ مضمون "در مدح خود" کی ذیل میں آتا ہے ۔ جی ہاں ضرور آتا ہے ، اس قسم کے سارے ہی مضامین در مدح خود کی ذیل میں آتے ہیں ۔ اٹھارہ معاشقوں کا ذکر بھی حقیقت نگاری نہیں ، در مدح خود ہی کی ذیل میں آتا ہے ۔ اپنا خاکہ ہو ، اپنی ذات کو مرکز بنا کر لکھی گئی آپ بیتی ہو یا خود نوشت سوانحعمری ۔ اور خود نوشت سوانحعمری روسو کی ہو ، عبد الماجد دریا بادی کی ہو یا جوش ملیح آبادی کی —— سب در مدحِ خود کی ذیل میں آتی ہیں ۔ سید عبد اللہ نے بڑے کام کی بات کہی ہے —— لکھتے ہیں :

"روسو نے اپنے اعترافات ضرور لکھے مگر مجھے روسو کی روحانی شوریدگی کے پیشِ نظر پورا بھروسہ نہیں کہ اس نے سب سچ لکھا ہو ۔ لوگوں کو یہ دھوکا ہے کہ اس نے اپنی بے لگام زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتا کر بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے ، لیکن یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ روسو کے عہد میں اس قسم کے ادب کی مانگ تھی اور اس قسم کی اشتہار بازی سے شہرت کا بازار گرم کیا جا سکتا تھا اس دور میں مغرب میں یہ خیال ہو چلا تھا کہ ادیبوں اور دانشوروں کے لیے جنسی بے راہروی خوبی کی بات ہے ایسی کہانیوں میں لوگ دلچسپی لیتے تھے (اور بعض اوقات شاید ایسی باتوں کو ادیب کی خصوصیت سمجھتے تھے) ممکن ہے روسو نے اشتہار بازی کی ہو ۔" (میر امن سے عبد الحق تک ص ۳۰۷)

خود نوشت سوانح یا خاکے میں سرشاریوں اور کامرانیوں کا تذکرہ ہو یا محرومیوں اور ناکامیوں کا ، دونوں صورتیں در مدح خود کی ذیل میں آتی ہیں ۔ موخر الذکر صورت میں اپنی جگر داری ، تحملِ مصائب اور مظلومیت کی داد وصول کی جاتی ہے بلکہ اپنی حماقتوں اور بدحواسیوں کا تذکرہ بھی در مدح خود کی ذیل میں آتا ہے کیونکہ فنکار پورے فنکارانہ سلیقے سے یہ جتا رہا ہوتا ہے کہ اپنی ذات کو ہدفِ مزاح بنانا ایک بڑی شخصیت کا متقاضی ہے ۔ دیکھو میں ایک عظیم آدمی ہوں ۔ لے دے کے ایک مشتاق احمد یوسفی باقی رہ جاتے ہیں جن کی زرگزشت کی ان دنوں بڑی دھوم ہے ۔ بقول ان کے یہ ان کی سوانح نوعمری ہے ۔ مزاح میں یوسفی کا (اور بالخصوص اس کتاب کا) مقام بہت بلند ہے ۔ زرگزشت (نوعیت مزاح کے فرق سے

قطع نظر) پطرس کے مضامین کے بعد اردو مزاح کی بہترین کتاب ہے لیکن میں اسے خود نوشت سوانحمری ماننے کو تیار نہیں۔ اس میں مرکزی اہمیت یوسفی کی ذات کو نہیں، دوسرے کرداروں کو حاصل ہے۔ خود کہتے ہیں:

"ممکن ہے بعض پڑھنے والوں کو اس خود نوشت سوانحمری میں لکھنے والا خود کہیں نظر نہ آئے۔ اگر ایسا تاثر ہے تو یہ عین قرینِ حقیقت ہوگا اس لیے کہ اپنی زندگی میں بھی ہر قدم پر دوسرے ہی دخیل نظر آتے ہیں۔ عام آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی زندگی میں صرف تین موقعے ایسے آتے ہیں جب وہ تنہا سب کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے عقیقہ، تدفین اور نکاح۔ اس کتاب کا مرکزی کردار کون ہے؟ راقم الحروف؟ مسٹر اینڈرسن؟ وہ فرزانے جن کے دم سے کوچۂ سود خواراں شاد و آباد ہے؟ یا زمانے کی رو، جو ایلس ان ونڈر لینڈ کی بلی کی طرح خود تو فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے لیکن اپنی امر مسکراہٹ پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔" (ص ۱۲-۱۱)

یوسفی تو بسا اوقات ایک ناظر ہی کے رُوپ میں سامنے آتے ہیں اور جہاں وہ کردار کی حیثیت سے موجود ہیں وہاں بھی UNDER ACT کرنے پر مجبور رہیں۔ اگرچہ بعض اوقات انھوں نے جان بُوجھ کر بھی ایسا کیا ہے کہ یہ بھی تخلیقِ مزاح کا ایک مسلّمہ اور موثر حربہ ہے پھر یہ فرق بھی ملحوظ رہے کہ یوسفی کا بنیادی مقصد اپنی ذات کا انکشاف نہیں، تخلیقِ مزاح ہی ہے۔ الغرض زرگزشت اگر درمدح خود نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر اپنے بارے میں ہے ہی نہیں۔ اگر یہ سوانحمری یا خاکہ ہوتی تو یہ بھی درمدح خود ہوتی بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جن جن صورتوں میں یہ سوانحمری ہے ان ان صورتوں میں یہ اب بھی درمدح خود ہے ——— کہنا یہ مقصود ہے کہ خود نوشت سوانح تو پھر ایک خاص حد تک ممکن ہے، خود نوشت خاکہ، خاکہ نگاری کے مخصوص فنی تقاضوں کے تحت یکسر ناممکن ہے۔ اس قسم کے مضامین کو جن میں مصنّف نے اپنی ذات کو مرکز بنا کر اپنے بارے میں کچھ باتیں کہی ہوں خاکہ نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ایسے مضامین کو خاکے کی کڑی شرائط پر جانچنا چاہیے۔ ایسے کسی مضمون میں اگر لہجہ انکسار آمیز ہے، خودستائی مبالغہ آمیز نہیں، بےجا مظلومیت کا تاثر دینے کی کوشش نہیں کی گئی، اپنی شخصیت کو روشن کرنے کے لیے دُوسروں کے چراغ نہیں بجھائے گئے، ممکن حد تک "اپنا ہاتھ اور اپنا گریباں" پہ عمل کیا ہے، اتفاقات کو اپنا شرف منوانے کی کوشش نہیں کی گئی، اپنی نمایاں کمزوریوں کی

طرف معنی خیز اشارے موجود ہیں ، لکھنے والے نے حتی الامکان اپنی علمی شخصیت کو اپنی عملی شخصیت کے ساتھ گڈ مڈ نہیں کیا (یہ بہت بڑی شرط ہے) تو اسے کافی سمجھنا چاہیے ۔ یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ ہر گفتنی و ناگفتنی بات "درج گزٹ" ہوگی ۔ وہ واقعات جنھیں کوئی شخص خود اپنے آپ سے چھپاتا ہے ، ہمارے مطالعے کے لیے کیسے شائع کر سکتا ہے چنانچہ کچھ واقعات کے اِخفا کی اجازت دینی ہوگی ، خواہ یہ واقعات شخصیت کے اہم پہلوؤں ہی سے متعلق ہوں ۔ واقعات کی تعبیر و توجیہ میں تمامتر انصاف پسندی کے باوجود مصنّف کا اپنا زاویۂ نظر ضرور دخیل ہوگا ، اسے گوارا کرنا ہوگا ۔

مدیرِ نقوش (طفیل صاحب کا اپنا خاکہ) "جناب" میں شامل ہے بعض واقعات کے بارے میں صاف صاف اعتراف کر لیا ہے کہ میں انھیں قلم بند نہیں کر سکتا ۔

"ان سارے واقعات پر یہ کبھی ناول ہی لکھیں گے جس کی ضخامت کوئی چھ سو صفحات تو ہوگی ۔"

اس مضمون میں محمد طفیل نے اپنی یہ خصوصیات گنوائی ہیں :

شرافت ، حیا ، نفاست ، مضبوط قوتِ ارادی اور عزم و استقلال ، شرمیلاپن ، بعض دُنیوی معاملات میں گھامڑ پن ، ماں سے عقیدت[1] ، کم سخنی ، نقوش سے حد درجہ کی محبت ، مدیرِ نقوش ہونے پر حد درجہ مگر بجا ناز و تبختر ، (اس مضمون کا عنوان بھی محمد طفیل نہیں مدیرِ نقوش ہے) قیافہ شناسی ، پتنگ بازی سے رغبت ، کرکٹ سے دلچسپی ، شہرت ، انسان دوستی یا غریب دوستی ، رقّتِ قلب ، نفاست پسندی کے باوجود میز کی اشیا میں بے ترتیبی اور انتشار کا عالم ——— مدیرِ نقوش نے اپنے خاکے میں خلوص کو کوئی نمایاں مقام نہیں دیا بلکہ اسے دوسری خصوصیات میں خلط ملط کر کے اپنی شخصیت کی تصویر بنائی ہے ہم جانتے ہیں کہ شخصیت نگار دُوسروں کو بے نقاب کرنے میں خود بھی بے نقاب ہو جاتا ہے ۔ اس کے عادات و اطوار ، رجحانات و میلانات ، اس کے عقائد و اوہام اور اس کی پسند اور ناپسندیدگی کو جاننے کیلیے اس کی اپنی تحریر جو اصلاً دوسروں کے بارے میں ہوتی ہے ، اس کی اپنی شخصیت کا آئینہ بن جاتی ہے ۔ عبدالحق نے نام دیو مالی کی فرض شناسی ، کام کی لگن ، اپنے پیشے سے والہانہ محبت

---

[1] اس خاکے کا جاندار حصہ وہ ہے جس میں والدہ کا ذکر ہے ۔ یہ بجائے خود ایک ضمنی خاکہ ہے ۔ (ر ۔ ل)

اور جذبۂ خدمت پر بہت زور دیا ہے ۔ یہ باتیں عبدالحق کی اپنی شخصیت میں بھی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہیں؛ رشید احمد صدیقی نے ایوب کی دلسوزی اور جذبۂ خدمت کو سراہا ہے ۔ مولانا ابوبکر اور مولانا سلیمان اشرف کی علم دوستی ، مادی تمتعات سے بے نیازی اور مشرقی شائستگی پر زور دیا ہے ۔ خورشید احمد صدیقی نے بھی انہی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اسی طرح محمد طفیل نے اپنے اکثر خاکوں میں شخصیتوں کا خلوص ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے ۔ اگر خلوص کی ایک رتی بھی انھیں کہیں دکھائی دے گئی ہے تو انھوں نے اسے چمکا کر ضیا پاش بنا دیا ہے ۔ مخلص آدمی خلوص ہی ڈھونڈے گا اور اسی کو اہمیت دے گا ۔ دوسری نمایاں بات ، جو ان خاکوں کی روشنی میں محمد طفیل کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ محمد طفیل توازن کو بہت اہمیت دیتے ہیں شخصیت میں بھی ، شخصیت نگاری میں بھی ۔ ان کے نزدیک برائیاں یا شخصیت کی بشری کمزوریاں منافیِ انسانیت نہیں ، لیکن عظمت برائی کو نہیں نیکی ہی کو حاصل ہے ——— میرا خیال ہے کہ ایک خاکہ نگار کا صحیح مزاج یہی ہونا چاہیے ۔

طفیل صاحب ایک موقر ادبی رسالے کے مقتدر مدیر ہیں ، ایک ایسے مدیر جو منٹو جیسے چوٹی کے ادیب کا افسانہ یہ کہہ کر لوٹا سکتے ہیں کہ یہ معیاری تخلیق نہیں ۔ ان کے پرچے میں چھپنا اہلِ قلم کے لیے موجبِ عزت ہے ۔ وہ ایک اشاعتی ادارے کے مالک بھی ہیں ، پھر وہ کتابوں اور مضامین پر مصنفین کو معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں ۔ سرکاری حلقوں میں بھی ان کی آواز کو کسی نہ کسی حد تک اہمیت دی جاتی ہے وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ چوٹی کے ادیب اور شاعر انھیں اپنے جھگڑوں میں حَکَم بنانا چاہیں ——— چنانچہ انھیں اہلِ قلم سے ملنے ، ان کے حالات جاننے ، ان کے ساتھ مراسلت کرنے ، مستقل رابطہ قائم رکھنے ، انھیں قریب سے دیکھنے اور پرکھنے اور بالخصوص کسی ادیب کے مالی معاملات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل اور الجھنوں کو سمجھنے اور پہچاننے کے بہتر مواقع حاصل ہیں اور محمد طفیل نے ان مواقع سے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے ۔ ان کے خاکوں میں بعض اہلِ قلم کے بارے میں ایسی باتیں بھی موجود ہیں جو منظرِ عام پر نہ آ سکتیں اگر محمد طفیل نقوش کے ایڈیٹر نہ ہوتے اور نقوش اتنا عظیم ادبی رسالہ نہ ہوتا ۔

مگر میرا خیال ہے کہ طفیل صاحب کی اسی قابلِ رشک پوزیشن نے خاکہ نگاری میں ان کا رستہ روکا بھی ہے ۔ بعض لوگ ان کے سامنے کھلے نہیں کیونکہ انھیں تو خط لکھنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا ۔ لوگ جانتے تھے کہ یہ صاحب خطوط نمبر اور مکاتیب نمبر کے چکر میں رہتے ہیں ۔ پھر

طرّہ یہ کہ خاکہ نگار بھی ہیں ان کا سامنا کرنا مووی کیمرے کا سامنا کرنے کے مترادف ہے ۔[1]
اس لیے احتیاط لازم ہے ۔ جب آدمی کیمرہ کانشس ہوجائے تو اصل شخصیت کی بجائے شخصیت کا خول سامنے آجاتا ہے ۔ لطیفہ ہے کہ کسی علمی محفل میں کچھ اس قسم کا موضوع زیرِ بحث تھا کہ افتادِ طبع کے اعتبار سے انسانوں کو کتنے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ ایک نے کہا : " انسانوں کی دو ہی قسمیں ہوتی ہیں : دروں بیں اور بیروں بیں ۔"

دوسرے نے کہا : " یہ کوئی واضح تقسیم نہیں ۔ انسانوں کی زمرہ بندی دو گروہوں میں کی جاسکتی ہے : رجائی اور قنوطی ۔"

ایک پولیس افسر بھی محفل میں موجود تھے ، بولے : " یہ سب باتیں غلط ہیں ۔ ہمارے نزدیک تو آدمیوں کی دو ہی قسمیں ہیں :

ایک وہ جن کے قلندرے کھل چکے ہیں ۔

دوسرے وہ جن کے قلندرے ابھی نہیں کھلے ۔"

طفیل صاحب کے ہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے ۔ ہر ادیب جو ان کے قریب گیا یا نقوش کے صفحات پر ابھرا ، طفیل صاحب نے اس کا قلندرا کھول دیا ۔ بے چارے ادیب کو بھی معلوم ہوجاتا تھا کہ اس کا قلندرا کھل گیا ہے ۔ اب بہت محتاط رہنا پڑے گا ۔ اس قسم کی احتیاط اخفائے حقائق پر مجبور کرتی ہے ۔ اس صورتِ حال میں بدحواسیاں بھی سرزد ہوتی ہیں جو غلط نتائج کی بنیاد بھی بن سکتی ہیں ۔ غالب کو ۱۸۵۰ء ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے خطوط اشاعت کی غرض سے جمع کیے جارہے ہیں مگر اس کی رندی بے ریا تھی ، اس لیے اس نے اپنے انتقال ۱۸۶۹ء تک شراب پینے اور بھیک مانگنے سے پہلے نقاب ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی —— لیکن ہر شخص غالب نہیں ہوتا ۔

مخاطب کی حیثیت کے پیشِ نظر بیان کا زاویہ بدل بھی سکتا ہے اور اس کا مجموعی تاثر تو لازماً بدل جاتا ہے ۔ مثلاً کسی قابلِ اعتراض شرارت کا بیان اور اس کا مجموعی تاثر حسبِ ذیل صورتوں میں مختلف ہوگا ،

۱ ۔ بے تکلف اور ہم مشرب احباب کے سامنے

---

[1] فراق جیسے آدمی کو بھی اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر طفیل صاحب سے کہنا پڑا کہ یہ باتیں آف دی ریکارڈ ہیں ۔

۲۔ کسی ناصح مشفق قسم کے دیندار دوست کے سامنے۔

۳۔ مشفق استاد یا شیخ طریقت کے سامنے۔

۴۔ والدین کے سامنے۔

۵۔ پولیس انسپکٹر کے سامنے۔

چنانچہ موضوعِ خاکہ کے بیانات، مکالمات اور خطوط پر انحصار خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ محمد طفیل نے بیانات و مکالمات درج تو بہت کیے ہیں مگر ان پر بہت کم انحصار کیا ہے۔ اور جہاں انھیں ایسا کرنا پڑا ہے وہاں بھی انھوں نے اس مواد کو شخصیت کے دوسرے مظاہر سے ملا کر دیکھا ہے اور بالعموم استنباطِ نتائج میں اس مواد کو اتنی ہی اہمیت دی ہے جتنی شخصیت کے دوسرے مظاہر سے حاصل ہونے والے مجموعی تاثر کی روشنی میں دی جا سکتی تھی۔

کسی شخص کے تضادات کی تحلیل اور ان تضادات میں مطابقت کی تلاش بہت مشکل کام ہے اور اس امرِ خاص میں محمد طفیل کا مقابلہ کوئی دوسرا خاکہ نگار نہیں کر سکتا۔ شخصیت کے متخالف اور متضاد پہلوؤں کا ذکر تو سبھی خاکہ نگار حسبِ توفیق کر لیتے ہیں لیکن تضادات میں وہ "رابطہ" ڈھونڈ نکالنا جو انھیں ہم آہنگ کر کے شخصیت کے متخالف و متصادم عناصر کو ایک اکائی کی شکل عطا کر دے، طفیل اور شاید صرف طفیل کے حصے میں آیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے نیاز، جوش اور صادقین کے خاکے معیاری خاکے ہیں اور نئے خاکہ نگار ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ البتہ ممتاز مفتی کے خاکے میں محمد طفیل اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے۔ حالانکہ اس خاکے پر، اس خاص زاویے سے سب سے زیادہ محنت ہوئی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہاں ناکامی کا سارا الزام محمد طفیل کے سر تھوپنا مناسب نہ ہو گا۔ کیونکہ اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی کی شخصیت ہی ابھی تک کٹھالی میں ہے۔

محمد طفیل کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ شخصیت کی کلید ہاتھ آ جائے۔ کوئی ایسی کلید جس سے قصرِ شخصیت کے تمام بند دروازے کھل سکیں، شخصیت کے تمام مظاہر کی توجیہ کی جا سکے۔ وہ حکمران جذبہ یا چند جذبوں کی کوئی ایسی ہئیتِ ترکیبی ڈھونڈ نکالی جائے جسے شخصیت کی تمام خوبیوں اور کمزوریوں کا مصدر و ماخذ قرار دیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہے، لیکن اگر اس کوشش میں کامیابی حاصل ہو جائے تو مزاج اور شخصیت کی ایک ایسی قابلِ اعتماد تصویر بنائی جا سکتی ہے جسے خاکہ نگاری کا منتہا قرار دیا جا سکے۔ محمد طفیل نیاز فتح پوری کے بارے میں

لکھتے ہیں :

"چونکہ شرارت اور اُپج سے نیاز صاحب کا خمیر اُٹھا ہے اس لیے بے مہار بھی چلے۔" (آپ ص ۲۵)

نیاز صاحب کے مذہبی افکار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"نہ تو انھیں روایتی قسم کے اسلام سے کوئی دلچسپی ہے، نہ شیعوں سے، نہ سُنّیوں سے اور نہ غریب احمدیوں سے۔ یہ تو کوئی اچنبھے کی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جس سے لوگوں کے کان کھڑے ہوں اور انھیں اپنی علمیت کے جوہر دکھانے کا موقع ملے۔ یہ تو صرف اپنی قابلیت اور علمیت کی وجہ سے سب کو نالائق ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ انا بھی کیا بُری بلا ہے۔" (آپ ص ۲۹)

اختر اورینوی کے بارے میں لکھا ہے :

"مذہب اور رومان، انھی دو حقیقتوں میں اختر صاحب گم ہیں۔ آئیے انھیں ڈھونڈ نکالیں۔" (آپ ص ۱۷۹)

صادقین کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ہماری نیک اطواری میں خوفِ خدا کم ہے، خوفِ دنیا زیادہ ہے۔ لیکن ان کی پاک بازی میں خوفِ خدا زیادہ، خوفِ دنیا کم ہے۔ یہی وُہ بنیادی نکتہ ہے جس پر صادقین کی شخصیت اور فن کا خمیر اُٹھا ہے۔" (معظم ص ۱۱۲)

شخصیت کا کوئی مطالعہ نفسیاتی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں۔ شخصیت کے مختلف عناصر میں کسی رشتے کی تلاش، مختلف اور متضاد واقعات و مظاہر کی توجیہ و تعبیر اور مظاہرِ شخصیت کے پیچھے چھپے ہوئے نفسی عوامل کی تفہیم کے لیے نفسیاتی بصیرت سے کام لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ واقعات اور مظاہرِ شخصیت تو سپردِ قلم کئے جا سکتے ہیں، ان واقعات و مظاہر میں شخصیت کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن شخصیتوں کے مطالعے میں فرائڈ، یونگ یا کسی اور ماہرِ نفسیات کے بنے بنائے سانچوں سے کام لینا اور انھی پر انحصار کرنا خطرناک ہے۔ نفسیات کا علم ہمیں شخصیت کا کھوج لگانے میں مدد ضرور دیتا ہے مگر کسی سکّہ بند نظریے کی روشنی میں شخصیت کا مطالعہ چنداں مفید نہیں ہوگا۔ اس سے کسی ماہرِ نفسیات کے مزعومات کی تائید تو ہو سکے گی، شخصیت کا کھوج نہیں لگایا جا سکے گا۔ شخصیت نگاری میں نفسیات کے سکّہ بند نظریات نہیں نفسیاتی

بصیرت کام دیتی ہے (البتہ یہ مسلّم ہے کہ نفسیات کے مختلف مکاتبِ فکر اور مختلف ماہرینِ نفسیات کے افکار کا مطالعہ نفسیاتی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے) محمد طفیل نے اپنے خاکوں میں ماہرینِ نفسیات کے مزعومات یا ڈھکوسلوں سے نہیں نفسیاتی بصیرت سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر احمد ندیم قاسمی کے خاکے سے دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

"جو ذرا سا جرأت کے ساتھ سوچنے لگتا ہے، ہم اسے کمیونسٹ کہہ کر اس سے زیادتی پر اُتر آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ انہی نظریات پر راضی ہو جاتا ہے۔"

(صاحب ص ۵۶)

"حقیقت یہ ہے کہ انھیں خفا ہونا آتا ہی نہیں۔ خفگی کے موقع پر یہ بڑے اوپرے اوپرے معلوم ہوتے ہیں اور اس وقت ان کی حالت بڑی عجیب ہوتی ہے جیسے کہہ رہے ہیں کہ "بھئی! اب میں خفا تو ہو گیا ہوں لیکن اسے نبھاؤں کیسے!"

(صاحب ص ۷۰)

شوکت تھانوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آپ فرسٹ کلاس قسم کے بزدل ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار ہیں، اگر اپنا دل مضبوط ہوتا تو لوگوں کو رُلانے پر بھی قادر ہوتے اور پھر آپ شوکت تھانوی نہ ہوتے، علامہ راشد الخیری ہوتے۔" (صاحب ص ۹۳)

میں نے یہاں ان خاکوں کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا جن میں نفسیاتی طریق کار اختیار کر کے نفسیاتی حربوں سے شخصیتوں کے قفل کھولنے کی کوشش کی گئی ہے، کیونکہ وہاں تو نفسیاتی بصیرت قدم قدم پر ملے گی۔ مجھے تو یہ بتانا ہے کہ نفسیاتی بصیرت سے محمد طفیل نے تقریباً ہر خاکے میں کام لیا ہے۔ اور یہ ان کے طریقِ کار کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

شخصیت نگاری میں مفروضہ بہت احتیاط چاہتا ہے۔ جملوں کی حد تک اس کی مثالیں لگ بھگ ہر خاکہ نگار کے ہاں مل جائیں گی مگر محمد طفیل کے ہاں یہ ٹھوک کے حساب سے بھی ملتا ہے۔ منٹو کے خاکے میں عالمِ بالا سے منٹو کا ایک خط بھی شامل ہے۔ یہ نہایت کامیاب کوشش ہے۔ اس خط میں منٹو کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ نقوش نے منٹو پر ایک خاص نمبر بھی شائع کیا ہے۔ اس ضخیم نمبر کے بالاستیعاب مطالعے سے منٹو کی جو تصویر اُبھرتی ہے، وہی تصویر اس خاکے میں بھی چھوٹے پیمانے پر موجود ہے۔ جگر مراد آبادی کے خاکے میں ایک جگہ یہ ظاہر کرنا

مقصود ہے کہ "جگر صاحب گفتگو میں اضافتوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں جس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کسی پڑھے لکھے انسان سے ہو رہی ہیں لیکن ان میں روانی مفقود ہوتی ہے۔ پھر باتوں ہی باتوں میں کہیں کے کہیں نکل جائیں گے اور سامع بے چارہ وہیں کا وہیں بیٹھا رہ جائے گا۔ کوشش کریں گے کہ اسے اس دنیا کی بھی سیر کرا دیں اور اُس دنیا کی بھی۔ ان کی باتیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں" ــــــ اس کے بعد وادین میں جگر صاحب کی گفتگو کا نمونہ دیا ہے جو پُورے ایک صفحے کو محیط ہے۔ اگر یہ ریکارڈ کی ہُوئی تقریر نہیں تو محمد طفیل مستحق ہیں کہ انھیں اس کمالِ صناعی کی داد دی جائے۔

سعادت حسن منٹو نے اپنے متعدد کرداری افسانوں میں بُرے لوگوں کے باطن میں چھپی ہوئی نیکی کی رُوح یا فطرتِ سعید کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً موذیل جو عفت اور حیا جیسے نسوانی محاسن سے یکسر عاری ہے، کرپال کور اور ترلوچن کے حق میں فرشتہ ثابت ہوتی ہے اور اپنے ایثار کا انمٹ تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ بابو گوپی ناتھ ایک رنڈی باز ہے مگر زینت کے معاملے میں اپنی انسانیت، دلسوزی اور شرافتِ نفس کی داد وصول کیے بغیر نہیں رہتا۔ ممی بدمعاش اور بدنام دلّالہ ہے مگر منٹو نے اس میں بھی انسانیت ڈھونڈ نکالی ہے بلکہ ان کہانیوں کا مقصود ہی ان کرداروں کی عظمت کا سکہ جمانا ہے۔ گویا منٹو کہتا ہے بُرے اور بدنام لوگ بھی اتنے بُرے نہیں ہوتے جتنا بُرا انھیں سمجھ لیا جاتا ہے، آدمی کتنا ہی بُرا ہو اس کی فطرتِ سعید اُس کے اندر کہیں نہ کہیں خوابیدہ شکل میں موجود رہتی ہے اور موقع پاتے ہی اظہار کے لیے بے تاب ہو جاتی ہے۔ محمد طفیل کا واسطہ افسانوی کرداروں سے نہیں معاصر شخصیتوں سے ہے، جو دنیائے علم و فن کی عظیم ہستیاں ہیں۔ ان میں سے بعض کی شخصیتیں متنازعہ فیہ ہیں۔ محمد طفیل کہنا چاہتے ہیں کہ ظاہر بین نگاہوں نے انھیں صحیح رُوپ میں نہیں دیکھا یا ان کی بعض کمزوریوں کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے جس سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اس طرح وُہ عظیم ہستیاں بعض حلقوں میں معتوب، ناپسندیدہ یا بدنام سمجھی گئیں۔ جو لوگ اچھے ہیں وہ تو بعض پیاری پیاری کمزوریوں کے باوجود اچھے ہی ہیں۔ یہ لوگ جو بُرے سمجھے جاتے ہیں اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود اتنے بُرے آدمی نہیں جتنا انھیں سمجھ لیا گیا ہے۔ انسانیت کا جوہر ان میں بھی موجود ہے۔ آئیے میں آپ کو ان کی فطرتِ سعید کی ایک جھلک دکھاؤں:

"صادقین مومن نہیں کافر ہے مگر اتفاق کہ زاہدوں سے زیادہ پاکباز ہے۔"

(معظم ص ۱۱۲)

"یہ بنے ہوئے شرافتیوں سے زیادہ شریف ہیں۔۔۔۔۔ بُرائیاں ڈھونڈنے والوں کو مفتی میں بہت سی بُرائیاں بھی مل جائیں گی مگر انھیں بھی ریا کاری نہ ملے گی۔۔۔۔۔ میں نے ان میں بے اندازہ خلوص پایا۔۔۔۔۔ وقت پڑنے پر دشمنوں کے بھی کام آتے ہیں۔" (معظم ص ۴۱ تا ۵۴)

"اختر شیرانی جیسا ناقابلِ اصلاح شرابی، جس کی والدہ بھی اس کی موت کی دعائیں مانگتی تھی: اخلاص، حیا، سادگی، بھولپن، دردمندی اور دوست نوازی جیسی عظیم صفات کا پیکر تھا۔" (جناب، ملخص ص ۴۷ تا ۶۴)

"کیا خبر تھی کہ جب اسی کافر اور ملحد (= نیاز فتح پوری) سے ملاقات ہوگی تو وہ کئی عابدوں سے بہتر انسان ثابت ہوگا۔" (آپ ص ۲۵)

محمد طفیل بھی منٹو کی طرح انسان کی فطرت سعید کے اچھے جوہری ہیں۔

محمد طفیل ایک خاکہ نگار ہیں اور خاکے کے فن کو خوب سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنے خاکوں میں کامیاب رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب کسی قدر تفصیل کا طالب ہے۔ خاکہ نگار کو موضوعِ خاکہ کی شخصیت کو روشنی میں لانے کے لیے تین قسم کی باتوں کا ذکر کرنا پڑتا ہے:

۱۔ وہ باتیں جنھیں اخلاقی محاسن سمجھا جاتا ہے، جیسے حیا، خلوص، معصومیت، رواداری، ایثار، تحمل، خوش معاملگی اور تبحرِ علمی وغیرہ۔

۲۔ وہ باتیں جنھیں اخلاقی معائب سمجھا جاتا ہے، جیسے مغلوب الغضبی، خود غرضی، الحاد، بد زبانی اور جنسی بے راہروی وغیرہ۔

۳۔ وہ باتیں جنھیں نہ اخلاقی خوبیاں سمجھا جا سکتا ہے نہ خامیاں، جیسے ایک خاص قسم کا لباس پہننا، کرسی پر اکڑوں بیٹھنا، ایک خاص انداز میں چلنا، بلند آہنگ قہقہے لگانا، بلیاں یا کبوتر پالنا، پتنگ اڑانا، ہجوم میں بدحواس ہوجانا، چٹپٹی چیزیں کھانا، حُقّے یا پان سے رغبت، گرمیوں میں گرم پانی سے غسل کرنا، خوشی کے موقعے پر غمگین ہوجانا، یادوں سے جی بہلانا، خیالی پلاؤ پکانا وغیرہ۔

جہاں تک پہلی اور تیسری قسم کی باتوں کا تعلق ہے محمد طفیل کامیاب رہے ہیں بلکہ بعض جگہ ان کی کامیابی رشک انگیز حد تک پہنچ گئی ہے۔ دوسری قسم کی باتیں لکھتے ہیں، متعدد موانع کے باوجود،

وہ دوسرے خاکہ نگاروں سے کہیں زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ اس جواب سے ایک اور سوال ابھر آیا کہ اگر محمد طفیل کامیاب خاکہ نگار ہیں تو اردو خاکہ نگاری میں ان کا مقام کیا ہے؟ جب میں نے اس سوال پر غور کیا تو بہت اُلجھن ہوئی۔ اگر ان کے کام کی مقدار کو پیشِ نظر رکھا جائے تو وہ اردو کے سب سے بڑے خاکہ نگار ٹھہرتے ہیں۔ ایک نہ دو، اکٹھے سات مجموعے! "محترم"[1] کو نکال بھی دیجئے تو بھی چھ مجموعے! دوسری بات یہ سامنے آئی کہ خاکہ نگاری میں بیشتر خاکہ نگاروں کی دلچسپی جزوقتی رہی ہے۔ خاکہ نگاری ان کی ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا صرف ایک پہلو ہے۔ فرحت اللہ بیگ مضمون نگاری کرتے کرتے بعض اچھے خاکے بھی لکھ گئے۔ مولوی عبدالحق تحقیق، تنقید، تاریخ، لغت اور لسانیات جیسے علمی مشغلوں کے آدمی تھے۔ چند ہمعصر بھی لکھ گئے۔ رشید احمد صدیقی بنیادی طور پر طنز نگار تھے، تنقید اور شخصیت نگاری سے بھی دلچسپی لیتے رہے۔ سعادت حسن منٹو افسانہ نگار تھے 'گنجے فرشتے' بھی لکھ گئے جو ان کے افسانوی عمل ہی کی ضمنی پیداوار (BY PRODUCT) معلوم ہوتی ہے جبکہ محمد طفیل نے صرف خاکے لکھے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ یک فنے ہیں۔ اگرچہ ان کے خاکوں کو بھی تدوین نقوش کے عمل کا BY PRODUCT قرار دیا جا سکتا ہے مگر تخلیق کے میدان میں یک گیرو محکم گیر کے اصول کے تحت اُنھوں نے شخصیت نگاری ہی کو اپنا میدان قرار دیا اور دوسرے میدانوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ خاکہ نگاری سے ان کی دلچسپی جزوقتی نہیں۔ یہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

پیشہ ور نقاد اسے میری کمزوری سمجھیں یا مجبوری (تاہم میں اس پر نادم نہیں نازاں ہوں) کہ خاکوں کا مجموعہ یا انشائیوں کا، ناول ہو یا ڈراما ——— میں جب بھی کوئی کتاب پڑھوں یہ ضرور دیکھتا ہوں کہ حسن خیر اور صداقت کو چمکانے، آگے بڑھانے، دلوں میں اتارنے یا دلپذیر بنانے میں مصنف نے کوئی دلچسپی لی ہے یا نہیں ——— اس کتاب سے کوئی صالح نظام اقدار

---

[1] "محترم" خاکوں کا مجموعہ نہیں۔ خود مصنف نے اسے "ایک سفر نامہ ایک تذکرہ" قرار دیا ہے۔ البتہ اس میں مختلف اشخاص کے بارے میں کچھ چہرہ نما پیراگراف ہیں۔ شرکائے مجلس کی بعض سرگرمیوں کا تذکرہ ہے، ادیبوں کی گفتگو ہے، کراچی کے بعض احباب سے ملاقاتوں کا ذکر ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ شخصیتوں کے خط و خال واضح کیے جائیں۔ یہ خاکوں کا مجموعہ نہ سہی لیکن ہے بڑی حد تک شخصیت نگاری ہی کے دائرے کی چیز۔

اُبھرتا ہے یا نہیں؛ اس کتاب میں کتنی عبارتیں، پیراگراف یا جملے ایسے ہیں جو نیکی کی عظمتوں کے نقیب ہیں اور انسانیت پر اعتماد سکھاتے ہیں؛ کتاب میں کہیں کوئی نوائے سینہ تاب سنائی دیتی ہے یا نہیں؛

اس نقطۂ نظر سے ان سات مجموعوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بے عیب ذات خدا کی ہے۔ ہم جس طرح کے انسانوں میں گھرے ہوئے ہیں، وہ خُوبیاں بھی رکھتے ہیں اور خامیاں بھی۔ خُوبیوں کی قدر کرنا سیکھو۔ خامیاں منافیٔ عظمت ہیں مگر خامیوں سے بَری نہ آپ ہیں نہ میں۔ پہلا پتھر وہ مارے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ وہ لوگ عظیم ہیں جو مولوی عبدالحق کی طرح دیوانگی کی حد تک کسی اعلیٰ نصب العین سے وابستہ ہیں۔ ان کے جنونِ عشق کے طفیل ان کی چھوٹی موٹی خامیوں سے درگزر کیجیے۔ یاد رکھو "تاریخ یا تو غداروں کو یاد رکھتی ہے یا اپنے محسنوں کو۔" پھکڑپن کوئی اچھی بات نہیں۔ لیکن ریاکاری کے مقابلے میں تو پھکڑپن ہی بہتر ہے۔ آدمی کی ہزار مجبوریاں ہوتی ہیں، اس کی کمزوریوں پر گرفت کرنے سے پہلے اس کی مجبوریوں پر بھی ایک نظر ڈال لیا کرو۔ دوستی تبادلہ منفعت ہی نہیں ایک مقدس رشتہ بھی ہے اس رشتے کی تقدیس کو پہچانو۔ اس آبگینے کو ٹھیس نہ لگنے دو۔ عظیم ہیں وُہ دوست جو خفا نہیں ہوتے اور عظیم تر ہیں وہ دوست جو خفا ہونے کے بعد منانے میں پہل کرتے ہیں اور پھر جائز شکایت کو بھی یوُں بھول جاتے ہیں جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ اچھا آدمی وُہ ہے جو دوسروں کے لیے جیتا ہے" وہ لوگ جو دُوسروں کے لیے جیتے ہیں وہ مرا نہیں کرتے۔" اگر آپ اپنے مسائل میں گھرے ہونے کی وجہ سے اس بلند معیار پر پُورے نہیں اُتر سکتے تو بھی آپ سے کم از کم یہ توقع ضرور کی جائے گی کہ آپ دوسرں کے لیے بے ضرر ہوں۔ دنیا میں متاعِ شادمانی بہت کم ہے، اس لیے اپنے عادات و اخلاق، اپنے معاشرتی رویے، اپنی بات چیت اور میل جول سے اس ذخیرے میں اضافہ کرتے رہو۔ دنیا میں خود غرضی بڑھ رہی ہے، معاشرہ ریاکاری، منافقت اور زرپرستی کا جہنم بن گیا ہے۔ آگ میں پھول کھلانے کی کوشش کرتے رہو۔ یہ درست ہے کہ "سُولی پر لٹکنا آسان ہے، حساس بن کر جینا مشکل ہے۔" لیکن یہ احساس موہبتِ خداوندی ہے، دولتِ عظمیٰ ہے۔ اس بارِ امانت کو قبول کرو۔" وہ ادیب، شاعر اور مصور ہی نہیں جس کا دل گداز نہ ہو، جو دوسروں کے مرنے سے پہلے خود نہ مرجاتا ہو۔" اپنی سوچ کا زاویہ اور قبلہ راست رکھو کیونکہ "عبادت صرف وہی نہیں جس سے ماتھے پر گٹے پڑتے ہوں صالح سوچ بھی عبادت ہے۔" اہلِ ثروت نے

تواپنی دنیا الگ بسالی ہے۔ تم علم وفن کی دنیا کے آدمی ہو، دولتِ احساس سے بہرہ ور ہو، حسن خیر اور صداقت کے علمبردار ہو، اپنی دنیا کی حفاظت کرو، اپنی اقدار کے گیت گاتے رہو۔ زر پرست کا ہر لمحہ اس کے نفس کی امانت ہے مگر" ادیب کا ہر لمحہ دوسروں کی امانت ہے۔" دیانت کا تقاضا ہے کہ یہ امانتیں لوٹاتے رہو۔ زندگی کا حقیقی اثاثہ صالح اصول ہیں۔ وُہ لوگ عظیم ہیں جو اصولوں سے محبت رکھتے ہیں۔ وہ لوگ بھی عظیم ہیں جو اولاد سے محبت رکھتے ہیں، اور وہ لوگ عظیم تر ہیں جو اولاد کی خاطر اصولوں کو قربان نہیں کرتے۔ اصول ایثار کا تقاضا کرتے ہیں۔ اصول کی قربان گاہ پر اپنی توفیق و استطاعت کے مطابق ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھاتے رہو تاکہ اس قربان گاہ کی شمعیں روشن رہیں۔ وہ لوگ عظیم ہیں جو حق و صداقت کی حفاظت کے لیے سُولی پر چڑھنے کو تیار رہتے ہیں۔ اور وُہ لوگ بھی اہم ہیں جو اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کے باعث اس جہاد میں عملاً حصّہ نہیں لے سکتے۔ مگر ان کے سینوں میں بھی خیر و صداقت کے لیے تڑپ موجود ہے۔ کوشش کرتے رہو کہ یہ تڑپ —— یہ شعاعِ سینہ تاب —— بجھ نہ جائے، ورنہ انسانیت کا کارواں ہوس کے اندھیروں میں بھٹک جائے گا، کھو جائے گا۔

قصّہ مختصر!

محمد طفیل کی کتابوں میں "آپ" "معظّم" اور "مجبّی" کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اور یہ کتابیں فن خاکہ نگاری کے باب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

ایک جدید شخصیّت نگار

مجنوں گورکھپوری

پندرہ سال سے کچھ اُوپر ہی ہوئے ہوں گے کہ میری شناسائی نقوش اور طفیل سے ہوئی ۔ نقوش سے بالمواجہ یعنی پرچہ میرے پاس برابر آتا رہا اور میں اُس کا بڑے شوق اور غور کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا۔ طفیل سے میری شناسائی دسمبر ۱۹۶۷ء تک نصف الملاقات یعنی مراسلت تک محدود رہی، میں ان کو ایک خاصی مدت تک نقوش کا مدیر سمجھتا رہا اور اُن لوگوں میں شمار کرتا رہا جن کا منصب صرف ارباب قلم کو ستاتے رہنا ہوتا ہے اور جو یہ نہیں سمجھ سکتے یا سمجھنا نہیں چاہتے کہ لکھنے والے اوزار و آلات نہیں ہوتے۔ رگ، پٹھے اور گوشت پوست کے زندہ جانور ہوتے ہیں جو تھکے ہارے بھی ہو سکتے ہیں۔ عام روزمرہ زندگی کے حالات و حوادث کا شکار بھی ہو سکتے ہیں اور اگر وہ کسی مدیر کے مطالبے یا تقاضے کا حسب مراد جواب نہ دے سکیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مغرور یا بداخلاق ہیں۔

قصہ مختصر اوّل اوّل میں نے طفیل کو بھی ایک مدیر ہی سمجھا۔ لیکن اُس وقت بھی ان کی بعض خصوصیات بار بار مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی رہیں اور کچھ دنوں کے بعد مجھے ان کا معترف ہونا پڑا۔ مجھے غائبانہ طور پر ہی یہ محسوس ہو گیا کہ طفیل بڑے سالم کردار کے انسان ہیں۔ اِن کے مزاج میں بڑا استقلال ہے۔ استقامت تحمل اور اعتماد ان کے خمیر میں داخل ہیں۔ اِن کا اپنا ایک معیارِ نظر ہے اور ان کی فطرت کی ترکیب میں تخیُّل اور ذوقِ عمل دونوں یکساں طور پر داخل اور کارفرما ہیں۔ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں اُس کو پورے انہماک اور نشاطِ کار کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ طفیل کی انہی تمام خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ نقوش آج اتنا کامیاب اور معتبر رسالہ ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ نقوش اور طفیل سے مجھے واقف ہوئے پندرہ سال سے زیادہ ہوگئے۔ مجھ میں ابتدا سے ایک عیب ہے۔ ویسے تو میں اپنی ادبی زندگی کے اوائل میں مہینے کے اندر دو دو افسانے یا مضامین لکھ لیتا تھا، میرے سارے ناولٹ یا طویل مختصر افسانے اسی حساب سے لکھے گئے ہیں۔ بعض افسانے اور مضامین عشاء سے فجر کی اذان تک ایک نشست میں لکھ ڈالے گئے ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک ماہوار رسالے کے لیے بارہ شماروں کا مواد ایک ماہ کے اندر مرتب

کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن کبھی کی فرمائش پر کسی دی ہوئی میعاد کے اندر میں لکھنے سے ہمیشہ معذور رہا، اور اب تو اور معذور ہوں۔ صرف نیاز فتحپوری کی فرمائش پر "نگار" میں تا بہ مقدور دی ہوئی مدّت کے اندر ضرور لکھتا رہا۔ ورنہ میں اپنا موضوع اور عنوان خود مرتب کرتا رہا اور وقت لے کر اس پر لکھتا رہا۔

طفیل کے بھی جتنے خطوط میرے پاس آئے وہ نقوش کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش لیے ہوتے۔ مجھے شرمندگی اور افسوس کے ساتھ احساس ہے کہ نقوش کو اُردو کے گنتی کے چند وقیع رسائل میں شمار کرتے ہوئے بھی اُس کے لیے کچھ نہ کر سکا اور جو کچھ کیا وہ نہیں کے برابر ہے۔ لیکن قائل ہوں طفیل کی وضع کا جس میں مجھے شروع سے خلوص اور محبت کا عنصر نمایاں طور پر محسوس ہوتا رہا۔ وہ مجھے نقوش برابر بھیجتے رہے اور تقاضے کے خطوط مسلسل لکھتے رہے۔ یہ ثبوت اس کا ہے کہ طفیل کو ایک طرف تو نقوش کے ساتھ لگن تھی دوسری طرف جن لکھنے والوں کو انھوں نے اپنے رسالے کے لیے منتخب کیا تھا اُن پر اُن کو اعتماد تھا کہ جلد یا بدیر وہ ضرور کچھ لکھ کر بھیجیں گے۔

طفیل نے معصوم طبیعت پائی ہے۔ وہ بچوّں کی طرح روٹھ بھی سکتے ہیں اور بہت جلد منائے بھی جا سکتے ہیں۔ یہ احساس مجھے اُس وقت سے ہے جب میں ان سے ملا نہیں تھا صرف مراسلت کا رشتہ درمیان تھا اور ملنے کے بعد میرا یہ احساس مضبوط ہو گیا۔ لیکن وہ محض معصوم نہیں ہیں۔ وہ بعض اُن بچوّں کے مانند ہیں۔ جن کے ذہن عمر سے زیادہ بالغ اور رسا ہوتے ہیں اور جو بالغوں سے زیادہ آدمیوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اپنی اس صلاحیت کا بڑی معصوم بے باکی کے ساتھ سیدھے سادے مگر دلنشیں انداز میں اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں نے ان کی وہ کتابیں پڑھیں جو باہم ایک سلسلہ ہیں۔

جنوری ۱۹۶۷ء کے اواخر میں، لاہور کی تین ادبی نشستوں میں مجھے اِن سے دیر تک ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ملا۔ اور اُس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ باتیں کم کرتے ہیں مگر کام کی کرتے ہیں گرد و پیش بیٹھے ہوئے لوگوں کو نظر جمائے دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کے دیکھنے کے انداز میں بظاہر بچوّں کا سا استعجاب اور تجسّس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو اُن کے اس دیکھنے کے انداز کو غور سے دیکھے گا وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کی نگاہ بڑی دریاب ہے اور جس شخص پر پڑتی ہے اُس کی شخصیت کی ہر تہہ اور ہر زاویہ تک پہنچنے کی اور ڈوب کر جائزہ لینے کی کوشش کرتی ہے۔ مجھے جتنی بار موقع ملا ہے ان کو عینک کے پیچھے سے دیکھتے ہوئے بہت غور سے دیکھا ہے اور ان کی جویا اور خاموشی کے ساتھ دریافت کرنے والی نگاہوں سے بڑا لطف حاصل کیا ہے۔

پہلے میں طفیل کو صرف نقوش کا مدیر سمجھتا تھا اور یہ آج تک ان کی سب سے بڑی اور قابلِ قدر حیثیت ہے۔ نقوش محض ایک رسالہ ہی نہیں۔ وہ ایک ادارہ کا مقام پا چکا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے پہلے نقوش سال میں کئی بار نکلتا تھا۔ لیکن عرصے سے اُس کا ہر شمارہ سالنامہ ہوتا ہے اور کسی خاص موضوع کے لیے وقف ہوتا ہے۔ موضوع اور اُس پر لکھنے والوں کا انتخاب بڑے شعور اور سلیقے کے ساتھ کیا جاتا ہے اور رسالہ کا ہر شمارہ حُسنِ نظر اور حُسنِ تدبیر کا پتہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا ہر نمبر ایک معتبر قدر کا حامل ہوتا ہے۔ نقوش کا کوئی شمارہ اب تک ایسا نہیں نکلا ہے جو اپنے موضوع پر تاموسی معلومات کا ذخیرہ نہ ہو۔ ہر شمارہ موضوع کے اعتبار سے اس قابل ہوتا ہے کہ اہلِ تحقیق اُس سے استفادہ کریں اور اس کے حوالے دیں اگر طفیل نے اور کچھ نہ کیا ہوتا تو بھی ان کا نقوش اُردو زبان اور ادب کی یادگار خدمت ہے۔

لیکن طفیل صرف مدیر ہی نہیں۔ وہ ایک چونکا دینے والے مصنّف بھی ہیں۔ ان کے مضامین کے چار مجموعے "صاحب"۔ "جناب"۔ "آپ"۔ اور "محترم" میں پڑھ چکا ہوں اور اُن سے لُطف بھی اُٹھایا ہے۔ دو مجموعے 'مکرم' اور 'ناچیز' زیرِ طبع ہیں۔ یہ تمام مضامین ایک مخصوص نوع کے ہیں اور اپنی اپنی جگہ الگ اور مکمل ہوتے ہوئے بھی ایک سلسلہ ہیں۔ سب کے سب مصنّف کی اسی متجسّس اور دریابِ نگاہ کے نتیجے ہیں جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اور جس سے ہم سب کو ہشیار رہنا چاہیئے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اُردو میں اس نوع کی ادبی تحریریں پہلے نہیں تھیں مگر اب تک کسی نے اس اہتمام اور درد کے ساتھ اُسے اپنا فن نہیں بنایا تھا۔ ایسے کردار نما قلمی چہرے ہمیں مغربی بالخصوص انگریزی زبان میں کافی ملتے ہیں طفیل نے اس کو اپنا فن بنا لیا ہے جو بلا شبہ ایک جدید انداز کی شخصیت نگاری ہے مصنّف جس شخص کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ اُس کے قیافے، اُس کی حرکات و سکنات، اُس کی بات چیت سے اُس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ اور وہاں جو کچھ اُس کے ہاتھ لگ جاتا ہے اُسے کو بے ساختہ سب کے سامنے لے آتا ہے۔ طفیل کا ہر مجموعہ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں متعلق اشخاص کو اپنی اپنی شخصیت کے چند ایسے خم اور گوشے اُجاگر نظر آئیں گے جن کا یا تو اُن کو اب تک کوئی علم نہیں تھا یا وہ جان بوجھ کر اُن کو چھپائے ہوئے تھے۔ یہ ایک ایسا کمال ہے جسے فنِ شخصیت نگاری میں اُونچا درجہ حاصل ہے۔ طفیل نے اب تک جن شخصیتوں پر اپنے فن کا اظہار کیا ہے۔ ان میں کچھ تو ایسے ہوں گے جو سنی اَن سنی کر دیں۔ بہتیرے ایسے ہوں گے جو طفیل سے بلا وجہ مکدّر ہو جائیں۔ لیکن کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوں گے جو چونک کر خود اپنے بارے میں، ایمانداری کے ساتھ سوچنے لگیں۔

جن چار مجموعوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے اُن میں ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی طرف ذہن جلد منتقل نہیں ہوتا اور وہ ہے مصنف کا حسن اہتمام اور بند و بست۔ طفیل نے بڑی مرتبہ شناسی اور ہنر مندی کے ساتھ اپنی مجلس آراستہ کی ہے۔ جن لوگوں کو "صاحب" کی صف میں جگہ ملنا چاہیئے، اُن کو وہیں جگہ ملی ہے۔ جو لوگ "جناب" کی صف کے لائق ہیں اُن کو کسی اور صف میں نہیں رکھا گیا ہے۔ اسی طرح نہ "آپ" کو "محترم" کے ساتھ مخلوط کیا گیا ہے نہ "محترم" کو "آپ" کے ساتھ!

طفیل کا اندازِ بیان سادہ اور بے تکلف ہے۔ ان کے مزاج میں مزاح کا ایک میلان ہے جو مہذب شوخی کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ کسی کا مضحکہ نہیں اُڑاتے۔ ہجو و استہزا ان کا شیوہ نہیں۔ کسی کو رسوا کرنا ان کا مقصد نہیں۔ شخصیتوں کے مزاج و کردار میں ان کو جو خوبیاں ملتی ہیں۔ ان کو تمام کمزوریوں کے ساتھ جو چھپی رہتی ہیں، ہلکی پھلکی ظرافت اور ایک فنکارانہ انداز میں بغیر ہچکچائے ہوئے سب کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور یہ انداز اُن کا اپنا ہے اور بس ——— یا باقی پھر!

صاحب طرز شخصیت نگار

ڈاکٹر احسن فاروقی

اگر میں کہوں کہ محمد طفیل (وہی جن کو محمد نقوش بھی کہہ دیا جاتا ہے) مؤرخ اور سوانح نگار ہیں تو اور تو اور وہ خود بھی جھجک جائیں گے ـــــ وہ محسوس کریں گے کہ علامہ شبلی کا بوجھل آہنی تاج ان کے سر پہ اُتر رہا ہے، اور وہ اس کے بوجھ سے پچکنے کے لیے کبھی راضی نہ ہوں گے۔ مگر اصلیت یہ ہے کہ وہ مذاق ہی مذاق میں اسی صورت کا (چاہے وہ ہلکا پھلکا سہی) تاج پہن بھی چکے وہ آدمی صاحب دل ضرور ہیں اور خالی رسالہ ہی نہیں نکالتے بلکہ رسالے کے مواد یعنی زندگی پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ رسالہ ادبی ہے۔ اس لیے ادیبوں کی زندگی ان کی مخصوص دلچسپی ہے، جیسے کوئی صوفی بزرگوں کی قبروں پر جائے اور ان سے روحانی فیض حاصل کرے ویسے ہی وہ ادیبوں کے پاس گئے اور ان کو زندہ دیکھا۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا کام محض اتنا تھا کہ مضمون، افسانہ، نظم وغیرہ مانگتے اگر وہ دیتا نہ دیتا، بہر حال سلام کر کے خیر سے گھر واپس آتے۔ مگر رسالے کی بزنس تو الگ رہی۔ انہوں نے ادیب کی رُوح دیکھ لی اور اسے لیے ہوئے چلے آئے اور الفاظ کے شیشے میں اتار کر رکھ لیا۔ ان تصانیف کی نوعیت ان شیشوں کی ہے جو قطار میں لگے ہوئے ہیں اور جن میں جدید دور کے نمایاں ترین مصنفین کی روحیں بند ہیں، جیسے پرانے زمانے کے جادوگر جناتوں کی روحیں قید کر لیا کرتے تھے۔ میرا یقین ہے کہ جینیئس اور جن ایک ہی چیز ہے۔ دونوں لفظ بالکل ایک ہی ہیں، اس لیے طفیل صاحب کا عمل جادوگری ہے اور انہوں نے اس دَور کے جنّوں کو ان تصانیف میں محصور کر لیا ہے۔

کہیں ہر ایڈیٹر کو یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ جدید دور کا جادوگر ہے۔ نہیں ہر لکھنے والا جن بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے رسالہ نکالنے والوں میں طفیل صاحب ہی نے اپنے کو جادوگر ثابت کیا۔ ممکن ہے کہ ایک آدھ مرحوم بھی اسی طرح کے ہوں مگر زندوں میں تو میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھ رہا ہوں وہی نظر آتے ہیں۔ نقوش کے ہر نمبر کے چھوٹا یا بڑا ہونے کا اعتراف بہت لوگ کریں گے اور بہت لوگ نہیں کریں گے۔ اصل میں ان کی جادوگری ان سوانح کے لیے مخصوص تھی، کیونکہ ان میں وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ دیکھنے میں کوئی بات ہی نہیں ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے جس کو وہ ذرا سا ہلا دیتے ہیں یعنی انہیں کوئی فن کرتب

یا شعور سے کوئی تعلق نہیں۔ سیدھی سیدھی بات یہ کہ وہ دہلی پہنچے اور کرشن چندر سے ملے لکھنؤ پہنچے نیاز صاحب سے ملے، کراچی آئے جوش صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بہار جا کر اختر اورینوی سے مل آئے۔ وہ نہ قاضی نہ محتسب نہ فقیہہ اور نہ امریکی ٹورسٹ جو گلے میں کیمرہ لٹکا کر ہر معمولی چیز کو معجزہ کہہ کر اس کی تصویر کھینچ لیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ کچھ کہا اور نہ کچھ سنا۔ آپ سے آپ کچھ باتیں آئیں اور جادو کے اثر سے ایک زندہ طلسمات میں تبدیل ہو گئیں۔ عجیب سیدھا سادا کھیل تماشا ہے مگر پھر بھی اس میں وہ جادو کر دیکھنے والا گم ہو جائے۔ ان تین تصانیف میں سے ہر ایک میرے پاس آئی۔ پارسل کھولا اور پڑھنے لگ گیا۔ اس نے وہ جادو جگایا کہ سب کچھ بھول کر اسی میں محو ہو گیا۔ کتاب ختم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ یقین مانئے کہ ایک سانس میں پوری کتاب ختم۔ کوئی افسانہ، ناول، ڈراما، سینما کا فلم ایسا دلچسپ یاد نہیں آتا۔ پھر ایک دن تینوں ایک بنڈل میں آئیں اور تینوں کو ایک ہی سانس ذرا لمبی تھی مگر تھی ایک ہی، ہر سوانح کے بعد ایک ہچکولا ضرور محسوس ہوا اور ہر تصنیف کے بعد ضروریات زندگی کی کسی نہ کسی مصروفیت میں ضرور لگا۔

مگر دم ادھر ہی لگا رہا اور پوری سانس اس وقت آئی جب یہ معلوم ہوا کہ آگے کچھ اور نہیں ہے، کوئی عجائبات کا ذکر نہیں کوئی حسن کے کرشمہ کا نقشہ نہیں۔ اگر موضوعات کو عظیم بھی کہا جائے تو ان بیانات میں ان کی عظمت پیش نظر نہیں پھر کیا ہے کہ ان کی سانس رک جاتی ہے اور توجہ اٹک جاتی ہے اسے دلچسپی کہتے ہیں اور یوں تو اس کا پیدا ہونا عام بات سمجھی جاتی ہے مگر اس کا پیدا کر لینا اور ایسے موضوعات سے جیسے کہ ان سوانح میں ہے، جادو ہی کے زور پر ہو سکتا ہے۔ اس وقت بھی بہت سی مختصر سوانح لکھی گئی ہیں مگر مجھ پڑھنے والے کو کسی نے اس طرح نہیں نچایا اور نچا کر لٹو نہیں کر دیا تھا کہ ان خاکوں نے۔

طفیل صاحب نے کچھ بھی نہیں کیا مگر سب کچھ کر گئے ہیں، یہ کتابیں مجھ سے دور رہیں ہیں اٹھا کر پاس لانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیوں لاؤں جب کہ ان کی تمام باتیں میرے حافظہ پر ثبت ہیں بلکہ نگاہوں کے سامنے گھوم رہی ہیں، یہ ہمارا دور ہے اور یہ ہماری ادیبوں کی دنیا ہے۔ تاریخ؟ ہاں تاریخ۔ آخر موٹے موٹے ناموں کی فہرست اور دن و تاریخ و سن کا کیٹلوگ ہی کو کیوں تاریخ کہا جائے۔ یہاں آج کل کے حالات اور ان کے اثر سے رہن سہن کے طریقوں اور بات چیت کے موضوعات میں جو مخصوص چیزیں نمایاں ہو گئی ہیں وہ پورے طور پر اسی طرح سامنے آتی ہیں جیسے کسی صحیح تاریخ سے ایک ماحول اور پس منظر روشن ہو جائے۔ جوش صاحب کے سلسلے میں ملیح آباد کے رئیس پٹھانوں کے رد بیے ان کے کردار اور ان کی تکرار کا پورا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ کرشن چندر کے ساتھ ساتھ وہ گروہ

سامنے آجاتا ہے جسے ترقی پسند ادب سے متعلق کہا جاتا ہے۔ طفیل صاحب کے سفر کرنے میں رسل ورسائل کی آسانیاں اور مشکلات دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہاں مرکزِ نظر وہ طبقہ ہے جو ادب کی جان ہے اور اس کی زندگی کا ڈھنگ اور بے ڈھنگاپن اس میں سے ہر ایک کے خبط اور انفرادی طریقے نگاہوں کے سامنے پھر جاتے ہیں، اور یہ سب اس آسانی اور اس دلچسپی سے ہوتا ہے کہ کوئی گرانی نہیں محسوس ہوتی۔ جب ہمیں اسکول کے زمانے میں تاریخ کا پڑھنا یاد آتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ اگر تاریخ اسی طرح لکھی جاتی جیسے طفیل صاحب نے لکھی ہے تو ہم "گھوٹا پھیرنے" کی اس مصیبت سے بچ جاتے جس کا خیال کر کے اب بھی دماغ چکر میں آجاتا ہے۔ اس دور کی ادبی دنیا کے اہم واقعات بھی پورے طور سے زندہ کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً شاہد احمد دہلوی مرحوم اور جوش صاحب کا تصادم جس کی بنا پر اول الذکر نے "ساقی" کا ایک خاص جوش نمبر نکالا۔ اس تصادم کے حالات طفیل صاحب نے کافی تفصیل سے دیئے ہیں اور یہ بھی دکھایا ہے کہ انھوں نے صلح کرانے میں کیا کام کیا۔ یہ تصادم ایک چیز ہی نہیں ہے بلکہ اس دور کی نمائندہ چیز ہے۔ یعنی ادیبوں کے درمیان ایسے جھگڑے آئے دن ہوتے رہتے ہیں مگر یہ مخصوص معرکہ سب سے آگے بڑھ گیا۔ بہر حال وہ اس دور کی ادبی تاریخ کی مثالی اور انفرادی چیز ہے، غرض دلچسپ تاریخ نگاری کا حق طفیل صاحب پورے طور پر ادا کر دیتے ہیں۔

اب سوانح پر آئیے۔ ہمارے یہاں جو چیز سیرت نگاری کہلاتی ہے اور اس سلسلے میں بڑے جغادری نام حالی اور شبلی کے لیے جاتے ہیں، وہ نثر میں قصیدہ گوئی کے سوا کچھ ہے ہی نہیں جیسے قصیدہ گو ممدوح کے کردار کو واضح کرنے کی بجائے شجاعت، فیض، خلوص، ایمان وغیرہ پر ایک ایک دو شعر کہہ دیتا تھا، ویسے یہ سیرت نگار اخلاقی قدروں کی سرخیاں قائم کر کے ہر صفت اپنے ممدوح میں بدرجہ اتم دکھاتے ہیں اور لطیفوں سے مثالیں دیتے ہیں۔ یہ بیوگرافی نہیں ہوتی کیوں کہ اس سے بیو (زندگی) کا گراف (لکیر) نہیں بنتی۔ کوئی مربوط اور مسلسل شخصیت سامنے نہیں آتی۔ طفیل صاحب کی تصانیف مختصر سہی مگر بیوگرافی ضرور ہیں جس ہستی سے وہ ملے ہیں اس کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا اور اچھی بری جو بھی باتیں آئی ہیں ان کو رقم کر دیا ہے۔ وہ اس بات کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ اعلیٰ فنی قوت رکھنے والوں میں اعلیٰ اخلاق ضروری نہیں اور آج کے اہم فن کاروں کی اخلاقی کمزوریاں دیکھ کر ان لوگوں کے فن کو ناقص ثابت کرنے کی طرف نہیں جھکتے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ فن کو الگ چھوڑ جاتے ہیں۔ اصل میں ہر ادیب کے ادبی رجحان اور اس کی ذہنی خصوصیت کو سامنے لانے میں انہیں سب سے زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ کرشن چندر ان سے کہتے ہیں "آئندہ کے افسانے ایسے ہی ہوں گے" تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔

اور بات ہم پر چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم انہیں مانیں یا کرشن چندر کو۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض شہرت کے رعب میں یا ترقی پسندوں سے وابستگی میں کرشن چندر کے افسانے "نقوش" کے ہر نمبر میں برفہرست نہیں رکھتے رہے بلکہ ان افسانوں میں افسانویت کے فقدان سے اسی طرح غیر مطمئن ہیں جیسے ہم خود اور ان کے دوام پر خود کچھ نہیں کہنا چاہتے کیوں کہ اس سلسلے میں ہر ایک نقاد نے ہمیشہ دھوکا کھایا۔ غرض ہر سوانح میں موضوع کی ذاتی انفرادیت اور ادبی انفرادیت کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور نقشہ کھینچنے والے کی سادگی اور خلوص بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان تصانیف میں انفرادی نظر سے افراد کے کرداری تاثرات اس طرح جمع ہیں جیسے اُردو کی سیرت نگاری میں تو ملتے نہیں۔

طفیل صاحب کی انفرادیت ہیں ان کی اُردو کے اہم ترین رسالے کی ایڈیٹری بھی شامل ہے یعنی وہ ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر کی زبان میں بولتے ہیں۔ بنیادی طور پر ان کا طرز صحافیانہ ہے مگر ان کا دائرہ ادبی صحافت ہے جس میں ایڈیٹر کو ہنگامی موضوعات سے نہیں بلکہ ہر قسم کی نثری، شعری اور افسانوی تصانیف سے سروکار ہوتا ہے اور ان کو غور سے پڑھ کر رسالے کے معیار کا خیال رکھتے ہوئے شامل کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ان کی زبان میں کہیں غزل کا مزا تو کہیں تنقید کا اور زیادہ تر انشائیہ اور افسانے کا مزا ملتا ہے۔ ایک نارمل نگاہ ہر موقعہ کی موزوں زبان ڈھونڈھ لاتی ہے اور وہ خلوص و ہمدردی سے ایک مخصوص شگفتگی دے دیتے ہیں جو ایک جادو کی کیفیت اختیار کر لیتی ہے اور پُراسرار صفات میں سے خاص صفت وہ ہو جاتی ہے جو ہماری توجہ اور دلچسپی کو کان پکڑ کر کھینچ لے جاتی ہے اور ہم بڑی محبت کے ساتھ کھنچتے چلے جاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ طفیل صاحب "صاحب"، "آپ"، "جناب" کے بعد "تُسی"، "تم"، "تُو" بھی لکھیں گے اور ان کی اس طرح کی تمام تصانیف مل کر اس دَور کے رجحانات کے ساتھ چھوٹے بڑے ادیبوں کی سب سے زیادہ زندہ تاریخ ہو جائے گی۔"

(۲)

میں نے ان خاکوں میں جس دلچسپی کا اظہار کیا، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ محض سطحی چیزیں ہیں جو پڑھنے والے کو گرویدہ کر لیتی ہیں اور وہ انہیں بے تکان پڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان کے مصنف نے انہیں بڑے غور و فکر کے بعد تخلیق کیا ہے اور ان کے پیش کرنے میں بڑی محنت اور کاوش سے کام لیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ان میں وہ فن ہے جو فن کو چھپا دیتا ہے۔ یعنی علمیت، فن کاری اور محنت سے ایسی قدرتی چیز بنا دیتا ہے جس کا حسن اک دم سے اثر کرتا ہے۔ آورد کا نام نہیں رہتا اور آمد ہی

آمد نظر آتی ہے ۔ یوں تو تینوں کتابیں ایک ہی سطح پر ہیں اور ایک ہی انفرادیت کی آئینہ دار ہیں، مگر ان میں میں "آپ" کو ترجیح دیگر مثال کی طرح لیتا ہوں اور اس سے ان سب کی بابت رائے قائم کرتا ہوں ۔

یہاں اُردو کے تین بڑے ادیبوں سے مصنف کی ملاقات کا حال ہے ۔ مصنف نہایت خوش مزاجی کے موڈ میں ان سے ملنے جاتا ہے اور ملاقات بھی بظاہر سرسری ہی نظر آتی ہے مگر یہ خیال رہتا ہے کہ یہ لوگ مصنف ہیں، یعنی ان کے کارنامے تصانیف ہیں جن کی بابت بات کرنے کے لیے علمیت اور تنقیدی شعور ضروری ہے ۔ یہ معمولی بات نہیں ہے ۔ ملاقات کی وقعت اس میں ہے کہ ملاقات کرنے والا مصنف کی تخلیقات پر صحیح نظر ڈال سکے اور ان کی بابت ایسی باتیں کر سکے جو مصنف کی انفرادیت کو گہرائیوں میں لے جائے ۔ طفیل صاحب اس دَور کے مشہور ترین اور مقبول ترین افسانہ نگار کرشن چندر کے پاس پہنچے ہیں، اور یہ عالم سامنے آتا ہے:

> اِدھر کرشن چندر کا قلم سرپٹ بھاگ رہا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے عالم میں یہ اپنے جن دوستوں سے ملوانا چاہتے اس سے سرسری ملاقات ہوتی ہے اور نوبت جلد گڈ بائی تک پہنچ جاتی ہے ۔ ظاہر ہے ایسی بھاگیہ تحریروں میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی جو ہفتوں اور مہینوں غور و فکر والی تحریروں میں ہو سکتی ہے، چونکہ وہ بڑے فن کار ہیں، اس لیے ہر کوئی ایسی بھی کہانیاں نہیں لکھ سکتا، میں نے ان سے اس موضوع پر بات کی تھی ۔
>
> "کرشن جی ۔ آپ زیادہ لکھنے لگ گئے ہیں ۔ اس لیے آپ کے افسانوں میں اب وہ بات نہیں رہی ۔"
>
> مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں، مستقبل کا افسانہ یہی کچھ ہوگا ۔
>
> اس جواب پر میں چپ رہ گیا ۔ یہ دعویٰ انہیں سجتا تھا ۔ کوئی اور ہوتا تو خواہ نقضِ امن کا خطرہ پیدا ہو جاتا، میں اس سے ضرور اُلجھ پڑتا ۔

پھر

> باتوں باتوں میں یہ معلوم ہوا تھا کہ کرشن چندر تقریباً ہر روز لکھتے ہیں جس طرح دفتر کے بابو کو روز کام کرنا پڑتا ہے ۔ اسی طرح انہیں بھی روز لکھنا پڑتا ہے اسے چاہے آپ ان کا شوق کہہ لیں چاہے ان کی ضرورت بہرحال یہ ان چند خوش نصیب

میں سے ہیں جو اپنے قلم کی بدولت شان دار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ورنہ قلم سے روستی رکھنے والوں کو عموماً بھوکوں مرنا پڑتا ہے۔

باتوں باتوں میں کرشن چندر کے ادبی کارناموں پر "سرچ لائٹ" پڑجاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ کرشن چندر کے کردار کی بنیاد بھی دکھائی دے جاتی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ ان کی زندگی میں بناوٹ کو بہت کم دخل ہے۔ کوئی فنکارانہ اتراہٹ نہیں، باتوں میں انکسار ہے۔ بڑے متواضع ہیں (کبھی خوب صورت بھی ہوں گے) اور اس کے ساتھ خود بے حد شرمیلے۔

اس کے آگے کیا چاہیے محسوس ہوتا ہے کہ ایک افسانہ پڑھا جو بالکل تاریخی حقیقت ہے اور جس میں ایسی باتیں جن پر جتنا غور کیجیے اتنا ہی لطف آتا ہے کیوں کہ یہ باتیں بڑے پتے کی ہیں اور کرشن چندر کی افسانہ نگاری پر بڑی ہی اہم تنقید۔ یہاں نہ تعریف ہے نہ مذمت ہے۔ کرشن چندر آپ سے آپ بالکل کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ طفیل صاحب نے بڑا زبردست آپریشن کیا ہے مگر اس صفائی اور پھرتی سے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات ہی نہ تھی۔ عام آدمیوں کے لیے ایک قلمی تماشا دکھایا ہے مگر جو کسی شخص کے کردار کو پیش کرنے اور کسی مصنف پر تنقید کرنے کی زبردست مشکلات سے واقف ہیں ان کے لیے ایک عجیب کمال، عجیب علمیت جس نے الہامی درجہ حاصل کر لیا ہے۔

کرشن چندر سے ملاقات میں ایک حد تک ہمسری، ہمسنی اور برابری کا پہلو سامنے ہے۔ مگر جوش اور نیاز فتح پوری کے سامنے سن کی بزرگی اور ادبی بزرگی کا رعب غالب ہے۔ مگر سوانح نگار کے فرائض سے وہ کسی طرح سبکدوش نہیں ہوتے۔ نیاز صاحب کے سلسلے میں وہ فرمان صاحب سے کہہ دیتے ہیں "اتنی مختصر یادوں کے سہارے مجھ سے اتنی بڑی شخصیت کا جھٹکا نہ کرائیں، مگر وہ جھٹکا کر ہی ڈالتے ہیں۔ وہ یہاں ہمیں اپنا خاص مقصد بھی بتا دیتے ہیں۔

"میں نقاد نہیں ہوں کہ جہاں چاہوں ڈنڈی مار دوں، میرا موضوع شخصیتوں کا مطالعہ ہے جس میں جھوٹ نہیں چلتا بلکہ کنواری لڑکیوں کی طرح اپنی لاجوں آپ مرنا پڑتا ہے۔"

وہ نیاز صاحب کے کفر کو عبادت سے بہتر ثابت کرتے ہیں اور ان کی انا کو واضح کر کے یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔

"وہاں تک میرا خیال ہے نیاز صاحب اندر سے بڑے مذہبی آدمی ہیں۔

انھوں نے اب تک مذہب کے بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا اس میں صرف
جھوٹی مذہبیت کو جھنجھوڑا۔ بنے ہوئے خدائی فوجداروں کے مذہبی پندار کو آئینہ دکھایا۔

ان کی تحریر کے بابت کہتے ہیں :-

ان کے یہاں آمد ہی آمد ہے۔ آورد کا نام نہیں۔ الفاظ واقعی ہاتھ باندھے
کھڑے رہتے ہیں۔ یہ کمال میں نے صرف انیس، جوش اور نیاز میں دیکھا۔

ان کی تنقید پر یہ رائے دیتے ہیں۔

ان کا شعروں پر عمل جراحی کچھ مکتبی تعلیم ہی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

نیاز صاحب کی صنف نازک سے دلچسپی کی بھی بے کلانہ وضاحت کرتے ہیں، اور ضمناً وہ تمام باتیں کہہ جاتے ہیں جو نیاز صاحب کی شخصیت کے ہر پہلو کو جیتا جاگتا سامنے لے آتی ہیں مگر جوش کا خاکہ میری نظر میں سب خاکوں پر بھاری کہا جا سکتا ہے۔ جوش کی بدنامی، طفلی کا ماحول، جوش کے مذہبی خیالات، جوش کی شراب نوشی، ان کا حیدر آباد سے نکلنا، غزل کی مخالفت، جگر اور فراق پر رائیں عشق بازیاں، بیوی کا خوف، نیاز سے تنازعہ، لغات سے دلچسپی، بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات، دوستوں سے سلوک، روپیہ سے دلچسپی اور بے پرواہی اور آخر میں ان کا اور شاہد احمد کا جھگڑا۔ یہ سب چیزیں اس کیف و خوبی سے سامنے آتی ہیں کہ ان کی مثالیں دینا پورے مضمون کو نقل کر دینا ہوگا جوش صاحب کو زندہ کرنے میں طفیل صاحب خود بھی پورے طور پر زندہ ہو گئے ہیں۔ اگر میں اس کو اُردو میں خاکہ نگاری کا شاہکار کہوں تو بجا ہوگا۔ یہ تمام خاکوں میں شاید سب سے زیادہ طویل ہے مگر ہر بار پڑھنے میں اسے ختم کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔

یہاں تینوں کتابوں کے سب خاکوں کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے۔ صرف اس بے پناہ صحیح نظر کا اندازہ کرانا ہے جو نہایت خلوص اور ہمدردی کے ساتھ ہر شخصیت کی تہیں کھولتی جاتی ہے۔ واقعات نہایت قدرتی طریقہ سے آتے جاتے ہیں مگر مصنف نے ان کو بڑی غور و فکر سے ضرور انتخاب کیا ہے اور بڑی فن کارانہ صلاحیت سے ترتیب دیا ہے۔ عام رائیوں کی بڑی ذہانت سے ردکی ہے قصوں کو بڑی روانی سے بیان کیا ہے اور اپنے نتائج کو بہت سوچ سمجھ کر الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ سنجیدگی میں خوش مزاجی کی وہ لطیف آمیزش ہے کہ ایک مخصوص انفرادی "جینیئس" کا ثبوت ملتا ہے۔ بظاہرہ افسانے بیان ہوتے ہیں، مگر نظر رکھنے والوں کے لیے بڑے گہرے نفسیاتی جائزے سامنے آتے ہیں، ان کی تحلیل آسان نہیں ہے کیوں کہ ایسا کرنا ایک ایسے دریا کے بہاؤ کے روکنے کے برابر ہوگا جو موجیں مارتا چلا جا رہا

ہے اور جس کی سطح پر ہر قسم کی ضروری چیزیں بہتی چلی جارہی ہیں۔ یہاں جناتوں کو شیشوں میں اتارا گیا ہے ان کا منظر دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر موضوع پر ہر بُری بات اور ہر خوبی واضح کر دی گئی ہے مگر اس طرح کہ ہمدردی ہاتھ سے کہیں نہیں جاتی اور شخصیت کی اہمیت اور اس کے کارناموں پر ایسی روشنی پڑتی ہے کہ اس کی عظمت دل میں گھر کر جاتی ہے جو ہستیاں لی گئی ہیں وہ پیچیدہ ہیں، اس لیے عام نظر نے ان کو ناسمجھی میں مطعون کر ڈالا ہے اور ان کی بابت پٹے ہوئے جملے استعمال کیے ہیں مگر طفیل صاحب دکھاتے ہیں کہ عام رائیوں اور حقیقت میں کتنا بڑا تضاد ہے اور اصل حقیقت کیا ہے۔ مثلاً جوشؔ صاحب کی بابت عام ہے کہ وہ لالچی ہیں اور بغیر معاوضے اور کرایہ کے کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے۔ طفیل صاحب اس سلسلے کے ایسے واقعات بیان کرتے ہیں جن میں خودداری اور دوستی کی بنیاد پر جوشؔ صاحب نے روپیہ کو لات ماردی اور اس کے بعد کہتے ہیں۔

"دیکھا آپ نے جوشؔ صاحب روپے کے معاملے میں کتنے لالچی ہیں"

اس کے بعد وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ ان کی سیرت نگاری کا نصب العین ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ اپنے مقصد میں پورے اُترنے کے بعد وہ اس کا خلاصہ بھی اسی طرح کر دیتے ہیں جیسے کہ شاعر اپنی نظم کے آخر میں اپنے فن کی خصوصیت کا اظہار کر دیتا ہے۔

"درختوں کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ درخت جتنا اُونچا ہوگا، اتنی ہی گہری جڑیں ہوں گی۔ اصل درخت تو زمین کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔ یہی حال اشخاص کا ہے جو شخص جیسا نظر آتا ہے وہ ویسا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اس کے اندر بہت کچھ چھپا ہوتا ہے۔ شخصیت سے واقفیت حاصل کرنے کیلئے صرف زمین پر چلتے پھرتے دیکھ لینا شخصیت سے آگاہی کے ذیل میں نہیں آتا۔ شخصیت سے آگاہی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی دبے پاؤں چھپی ہوئی شخصیت میں اُتر جائے۔"

نفسیات نگاری کا یہ اہم فرض طفیل صاحب نے ادا کیا ہے ہمارے یہاں شخصیت کو سمجھنے کی روایت ہی بہت کم ہے۔ مدح و قدح۔ قصیدہ و ہجو کے درمیان کا راستہ تلاش کر لینا اور دونوں سے بچ کر "نفسیات" کی اس صراط المستقیم پر رہنا جو بال سے زیادہ باریک اور تیغ سے زیادہ تیز ہے طفیل صاحب ہی کا کام ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو کے دوسرے سوانح نگار چاہے انہوں نے مختصر سوانح لکھی ہوں یا طویل اس راہ پر سے کٹ کر گر ہی گئے۔ ہمارے یہاں "سیرت نگاری" ہے جسے

قصیدہ کی ایک نثری صورت کہہ لیجئے۔ طفیل صاحب "سیرت" کے بجائے "شخصیت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہی ان کی ایک جدت ہے اور اس کے ماتحت تخلیق کیے ہوئے نقوش جو انھوں نے ابھارے ہیں وہ اسی وجہ سے اُردو کی تمام سوانح نگاری کو ترقی کے اس درجہ پر لاتے ہیں جو پہلے اس کو نصیب نہیں ہوا۔

(۳)

"مختصر سوانح جدید دور کی اسی طرح ایک نئی صنف ہے جیسے مختصر افسانہ، طویل سوانح اور طویل ناولیں پورے دریا کا منظر پیش کرتی ہیں مگر بیسویں صدی کی تیز زندگی میں فرصت کہاں کہ طویل چیزوں کو وقت دیا جائے۔ اس لیے دریا کو کوزے میں بند کرنے اور قطرہ میں دجلہ دکھانے کی ضرورت ہوئی۔ انگریزی میں لٹن اسٹریچی (LYTTON STRACHEY) نے اس کام کو انجام دینے کی پہلی کوشش کی۔ انگریزی کے کلاسیکی ادب میں اس کی مثالیں تھیں جن میں سے لٹن اسٹریچی نے بہت زیادہ اہمیت سترھویں صدی کے اوبری (AUBREY) کی بریف لائیوز (BRIEF LIVES) کو دی ہے۔ لٹن اسٹریچی نے ان لوگوں کی مختصر سوانح لکھیں جو تاریخ میں اہمیت رکھتی ہیں، اور اب ان کا وجود نہیں ہے۔ انیسویں صدی میں ڈی کوئنسی (DEQUINCY) کی مختصر سوانح اس کی شاعروں سے ملاقاتوں کا حال بیان کرتی ہیں۔ اس لیے میں ان کو ان جدید مختصر سوانح کے سلسلے میں اہم سمجھتا ہوں جن میں سوانح نگار اپنے موضوع سے اپنی ملاقاتوں اور اپنے ذاتی تعلقات کے بیان دیتا ہے اور اس طرح موضوع کی شخصیت کو سامنے لاتا ہے۔ اصل سوانح یہی ہے کیوں کہ تاریخ کی ہستیوں کی بابت ہم کتنی ہی معلومات کیوں نہ حاصل کرلیں، وہ بات نہیں معلوم ہوتی جو دیکھ کر اور برت کر ایک پُراسرار الہامی طریقہ پر منکشف ہو جاتی ہے چنانچہ بیسویں صدی میں اور خاص طور سے پہلی جنگ عظیم کے بعد سے یہ طریقہ بہت ہی عام نظر آتا ہے، کہ سوانح نگار مشہور و معروف ہستیوں سے ملاقاتوں کے قصے بیان کرتا ہے اور یہ رسالوں یا اخباروں میں شائع ہوتے ہیں، اڈمنڈ گاس (EDMUND GOSSE) کی اسٹیونسن (STEVENSON) کی اس طرح پر لکھی ہوئی سوانح اس صنف کے ابتدائی شاہکاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ پھر تو رواج بہت ہی عام ہو گیا اور کم ہی مضمون نگار ایسے ہوں گے جنھوں نے کبھی نہ کبھی اس کی طرف رجوع نہ کیا ہو۔ ان میں سے نمایاں ترین میکس بیربوم (MAXBEERBHOM) اے۔ جی۔ گارڈنر (A.G. GARDINER) اور ہیلیر بیلاک (HALAIREBELLOC) ہیں۔ اس وقت یعنی ان لوگوں میں جو حیات ہیں۔ جے۔ بی۔ بریسٹلے (J.B.BRIESTLEY) سب سے آگے نظر آتا ہے طفیل صاحب

کی کتابیں پڑھ کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ اس روایت اور اس عمل کو اُردو ادب میں منتقل ہی نہیں کرتے بلکہ پیدائشی صلاحیتوں اور شعوری کوششوں سے اس کو وہ درجہ دے دیتے ہیں کہ ہم ان کی تصانیف کو انگریزی میں اور یورپ کی دوسری زبانوں میں اسی قسم کی تصانیف کے برابر رکھ سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرح ان کی بھی وہ سائنسی بے لاگ نظر نفسیات کا جائزہ لینے کی بے پناہ صلاحیت اور پھر اپنے تاثرات جمع کر کے ایک مختصر مگر حسین اور تمام تر پُر از آمد شکل دینے کی قابلیت ہے جو اُردو کے کسی اور سوانح نگار کو میسّر نہیں ہوتی۔

میں یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارے قصیدے غزل اور اسی قسم کی محض جذباتی اصناف میں اُلجھے ہوئے ادیب کو نفسیات نگاری کی صاف روشنی میں آکر آنکھیں کھولنا کس قدر شاق گزرا اور وہ زیادہ تر چندھیا کر رہ گیا۔ مختصر سوانح میں فرحت اللہ بیگ شاید پہلے شخص ہیں جنہوں نے "نذیر احمد کی کہانی" میں مولوی نذیر احمد کے کردار کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے مگر وہ تصویر کو پورے فوکس میں نہ لا سکے اور اس کی سوانح سے ان کی خوش طبعی کا تو پتہ لگتا ہے مگر مولوی نذیر احمد ایک دھندلی سی چند لکیروں سے بنے ہوئے نظر آتے ہیں جن کو ہم خود جیسا چاہیں، ملا جلا کر ایک نقشہ بنا لیں۔ اس کے مقابلے میں طفیل صاحب کے پاس زیادہ باڈر کا لنس بھی ہے اور بہت زیادہ جدید شعیری کا ایک کیمرہ بھی اور خوش طبعی یا مزاحی میں بھی وہ ان سے پیچھے نہیں ہیں۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق بھی اس میدان میں اپنی تحقیق اور علمیت کے گھوڑے پر گامزن نظر آتے ہیں، مگر آخرکار وہ "مقدمات" کے محقق ہیں اور بابائے اُردو، نفسیات نگاری کا والہانہ فن ان کی بھاری بھرکم شخصیت کے لیے ایک توہین ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے چند ہمعصروں کی خوبیوں ہی خوبیوں کی تحقیق ضرور کرتے ہیں مگر ان کو زندہ کرنے کے سلسلے میں شان سے کہتے نظر آتے ہیں "میں یہ کام تو کر سکتا ہوں مگر کروں گا نہیں، کیوں کہ میری تخلیق سے میری کسر شان ہے۔ بہر حال مولوی عبدالحق کی مختصر سوانح ان کے اپنے علمی کارناموں سے الگ ہونے کی کوشش سے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ہاں رشید احمد صدیقی صاحب کے مزاحیہ مضامین مختصر سوانح بھی ہیں اور انہوں نے اکثر شخصیتوں کے بڑے اچھے نقوش چھوڑے ہیں، مگر وہ جس سے بھی ملے ہیں اس سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، اور اس لیے ایسی باتیں کہتے ہیں جن پر ہم مسکرا تو ضرور دیتے ہیں مگر ان سے شخصیت پر کوئی پوری روشنی نہیں پڑتی۔ ان کا خاص کام شخصیت نگاری نہیں مزاح نگاری ہے۔ طفیل صاحب بھی اپنے موضوعات کے پاس ہنستے ہوئے جاتے ہیں اور زیادہ تر ہنستے ہنساتے ہی رہتے ہیں مگر وہ اپنے تئیں باسول (BOSWFLL) کی طرح ایک جونسن

(JOHNSON) کے سامنے محسوس کرتے ہیں اور اس ادبی انکساری کی بنا پر جو تمام تر خلوص ہے وہ اپنے موضوع کی رُوح تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کی ان باتوں کو نوٹ کر لیتے ہیں جو اسے زندہ اور زندۂ جاوید بنائے ہوتے ہیں۔ سوانح نگار کی ماڈل ہستی باسول ہی ہے جیسے ڈرامہ نگار کی شیکسپیئر اور غزل گو کی حافظ اور طفیل صاحب وہی مزاج، وہی صاف دلی، وہی محبت، وہی خود فراموشی اور وہی ادبی شوق کے حامل نظر آتے ہیں، جو باسول کو دنیا کا اہم ترین سوانح نگار منوانے پر مجبور کرتی ہیں، اس صفت کے لیے انگریزی میں (RIGHT SYMPATHY) کا فقرہ اصطلاح کی طرح استعمال کیا جاتا ہے اور یہ ہمیں طفیل صاحب کے ہر "خاکے" میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اس کا خیال کرتے ہوئے شاہد احمد صاحب کے "گنجینۂ گوہر" اور دوسری مختصر سوانح یاد آتی ہیں، مقابلہ کے لیے نہیں بلکہ تضاد کے لیے جن میں ہمدردی کے بجائے ایک قسم کا غصہ ہے۔ ویسا ہی غصہ جوان کے دادا نذیر احمد نے ابن الوقت کو ریفارمر کے درجہ سے گرا ہوا ثابت کرنے میں دکھایا ہے اور جو شاہد صاحب کے جوشش والے خاکے میں اپنا پورا زور دکھاتا ہے۔ شاہد صاحب کے خاکے ان کے موضوعات سے زیادہ ان کی خود کی ہستی کے آئینے ہیں جب کہ طفیل اپنے تئیں بالکل فراموش کر دیتے ہیں یا اگر سامنے آتے ہیں تو اپنے موضوع کی توضیح اسی طرح کرتے ہیں جیسے باسول جونسن کی خدمت کرنے کو اپنے تئیں اپنے شاہکار میں داخل کر دیتا ہے۔

غرض دنیاوی ادب کے حوالے سے دیکھتے ہوئے طفیل صاحب کے یہ "خاکے" جدید ترین طرز سوانح نگاری کی مثال ہیں کیوں کہ ان میں ایک صحافی کی اہم ہستیوں سے ملاقاتیں ہیں اور ان ملاقاتوں سے وہ اہم نفسیاتی باتیں موضوع کی بابت اُبھرتی ہیں جو بڑی صحیح بڑی پُر مغز اور معنی خیز ہیں۔ یعنی صحافت اور ادب ہمکنار ہو کر ایسے نقوش قائم کرتے ہیں جو ادب میں اہم اضافہ ہو جاتے ہیں، اس لیے ان کو دنیا کے ادب کی اسی قسم کی چیزوں کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔
اُردو ادب کے حوالے سے دیکھتے ہوئے یہ ایک طرف تو مختصر سوانح نگاری کو وہاں تک پہنچاتے ہیں، جہاں تک کوئی اور نہ پہنچا۔ دوسری طرف کردار نگاری کی وہ مثال قائم کرتے ہیں جس تک اردو اور فارسی کی روایات میں جکڑے ہوئے ادیب نہیں پہنچ سکتے۔ ہمارے روایتی ادب کا مخصوص رُجحان علمی ہے اور اب تک کم ہی لوگ ایسے ہیں جو واقعیت کی ضروریات سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو سکیں، ذاتی لگاؤ، ذاتی پسند اور ناپسند مذہبی اور اخلاقی قدروں کے ٹکے بندھے اصولوں کی عینک لگا کر وہ جیتے جاگتے لوگوں کو بھی دیکھتے ہیں اور خیالی ہیولوں کا بھی تصور کرتے ہیں، اس لیے ہمارے ادب

میں حقیقت کو مروڑنے کا کام ہی مجھے زیادہ تر نظر آتا ہے اور میری اس سے ہمدردی ختم ہوجاتی ہے۔ میرے لیے طفیل صاحب کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے کہ ان کے بیان میں کسی مروڑ کا شائبہ بھی نہیں ملتا اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ میں ان کی تصانیف سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ ان خاکوں میں میری غیر معمولی دلچسپی کی وجہ یہی ہے۔ اُردو کی تصانیف میں جہاں کوئی مروڑ آئی اور میں اسے الگ رکھ دیتا ہوں، ان تمام خاکوں کو پڑھنے میں کہیں بھی اس قسم کے اثر کا شائبہ بھی نہیں آیا۔ طفیل صاحب کو کسی قسم کے بلا ضرورت علم نے گمراہ نہیں کیا۔ اس لیے وہ زندگی کے علم کی سیدھی راہ پر چلتے نظر آتے ہیں۔ اس پر انہیں چلتے ہوئے دیکھ کر مجھے جو خوشی ہوئی اسی کے اظہار سے میں نے یہ مضمون شروع کیا اور اسی پر زور دیتے ہوئے ختم کرتا ہوں۔

محمد طفیل ، بہ حیثیت خاکہ نگار

ڈاکٹر صابرہ سعید

حیدرآباد دکن کی یونیورسٹی سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے ڈاکٹر صابرہ سعید نے " اردو ادب میں خاکہ نگاری " کے موضوع پر تحقیقی اور تجزیاتی مقالہ لکھا ۔ یہ مضمون اس کتاب کا ایک باب ہے ۔

محمد طفیل اردو کے مقبول اور وقیع رسالہ نقوش کے مدیر ہیں ۔ بقول خود " شکل و صورت کے اعتبار سے لونڈے سے ہیں " ۔ مدیر نقوش ہونے کا مطلب تو یہ تھا ڈپٹی نذیر احمد جیسا جبہ پہنا کرتے ۔ سرسید ایسی داڑھی ہوتی ، ابوالکلام جیسا رُعب و دبدبہ ہوتا ۔ برعکس اس کے یہ سیدھے سادے آدمی کا بچہ ہیں نہ رُعب نہ کچھ ان کی شکل و صورت سے زیادہ ان کے نام کا اثر ہے ۔

شخصی مرقعوں کی حد تک ان کے مضامین کے صرف پانچ مجموعے منظر ادب پر آئے ہیں ۔ ان کے نام ہیں " صاحب " " جناب " " آپ " " محترم " اور " مکرم " ۔[1]

" صاحب " ان کے مرقعوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۵۵ء میں ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع ہوا جس کے متعلق عرش ملسیانی لکھتے ہیں کہ منٹو ، ندیم ، شوکت تھانوی ، جگر مراد آبادی ، عابد اور احسان ۔ یہ ہیں وہ سات ستارے جو اس آسمانی کتاب میں معلق ہیں ۔

نیاز فتحپوری نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا " صاحب " کے چند مطبوعہ اجزا دیکھ کر بڑا لطف آیا نہ صرف چہرہ نمائی ہے بلکہ گہرا نفسیاتی مطالعہ بھی ہے جس میں پطرس کا مزاح ، شا کا نشتر ، اسکر وائلڈ کا PARADOX اور چسٹرٹن کی چٹکیاں سبھی کچھ موجود ہے ۔

" جناب " کی اشاعت ۱۹۵۶ء میں عمل میں آئی ، بائیس شخصیتیں جو سب کی سب دنیائے ادب سے وابستہ ہیں اس مجموعہ کی زینت ہیں ۔ " جناب " کے متعلق خود طفیل صاحب کہتے ہیں کہ یہ کوئی غیر فانی اور زندہ رہنے والی کتاب نہیں ۔ مگر اس میں کچھ غیر فانی شخصیتوں کے بارے میں میرے

---

[1] اب معظم اور مجتبی بھی منظر عام پر آچکے ہیں ۔

تاثرات ہیں میری یہ کوشش اپنی طرزِ نگارش یا شخصی مطالعہ کی بجائے ان شخصیتوں کی وجہ سے زندہ رہے گی جن پر میں نے قلم اٹھایا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں کرشن چندر نے اپنی گراں قدر رائے یہ دی کہ لکڑیوں کے اس گٹھے میں جس کا نام "جناب" ہے ہر طرح کی لکڑی ہے موٹی اور پتلی بھی، نئی اور پرانی بھی، گیلی اور سوکھی، مگر ادیبوں کا یہ شہ پارہ ہے۔ بے حد دلچسپ۔ صفحۂ اول سے آخر تک یہ کاغذی زنبیل گوناگوں جادو رنگ کیفیتوں سے معمور ہے اور ان میں سے ہر ایک لکڑی جلتی ہے، کوئی شکیلہ اختر کی طرح ایک ہی رنگ میں جلتی ہے تو کوئی مجاز کی طرح راکھ ہو چکی ہے۔

"آپ" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی، کل مضامین پانچ ہیں لیکن اس میں ادبی خاکے صرف چار ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

——— نیاز فتح پوری

——— جوش ملیح آبادی

——— اختر اورینوی اور

——— کرشن چندر

ان مجموعوں کے علاوہ بھی طفیل صاحب نے اپنے رسالہ نقوش کا ایک خاص نمبر بھی اس صنف کے لیے مخصوص کیا جس میں کئی ادبی اور غیر ادبی شخصیتوں پر خاکے اور سوانحی مضامین شامل ہیں۔ یہ ضخیم نمبر سات سو صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اگر طفیل صاحب اس خاص نمبر کو مرتب کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی اس نمبر میں ان کا جمع شدہ سرمایہ اتنا تھا جو ان کے نام کو اس صنف کے پروان چڑھانے والوں میں ممتاز حیثیت عطا کرنے کے لیے کافی تھا۔ کنھیا لال کپور نقوش کے ایک شمارے میں لکھتے ہیں کہ:

طفیل نے شخصیت کا ایک اسکول قائم کیا ہے جس کا نصب العین ہے ع

بچ کے یہ مجھ سے جائیں گے ایسے کہاں کے ہیں

اس ایک جملے ہی سے اندازہ ہوتا ہے انھوں نے اس صنف کے لیے کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

ان کے خاکوں کی محرک کیا چیز تھی اور ان کے لکھنے میں ان کا کون سا مقصد پنہاں تھا۔ اس کا اندازہ خود مصنف کی تحریروں سے ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میرے مضامین لکھنے کی ابتدا اختیاری نہیں اضطراری ہے۔ مارچ ۵۳ء میں جب قادیانی تحریک کے سلسلے میں معرکے سر ہونے شروع ہوئے تو نوبت مارشل لا تک پہنچی تھی۔ چونکہ فطرتاً ہنگامہ کار نہیں ہوں اس لیے مجبوراً گھر بیٹھنا پڑا۔ پہلے گھر والوں سے لڑنے جھگڑنے کا سلسلہ چلا یا۔ جب اس مشغلے سے طبیعت سیر ہو گئی تو یہ مضامین لکھنے شروع کر دیے جو انشاء اللہ آئندہ جھگڑوں کا موجب بنیں گے۔"

آگے لکھتے ہیں:

"قاضی جی جب شہر کے اندیشے میں دُبلے ہوئے تو اس بچارے نے بھی میری ہی طرح سوچا تھا۔ مجھے بھی جب شخصیت نگاری کا میدان قریب قریب سنسان نظر آیا، تو میں نے شخصی مضامین لکھے اگر مجھے شعری ادب ڈوبتا نظر آتا تو شعر کہتا اگر تنقید میں ہُو کا عالم دیکھتا تو اس صنف میں بھی اپنا لوہا منوا کر رہتا اس لیے کہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔"

"آپ کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ:

یہ چار مضامین میں نے سات برس میں لکھے ہیں۔ ایک لحاظ سے پہلے دو مضمون میں نے بیس برس سے زاید عرصے میں لکھے ہیں اس لیے کہ نیاز صاحب اور جوش صاحب کو میں ایک مدت سے پڑھ رہا تھا۔ اختر اورینوی اور کرشن چندر پر مضمون حقِ دوستی ادا کرنے کے لیے لکھے گئے ورنہ ان شخصیتوں کے بارے میں میرا مطالعہ جمتول قسم کا نہ تھا۔ پہلے دو مضمون کے بارے میں میرا دماغ مطمئن ہے اور دوسرے دو مضمون کے بارے میں میرا دل، ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ نہ دل مطمئن اور نہ دماغ اس لیے کہ یہ مضمون مجھ سے زبردستی لکھوائے گئے ہیں جنھیں میں نے محض ضرورتوں کو بہلانے کی خاطر لکھ ڈالا۔ یوں مجھ سے کسی بھی طرح ان مضامین کی تخلیق کا جُرم ثابت نہیں ہوتا۔

پانچواں مجموعہ "مکرم" تین خاکوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک خاکہ مختصر، دوسرا متوسط اور تیسرا طویل ہے۔ 'مکرم' میں جو تین شخصیتیں جلوہ افروز ہیں ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں: "مصطفٰے زیدی، شاہد احمد دہلوی اور حکیم یوسف حسن۔"

طفیل صاحب نے جن افراد پر قلم اٹھایا ہے وہ سب ادب کی معروف شخصیتیں ہیں جن کے خد و خال ہم ان کی تحریروں میں دیکھ چکے ہیں۔ لیکن طفیل صاحب ان شخصیتوں کی ادبی حیثیت کو پرے ہٹا کر ایسے نقش و نگار تک پہنچے ہیں جو ان کی ادبی شخصیت کو نہیں بلکہ ان کی حقیقی سیرت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ شخصیتوں کے جن پہلوؤں کی اُنھوں نے نقاب کشائی کی ہے ان سے صورت اور سیرت دونوں کی تمام تر تفصیلات نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ایک کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> ان کا رنگ تو ہے گہرا گندمی (اگر میں ہلکا سیاہ کہوں گا تو ان کی ہو گی ہتکی) قد اچھا خاصا مردوں جیسا ہے نہ زیادہ اونچا نہ ناٹا، بلکہ خوب صورت قد۔ ناک کو لمبی کہوں تو بھی غلط چپٹی کہوں تو بھی غلط اس لیے بین بین سمجھیے البتہ ناک ذرا اور شمال جنوب کو پھیلتی تو آپ بے دھڑک چینی ناک کا خطاب دے سکتے تھے۔ اب احتیاط لازم، دانت خاصے خوب صورت تھے مگر یہ اس رفتار سے پان کھاتے رہے ہیں کہ آخر کب تک بھلے لگتے رہتے، چہرہ پر عینک، پہلے چہرے پر مونچھیں ہوتی تھیں درمیان میں غائب ہو گئیں اب پھر اپنا جلوہ دکھانے لگی ہیں ویسے ان کے چہرے کی اس چیز کا کوئی اعتبار نہیں ہے نہ جانے کب غائب ہو جائے اور کب نمودار ہو جائے۔

گو طفیل صاحب نے غیر معروف شخصیتوں پر قلم نہیں اُٹھایا لیکن اس صنفِ ادب کو اسلوب اور لہجے کا نیا رجحان ضرور عطا کیا جس میں تراکیب، رنگین اصطلاحات اور شُستہ محاورات سے ان کے لکھے ہوئے مضامین مالا مال ہیں۔ وہ خاکوں میں اپنے جذبات و تاثرات کے اظہار کے لیے جو الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ روزانہ بول چال کے الفاظ ہیں جو نہ کل پرانے تھے نہ آج پرانے ہوں گے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ان کا اپنی ذات کے بارے میں جو یہ خیال ہے کہ میں بڑا بے وقوف قسم کا انسان ہوں۔ بڑا غلط ہے بہت سارا پیارا دوست، مخلص محبت ہی محبت قسم کا برانڈ خوب صورت باتوں کا بادشاہ۔ باتیں انسانوں کی طرح دلکش، پیچ در پیچ اتنی کہ تسلسل ٹوٹنے ہی نہیں پاتا۔ ریکارڈ کی طرح بجتے ہی چلے جائیں گے ایکٹنگ ایسی غضب کی کہ ہاتھوں کے سارے طوطے اُڑ جائیں اور مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔

ان کا یہ انداز ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتا۔ اپنے نئے ملنے والوں سے دُلہن کی طرح شرماتے ہیں۔ پرانا ملنے والا مل جائے تو بازار ہی میں کھڑے کھڑے اتنا ہنسائیں گے کہ راہ گیر کم از کم دونوں میں سے ایک کو تو ضرور پاگل سمجھے گا۔

محمد طفیل کو اظہار پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کا لب و لہجہ شوخ و دلکش ہے۔ الفاظ میں موسیقی ہے اسلوب نہایت ہلکا پھلکا اور رواں دواں ہے جس میں بے ساختگی، برجستگی اور بے تکلفی اور لطافت سب ہی کچھ موجود ہے۔ ان کی تحریر کی روانی کو اس صحرائی چشمے سے مشابہت دی جا سکتی ہے جو سبک خرامی کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کوئی رکاوٹ سدِّ راہ نہیں ہوتی۔

طنز و مزاح کے لیے خاکے میں کافی گنجائش ہوتی ہے۔ طنز و مزاح کے میدان میں بالعموم عامیانہ مذاق سے دامن بچانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ ان کے ہاں یہ دونوں عناصر اعتدال کے ساتھ موجود ہیں۔ گو ان کے رنگ گہرے نہیں لیکن کہیں عامیانہ لہجہ یا بد مذاقی کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ طنز اس انداز سے کرتے ہیں کہ ان میں تلواروں کے کاری وار نہیں ہوتے بلکہ نشتروں کی چبھن ملتی ہے یہ انداز نگارش دیکھئے۔

جہاں تک شعر سمجھنے کا تعلق ہے خوب سمجھتے ہیں۔ شعروں کا آپریشن بھی خوب کرتے ہیں مگر اس آپریشن میں بعض اوقات شعر کو بھی ذبح کر ڈالتے ہیں ساری دنیا ان کی اصلاحوں کو جو چاہے درجہ دے مگر میری ناچیز رائے میں اصلاحیں بڑی بھونڈی دیتے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ طفیل صاحب طبعاً مزاح نگار ہیں اس لیے ان کی چٹ پٹی باتیں مزہ دے جاتی ہیں بڑے فقرہ باز بھی ہیں اور ان کے فقروں کی برجستگی ان کے شگفتہ اندازِ گفتگو اور اندازِ تحریر کی جان ہے۔ طفیل صاحب کی تحریر اور تقریر میں کوئی بیّن فرق نہیں ہے۔ جب وہ اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں لکھتے ہیں تو بعض دفعہ اپنی روانی میں حفظِ مراتب کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور مولوی عبدالحق جیسے بزرگ ادیب کو بھی کانوں کے کچے اور متعصب تک کہہ جاتے ہیں مگر اس پیار اور خلوص سے کہ موصوف کے یہ عیب ہمیں نہیں کھٹکتے۔

طفیل صاحب نے جتنے اسکیچ اپنے نوکِ قلم سے ادب کے کینوس پر اُبھارے ہیں اس میں شخصی خوبیاں، خامیوں اور کمزوریوں کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ ان کی تصویروں میں سیرت کے نقش و نگار نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ بغض یا عناد کی گرد سے آلودہ نظر نہیں

آتیں۔ بعض خاکوں کا کینوس بہت طویل ہے اور بعض کا بیحد مختصر۔ لیکن ان کے فن کی بدولت ان کی پیش کردہ ہستیاں جیتے جاگتے انسان کے رُوپ میں ملتی ہیں ان کے کردار محض سایوں کے مانند قاری کے سامنے نہیں آتے بلکہ وہ انھیں اس طرح پہچانتا ہے جیسے کہ برسوں سے ان سے واقفیت رکھتا ہو۔ نہایت معمولی جزئیات کو بھی بڑی خوبی سے پیش کرجاتے ہیں۔ عام نگاہوں میں جن چھوٹے چھوٹے واقعات کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی وہ اپنی ساحرانہ فن کاری کی بنا پر انھیں اہم اور قیمتی بنا دیتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے بعد اگر کسی نے شخصی خاکہ نگاری کی زمین میں صحیح طور پر بیج بوئے اور فصل کاٹی ہے تو وہ محمد طفیل ہیں جو سراپا شخصیت نگار ہیں۔

(۲)

اُردو میں خاکہ ایک کم عمر صنفِ ادب ہے۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس صنف میں انتہائی کم عرصے میں اس قدر وافر ذخیرہ جمع ہوگیا ہے جس کی مثال کسی دوسری صنفِ ادب میں نہیں ملتی۔ اس صنف میں اردو ادب کے صفِ اوّل کے ادیبوں اور مزاح نگاروں نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ محمد حسین آزاد، مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، ابوالکلام آزاد اور عبدالماجد دریابادی، محمد طفیل، اشرف صبوحی، شوکت تھانوی اور سعادت حسن منٹو جیسے انشاپردازوں نے اپنے زورِ قلم سے اس صنف کو اس درجہ نکھارا ہے کہ وہ موجودہ دور میں اردو ادب کی ایک دلکش اور مقبولِ عام صنف بن گئی ہے۔ مختصر افسانے کی طرح خاکے کی صنف کے فروغ پانے کا ایک سبب قارئین کی کم فرصتی ہے۔ صحافت اور ریڈیو نے بھی اس صنف کو ترقی دینے اور مقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ لوگ مشہور شخصیتوں کی زندگی کے بارے میں جاننے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ شخصیت کی زندگی کے رازوں اور ان کی داخلی کیفیات سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ جبھی تو ہم سوانح عمریاں، خطوط اور خاکے دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ یہ ایک جبلی خواہش ہے اور کبھی انسان کے دل سے معدوم نہیں ہوسکتی، اس لیے مستقبل میں بھی ایک صنف کی حیثیت سے خاکے ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے بشرطیکہ اس کے اظہار کے طریقے بھی زمانے کے لحاظ سے بدلتے رہیں۔ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب کسی شخصیت کے بارے میں کوئی اہم خبر شائع ہوتی ہے کسی شخص کو کوئی بڑا انعام یا اعزاز ملتا ہے، کوئی شخص ایک اہم کارنامہ انجام دیتا ہے،

کسی نامور شخصیت کا یوم پیدائش منایا جاتا ہے، کسی معروف و مشہور انسان کی موت واقع ہوتی ہے تو اس کے تعلق سے مضامین اور سوانحی خاکے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے اور ریڈیو سے نشر ہوتے ہیں اہم شخصیتوں کی یاد میں رسالے خاص نمبر شائع کرتے ہیں تو ان کے احباب اور جاننے والوں کے لکھے ہوئے خاکے ایسی خصوصی اشاعتوں کا اہم جزو ہوتے ہیں۔ آج اردو میں جو خاکے ملتے ہیں ان میں سے بیشتر ایسے ہی موقعوں پر لکھے گئے تھے۔ بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آئندہ خاکہ نگاری کے یہ محرکات باقی نہ رہیں دوسری طرف خاکے کا موضوع ایسا نہیں ہے کہ آئندہ زمانے میں کبھی اس سے قارئین کی دل چسپی ختم ہو جائے، بظاہر خاکے کا بس ایک ہی موضوع ہے، یعنی انسانی شخصیت لیکن شخصیتوں کی انفرادیت ہی خاکہ نگاروں کی صنف کو نقش ہائے رنگ رنگ عطا کرنے کا باعث ہوتی ہے، خاکے کا ہر موضوع جداگانہ شخصیت کا حامل ہوتا ہے، اس اعتبار سے موضوعات کا تنوع سب سے زیادہ خاکے ہی کی صنف میں ملے گا اور ایسی ندرت اور تازگی کے سبب یہ صنف ہمیشہ جاذب توجہ بنی رہے گی۔

یوں بھی اس صنف کے مٹنے کا کوئی احتمال نہیں ہے البتہ خاکے کا ادبی معیار اور اس صنف کا وقار اسی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے جب کہ بلند پایہ انشا پرداز اس میں طبع آزمائی کرتے رہیں۔ اردو میں ڈرامے، انشائیے اور خاکے کی اصناف پر دوسرے اور متوسط درجے کے مصنفوں نے زیادہ توجہ کی ہے۔ ناولوں کی طرح خاکے بھی بکثرت لکھے جا رہے ہیں۔ مقدار (QUANTITY) کی اس فراوانی میں معیار (QUALITY) پر نظر رکھنا نہایت ضروری ہے لیکن جب تک فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، محمد طفیل، سعادت حسن منٹو، کنہیالال کپور جیسے ادیبوں کی تحریریں اردو ادب میں باقی رہیں گی۔ خاکہ اردو ادب کی ایک مقبول صنف بنا رہے گا۔ اس لیے امید بندھتی ہے کہ مستقبل میں اردو میں خاکہ نگاری کی صنف مزید ترقی کرے گی۔ اردو کے صف اول کے ادیبوں نے اعلیٰ پایہ کے خاکوں کے جو نمونے ہمیں دیے ہیں وہ مستقبل کے خاکہ نگاروں کے لیے چراغ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اظہار کے تجربوں کی بالخصوص اس صنف میں بڑی گنجائش موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ غزل کی طرح خاکہ بھی اردو نثر کی ایک سدا بہار صنف بن جائے گا۔

اُردو میں خاکہ نگاری

انور سدید

اُردو میں خاکہ نگاری کی تاریخ کچھ زیادہ پُرانی نہیں ہے۔ ذرا پیچھے دیکھیں تو فرحت اللہ بیگ سے پرے کوئی ایسی بڑی شخصیت نظر نہیں آتی جس نے کوئی مکمل خاکہ لکھا ہو۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں کچھ شاعروں کے مرقعے جمع کیے ہیں اور یہ مرقعے دلچسپ بھی ہیں لیکن محمد حسین آزاد کے زمانے میں خاکہ نگاری کی باقاعدہ ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ ان کے ہاں ایک اچھے خاکہ نگار کی تمام خوبیاں موجود ہیں لیکن آبِ حیات میں یہ تمام خوبیاں مرتب صورت میں سامنے نہیں آسکیں۔ چنانچہ محمد حسین آزاد ایسے ہی خاکہ نگار ہیں جیسے آج کل کچھ لوگ سرسید کو انشائیہ نگار کہتے ہیں۔ اگر محمد حسین آزاد کو خاکہ نگار تسلیم کر لیا جائے تو ناصر لکھنوی جنھوں نے تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں سودا کے بارے میں اور قدرت اللہ قاسم جنھوں نے مجموعۂ نغز میں انشاء اللہ خاں انشا کے بارے میں ذاتی تاثرات وادبی واقعات اور عام دلچسپی کا مواد مہیا کیا ہے تو انہیں بھی اولیں خاکہ نگاروں میں شمار کرنا پڑے گا۔ انشاء اللہ خاں انشاء نے بھی دریائے لطافت میں بعض شخصیتوں کو انوکھے زاویے سے دیکھا ہے اور نکتہ آفرینی اور مشاہدے کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔ رتن ناتھ سرشار اپنے قلم کا رہوار خوجی اور آزاد کے علامتی کرداروں سے ہٹا کر اپنے عہد کی شخصیتوں کی طرف موڑتے تو اس میدان میں بھی مثالی رتبہ حاصل کر لیتے۔ درحقیقت ان سب کے ہاں خاکہ نگاری کا جوہر تو موجود ہے اور چند ایک کے ہاں اس صنف کے ابتدائی نقوش بھی ملتے ہیں لیکن یہ بکھرے ہوئے اور غیر مدون صورت میں ہیں۔ خاکہ نگاری کی ابتداء دراصل مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوتی ہے جنھوں نے مولوی نذیر احمد کی کہانی۔ وحید الدین سلیم کا خاکہ پھول والوں کی سیر اور دلّی کا آخری مشاعرہ لکھ کر خاکہ نگاری کو الگ صنفِ ادب کا درجہ دے دیا۔ اس کی انتہا محمد طفیل پر ہوتی ہے جنھوں نے جناب، صاحب، آپ اور محترم کے بعد مکرم پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس میدان میں بھی زیادہ سے زیادہ وکٹیں حاصل کرنے کا اٹوٹ ریکارڈ قائم کیا جا سکتا ہے۔

خاکہ نگاری کے بارے میں اہلِ علم کی آراء مختلف ہیں۔ بعض اسے اتنا آسان سمجھتے ہیں کہ ادھر قلم اٹھایا اُدھر کھٹ سے خاکہ تیار۔ بعض اسے اتنا مشکل سمجھتے ہیں کہ خامہ خونچکاں اور انگلیاں فگار

ہوجانے کے باوجود شخصیت کی ڈوری مصنف کے ہاتھ میں نہیں آتی۔ کہیں عقیدت مدح کا روپ دھار لیتی ہے کہیں نفرت کا قدح۔ کچھ لوگ خاکہ نگاری کرتے کرتے سیرت نگاری کا فریضہ سرانجام دے ڈالتے ہیں جب کہ دوسرے شخصیت کی تلاش میں تاریخی گوشواروں کے جنگل میں کھو جاتے ہیں۔ بعض اوقات شخصیت بڑی ہوتی ہے اور مصنف اس کی چہرہ نمائی کے لیے اپنی دستار سنبھال رہا ہوتا ہے اور کبھی شخصیت کھوکھلی ہوتی ہے اور خاکہ مصنف کے اپنے جلال و جمال کا مظہر بن جاتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ خاکہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کا خام مواد کسی دوسری شخصیت کے اخذ و مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ایک عمدہ خاکہ اس خام مواد کو من وعن پیش نہیں کرتا۔ بلکہ مختلف واقعات کو مشاہدہ بین کے تاثر اور تجزیے کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہی وہ مشکل مرحلہ ہے جہاں مصنف کے تخلیقی جوہر سے مس خام یا تو کندن بن جاتا ہے یا راکھ۔ شاید اسی لیے مجنوں گورکھپوری خاکہ نگار کے لیے متجسس اور دریاب نگاہ ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے نزدیک اس فن میں "طوفان پہ چلنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے لیکن ازلی طور پر اظہار کے راستے مسدود ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر احسن فاروقی اسے ایک ایسے صراطِ مستقیم سے تعبیر کرتے ہیں جو بال سے زیادہ باریک اور تیغ سے زیادہ تیز ہے۔ علی عباس حسینی شخصیت نگاری کو سوانح نگاری کی مشکل ترین قسم تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی عظیم ہستی کے واقعاتِ حیات کو بیان کر دینا اور اس کے کارناموں شاہکاروں اور تصنیفوں پر تقریظی نظر ڈال لینا نسبتاً آسان کام ہے لیکن شخصیت نگاری کے فن میں کامیابی کے لیے مردم شناس نظر کے ساتھ ساتھ عام انسانی نفسیات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ علی عباس حسینی اس فن کارانہ سکہ دستی کو جو غیر جمیل نقوش میں بھی آب و رنگ بھر دے اہم قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم خاکہ نگاری کے لیے انسان کی شخصیت کا ہمدردانہ ادراک ضروری سمجھتے ہیں۔ معین الدین کے نزدیک اس صنف میں تاریخی واقفیت سے زیادہ شخصی تاثر کی دھوپ چھاؤں کو اسیر کرنا پڑتا ہے۔ نثار احمد فاروقی خاکہ نگاری کو تنقید یا تنقیص کے برعکس شخصیت کی عکاسی کا نام دیتے ہیں اور یحییٰ امجد کا تقاضا ہے کہ خاکے کے تعارفی جملوں اور واقعات سے ایک ایسا تاثر مرتب ہو جس سے شخصیت زندہ ہو کر سامنے آجائے۔ عبدالرشید کے نزدیک خاکہ شخصیت کی کھدائی ہے جو تہذیبی حقائق کے کشف کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

ان سب باتوں کو ملحوظِ نظر رکھیے تو اردو ادب میں بہت کم ایسے خاکہ نگار ملتے ہیں جنھوں نے آزمائش کے ان تمام مرحلوں کو پوری کامیابی سے سر کیا ہو۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر وزیر آغا اس فن کو

"کارگہِ شیشہ گراں" کا عنوان دیتے ہیں اور محمد طفیل ایک ایسی تلوار کا جس سے خود لکھنے والا بھی زخمی ہوتا ہے۔

ان معروضات کی روشنی میں محمد حسین آزاد کا جائزہ لیجیے تو اُن کے ہاں تعریف اور تنقیص دونوں میں توازن کی کمی نظر آتی ہے۔ وہ سراپا نگاری اور لباس کی تفصیلات تو عمدگی سے بیان کرتے ہیں لیکن ملبوس سے نیچے شخصیت کی تہ تک ان کی نگاہ نہیں جاتی۔ پھر انکے ہاں لطیفوں کے بے محل استعمال سے بھی شخصیت کے بارے میں غلط تاثر پیدا ہوتا ہے۔ درحقیقت محمد حسین آزاد نے شخصیت سے زیادہ ایک تہذیبی ماحول کی عکاسی کی ہے اور جہاں کہیں بھی انہیں اقدار کی شکستگی کا احساس ہوا ہے انہوں نے اسے شخصیت کے حوالے سے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے اور اس کوشش میں وہ اپنے تعصبات پر بھی پردہ نہیں ڈال سکے۔ آخری بات یہ کہ بعض ایسے واقعات جن کی تاریخی صداقت غلط ثابت ہو چکی ہے آب حیات میں راہ پا گئے ہیں اور ان سے شخصیات کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی محمد حسین آزاد کے خاکوں کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے تذکرہ نگاری سے خاکہ نگاری کی طرف ایک مثبت قدم اُٹھایا اور وہ مستقبل کی ایک نئی صنف کے لیے اشارہ نما ثابت ہوئے۔

اُردو خاکہ نگاری میں پہلا اہم نام فرحت اللہ بیگ کا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد سے عقیدت رکھنے کے باوجود اور ان کی عظمت کا اعتراف کرنے کے باوصف ان کی کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالا۔ انہوں نے زہر خند کی کیفیت پیدا کیے بغیر ڈپٹی صاحب کی شخصیت کو اس فنی پختگی سے بیان کیا ہے کہ قاری ان کے بارے میں ایک مناسب رائے قائم کرنے کی سہولت حاصل کر لیتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ فرحت اللہ بیگ نے محمد حسین آزاد کے آرائشی اسلوب کی تقلید بھی نہیں کی بلکہ ان کی ندرت پسند طبیعت نے ایک ایسا متحرک اسلوب دریافت کیا ہے جس سے نذیر احمد کی بھاری بھرکم شخصیت کو نرم اور کومل انداز میں بیان کرنا ممکن ہو گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے خاکے میں انشائیے جیسی غیر رسمی کیفیت ہے۔ اس کا ڈھانچہ جامد نہیں بلکہ ڈھیلا ڈھالا اور لچک دار ہے۔ جن نقادوں نے اس خاکے میں زمانی اور تاریخی ترتیب تلاش کرنے کی سعی کی ہے وہ شاید اس بات کو نظر انداز کر گئے ہیں کہ شخصیت نگاری تاریخ نگاری سے ایک بالکل الگ فن ہے۔ فرحت اللہ بیگ کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس فن کی حدود ہی متعین نہیں کیں بلکہ اس نوخیز صنف کو ابتدا میں ہی پختگی کی ڈگر پر ڈال دیا۔ چنانچہ پھول والوں کی سیر۔ دہلی کا یادگار مشاعرہ میں ایک زوال پذیر معاشرے کی

بیان سے تصویر کھینچی گئی ہے اور اسی معاشرے کی جھلک ڈپٹی نذیر احمد اور وحید الدین سلیم کے خاکوں میں بھی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔

رشید احمد صدیقی نے خاکہ نگاری میں شخصیت کے انسانی اور عظمت کے تاریخی پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کی انفرادیت تو مسلم ہے لیکن اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ ان کی خاکہ نگاری پر شبابیت پسندی کا زیادہ غلبہ ہے۔ وہ اپنے موضوع کی انفرادیت کو پوری طرح منظر پر لانے کے لیے کردار کا ہمہ پہلو مشاہدہ کرتے ہیں اور اس مشاہدے میں ان کے ذاتی نظریات کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے بعد رشید احمد صدیقی پہلے خاکہ نگار ہیں جن کے خاکوں میں اشخاص چلتے پھرتے اور سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور قاری ان سے محبت اور ہمدردی کا جواز بھی پا لیتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ رشید احمد صدیقی کی اپنی شخصیت بے لوث اور بے کراں محبت کا پیکر ہے اور اُن کے آئینہ دل پر جس شخصیت نے بھی اثر ڈالا ہے اس تاثر کو انہوں نے اپنی شخصیت کے پیکر میں ہی گھر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی کے خاکوں میں صیغہ واحد متکلم اکثر نمایاں نظر آتا ہے۔ محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے خاکوں میں ان کی جذباتی محبت کے بے شمار چراغ روشن ہیں۔ ایوب عباسی کے خاکے میں انہوں نے انسان کی بنیادی نیکی کو اُجاگر کیا ہے۔ اُردو خاکہ نگاری میں رشید احمد صدیقی کا نام عظمت اور رفعت کا آئینہ دار ہے۔[1]

اُردو کے ابتدائی خاکہ نگاروں میں تیسرا اہم نام مولوی عبد الحق[2] کا ہے۔ مولوی صاحب چونکہ خود ایک اُونچے سماجی مرتبے پر فائز تھے اس لیے ان کی نگہ صرف بلندیوں کا ہی احاطہ کر سکی۔ اور وہ پستیاں جن سے تصادم انسان کی چھپی ہوئی عظمتوں کو نمایاں کرتا ہے ان کی نظر سے اوجھل رہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے صرف جواہر ریزوں پر نظر ڈالی ہے اور خزف ریزوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بعض ایسے لوگوں کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے جو معاشرے میں بلند مقام نہیں رکھتے لیکن یہاں بھی ان کی نگہ صرف خیر کو ہی تلاش کر سکی ہے اور وہ پورا انسان جس کے ہاں غلطی۔ کوتاہی اور کمزوری کے امکانات زیادہ ہیں سامنے نہیں آتا۔ سرسید۔ حالی۔ اقبال۔ محسن الملک۔ محمد علی۔ راس مسعود وغیرہ تو بڑے آدمی ٹھہرے مولوی صاحب نے نام دیو مالی اور نور خان میں بھی عظمت کی کرنیں تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مولوی عبد الحق

---

[1] کتابیں۔ گنجہائے گرانمایہ اور ہم نفسان رفتہ، ذاکر صاحب۔ [2] کتاب۔ چند ہم عصر

اپنے موضوع کے محاسن کا تذکرہ تو بڑی وارفتگی سے کرتے ہیں لیکن ان کی نثر کا تنقیق انداز اس وارفتگی کو تحرک دینے سے قاصر رہتا ہے۔ اور اسی لیے اکثر اوقات ان کے خاکوں کو سوانح اور سیرت کا نام دے دیا جاتا ہے۔ تاہم اُردو خاکہ نگاری میں ان کا نام کافی اہم ہے اور اس سنگِ میل سے گزرے بغیر آگے جانا ممکن ہی نہیں۔

ان تین بڑے خاکہ نگاروں کے بعد اُردو ادب کو جن لوگوں نے زیادہ اچھے خاکے عطا کیے۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق صحافت کے ساتھ رہا ہے۔ ان میں دو اہم نام چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک کے ہیں۔ حسرت کے ہاں ذاتی وجاہت اور وقار کا اظہار نمایاں ہے۔ اور بعض اوقات ان کی اپنی انا شخصیت پر حاوی ہو جاتی ہے۔ وہ بات سے بات اور نکتے سے نکتہ پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور تیکھی چٹکیوں سے شخصیت کے بارے میں ہمہ گیر تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی کتاب "مردم دیدہ" اُردو خاکہ نگاری کی ایک اہم کتاب ہے۔ عبدالمجید سالک کے "یارانِ کہن" پر دوست داری کا دبیز و صندلی رنگ چھایا ہوا ہے۔ سالک صاحب کے قلم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ اس دھندلکے کو اخفا کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ اپنے نوکِ طنز سے اس کا پردہ چاک کر کے شخصیت کے خدوخال واضح کرتے جاتے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ دونوں خاکہ نگار ایک عرصے تک روزانہ اخبارات میں فکاہی کالم لکھتے رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے خاکوں پر بھی سیاسی بذلہ، صحافتی تبصرہ اور نوکیلے لطیفوں کا کھلا چھینٹا نظر آتا ہے۔ رئیس احمد جعفری کا بھی صحافت کے ساتھ لمبے عرصے تک تعلق رہا ہے۔ وہ بھی "دید و شنید" میں ایک لمحے کے فوری تاثر سے پہلو بچا نہیں سکے۔ جعفری صاحب کے خاکوں میں گہرائی کی شدید کمی ہے اور ان کا اختصار بے حد کھٹکتا ہے۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں نے سادہ زبان، نرم لہجے اور فطری صداقت کو بروئے کار لانے میں نسبتاً زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ مفتوں نے فنی لوازمات کو پوری پابندی سے قبول نہیں کیا۔ لیکن انہوں نے شخصیت کی عظمت کا پیمانہ اخلاقی قدروں کو بنایا ہے اور اس پیمانے پر جو شخص بھی پورا نہیں اُترا وہ سردار صاحب کی نشتریت سے بچ نہیں سکا۔ شورش کاشمیری کے خاکوں پر جذباتی وارفتگی اور شوکتِ احساس غالب ہے۔ ان کے ہاں ردّ و قبول کی نہائتیں الگ الگ ہیں لیکن وہ ان نہائتوں کو اعجازِ لفظی کا شکار نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ اک جوئے تیز رو کی طرح اپنا صحیح تاثر قاری کے حوالے کر کے خود آگے نکل جاتے ہیں۔ ظفر علی خان، حمید نظامی اور میاں افتخار الدین کے خاکے انہیں دو انتہاؤں پر تخلیق ہوئے ہیں۔ مگر تونسوی کے خاکوں پر سستے نظریاتی پروپیگنڈے کی کثیف تہ جمی ہوئی ہے۔ انہوں نے حالات و تاثرات سے

شخصیت کی بنیادی خوبیوں کو تلاش کرنے کی بجائے پارٹی ورکر کا کھوج لگانے کی زیادہ کوشش کی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خد و خال کی تصویریں غیر متحرک اور گونگی نظر آتی ہیں۔

تہذیبی نقطۂ نظر سے اشرف صبوحی کی خاکہ نگاری کو اہمیت حاصل ہے۔ اشرف صبوحی کا موضوع سماجی، سیاسی یا ادبی لحاظ سے مصروف لوگ نہیں بلکہ ان کا موضوع وہ گم شدہ انسان ہے جس کی انوکھی شخصیت سے تمدن کے امتیازی نقوش مرتب ہوتے ہیں اور جو اپنی عظمت کو جانے بغیر انبوہ کی گرد میں چھپا رہتا ہے۔ ایسی شخصیت میں کردار کی تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ اشرف صبوحی کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس شخصیت کو دریافت کرکے اس کی گرد کو نہیں جھاڑا بلکہ اس کے اندر چھپے ہوئے کردار کے انوکھے گوشوں کی طرف قاری کو متوجہ کرایا ہے۔ ماسٹر تققس۔ ملن نائی۔ مٹھو بھٹیارہ گنجے نہاری والے وغیرہ میں انہوں نے متنوع خاکے پیش کئے ہیں جن سے دلی کی شخصیت کا ایک واضح عکس مرتب ہو جاتا ہے اس لحاظ سے اشرف صبوحی نے بنیادی طور پر دلی کی شخصیت نگاری کی ہے ـــــ دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ـــ

اسی انداز کا ایک دوسرا خاکہ نگار خواجہ حسن نظامی ہے۔ خواجہ صاحب بھی شخصیت کے غیر معروف گوشوں کو مرکزِ نگاہ بنا کر اس کے اندر چھپے ہوئے بڑے پن کو نمایاں کرتے ہیں۔ لب و لہجے کی شائستگی اور سادگی۔ اسلوب کا لوچ۔ محاورے کی دلکشی اور استعارے کی برجستگی یہ سب حسن نظامی کے ہاں ایک ایسی فضا تعمیر کرتے ہیں جس سے شخصیت اپنے طول عرض اور عمق کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ آغا حیدر حسن کے خاکوں پر بھی تہذیبی اور مجلسی رنگ زیادہ چڑھا ہوا ہے۔ ان کی تیز نگہی خارجی زاویوں کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ ان کے ہاں آرائش کا عنصر زیادہ ہے اور "پسِ پردہ" کے بیشتر خاکوں میں شخصیت کی داخلی خوبیاں خارجی تحسین کے بوجھ تلے دب گئی ہیں۔

تہذیبی نقطۂ نظر کی تازہ کاری کا ایک اور نمائندہ شاہد احمد دہلوی ہے۔ ان کی کتاب "گنجینۂ گوہر" خاکہ نگاری کے سرمایے میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ شاہد احمد دہلوی کو شخصیت کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کا جائزہ لینے میں مہارت حاصل ہے۔ ان کے ہاں ذہانت اور جرأت کا عمدہ آمیختہ ہے۔ عقیدت اور محبت کا باہمی امتزاج ان کے خاکوں کا امتیازی وصف ہے۔ لیکن جہاں کوئی شخصی کمزوری ان کی گرفت میں آجاتی ہے وہاں انہوں نے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کے بجائے شخصیت کو بالکل برہنہ کر دیا ہے۔ میراجی۔ جوش۔ تاثیر۔ فراق۔ حسرت اور شوکت تھانوی وغیرہ کے بارے میں ان کے بعض جملوں سے استہزاء اور نفرت کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

ناصر علی دہلوی۔ ایم اسلم۔ عظیم بیگ چغتائی اور بیخود دہلوی کی شخصیت کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کی دیدہ بینا اور مشاہدے کی قوت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کے خاکے میں ان کا رویہ جارحانہ اور یک طرفہ ہے اور وہ تحفظ ذات کے لیے خاکہ نگاری کی جائز حدود سے بھی تجاوز کر گئے ہیں۔ بہرطور ان کے خاکے ادب کے قاری کے لیے ناقابل فراموش ہیں۔ لہجے کی شائستگی کا ایک اور مظہر اخلاق احمد دہلوی ہے۔" اور پھر بیان اپنا" میں انھوں نے کئی ایسے چشموں کی نشان دہی کی ہے جن میں محبت کی شیرینی اُبل رہی ہے۔

ایک عرصے تک مزاح کو خاکہ نگاری کا ایک ضروری عنصر تصور کیا جاتا رہا ہے۔ ہرچند شخصیت کے بعض تیکھے نقوش اُبھارنے کے لیے مزاح سے عمدہ کام لیا جاتا ہے لیکن مزاح اس فن کے لیے مقصود بالذات نہیں ہے۔ "شیش محل" میں شوکت تھانوی نے مزاح سے اساسی ضرورت پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ خاکے دلچسپ ضرور ہیں لیکن ان میں شخصیت ظرافت کے قہقہے تلے دب گئی ہے۔ ان خاکوں میں تاثر کا سرسری نتیجہ لمحاتی ہے اور تبصرہ محض ایجاد بندہ ہے اور اس میں بھی شوکت تھانوی کے مزاح کے تمام ذرائع یعنی اُلٹ پھیر۔ قول محال۔ پھبتی۔ بذلہ۔ لطیفہ، وغیرہ کو زیادہ عمل دخل حاصل ہے۔ شاید اسی لیے علی عباس حسینی نے ان خاکوں کو اچھے اچھوں پر کلوخ اندازی کہا ہے۔ شوکت تھانوی کے خاکوں میں اختصار کھٹکتا ہے تو غلام احمد فرقت کے خاکوں کی بیجا طوالت ناروا معلوم ہوتی ہے۔ شوکت تھانوی مزاح سے شگفتگی پیدا کر کے شخصیت سے اپنا ہمدردانہ رویہ واضح کر ڈالتے ہیں لیکن غلام احمد فرقت کے مزاح میں تصرف بیجا کا عنصر زیادہ ہے اور وہ شخصیت کے داخلی پہلوؤں پر توجہ دینے کے بجائے اس کے لباس اور شکل وصورت کو نشانہ مزاح بنا لیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر محمد حسین آزاد نے جو مضحک صورتیں سنجیدگی سے پیش کیں۔ غلام احمد فرقت نے انہیں صورتوں کو مزاح سے مزید بگاڑ دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ غلام احمد فرقت کے خاکوں میں ——— شخصیت کے بارے میں مخلصانہ جذبات پیدا ہی نہیں ہوتے۔ شاید اسی لیے ان کے خاکے زیادہ لائق اعتنا نہیں سمجھے گئے۔

اُردو خاکہ نگاری میں عصمت چغتائی نے اپنے فن کا پورا مظاہرہ نہیں کیا پھر بھی ان کا صرف ایک خاکہ دوزخی انہیں وہی مقام عطا کر چکا ہے جو میرزا فرحت اللہ بیگ کو نذیر احمد کی کہانی لکھ کر حاصل ہوا۔ دوزخی کی سب سے بڑی خوبی اس کا غیر رسمی منفعل مزاج ہے۔ یہاں گناہ و ثواب، خیر و شر اور نیکی و بدی کی تمیز کے لیے کوئی پیمانہ تلاش نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایسے واقعات جو بظاہر نفرت پیدا کر سکتے

ہیں۔ اس شائستہ بے خوبی سے بیان کر دیئے گئے ہیں جن سے عظیم بیگ چغتائی سے پیار وہ چند ہو جاتا ہے۔ خارجی سطح پر مصنفہ شخصیت سے محبت کا کوئی جذبہ ظاہر نہیں کرتی لیکن داخلی طور پر اس کے سینے میں محبت کا اتنا بڑا تلاطم ٹھاٹھیں مار رہا ہے کہ ضبط اور پابندی اس پر کوئی بند نہیں باندھ سکتی۔ اور خوبی یہ ہے کہ محبت کا یہی تلاطم پوری جولانی سے قاری کو منتقل ہو جاتا ہے عصمت چغتائی نے ایک اور اچھا خاکہ سعادت حسن منٹو پر لکھا ہے لیکن مجاز اور پطرس کے خاکے میں وہ اپنا معیار برقرار نہیں رکھ سکیں۔

عصمت چغتائی کا فن حلاوت کی مثال ہے تو سعادت حسن منٹو کا فن جراحت کی۔ لیکن منٹو کو اصرار ہے کہ :۔

"میں ایسی دنیا پر۔ ایسے مہذب ملک پر۔ ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں۔ جہاں یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کو کردار اور تشخص کی لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دُھل دھلا کر آئے اور رحمتہ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔ میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں۔ کوئی شیمپو نہیں۔ کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی۔ اس کے منہ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میرا جی کی غلاظت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔"

دیباچہ "گنجے فرشتے"

اس کھردری صدق بیانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ منٹو نے اس صنعت کو بے رحم حقیقت نگاری کی روش پر ڈال دیا اور شاید یہ منٹو ہی کے اثرات تھے کہ شاہد احمد دہلوی جیسا مرنجاں مرنج اور تہذیبی لحاظ سے شائستہ انسان جوش۔ میرا جی اور شوکت تھانوی وغیرہ کا مونڈن کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ منٹو نے نیم روشن تصویریں بنانے کے بجائے شوخ اور عریاں تصویریں بنانے کی طرح ڈالی جس سے سسپنس اور تحیر کی فضا پیدا ہوئی اور خاکہ افسانے کے قریب پہنچ گیا۔ انہوں نے باری علیگ۔ اختر شیرانی۔ حشر کاشمیری۔ میرا جی۔ اداکارہ نسیم۔ اشوک کمار اور صحافی بابو راؤ پٹیل کے خاکوں میں جن اصلی رنگوں کو اُجارا ہے انہیں صرف منٹو کی مصلحت نا اندیش آنکھ دیکھ سکتی تھی اور وہی صلیب پر

چڑھا کر انہیں لکھ سکتا تھا۔ منٹو شاید واحد خاکہ نگار ہے جو شخصیت کے سحر کو قبول نہیں کرتے بلکہ شخصیت خود ان کے سامنے سہمی اور زبان بستہ نظر آتی ہے۔ قائد اعظم کے خاکے میں ان کے لہجے میں تھوڑی سی نرمی پیدا ہوئی ہے لیکن یہاں بھی منٹو نے بہر عقیدت قلم کو بے جا جھکنے پر مجبور نہیں کیا۔ اور موٹر ڈرائیور کو متعارف کرا کے بالواسطہ طریق اختیار کیا ہے۔ اب قائد اعظم تو حسب دستور اپنے پُرعظمت مقام پر کھڑے ہیں۔ ان کے پاؤں میں آزاد ڈرائیور کھڑا ہے اور منٹو باہر کھڑکی میں کھڑے ہو کر صرف مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اب تک میں نے جن ادیبوں کا اجمالی ذکر کیا ہے ادب میں ان سب کا مقام بحیثیت خاکہ نگار متعین ہو چکا ہے (ایک اہم اور منفرد خاکہ نگار محمد طفیل ہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا) دوسری بات یہ کہ اُن سب کے خاکوں کی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ نقوش کے شخصیات نمبر سے پہلے یہ صنف صرف خواص تک محدود تھی۔ اس نمبر کی اشاعت کے بعد خاکہ نگاری کو جو فروغ حاصل ہوا اس سے کئی اور لوگوں کو بھی اس طرف متوجہ ہونے کا خیال پیدا ہوا اور بعض ادیبوں نے اتنے عمدہ خاکے لکھے کہ ان کا تذکرہ نہ کرنا غیر مناسب ہو گا۔ نقوش کے شخصیات نمبر میں خاکہ نگاروں اور شخصیتوں کا ایک پورا عالم آباد ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے زمانے میں پورے ہندوستان کو متاثر کیا اور جن کی گمشدگی کے بارے میں :

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

اس نمبر میں زندہ و تابندہ نظر آتے ہیں۔ تاہم اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اس نمبر کے بیشتر شرکاء نے خاکہ نگاری کے بنیادی تقاضوں کو نہیں سمجھا۔ چنانچہ ان خاکوں میں تاریخی واقعات اور مصنف کی ذات سے گہری وابستگی پیدا نہیں ہو سکی۔ پھر شخصیت اور مصنف کے درمیان جو طویل زمانی فاصلہ حائل تھا اُس نے مزید بُعد پیدا کر دیا۔ اس کے باوجود منشو پر حامد جلال، مالک رام پر مختار الدین آرزو، رشید احمد صدیقی پر آل احمد سرور، میر ناصر علی پر انصار ناصری اور محمد حسین آزاد پر آغا محمد باقر کے خاکے تفصیلی اور منفرد ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین کی کتاب "ملک ادب کے شہزادے" فن خاکہ نگاری میں تو کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتی لیکن اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ انہوں نے بڑے رواں انداز میں اپنے ملنے والوں کی ملاقاتوں کا حال لکھا ہے۔ انہیں فقط تاثرات کہا جا سکتا ہے خاکے نہیں۔ مگر ان میں اپنی جگہ یہ ایک دلکشی ضرور ہے۔

ممتاز مفتی نے "پیاز کے چھلکے" میں بانو قدسیہ، عزیز ملک، ابنِ انشا، محمد طفیل اور قدرت اللہ شہاب پر متوازن اور مستحکم خاکے لکھے ہیں۔ ممتاز مفتی کی انگلیاں باتیں کرتی ہیں اور آنکھیں لکھتی ہیں۔ ان خاکوں میں بھی ان کا پُراسرار اسلوبِ تحریر اپنا جادو پوری طرح جگاتا ہے۔ یہ پوری شخصیت کو نہیں گھیرتے بلکہ شخصیت کے کسی ایک بنیادی رُخ کو سامنے رکھ کر جائزہ لیتے ہیں۔ احمد بشیر کا ممتاز مفتی پر خاکہ "چُپ" میں دیباچے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ میں ابھی تک اسے بھلا نہیں سکا۔ اسی طرح ان کے احسان دانش اور ظہیر کاشمیری پر بھی خاکے بھلائے نہیں جا سکتے۔

اُردو خاکہ نگاری کے ابتدائی دَور میں اخلاقی رُجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ رشید احمد صدیقی اور مولوی عبدالحق کے ہاں یہ رُجحان بے حد اہم ہے۔ انہوں نے شخصیت کو ایک ایسا ماڈل بنا کر پیش کیا ہے جس کی تقلید آنے والی نسلوں کو کرنی چاہیئے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ کا بنیادی رُجحان بھی یہی ہے لیکن وہ اصلاحی مقصد کو غالب نہیں آنے دیتے اور اپنے ممدوح کو آسمان پر لے جانے کی بجائے زمین پر ہی رہنے دیتے ہیں۔ دوسرا اہم رجحان تہذیبی ہے اور اس کے نمائندے اشرف صبوحی حسن نظامی اور شاہد احمد دہلوی ہیں۔ اس قسم کے خاکہ نگاروں کے ہاں تہذیبِ نو کے خلاف دبا دبا احتجاج۔ قدروں کی شکست پر مرثیہ خوانی اور پرانی تہذیب کے مٹ جانے پر اشکباری کا انداز ملتا ہے۔ ان دونوں رجحانات کے امتزاج کی مثال محمد طفیل ہے جو قدروں کی تجدید کی خواہش بھی کرتا ہے اور نئے زمانے کے نقاضوں کا ساتھ دینے پر بھی مائل ہے۔ اُردو خاکہ نگاری پر سعادت حسن منٹو کے اثرات لازوال ہیں۔ اُس نے نہ صرف خاکہ نگاری کو نئی راہ پر ڈال دیا بلکہ شخصیتوں کے اتنے متنوع ماڈل پیش کر دیئے کہ اب نئے خاکہ نگاروں کے ہاں کسی خاص رجحان کی تلاش بے سُود ہے۔ اگر کچھ لوگ اس صنف کی طرف رشید احمد صدیقی اور محمد طفیل کی سی سنجیدگی سے متوجہ ہوں تو شاید خاکہ نگاری میں کچھ نئے رُجحانات کی ترویج کا مشاہدہ کیا جا سکے۔

محمد طفیل کی خاکہ نگاری

میں نے خاکہ نگاری کا یہ مختصر سا جائزہ اس لیے پیش کیا ہے کہ اس نوبرداں صنفِ ادب کا پس منظر بیان ہو سکے اور چند ایک منفرد خاکہ نگاروں کی نمایاں خوبیاں سامنے آ سکیں۔ اب میں ایک ایسے خاکہ نگار کا نسبتاً تفصیل سے جائزہ لینے کی اجازت چاہتا ہوں جس نے اس صنف کو ایک بلند مقام ہی نہیں بخشا بلکہ اسے اپنے لیے توشۂ آخرت بھی بنا لیا ہے۔ میری مراد محمد طفیل سے ہے۔

جنہوں نے اپنی خاکہ نگاری کی پانچویں کتاب "محترم" حال ہی میں شائع کی ہے۔
خاکہ نگاری بعض دوسرے مصنفین کے ہاں محض ایک اضافی صنفِ اظہار ہے۔ مثال کے طور پر فرحت اللہ بیگ اور شوکت تھانوی کی اوّلیں محبت مزاح نگاری سے ہے۔ عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت بنیادی طور پر صحافی تھے اور صحافت سے ہی منسوب ہونا پسند کرتے تھے — رشید احمد صدیقی مزاح اور تنقید دونوں میں امٹ شہرت پا چکے ہیں۔ مولوی عبدالحق خاکہ نگار سے زیادہ مقدمہ نگار تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین اعلیٰ پایے کے نقاد ہیں اور عصمت اور منٹو اوّل درجے کے افسانہ نگار ہیں۔ بعض لوگوں نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے یا محض فیشن کے طور پر ایک آدھ خاکہ لکھ کر شہیدوں میں نام لکھوانے کی کوشش کی ہے اور اس کے بعد بالکل بھول گئے کہ اس صنف سے تبرد آزما ہونے کی عمدہ صلاحیت بھی ان کے ہاں موجود ہے۔ اور ایک آدھ چراغ جو انہوں نے روشن کیا ہے اس کی جوت دُور دُور تک جا رہی ہے۔ ان لوگوں میں احمد بشیر۔ حامد جلال اور اوپندر ناتھ اشک وغیرہ کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ اشرف صبوحی۔ شاہد احمد دہلوی اور اخلاق احمد دہلوی نے خاکہ نگاری کو ایک الگ صنفِ اظہار کے طور پر قبول کیا اور اسے فنی طور پر پروان چڑھانے میں عمدہ خدمات سر انجام دی ہیں لیکن ان کے خاکوں کی تعداد کم ہے اور اسلوب کی یک رنگی ان سب پر حاوی ہے۔ پھر یہ تینوں شخصیت کو صرف تہذیبی نقطۂ نظر سے جانچتے ہیں جس سے اظہار کا دائرہ نسبتاً محدود ہو جاتا ہے۔

محمد طفیل شاید واحد قلمکار ہیں جنہوں نے اس ایک صنف سے عقد کیا ہے اور نباہ حال اسی سے تباہ کر رہے ہیں۔ خاکہ نگاری سے ہی ان کی تخلیقی زندگی کی ابتداء ہوئی اور یہی اب ان کی ادبی زندگی کا ملجا و ماوا ہے۔ بلکہ میر تقی میر کی زبان میں ؎

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا　　　سو آخر کو یہ ٹھہرا فن ہمارا

محمد طفیل کی دوسری خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اُردو کے دوسرے تمام ادیبوں سے زیادہ خاکے لکھے ہیں۔ میں ان کے رنزوں کی تعداد گن رہا ہوں مصطفیٰ زیدی کو ایل بی ڈبلیو کرنے تک وہ ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔ وکٹ پر جمے ہوئے تھے اور پوری فارم میں تھے۔ حکیم یوسف حسن پر انہوں نے اپنی سنچری مکمل کر لی ہے۔ ان پر ہر طرف سے مبارکباد کے ڈونگرے برس رہے ہیں اور وہ بلا تھامے میدان کو عاشقانہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں ؎

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگنِ عشق　　　ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

شاید ان پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ وہ آیا۔ اُس نے دیکھا اور اُس نے فتح کر لیا۔

تاہم یہ نقطہ ایسا نہیں جس پر آپ زیادہ توجہ دیں۔ کسی بڑے ادیب کی عظمت کا اندازہ کتابوں کی تعداد سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ایم اسلم اور نسیم حجازی اور اے، آر خاتون اور رضیہ بٹ اور دت بھارتی اور ابن صفی اُردو کے سب سے بڑے مصنف ہوتے۔ ادیب کی عظمت کتابوں کے انبار سے نہیں بلکہ تخلیقات کے معیار سے بنتی ہے اور اس پہلو سے محمد طفیل نے نیاز فتحپوری سے لے کر سجاد نقوی تک کسی کو مایوس نہیں ہونے دیا۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی نہیں۔

یوں تو انھیں تاجور نجیب آبادی، مولانا صلاح الدین احمد اور شاہد احمد دہلوی کی طرح زندہ رکھنے کے لیے نقوش کی خدمات ہی کافی تھیں (اور ان خدمات میں ہر نیا سورج مزید اضافہ کر رہا ہے) لیکن انھوں نے مسلسل اچھے خاکے لکھ کر اپنے تخلیقی اور مشاہداتی جوہر کو بھی منوالیا ہے اور ان کے عمدہ کام کی تحسین بھی بے پناہ ہوئی ہے۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ادب کے میدان میں جو شخص وکٹ پر وکٹ گراتا جائے اس کا انجام بخیر نہیں ہوتا۔ ردِّ عمل کا اظہار منفی ہوتا ہے۔ بے دریغ گالیاں ملتی ہیں۔ زندہ باد کم اور مردہ باد زیادہ ہوتا ہے۔ "کانٹے کی تول کا بھرم" رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ محمد طفیل خوش قسمت ہیں کہ انھیں اپنے ادبی کارناموں پر تمغے ملے اور دشنام دوسروں کے حصے میں آئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انھیں یہ تمغے بھی ادیبوں اور شاعروں نے عطا کیے جن کا بس چلے یا موقعہ ملے تو دوسروں کے تمغے بھی چھین لیں اور سب کے سب اپنے ہی سینے پر سجا لیں۔ اس لحاظ سے میرا یہ اندازہ صد فی صد درست ہے کہ محمد طفیل نے سارا کریڈٹ بزورِ فن حاصل کیا ہے اور جابر سے جابر نقاد بھی اس میں ڈنڈی نہیں مار سکتا۔

ویسے تو کسی بھی شعبے کی شخصیت پر خاکہ لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر ہے لیکن محمد طفیل نے جس طبقے کو منتخب کیا ہے ان میں سے ہر ایک اپنی دانست میں اپنے عہد کا رستم ہے، سہراب ہے۔ افراسیاب ہے[1]۔ ان کے ہاں داد قبول کرنے کا تمام سلیقہ موجود ہے لیکن نقد و جرح قبول کرنے کی کمزوری کا فقدان ہے۔ یہ ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کا طبقہ ہے جس کی ذکاوت حس اور زود رنجی ضرب المثل کی طرح مشہور ہے[2]۔ اس لحاظ سے محمد طفیل نے دوسروں

---

[1] اس قسم کی گالم کی ایجاد بھی محمد طفیل کے سر ہے۔ مثال کے طور پر مصطفےٰ زیدی کا خاکہ دیکھئے۔

[2] شاعر بے چارے کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ اسے روٹی نہ ملے تو گزارہ کر لیتا ہے۔ لیکن شعروں کی داد نہ ملے تو جیتے جی مر جاتا ہے اور جب داد بے داد ملے تو تعارف چھوڑ دوستیاں تک ہو جاتی ہیں۔

کی نسبت زیادہ مشکل ذریعہ قبول کیا ہے اور یہ ان کی ہمت ہے کہ وہ پچھلے مارشل لاء سے اس مارشل لا تک کے طویل عرصے میں "سوئی کے ناکے میں سے اونٹ کو گزار رہے ہیں"۔ لیکن اس دودھاری تلوار سے ابھی تک سلامت ہیں۔

دنیائے ادب کی ان نامور شخصیتوں میں سے بیشتر سے ان کی ملاقات نقوش کے زمانۂ ادارت میں ہوئی۔ نقوش سے پہلے یہ لوگ محمد طفیل کے لیے اجنبی تو نہیں تھے۔ قریباً سب سے ان کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات تھے اور وہ اس پر اترایا بھی کرتے تھے[۱]۔ تاہم میرا خیال ہے کہ انہیں بالمشافہ ملاقات کے مواقع نسبتاً کم ملے۔ اگر ایسا ہوتا تو اپنے اس دعوے پر خود شرمسار ہوتے۔

دنیا میں مے خانہ اور مدیر کا دفتر دو ایسے مقام ہیں جہاں ادیب رسمی تعلقات برطرف کرکے اپنی اصلی صورت میں نظر آجاتا ہے۔ یعنی یہاں مصنوعی غازہ اتارنے کے لیے "منہ ہاتھ دھلوانے" کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چنانچہ نقوش نے انھیں یہ موقعہ مہیا کیا کہ وہ ادیبوں کی تخلیقات سے قدرے الگ ہوکر ان کی شخصیتوں کے پیچھے میں بھی جھانک سکیں اور اس فطری انسان کی جھلک دیکھ سکیں جس پر تخلیق پردہ سا ڈال دیتی ہے۔ محمد طفیل نے اس عمدہ موقعے کا غلط فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے منٹو کی طرح خاکہ نگاری کے حمام میں کسی کا "موتڈن" نہیں کیا۔ لیکن ہر کسی کو "رحمتہ اللہ علیہ" کی کھونٹی پر بھی نہیں لٹکایا۔ ان کے ہاں شخصیت اور خاکہ نگار میں ہمیشہ ایک قابلِ عزت فاصلہ موجود رہتا ہے۔ وہ شخصیت کو اپنے اوپر حاوی ہونے کی اجازت دیتے ہیں نہ خود شخصیت کے کندھوں پر بلا اجازت سوار ہونے کی کوشش کرتے ہیں "جٹ پچھے" کا رجحان ان کے ہاں قطعاً مفقود ہے۔ وہ بڑے کو بڑا ہی سمجھتے ہیں۔ اور اس کا احترام اس کے مرتبے کے مطابق کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں میں کوئی "صاحب" ہے اور کوئی "محترم"۔ کوئی "مکرم" کوئی "آپ" اور کوئی "جناب" لیکن ابھی تک کسی "خانہ خراب" کو اس محفلِ ادب میں آنے کی اجازت نہیں ملی۔ کہنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ محمد طفیل اپنے "ممدوح" کو مکرم کی کرسی پر بٹھا کر خود اس کے پاؤں میں مؤدب بیٹھ جاتے ہیں۔ بلاشبہ محمد طفیل کے ہاں ایسے لمحات بھی آتے ہیں لیکن خاکہ نگار محمد طفیل کی ایک اپنی شخصیت بھی ہے۔ انھیں اگر غلطی سے

---

[۱] خاکہ عابد صاحب

بھی یہ احساس ہو جائے کہ شخصیت اکڑا ہوا بانس ہے تو وہ اس کے سامنے تنے ہوئے درخت کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عابد صاحب انھیں کے شہر میں پرنسپل تھے۔ بڑے وجیہہ، خوش شکل، خوش پوشاک اور خوش آواز ان سے راہ و رسم بڑھانے کو محمد طفیل کا جی بھی چاہتا تھا لیکن خواہ مخواہ کے تعارف کے لیے ان کا دل کبھی راضی نہ ہوا۔ جانے پرنسپل صاحب ادب کے اس طالب علم سے کس طرح پیش آئیں۔ مصطفےٰ زیدی لاہور میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کی چیزیں نقوش میں چھپتی تھیں۔ خط و کتابت کی نصف ملاقات بھی تھی۔ لیکن ان سے محمد طفیل کی ملاقات دیر تک نہ ہو سکی۔ محض اس لیے کہ صاحب بہادر جانے کس انداز میں شرفِ باریابی بخشیں۔ (یہ الگ بات ہے کہ بعد میں عابد صاحب کے اندر سے پرنسپل کے بجائے طالب علم اور مصطفےٰ زیدی کے باطن سے ڈپٹی کمشنر کے بجائے شاعر برآمد ہوا۔ لیکن ان کا خدشہ کون دور کرتا)

شخصیت کی یہ استقامت منفی ہے شاید اسی لیے محمد طفیل کے ہاں اس کی حیثیت غیر دوامی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ یقیناً اچھے خاکہ نگار نہ بن سکتے۔ اچھا خاکہ نگار تو آنکھیں کھلی رکھ کر دل میں اتر جاتا ہے اور محمد طفیل نے یہ حرکت ہمیشہ اس وقت کی ہے جب اسے احساس ہو جاتا ہے کہ شخصیت انکسار کے بوجھ تلے جھکی جا رہی ہے۔ ایسے وقت میں عیار طبع خریدار محمد طفیل کو بلا قیمت خرید لیتی ہے اور وہ شخصیت کی خاکِ پا کو بھی سرمۂ چشمِ عقیدت بنا لیتا ہے۔ شرافت ہی سہی لیکن یہ بھی تو ایک انتہا ہے۔ محمد طفیل کے خاکوں میں خلوص۔ محبت اور عقیدت کے تمام درجے ملتے ہیں اور یہ اسی انتہا پسندی کا نتیجہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ رنگ بھی اس کا اصلی نہیں اور اس پر تھوڑا بہت آورد کا غازہ چڑھا ہوا ہے۔ محمد طفیل اپنے اصلی رنگ میں اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب شخصیت کا قد محمد طفیل کے اپنے قد کے برابر ہو جاتا ہے اور دوئی کا پردہ درمیان میں سے ہٹ جاتا ہے اور حجاب دور ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں وہ معاصرانہ چشمک ظہور میں آتی ہے جو اس کے خاکوں میں بچے خون کی طرح رواں ہے اور جس کا موجد بھی محمد طفیل ہے اور خاتم بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی سے برابری کے درجے پر ملنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس مساوات پسندی کا نتیجہ یہ ہے کہ محمد طفیل نے خاکہ نگاری میں مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کی طرح آدم کو فرشتوں کا مثیل نہیں بنایا بلکہ اُس نے اس مشتِ خاک کو انسان ہی رہنے دیا ہے۔

اس سے یہ باور نہ کر لیا جائے کہ محمد طفیل کو مولوی عبدالحق یا رشید احمد صدیقی سے کوئی مماثلت نہیں۔ وہ اخلاقی نقطۂ نظر کو جس بھرپور انداز میں ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماضی کی

روایات جس شدت سے نمایاں کرتے ہیں اور قدروں کے احیاء کے لیے جس وارفتگی سے کوشاں ہیں اس سے تو وہ مجھے انھیں دو خاکہ نگاروں کے قبیلے کے فرد معلوم ہوتے ہیں۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولوی عبدالحق شخصیت کو سیدھی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور رشید احمد صدیقی بر سبیل مزاح عینک کا زاویہ تھوڑا سا بدل لیتے ہیں۔ لیکن وہ بھی شخصیت سے نظر ہرگز نہیں ہٹاتے۔ محمد طفیل کا موضوع محض شخصیت ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ معاشرہ بھی ہوتا ہے جس کا ایک فرد متذکرہ شخصیت ہے۔ اور وہ شخصیت کے احترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بھی معاشرے کے عیوب برہنہ کرتے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی خاکہ نگاری کا کینوس نسبتاً زیادہ وسیع ہے اور ان کے اصلاح خانے میں میٹھی چاپی کا انداز نہیں ملتا بلکہ وہ بار بار چٹکیاں لیتے ہیں۔ ایسی میٹھی چٹکیاں جن سے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو جاتی ہے لیکن آنکھوں میں آنسو بھی تیرنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں :۔

"حکومت فیملی پلاننگ میں لگی ہوئی ہے اور قوم ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں۔ نہ فرصت اسے ہے نہ اُسے۔"

"میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر واقعی لوگ یہاں نیشنل ڈریس میں آ گئے تو آپ لوگ کرسیاں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ اس لیے کہ ملک کے عوام کا نیشنل ڈریس تو نیچرل ڈریس ہے۔"

"اگر وہ لوگ کچھ کر گزرتے تو ممکن تھا کہ شاہد صاحب اتنی کس مپرسی کی حالت میں نہ مرتے۔ کیوں کہ یہ ہندوستان کے ملک جی تھے اور پاکستان کے کنگال جی۔"

ابھی تک اس ملک میں رائٹرز گلڈ کا وجود ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس کے بانیوں میں شاہد صاحب کا نام بھی آتا ہے۔ مخلص خدمت گزاروں میں سے تھے مگر سُنا ہے کہ جب شاہد صاحب کا انتقال ہوا تو رائٹرز گلڈ کے ممبران میں سے کوئی بھی جنازے میں شریک نہ تھا۔

"حکومت فیملی پلاننگ پر کروڑوں روپے خرچ کر سکتی ہے مگر ادبی رسائل کے سلسلے میں اس کے پاس کوئی پلاننگ نہیں۔"

آپ نے دیکھا کہ محمد طفیل ایران توران کی نہیں چھیڑتے۔ بس ایک چھوٹا سا جملہ لڑھکاتے ہیں اور معاشرے کی ناہمواری کو ہمالیہ کی طرح اُبھر کر سامنے آجاتی ہے اور صاف گوئی یہ ہے کہ محمد طفیل نے سچائی کے دھرم کانٹے میں دوستوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ وہ کجی کا اظہار برملا نہیں کرتے۔ ان کا نقطۂ نظر مثبت اور طریق بالواسطہ ہے۔ البتہ استخراج مطلب کا اہم کام وہ قاری کو سونپ دیتے ہیں۔ کہیں کہیں آپ کو "لہجے کی تکور" نظر آجائے تو اُسے نظر انداز کر دیجئے گا کہ محمد طفیل نے منفی پہلو سے کبھی وار نہیں کیا۔ وضاحت کے لیے صرف ایک دو مثالیں میں نے شاہد احمد دہلوی کے خاکے سے منتخب کی ہیں۔

"میں اقرار کرتا ہوں کہ میں دوسروں کو بُرا بھلا کہنے میں اتنا ماہر نہیں جتنا شاہد صاحب تھے!"

"شاہد صاحب کے جتنے بھی معرکے ہوئے وہ ہم "بے زبان" پنجابیوں کے ساتھ۔ مگر آخر میں وہ اس داغ کو دھو گئے۔ جوش ملیح آبادی کے خلاف نمبر نکال ڈالا۔"

اس زاویئے سے دیکھئے تو محمد طفیل کی خاکہ نگاری کا مقصد محض شخصیت کی کھدائی نہیں۔ شخصیت تو محض ایک وسیلہ ہے جس سے انہوں نے بعض بنیادی سچائیوں کی تلاش کی ہے۔ ان کے خاکوں میں قدروں کے زوال کا نوحہ نہیں بلکہ لٹی ہوئی عظمتوں کے دوبارہ اجراء کی خواہش ہے۔ شاید انہیں صداقتوں کے فروغ کے لیے انہوں نے بعض ایسے تیکھے جملے تخلیق کیے ہیں جن کے نوکیلے کنارے کبھی گھس نہیں سکتے۔ امتثال حقیقت کے لیے یہ چند جملے پیش کرتا ہوں:۔

"ادب کی منزل کا یہ ہے کہ جیسے جیسے بڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے یہ دُور ہوتی جاتی ہے۔"

"جھوٹ اور خوشامد کے بڑے فوائد ہیں۔ یہ دو وصف جس شخص میں بھی پائے گئے اس سے خدا ناراض ہو تو ہو، اس کے بندے ناراض نہیں ہوتے۔"

"ہم عصر جب کسی کے لیے کلمۂ خیر کہتا ہے تو اسے کم اہمیت والی بات نہ جانیئے۔ کسی کی تعریف کرنے کے لیے شرافت، دیانت اور حوصلہ چاہیئے۔"

"درخت جتنا اونچا ہوگا اتنی ہی گہری جڑیں ہوں گی۔ اصلی درخت تو زمین کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔"

محمد طفیل کے خاکوں میں شخصیت کو جو تحرک مل جاتا ہے اس کا سب سے بڑا باعث ان کا زندگی آموز اور رواں دواں اسلوب ہے۔ ان کے خاکوں میں اعداد و شمار اور تاریخوں کی بھرمار بھی ملتی ہے۔ بعض اوقات تحقیقی رنگ بھی غالب آجاتا ہے۔ لیکن ان کے اسلوب کی صفتِ خاص یہ ہے کہ یہ بوجھل سے بوجھل اور ادق سے ادق بات کو ہلکے پھلکے اور لطیف و دلنشیں انداز میں کہنے پر قادر ہے۔ یہ اسلوب نسیم صبح کا جھونکا بھی ہے اور صبح کی شبنم بھی جس سے ہمیشہ راحت اور تازگی ملتی ہے۔ تاریخ کے حوالے سے مجھے یاد آیا کہ ان کے بعض خاکوں پر پیدائش، تعلیم، ملازمت اور مشاغل وغیرہ کے گوشوارے حاوی ہو گئے ہیں (مثلاً اختر اور نیوی اور حکیم یوسف حسن کا خاکہ) لیکن شاید یہ محمد طفیل کی کمزوری ہے کہ انہیں جتنا بھی مواد ملتا ہے وہ اسے قاری کے حوالے کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اس امانت میں ذرا سی خیانت بھی نہیں کرتے۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ محمد طفیل خاکہ نگاری کی آخرِ شب کا چاند ہے یا صبح کا ستارہ۔ لیکن میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس فن کا نیا قلم کار مشاہدے اور مطالعے میں سالوں اپنا خونِ جگر صرف کرے تب بھی شاید بہت عرصے تک کوئی نیا سورج طلوع نہ کر سکے۔

مکرم

مکرم محمد طفیل کے تین خاکوں کی تازہ کتاب ہے۔ ان میں سے ایک خاکہ مختصر دوسرا متوسط اور تیسرا طویل ہے۔

مکرم میں جو تین شخصیتیں جلوہ افروز ہیں ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں:۔

مصطفٰے زیدی ——— شاہد احمد دہلوی ——— حکیم یوسف حسن!

ان میں سے مصطفٰے زیدی اور شاہد احمد دہلوی وفات پا چکے ہیں۔ مصطفٰے زیدی کے گرد شہناز گل سکینڈل کا کہرا ابھی تک چھایا ہوا ہے۔ شاہد احمد دہلوی پر مقبول جہانگیر کی کتاب "یادِ شاہد" اور ساقی کا "شاہد احمد دہلوی نمبر" حال ہی میں شائع ہوتے ہیں۔ حکیم یوسف حسن زمانے کے سرد گرم چکھ رہے ہیں۔ خدا انہیں اس نیک کام کے لیے مزید زندہ رکھے۔

مکرم میں حکیم یوسف حسن کے حوالے سے ایک چوتھی شخصیت بھی موضوع گفتگو بنی ہے اور

وہ ہے "ماہنامہ نیرنگ خیال" پانچویں شخصیت محمد طفیل کی اپنی ہے۔ ان پر "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کی کیفیت طاری ہے۔ لیکن یہ اپنی شخصیت کا تاثر ہر لفظ کے ساتھ کم کرتے جاتے ہیں۔ کتاب میں جو تصویر چھپی ہے اس میں وہ ایک تناور درخت کے ساتھ کھڑے ہیں۔ شاید اس لیے کہ "یہ شاخ ٹوٹ تو سکتی ہے جھک نہیں سکتی"۔

پہلے خاکے میں محمد طفیل نے ڈپٹی کمشنری کے ملبے تلے دبے ہوئے شاعر مصطفیٰ زیدی کو دریافت کیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی — جو دفتر نقوش میں آتا تھا تو اپنی صاحب بہادری کو ضلع کچہری کے کسی کمرے میں چھوڑ آتا اور پھر بیٹھتے ہوئے بے تکلفی سے کہتا "بھئی کچھ کافی وافی کا انتظام کراؤ"۔ یہ خاکہ محمد طفیل نے مصطفیٰ زیدی کی زندگی میں لکھا اور ان کے سامنے پڑھا۔ محمد طفیل کو اس وقت بھی احساس تھا کہ ان کے ٹھاٹ باٹ زیادہ سے زیادہ پنشن پا لینے تک ہوں گے۔ اس کے بعد انہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ اگر کسی رشتے سے پوچھا جائے گا تو وہ رشتہ ادب کا ہوگا۔ ڈپٹی کمشنر کو بنجارہ لاد کو لے گیا لیکن شاعری کے رشتے سے مصطفیٰ زیدی ہم میں موجود ہے۔ یہ لیجیے محمد طفیل کی ایک پیش گوئی تو پوری ہو گئی۔ مصطفیٰ زیدی نے کسی موقع پر محمد طفیل کو بتایا تھا کہ ——

زندگی جسم کی خواہش کے سوا کچھ بھی نہیں
خون میں خون کی گردش کے سوا کچھ بھی نہیں

اور خون کی گردش کی قیمت ——

بہت سے آئے ہیں تیری گلی میں لیکن میں
متاعِ عزتِ سادات لے کے آیا ہوں

محمد طفیل کا ماتھا ٹھنکا زیدی نے بھلا دیا ——

اک پیشۂ عشق تھا سو عوض مانگ مانگ کر
رسوا اسے بھی کر گئی سوداگروں کی ذات

مصطفیٰ زیدی کا المیہ تازہ ہے۔ لیکن دیکھئے جو پیش گوئی اس نے اپنے بارے میں دو تین سال قبل کی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔

دوسرے خاکے میں محمد طفیل نے شاہد احمد دہلوی کو تلاش کیا ہے۔ شاہد صاحب — دلی میں تھے تو ساقی کے مدیر تھے اور اس زمانے کے بڑے معروف آدمی تھے۔ لیکن پاکستان پہنچے تو عسرت کی زندگی گزارنی پڑی۔ ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا گویا بن کر پیٹ کے لیے ایندھن مہیا کرتا رہا۔

تابش دہلوی، انصار ناصری اور شمس زبیری وغیرہ ان کے لگائے ہوئے پودے تھے۔ بڑھتے بڑھتے قدآور درخت بن گئے۔ لیکن وہ اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ تین لڑکے اور سات لڑکیاں۔ یہ سب اس چیز کی بھینٹ چڑھ گئے جسے اگلے وقتوں کے لوگ خودداری اور آج کل کے لوگ "بیوقوفی" کہتے ہیں۔

اس "بے وقوفی" کا ایک اور مظہر حکیم یوسف حسن ہے جس نے اپنی نوجوانی سے بڑھاپے تک ساری عمر نیرنگ خیال کی بھینٹ چڑھا دی۔ قریباً نصف صدی تک بے شمار لوگوں کو ادبی ذوق بخشا۔ ان کے مذاقِ سخن کی صحت مند آبیاری کی۔ فتح پر فتح حاصل کی۔ لیکن جب مالِ غنیمت ملنے کا وقت آیا تو گھر کے دروازے کو کنڈی لگالی۔ پھر اپنی گودڑی سنبھالی اور شہر لاہور کو ہی خیرباد کہہ ڈالا

شہر نا پُرساں جو ٹھہرا۔

یہ دونوں خاکے زمانے کی قدر ناشناسی کا المیہ بیان کرتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر آنکھیں بار بار نم ہو جاتی ہیں۔

اس کتاب کی تینوں شخصیتیں ہماری تہذیب کے تین مختلف زاویے ہیں۔ ان خاکوں میں مصطفیٰ زیدی زمانے کو خندۂ استہزا سے ٹھکرا رہے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی ارادوں کی استقامت اور حوصلوں کی پختگی کا مظہر ہیں اور حکیم یوسف حسن ۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

کی تفسیر۔ پے درپے فتوحات حاصل کرنے کے بعد وہ ابھی تک زمانے سے نبرد آزما ہیں۔ یہ حرکت و عمل کے متحرک پیکر ہیں۔ لیکن تب و تاب جاودانہ سے زیادہ کوئی صلہ نہیں مانگتے۔ محمد طفیل نے ہنستے ہنستے ان کا سارا اندوہ قاری کو منتقل کر دیا ہے۔

"مکرم" میں محمد طفیل کی خاکہ نگاری کا ایک یہ رُخ بھی سامنے آیا ہے کہ وہ شخصیت کو ایک سو چھیالیس صفحات میں بھی پھیلا سکتے ہیں اور سارا حدود اربعہ دو ایک جملوں میں بھی سمیٹ سکتے ہیں۔ دیکھئے شاہد احمد دہلوی کی یہ تصویر کتنی مکمل ہے :۔

"زندگی میں ہزاروں لوگ ملتے ہیں مگر ایسے کم ملتے ہیں جن کی ہم عزت کرتے ہیں۔

شاہد صاحب ایسے لوگوں میں سے تھے"

اگر بات صرف "مکرم" کی نہ ہو رہی ہوتی تو میں آپ کی توجہ ایک اور مختصر خاکہ کی طرف بھی دلاتا، مختصر خاکہ لکھنا بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے کوئی چاول کے دانہ پر سورۂ الحمد لکھ دے میری مراد جوش ملیح آبادی

کے خاکے سے ہے۔ دیکھئے چند لفظوں میں کیا کچھ نہیں کہا گیا :۔

"جاگیردارانہ نظام کی پیداوار مگر خود اس نظام کے جانی دشمن۔ بھاری بھرکم شخصیت۔ بھاری بھرکم کلام۔ ہلکا پھلکا مزاج، ہلکا پھلکا ذوق، نہ اچھے دوست، نہ اچھے دشمن۔ شاعر اور صرف شاعر، آدمی اور صرف آدمی۔ اس کے باوجود قابلِ احترام، قابلِ تعظیم۔ ایک موہنی شخصیت!"

غرض یہ کتاب محمد طفیل کی خاکہ نگاری کا پانچواں سنگِ میل ہے ان کے فن پر مجموعی نظر ڈالنے کے لیے اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ انھوں نے رسمی باتوں کے لیے غیر رسمی اسلوب اختیار کیا ہے۔ کسی خاکے کا کوئی باقاعدہ ابتدائیہ یا اختتامیہ نہیں ہے۔ جیسے جیسے یادوں کے FLASHES آتے جاتے ہیں وہ انھیں اپنے جگمگ جگمگ انداز میں لکھتے جاتے ہیں اور آخر میں ایک ایسی تصویر مرتب کر دیتے ہیں جسے مزید ری ٹچنگ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محمد طفیل - ایک خاکہ نگار

ڈاکٹر سیّد محمّد عقیل

اُردو میں خاکہ نگاری کا فن، باقاعدہ طور پر، بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ یوں کوئی چاہے تو اسے کھینچ کر تذکرہ نگاری کے دور اور خاص طور پر مولانا محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' اور انشا کے مزاحیوں تک لے جاسکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بالقصد خاکہ نگاری کی طرف توجہ بیسویں صدی میں بھی زیادہ نہیں رہی۔ محمّد طفیل نے 'صاحب'، 'جناب'، 'آپ' اور 'محترم' لکھ کر اُردو نثر کی اس صنف کی طرف خاطر خواہ توجہ دلائی اور اُس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جیسے فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالحق اور اشرف صبوحی وغیرہ کی کوششوں کے باوجود ابھی تک محسوس کیا جا رہا ہے۔

یوں تو وقتاً فوقتاً خاکوں کے مجموعے اُردو میں شائع ہوتے رہے ہیں جن میں فرحت اللہ بیگ کی کتاب 'نذیر احمد کی کہانی'، عبدالحق کی 'چند ہم عصر'، آغا حیدر حسن دہلوی کی 'پس پردہ'، رشید احمد صدیقی کی 'گنج ہائے گرانمایہ'، عبدالمجید سالک کی 'یارانِ کہن'، اشرف صبوحی کی 'دلّی کی چند عجیب ہستیاں'، چراغ حسن حسرت کی 'مردم دیدہ'، منٹو کی 'گنجے فرشتے'، شاہد احمد دہلوی کی 'گنجینۂ گوہر'۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ فکر تونسوی کے 'خدوخال'، عرش ملسیانی کے 'پوسٹ مارٹم' سے ہوتا ہوا غلام احمد فرقت کے 'صید و ہدف' تک پہنچتا ہے مگر صرف خاکہ نگاری کو اپنا فن بنا کر اُسی پر ساری تخلیقی صلاحیتوں کو صرف کرنا اور اس طرح اس فن کی طرف بالقصد اور سنجیدگی سے توجہ دینا شاید محمّد طفیل سے پہلے کم لوگوں نے کیا ہوگا۔

خاکہ نگاری اور چہرہ نمائی یوں بادی النظر میں ہلکی پھلکی چیز معلوم ہوتی ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اگر کوئی اسے صحیح طریقے سے اختیار نہ کرے تو معمولی مزاح اور چٹکلوں میں اسے ٹالا بھی جاسکتا ہے لیکن اس فن کو سنجیدگی سے اختیار کرنے والوں کے لیے یہ بڑی ذمہ داری اور جان جوکھم کا کام ہے۔ جان جوکھم اس لیے کہ انسانی کمزوریوں کو بیان کرنے میں اگر قلم نے ذرا سی شوخی دکھائی تو نسلاً بعد نسلٍ مصنف کو ان خاکوں اور چہروں کے پرستاروں کی لعن طعن کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ شوخی تحریر کبھی کبھی تو

طنز و مزاح میں ٹل جاتی ہے لیکن کبھی دلوں میں ایسی گرہیں ڈال دیتی ہے کہ یہ گرہیں کھولے نہیں کھلتیں۔ ذمہ داری کا کام اس لیے ہے کہ مصنف ایمانداری سے چہروں کو اس طرح پیش کرے کہ پڑھنے اور سننے والے اُن شخصیتوں کے گرد و پیش، مذاق و مشاغل، ایقان و عقائد، ادبی ہوں یا مذہبی و تفریحی، سب سے کماحقہٗ واقف ہو جائیں۔ اس طرح چہرہ نگار کا کام کسی حد تک کسی ادبی ناقد سے بھی بڑھ سکتا ہے۔ چہرہ نگار کو صرف ادبی نمونوں کو ہی سامنے نہیں رکھنا پڑتا بلکہ اُن کے ظاہر و باطن، پیچ و بُن سب میں سرایت کر کے ایک ایسا نتیجہ نکالنا پڑتا ہے جس سے اگر تمام لوگ متفق نہ ہوں تو کم از کم ایک بڑی جماعت ضرور اس کی تصدیق کرے۔ پھر یہ بھی ہے کہ بقول کولرج، کوئی بھی شخصیت، چاہے وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اگر صداقت کے ساتھ بیان کی جائے گی تو دلچسپ ضرور ہوگی۔ یوں دلچسپی، چہرہ نمائی کے لیے جزو اوّل تو نہیں لیکن اس سہارے کے بغیر تصویریں روکھی پھیکی بھی ہو سکتی ہیں۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جب کہ ادیب کی شخصیت دھندلی ہو اور چہرہ نگار ادیب کی زندگی کی تہوں کو اُلٹ کر حقیقت تک پہنچنے کی کوشش بھی کر رہا ہو۔ قاری ایسے وقت میں دلچسپی کے بغیر چہرہ نگار کے ساتھ چلنے میں پریشان ہو سکتا ہے لیکن چہرہ نگار کی مشکل یہ ہے کہ وہ قاری کو بھی نہیں چھوڑ پاتا اور ادیب کی زندگی اور اُس سے اُس کی تخلیق کے واسطوں کو بھی سمجھنا اور سمجھانا چاہتا ہے کیونکہ اس عمل کے بغیر چہرہ نمائی شخصیتوں کی ظاہری صُورت کا اظہار ہوگا جنہیں صرف معمولات زندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس سے ہر فرد گزرتا رہتا ہے۔

ادیب کی زندگی کو سمجھے بغیر کوئی چاہے کہ اس کی تخلیق کو صحیح طرح سمجھ لے تو ممکن نہیں کیونکہ ہر تخلیق کے پیچ و خم میں ادیب کی شخصیت کسی نہ کسی جگہ ضرور نقب زن رہتی ہے۔ اس لیے بھی ادبی چہروں کے کیف و کم، مزاج اور مذاق کی جستجو کرنا کسی ادبی شارح کی محنت سے کم نہیں۔ شارح صرف کلام کو سامنے رکھ کر قاموس و لغات اور طرز پیش کش سے تخلیق کی گتھیوں کو حل کرتا ہے اور چہرہ نما یا اسکیچ نگار، ادیب اور شاعر کی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے کسی تخلیق کی مزاجی کیفیت کا تعین کرتا ہے۔ ادیب کی زندگی کے حادثوں اور طرز گذران سے اُن اسرار و رموز سے پردے اُٹھاتا جاتا ہے جو کسی تخلیق میں خاص اشاروں، نفسیاتی کیفیتوں اور اخلاقی یا سیاسی رنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں اور جن کی نقاب کشائی، ان حدود کے کونے کونے میں گھومے بغیر نہیں ہو سکتی۔ محمد طفیل کے ممدوحوں "صاحب" اور "جناب" میں منٹو، فراق، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، اور ناصر کاظمی کی شخصیتوں پر سے بہت سے ایسے پردے سرکتے ہیں جو قاری کو ان ادیبوں کے ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی ارتقا کو سمجھنے میں

کسی تنقیدی تجزیے سے کم مددگار ثابت نہیں ہوتے لیکن چونکہ چہرہ نمائی کا کینوس تجزیاتی کم اور بیانی زیادہ ہے اس لیے یہاں منطقی دلائل اور اثبات، استخراج و واقعات اور کبھی کبھی زندگی کے چھوٹے موٹے چٹکلے، قصے اور کہانیاں پورا کیا کرتے ہیں۔ بس چہرہ نما کی ایمانداری اسی میں ہے کہ اس نے اس بات پر کڑی نظر رکھی ہو کہ یہ واقعات اور چٹکلے واقعی کسی تاریک گوشے کو منور کرتے ہوں اور محض زیبِ داستان کے لیے نہ ہوں۔ ورنہ یہ زیبِ داستان کے لیے تراشے ہوئے چٹکلے آئندہ کے لوگوں کو ایک مشکل میں ڈال سکتے ہیں اور ادیب کی شخصیت کی غلط شرحیں بھی ہو سکتی ہیں۔ 'صاحب' اور 'جناب' میں محمد طفیل نے ہر امکانی کوشش کی ہے کہ ایمانداری سے منزلیں طے کی جائیں۔ وہ 'چہرہ نما' کے اُس منصب سے بھی اچھی طرح واقف ہیں جہاں اُسے ایک معتبر راوی سے لے کر ایک مورخ کی اُن ذمہ داریوں تک جانا پڑتا ہے جہاں تاریخی بصیرت، واقعات کی سچائی، قوتِ فیصلہ، زمان و مکان کی آگہی، شخصی تعصب کی نفی، سب باتوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ منٹو کے متعلق لکھتے ہیں:

> "اب منٹو صاحب میں یہ کمزوری راہ پا گئی ہے کہ وہ ہر ایک سے کہیں گے کہ کل فلاں صاحب ملے تھے اور انہوں نے میرے فلاں افسانے کی بڑی تعریف کی .... میرا یہ سگریٹ کیس گم ہو گیا تھا، اس کے دوسرے دن ایک صاحب اسے لیے ہوئے آ پہنچے اور کہا منٹو صاحب السلام علیکم۔ یہ اپنا سگریٹ کیس رکھیئے مجھے فلاں جگہ پڑا ہوا ملا۔ میں نے اُن سے کہا۔ آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں یہاں رہتا ہوں۔ وہ کہنے لگے، واہ بھلا آپ کو کون نہیں جانتا .... اِدھر ممتاز شیریں میرے فن پر ایک کتاب لکھ رہی ہیں۔ اُدھر میرے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ چھپ رہا ہے۔"

منٹو صاحب میں ذاتی طور پر بڑی خوبیاں ہیں لیکن شراب نے اُن میں کئی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں پہلے مجھے ان پر غصہ آتا تھا۔ اب ترس آتا ہے۔ میں تو اُن کے فن پر اُن کی تمام کمزوریوں کو نثار کر سکتا ہوں۔" (منٹو صاحب)

فراقؔ صاحب سے الٰہ آباد میں ایک ملاقات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"ہم دونوں پھر فراقؔ صاحب کے ذہن کی بھول بھلیوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اس بات کی انہوں نے مزید وضاحت یوں کر دی کہ یہ بات ایک

ایڈیٹر اور افسانہ نگار کی سمجھ میں ابھی نہیں سکتی۔ کیوں کہ مسئلہ نازک ہے۔

پھر انھوں نے اسی طرح کے کئی نازک مسئلے چھیڑے۔ آخر میں کہاں تک اُن کے ذہن کے آثار چڑھاؤ کے ساتھ اُترتا چڑھتا رہتا۔ حیران ہو کر الماریوں میں سے کتابوں کو دیکھنے لگا جو صرف انگریزی کی تھیں اور سینکڑوں کتابیں تھیں مگر اُن میں سے بعض کا مطالعہ دیمک کر رہی تھیں۔ بعض سے بُو آ رہی تھی، بعض کے صفحات دوسرے صفحات کے ساتھ گُتھے ہوئے تھے .... ان کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اپنے نظریات پر اٹل ایمان رکھتے ہیں۔ بُری چیزوں کا جواز نکالتے رہتے ہیں۔ مثلاً امرد پرستی پر انھوں نے بڑا ریاض کیا ہے۔ اپنی اُلٹی سیدھی دلیلوں سے پورے جذب و انہماک کے ساتھ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ تو بڑے ثواب کا کام ہے ...... انتہا پسندی خود ان کی ذات میں ہے لیکن کسی اور کو انتہا پسند ہوتے نہیں دیکھ سکتے .... اگر آپ نے فراقؔ صاحب کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی تو یہ میری ناکامی ہے۔ فراقؔ صاحب کی رنگا رنگ۔ دلآویز۔ اور غیر معمولی شخصیت پر کوئی غلط اثر نہیں پڑنا چاہیے جب کہ فراقؔ صاحب مشفق اُستاد، مخلص دوست، ہمدرد انسان۔ نامور شاعر۔ فاضل نقاد۔ سبھی کچھ ہوں۔" (فراقؔ صاحب)

محمد طفیل، فراقؔ صاحب کے مطالعے میں ان کے بہت نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ اُن کی 'انا' ان کی تحریروں اور تقریروں میں کس طرح بھیس بدل بدل کر آتی رہتی ہے۔ اس کا اندازہ طفیل صاحب نے اچھی طرح کرا دیا ہے۔ لیکن ایک بات طفیل صاحب شاید نہیں پہچان سکے کہ فراقؔ صاحب موڈ کے بھی آدمی ہیں۔ ایک خاص وقت میں ان پر اکثر ایک خاص جذبہ یا عقیدہ طاری ہو جایا کرتا ہے جو مہینوں کیا کبھی کبھی تو برسوں اُن کے ذہن میں چکّر لگایا کرتا ہے۔ اس عقیدے اور جذبے کو قوی بنانے کے لیے وہ ایسی ایسی شہادتیں فراہم کرتے رہتے ہیں کہ آدمی حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ کبھی یہ کہیں گے کہ شاعری اور فن میں مقصدیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ادب کو کسی پیغام اور تبلیغ سے کوئی واسطہ نہیں۔ جمالیات صرف مُجرّد حُسن کا نام ہے اور کبھی سوشلسٹ نظامِ حیات اور اُس کے تمام عقیدوں سے بہتر کسی نظامِ زندگی کو نہیں مانیں گے۔ کسی زمانے میں ویدانت کے فلسفے پر بحث کریں گے، کبھی سنسکرت زبان اور کلچر کو بہترین کلچر بتا کر اس پر بحث چلاتے رہیں گے۔ کبھی

خود کو بندو کہیں گے اور کبھی ان تمام باتوں کا انکار کریں گے۔ لیکن ان تمام مباحثوں میں علم کا دریا بہا دیتے ہیں۔ اُن کی طباعی کے آگے بڑے بڑے زیرک دنگ رہ جاتے ہیں۔ فراقؔ صاحب کی ایسی بحثیں کج بحثی نہیں ہوا کرتیں۔ اس عمر میں بھی، سوچنے سمجھنے اور محنت میں جوانوں کو مات کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں ایک دو ملاقاتوں میں کہاں ظاہر ہوتی ہیں۔ محمد طفیل صاحب نے فراقؔ صاحب کی معصومیت، بے نیازی، انسان دوستی اور طباعی کی جو تصویر پیش کی ہے اس پر اور اضافہ ہی ہو سکتا ہے کمی نہیں۔

مارک ٹوین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر جنت میں تمام اچھے لوگ ہی ہوتے تو پھر جنت میں کیا اچھائی رہ جائے گی۔ اسی طرح اگر انسانوں کی تصویر صرف اچھائیوں کی مظہر ہے تو وہ مکمل تصویر کہاں ہوئی۔ اسی بات کی غالبؔ نے کثافت اور لطافت کو ساتھ رکھ کر وضاحت چاہی تھی۔ محمد طفیل نے جن قلمی چہروں کی لغزشوں اور خامیوں کی طرف اشارے کیے ہیں وہ تصویر کے اسی دوسرے رُخ کی تکمیل کے لیے جس سے انسان کا خمیر بنا ہے۔ کوئی ان اشاروں کو بدنفسی اور دشمنی پر محمول کرے تو وہ خود نفسیاتی طور پر کسی اُلجھن میں گرفتار ہے۔ طفیل صاحب نہ ذاتیات پر حملے کرتے ہیں اور نہ کسی کی کمزوریوں کا مذاق اُڑا کر اُسے لوگوں میں بدنام کرنا اُن کا مقصد ہوتا ہے بلکہ اُن کا قلم اپنے خاکوں کے چہروں سے دھیرے دھیرے اس طرح نقاب سرکاتا جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو تمام خط و خال ہی نظر نہ آئیں بلکہ رنگ و روپ کے ساتھ، لوگ اُن چہروں پر تمام فطانت اور سادگی کے ساتھ اُن لغزشوں کو بھی پڑھ لیں جو شخص مذکور کے آب و گِل میں شامل ہیں۔ ان باتوں کا وہی لوگ بُرا مان سکتے ہیں جو خود کسی حد تک مُختل نفسیات یا شخصیت کے مالک ہیں اور نہیں چاہتے کہ اُن کے باطن کا بھی مطالعہ کیا جائے لکھنے والے کی نیت اور اس کے برآمد کیے نتیجوں پر اگر نظر رکھی جائے تو صحیح بات سمجھ میں آسکتی ہے۔

طفیل صاحب نے 'محترم' میں جوشؔ صاحب کے متعلق لکھا ہے:

> "وہ جاگیردارانہ نظام کی پیداوار۔ مگر خود اس نظام کے جانی دشمن۔ بھاری بھرکم شخصیت، بھاری بھرکم کلام، ہلکا پھلکا مزاج، ہلکا پھلکا مذاق۔ نہ اچھے دوست نہ اچھے دشمن۔ شاعر اور صرف شاعر۔ آدمی اور صرف آدمی۔ اس کے باوجود قابلِ احترام قابلِ تعظیم ایک موہنی شخصیت۔"

جو بھی جوشؔ صاحب کی معرفت رکھتا ہے اس سے بہتر اُن کی شخصیت کا اور کیا تجزیہ کرے گا۔ نئی شاعری ابلاغ و ترسیل سے جس طرح عاری ہے ہر پڑھے لکھے شخص کا جب اس شاعری کے نمونوں سے سابقہ پڑتا ہے تو اُسے یہی پریشانی ہوتی ہے جس کا اظہار محمد طفیل نے قیوم نظر کے مطالعے میں کیا ہے:

وہ یہ میرے دوست ہیں جن کا کلام سمجھنے کے لیے مجھے کئی کئی ہفتے خمیرہ گاؤ زبان کھانا پڑا مگر شعر پھر بھی سمجھ میں نہ آئے۔ ان کی اب تک جتنی بھی چیزیں نقوش میں چھپی ہیں وہ سب میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ پیش اس لیے کر دیں کہ اگر کوئی چیز میری سمجھ میں نہیں آتی تو ضروری نہیں کہ کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئے .... میرا مشورہ ان دوستوں سے (خاص کر قیوم صاحب سے) یہ ہے کہ اپنے علم کو لوگوں کی سطح پر لے آئیں ...... ورنہ کسی دن یہ ہوگا کہ اس اکھاڑے کے تمام ادیب قطب مینار پر چڑھ جائیں گے اور مجھ جیسے کم علم ادب کے چٹیل میدان میں کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے۔"

(قیوم نظر)

ہندوستان میں بھی نئی شاعری کے بیشتر علمبرداروں کا کلام ایسا ہی ملتا ہے جس کا ذکر قیوم نظر کے مطالعے میں کیا گیا ہے۔ نئی شاعری کو سمجھنے کے لیے ایک ایسے دماغ کی ضرورت ہے جس کی ابھی تخلیق شاید نہیں ہوئی۔ نئی شاعری کے بہت سے نمونے خود نئے شعراء کے حیطۂ فہم سے گریزاں ہیں دوسرے شارحین بے چارے کس شمار قطار میں ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ دن آگیا ہے جب کہ اس اکھاڑے کے تمام ادیب الگ الگ قطب میناروں پر چڑھ چکے ہیں — ایسے قطب مینار جن میں سے ہر ایک کے راستے الگ الگ ہیں اور جن کا راستہ سوا اکیلے چڑھنے والے کے دوسرا نیا شاعر بھی نہیں جانتا اور قارئین ایسے ریگستان میں کھڑے ہیں جہاں سے نیا شاعر کیا خود قطب مینار تک دکھائی نہیں دیتا۔ قیوم نظر صاحب کے متعلق طفیل صاحب کے بیانات کو نئی شاعری پر ایک بے لاگ تنقید سمجھنا چاہیے۔ ناپسندیدگی نہیں کیونکہ ناپسندیدگی نفسیات کی دنیا میں خوف کو جنم دیتی ہے لیکن خوف اس خیال سے پیدا ہو سکتا ہے جو اثر رکھتا ہو مگر جو کلام افہام و تفہیم سے نہ صرف بالاتر ہو بلکہ تفہیم و ترسیل کا کھلے بندوں انکار بھی کرتا ہو اُس سے کسی کو کیا خوف ہو سکتا ہے۔ طفیل صاحب ادبی دنیا میں خوف وہراس کے قائل نہیں۔ وہ جو کچھ جیسا سمجھتے ہیں اس کے اعلان میں قطعی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

شخصیات یا خاکوں کے مطالعے میں قاری کے لیے اس وقت دقت کا سامنا ہوتا ہے جب خاکہ نگار کسی ادبی یا سیاسی نقطۂ نظر کا سختی سے پیرو ہو اور ہر نظریہ کو اُسی لمحاتی کش مکش سے، نظریہ مذکور کے دُور سے الگ ہو کر جانچنا شروع کر دے اور ادیب کے مزاج و ماحول کو چھوڑ کر اپنے نقطۂ نظر سے فیصلے صادر کرنا شروع کر دے۔ ایسے شخصیت نگار انتہا پسندی کو اپنا معیار بنا لیتے ہیں۔ انسانی مزاج کی اس لچک اور حالات کے آثار چڑھاؤ کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن سے اُن کا خاکہ گزرتا ہوتا ہے۔ وہ اپنی

نفرت یا محبت کی رو میں قاری کی صحیح قوتِ فیصلہ کو متزلزل کر کے اُسے اپنے ساتھ یہاں تک کھینچ لاتے ہیں کہ اُن کے خاکے کی تصویر بالکل اک رُخی ہو جاتی ہے۔ قاری اس تصویر میں وہی کچھ دیکھتا ہے، جو خاکہ نگار دکھانا چاہتا ہے نہ یہ کہ جیسا خاکہ ہے۔ سویفٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تصویروں کو اس قدر بڑھا دیتا تھا کہ انسان کی ایک اِنچ کھال کے سارے مسامات یوں جھکنے لگتے تھے جیسے اس پر کوئی محدب شیشہ رکھ دیا گیا ہو اور یہ حالت اُس پر اُس وقت طاری ہوتی تھی جب وہ تصویر کا خراب رُخ پیش کرنے بیٹھتا تھا۔ ہوریس (HORACE) حقیقت نگاری کے چکر میں حالات اور شخصیات کی اُن صورتوں کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کرتا جنھیں انسان عام طور پر درگزر کرتے ہیں یا جنھیں دیکھ کر اُن پر ایک ناگوار کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ محمد طفیل نہ اُردو کے سویفٹ ہیں اور نہ ہوریس اور نہ اس بیان سے اُن کا ان ادیبوں سے مقابلہ مقصود ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ جہاں کہیں، 'جناب'، 'صاحب'، اور 'آپ'، میں ہلکا طنز اُبھارا گیا ہے، اس سے قاری کو کسی شخصیت کی طرف سے نہ تو بدظن کرنا مقصود ہوتا ہے اور نہ اُس کی خامیاں گنوانا بلکہ وہ تصویروں کی رنگارنگ کیفیت کو اُبھار کر ادیب یا شخصیت کے اندر چھپے ہوئے انسان کی صحیح تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ طفیل صاحب اپنے خاکوں کو اپنے کسی خاص نقطۂ نظر سے بنائی ہوئی کسوٹی پر نامناسب طور پر نہیں پرکھتے بلکہ جیسا کچھ کہ انھوں نے ان شخصیتوں کو پایا ہے یا اُن کے متعلق محسوس کیا ہے، پیش کر دیا ہے۔ نہ اپنی تصویروں کی انہیں تحقیر منظور ہوتی ہے اور نہ اُنہیں وہ تحسین کی اُس منزل پر لے جانا چاہتے ہیں جہاں پہنچ کر ان شخصیتوں سے واقف، طفیل صاحب کی تعریفوں کو تحسین ناشناس کا تمغہ عطا کر دے۔ ان کے مطالعے میں خلوص جھلکتا رہتا ہے جس سے نظر، خاکوں کے چہروں پر خردہ گیری کے لیے مرکوز نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کی تصویریں اس انفرادی رنگ کے ساتھ پیش ہوتی ہیں کہ ہر خاکہ اپنے گرد و پیش کو لے کر متحرک کیفیت کے ساتھ نظروں کے سامنے چلتا پھرتا رہتا ہے اور جن سے قاری یگانگت محسوس کرنے لگتا ہے۔ گویا بارہا اُن سے مل چکا ہے۔ ظہیر کاشمیری کی موٹر سائیکل، ان کی اشتراکیت میں انانیت، قدرت اللہ شہاب کا سرکاری مزاج، ناصر کاظمی کا رات کو ریستورانوں اور ہوٹلوں میں بسیرا اور بلوں (BILLS) پر دستخط کرتے پھرنا، شوکت تھانوی کا سب مزاح نگاروں کا کوٹہ اکیلے ختم کر لینا اور اس طرح اپنی بسیار نویسی کا ثبوت دینا۔ ابراہیم جلیس کی تمنا کہ سب لوگ انہیں بڑا لکھنے والا مانیں اور اُن کی جھوٹی باتوں پر بھی یقین کر لیں، یہ سب باتیں ایسے بیانات ہیں جو اپنے خاکوں کے لیے قاری سے الگ الگ فیصلے لیتے ہیں۔ پطرس کے متعلق لکھتے ہیں:

"اچھے مزاح نگاروں میں ایک پطرس نامی مزاح نگار گزرے ہیں۔ انہیں ایک بُری عادت یہ بھی کہ یہ سوچتے زیادہ تھے اور لکھتے کم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نصف صدی کی عمر تک پہنچ کر جو کتاب لکھ سکے وہ بھی شوکت صاحب کی کسی ایک کتاب کی نصف ہے۔"

انتظار حسین کے مزاج کی تصویر یوں پیش کی ہے :۔

"یہ دو دھاری تلوار ہیں۔ دوستوں سے بھی ہنس ہنس کر باتیں کریں گے اور دشمنوں سے بھی۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ باتیں کس کھاتے میں پیش کی جارہی ہیں۔ لوگ اُن کے جانی دشمن ہوتے ہوئے بھی اُن سے علیک سلیک ختم نہیں کرتے اگر دوسرا ختم کردے تو یہ ختم نہ ہونے دیں گے۔"

ناصر کاظمی کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں :۔

"ان کے بعض اشعار میں فنی کمزوریاں بھی ہیں۔ چونکہ ان کے بارے میں مجھے یقین نہیں اس لیے ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھا۔ اگر بدقسمتی سے یہ میرے دوست نہ ہوتے تو میں اوّل تو ان کی شاعری پہ تبصرہ ہی نہ کرتا اور اگر کرتا تو صرف ان کی تعریف ہی کرتا اس لیے کہ ان کے کلام کا مجھ پر بڑا اثر ہے.... ان کی شاعری میں جو ریاضت اور سوچ کر کہنے کی آرزو ہے وہ ایک نہ ایک دن انہیں اچھے شاعروں میں جگہ دے گی .... یوں تو اب تک بے شمار شاعر آئے اور گئے لیکن ان کا شمار آنے والے شعرا ہی میں ہوگا۔"

خاکوں میں ستیدیوں اور غیر مکمل چہروں کو پیش کرنا بہت زیادہ مناسب نہیں ہوا کرتا۔ کیونکہ جن ایسے چہروں پر خاکہ نگار محنت کرتا ہے ان میں سے اکثر آگے چل کر ادب کی دنیا سے غائب ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر یا ادیب پر زمانہ اپنی پرچھائیاں ڈالا کرتا ہے۔ اس کے راستے ابتد اً بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی صحبتوں کے معیار میں تبدیلی ہوا کرتی ہے اور اس طرح آج جو اس کا نقطۂ نظر کسی خاکے میں بیان کر دیا گیا، کل اُس میں بالکل متضاد سمتوں کی طرف تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اس کا علم، اس کی کم علمی، اس کے سفر، اس کے تمام نظریات ایک ایسا نقشہ بنا سکتے ہیں جس کا خاکہ نگار نے کبھی اور اک بھی نہ کیا ہوگا۔ طفیل صاحب نے محترم میں چند ایک ایسی ہستیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے چونکہ ان کا اشارہ اس مقالے میں کرنا خطرے سے خالی نہیں اس لیے کسی ایسی ہستی کا نام مثال کے

لیے پیش نہیں کیا جا رہا۔

'جناب'، 'صاحب'، اور 'آپ' میں طفیل صاحب کو بار بار 'اہل زبان' سے شکایت پیدا ہوئی ہے۔ اکثر خاکوں میں یہ شکایت کبھی طنزیہ اور کبھی مزاحیہ طور پر ظاہر کی گئی ہے اور ایک مرتبہ تو یہ شکایت ایسی شدت اختیار کر گئی کہ 'نقوش' کا پورا اداریہ "آپ نے کہاں جانا ہے" پر لکھ ڈالا گیا۔ پھر جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے وہی ہوا۔ "اہل زبان" نے بھی جواب پر جواب دیئے لیکن خیریت یہی گزری کہ تلخی کی کوئی صورت نہیں پیدا ہوئی۔

میں نہیں سمجھ پایا کہ طفیل صاحب کو "اہل زبان" سے اس قدر شکوہ کیوں ہے۔ اُردو زبان کا ارتقاء تہذیبی اور سماجی سانچوں کے دائرے میں مخصوص تاریخی اثرات کے تحت ہوا۔ جو لوگ مستقر سے قریب رہے (جسے محض اتفاق سمجھنا چاہیئے) وہ ان اثرات کو اپنے اندر زیادہ سمو سکے۔ جو دُور رہے انہیں اُن کے مقامی اثرات نے اپنی گرفت میں رکھا اور اس طرح زبان اپنے فطری ارتقاء کی صحیح سمتوں کو اپنا کر چلتی رہی جس میں مقامی بولیاں معیاروں میں تھوڑا بہت ردّ و بدل کرتی رہیں۔ یہ بھی بالکل اتفاق تھا کہ زبان کا آخری مرکز لکھنؤ بنا اور وہی آئندہ کا معیار بن گیا۔ اس میں نہ کسی کو فخر کی جا ہے، اور نہ کسی کو آزردہ ہونے کی۔ پھر اس دَور میں "اہل زبان" ہیں کہاں؟ آج تو اُردو کا ہر پُر خلوص خدمت گزار اہل زبان ہے۔ جو اندرونی رموز و نکات ہیں، تو اُن کے لیے یہ ہے کہ مقامی اثرات' لہجے اور سماجی تہذیبی بہاؤ، انہیں تبدیل کیا کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ادبی سخت جان لاکھ اُن کا انکار کرتے رہیں۔ زبان کوئی سکہ بند، جامد اور اٹل چیز تو ہے نہیں کہ روزِ ازل سے جس طرح تخلیق ہو گئی بس اس میں کوئی تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ اہل زبان کے سارے معیار زبان کے حسن کے لیے ہیں لیکن اگر حُسن کا معیار بدل رہا ہے، اگر زبان کے قدیم معیار حُسن کے بجائے اس کے لیے زنجیر بنتے جا رہے ہوں تو تاریخی اور تہذیبی بہاؤ ان پابندیوں اور غلط معیاروں کو خود خس و خاشاک کی طرح بہا دے گا۔ اور پھر اہل زبان وہی ہوں گے جن کے ہاتھوں میں زبان کو ترقی دینے کے آلے ہوں گے اور جن کے دل میں زبان کی طرف سے خلوص بھی، اس سے بڑا نا سمجھ کون ہوگا جو حُسن ظاہری کے چند لوازمات کی خاطر، زبان کا جنازہ ہی نکال دے۔ معیار میں تبدیلی زندگی کی دلیل ہے اور بالکل فطری و لازمی بات بھی اور ظاہر ہے کہ اہل ذوق سے، خوب سے خوب تر کی تلاش کی ہی اُمید رہتی ہے۔ کاش طفیل صاحب "اہل زبان" کو اُن کی ٹکسالوں میں آج دیکھتے تو اُن کو خود اپنی شکایت بہر

افسوس[1] ہوتا۔ کیا تھا۔ کیا ہوگیا۔

خاکہ نگاری کی حیثیت سے محمد طفیل نے جو اندازِ تحریر اپنایا ہے وہ بہت دل کش ہے۔ ژولیدہ بیانی اور قاموسی طرز کے بجائے انہوں نے عام بول چال اور طرزِ گفتگو کو اپنایا ہے جس میں قاری سے بالمشافہ گفتگو کا مزہ آتا ہے جسے دیکھ کر بہت سارے تنقید نگاروں کی طرح ہر پڑھنے والے کو یہی کہنا پڑتا ہے کہ "آپ، صاحب اور جناب"، ایسی کتابیں ہیں کہ کوئی انہیں شروع کرکے ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تُلے جملے، ان کی معنویت، دلکش اشارے اور ان جملوں کا بہاؤ، یہ سب محمد طفیل کو ایک ناقابلِ فراموش، متوازن اور حقیقت پسند خاکہ نگار کی حیثیت سے اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

---

[1] اس کے باوجود ہم "گنہگارانِ ادب" کے ساتھ، رویہ دوستوں کا یہ ہے سے

جنگ چھڑ جائے ہم اگر کہہ دیں

یہ ہماری زبان ہے پیارے

(ادارہ)

ایک اور نو آبادکار

جوگندر پال

کسی معتبر رسالے کے مدیر کو خواہ مخواہ بہت بڑا ادیب ثابت کرنے میں بھی وہی احساسِ کمتری کارفرما ہوتا ہے جو اُس وقت، جب کوئی مدیر واقعی اچھا خاصا ادیب ہو اور آپ اُسے محض اس بناپہ ٹال جائیں کہ یار لوگ آپ کے بیان کو 'لین دین' پر محمول کر لیں گے۔ محمد طفیل کی خوش قسمتی ہے کہ وہ محمد نقوش بھی ہے مگر کسی نقاد کے کوتاہ شعور کے اس کامپلکس کے باعث نقوش اگر طفیل کو ہڑپ کر جائے تو جدید اُردو خاکے کا چہرہ بالغ ہوتے ہوتے اچانک کسی مسخرے کی بے شکلی کا شکار ہو جائے گا۔

میں نے 'آپ' پڑھنے کے بعد 'جناب' اور 'صاحب' کو پڑھا اور لگا کہ قتل کے ارتکاب سے پہلے محمد طفیل دن دہاڑے ڈاکے ڈالتا تھا۔ کم از کم چور وہ کبھی نہ تھا کہ اِدھر ذرا آہٹ ہوئی اور اُدھر میاں سارا مال وہیں پھینک کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ 'جناب' میں عبدالحق کے خطوط لے لیجئے یا پطرس کے بارے میں سُنی سنائی باتیں، محمد طفیل کے خاکوں کے سیاق و سباق میں اُن پر اُس کے اپنے مال کا ہی گمان ہوتا ہے اور یہی وہ کمال ہے جس سے خاکہ نویسی کا اندراج بحیثیت فنِ تخلیق ممکن ہے۔ بات کسی اور نے کہی ہو لیکن اُس کا معنی آپ کا ہو۔ اپنے اُردو ادب کے بیشتر خاکہ نویس بظاہر اپنی تحریریں لکھتے ہیں مگر کہتے وہی ہیں جو اُن کے ماڈل اپنے متعلق کہلوانا چاہتے ہوں۔

"لو بھئی اِس خاص پوز میں ایک عمدہ سا فوٹو بنا دو۔"

"لیجئے جناب، فوٹو تیار ہو گیا۔ پوز دیکھ لیجئے۔ ٹھیک ہے نا؟ ـــــ لائیے معاوضہ!

محمد طفیل کمرشل فوٹوگرافر نہیں، ایبسٹریکٹ پینٹر ہے جو پوز تو درکنار، ماڈل کے چہرے کی اہمیت تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتا ہے۔ اُس کے بنائے ہوئے چہروں کی تکمیل الفاظ کے خارجی تناسب سے نہیں، بلکہ جذباتی اور آڑی لکیروں کے داخلی مفہوم سے ہوتی ہے۔

"موت برحق ضرور ہے مگر وہ پطرس کی وجہ سے کیوں آئے؟"

یہ پینٹر بول رہا ہے۔ ماڈل پطرس ہے مگر تخلیق پینٹر کی ہے۔ جیسے کسی موضوع کے اتنے ہی پہلو ہوتے ہیں جتنے ہم سب لوگ، ویسے ہی ماڈل کے اَن گنت الگ الگ شیڈ ہیں۔ اور تخلیق کار وہ ہے جس کے

شیڈ میں ماڈل بھی نظر آئے اور اُس کا اپنا ادراک بھی۔

"اگر مجھے کسی پریشانی نے نڈھال کر رکھا ہو، مایوسی کا کوئی پہاڑ سامنے ہو تو میں انتظار حسین کی تلاش میں نکلتا ہوں ——"

یہ انتظار حسین خود آپ انتظار حسین بھی ہے اور مصنف کی اپنی دریافت کی کوئی شئے بھی۔

باسویل کی 'جانسن' کی کلاسیکیت پر شک کی گنجائش نہیں لیکن اس کتاب میں باسویل کی عدم موجودگی سے مصنف کربناک حد تک جانسن کا محتاج ہو گیا ہے۔ چار سُو جانسن ہی جانسن نظر آتا ہے۔ جانسن بول رہا ہے، جانسن ہنس رہا ہے، جانسن جھگڑ رہا ہے، ماننے یہ باسویل کی 'جانسن' نہیں، جانسن کی جانسن ہے جانسن نہ ہو تو باسویل کسی موضوع پر بھی لکھنے سے معذور ہو۔ باسویل صرف اس لیے ہے کہ جانسن ہے۔ مصنفین تو اس اعتبار سے باسویل سے مختلف ہیں کہ ایک جانسن نہیں، نہ سہی، کئی اور موجود ہیں۔ جب تک اُن کی اپنی سوچ جواب نہیں دے دیتی، اُن کے نئے ماڈل ہی ماڈل ہیں۔

محمد طفیل کی پُرگو خاکہ نگاری کا ایک اور نمایاں سبب اُس کی کم گوئی ہے۔ "وہ اہلِ زبان اور مَیں بے زبان" انتظار حسین ہی نہیں، وہ اپنے ہر موضوع کو خوب کُھل کر باتیں کرنے کا موقع دیتا ہے، گویا اپنی خاموشی سے اُن کے جملوں کی مناسب پنکچویشن کر کے اُن کے معانی اپنی خواہش کے مطابق بڑھا گھٹا رہا ہو۔ نئی تحریر کو مصنف کی یہی پہچان ممتاز کرتی ہے کہ وہ اپنی وادیٔ خیال میں خالی خولی الفاظ کا ہجوم اور چیخ و پکار برپا کرنے کی بجائے انہیں ایک پُرلچک صف آرائی کا پابند کر لیتا ہے تاکہ اُن کی استعداد باقاعدہ رہے اور عین موقع پر وہ گھبرا کر بیک وقت اِدھر اُدھر دوڑتے نظر نہ آئیں۔

آسکر وائلڈ کا یہ مقولہ بے معنی ہے کہ جینئس بتدریج جینئس نہیں بنتا، جینئس آغاز تا انجام بیک وقت جینئس ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی اپنی مخصوص جینئس کو بتدریج دریافت کرتا ہے اور اسے دریافت کرنے سے پہلے اُسے خون اور درد کی ندی پار کرنی ہوتی ہے، پہلے بے جھجک، پھر دیوانہ وار، بہ ایں انداز وہ اپنی ہڈیوں میں گُھس کر کہیں چُھپے بیٹھے شعور کی ٹوہ لگاتا ہے اور بڑی لگن اور صبر سے کئی حیلے کر کے اُسے رام کرتا ہے۔ بڑے مزے سے کھیلتی ہوئی تحریر کے پس پُشت دراصل اُس کا خالق اپنی تمام حِسیّں یکجا کر کے بڑی تنی تنی احتیاط سے اپنی تخلیق کے کھنڈر این کا سامان کر رہا ہوتا ہے، اور اپنی اسی توفیق کی بدولت اُس کا فن بکھر جانے کے باوجود اور نکھرنے کی اُمید بندھاتا ہے۔

'صاحب' میں محمد طفیل بدستور ارتقا پذیر ہے۔

"میں نے بھی یہ کتاب لکھ کر کوئی بڑا تیر نہیں مارا ہے۔ تیر تو انہوں نے

مارا، جن سادہ لوحوں کو یہ پڑھنی پڑی۔"

یعنی آپ اپنے آپ کو بڑا وہ سمجھ کر یہ کتاب پڑھنے پر رضامند نہ بھی ہوتے تو کیا تیر مار لیتے۔ مصنف کو گویا یہ احساس ہے کہ نئے لوگ (ان میں وہ خود بھی شامل ہے) بُت تراش نہیں بُت شکن ہیں، لیکن اُسے اِس سے چڑ ہے کہ بہت سے نئے لوگ بے مقصد توڑ پھوڑ کر رہے ہیں، صرف اس لیے توڑ پھوڑ میں لگے رہتے ہیں کہ انہیں ٹھا۔ دھم کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، اور بس۔

اگر آپ کے ذہن میں کوئی برتر ایمان رچ بس گیا ہے تو بڑے شوق سے ایک ایک بُت کے سو سو ٹکڑے کر دیجئے مگر مومن بننے سے پہلے ہی اگر آپ بتوں کو توڑ کر رکھ دیں گے تو آپ سے دل بہلانے کا سامان بھی چھن جائے گا۔ شخصیت نگاری سے متعلق کنفیوژڈ تھنکنگ کا ایک اور سبب شاید یہ بھی ہے کہ اگلے لوگوں نے شخصیت نگاری کو صرف طاعت کا پندار سمجھ لیا اور آج کی باغیانہ خُو کے بہت سے نمائندے اس غلط رویّے کی صحت کرنے کی بجائے سرے سے اس ادبی صنف سے ہی مُنکر ہو رہے ہیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ بھئی، آدمی کبھی بندر تھا، سو اُس کی حیوانیت کا تدارک ناممکن ہے حالانکہ متمدن علم و فکر کا تقاضا یہ ہے کہ نئی زندگی کا شعور پرانی اصناف کے ارتقائی عمل کے اسباب پیدا کرے۔ محمد طفیل اس لیے ایک اہم شخصیت نگار ہے کہ اُس نے شخصیت نگاری کے ارتقا کی ذمہ داری کو بہ وثوق قبول کیا ہے اور اِس صنف کو پرانی، مضحکہ خیز قصیدہ گوئی سے آزاد کر کے اِسے نئی حیثیت دی ہے جس سے بُت تو بنتے ہیں، پر گوشت پوست کے، فانی، جو ہمارے تمہارے مانند آج کل میں مر جائیں گے، کیوں کہ انہیں خدا نے روشنی سے نہیں بنایا، بلکہ وہ ایک خاکی کے ادراک سے برآمد ہوئے ہیں۔ مٹی کے لوگ ہیں، پر ان میں جان ڈال دی گئی ہے اور مصنّف کی ذمہ داری یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے بھلے بُرے کے ذمہ دار خود آپ ہوں، جیسے واقعی ہیں ویسے ہی لگیں۔ مصنّف کا ایمان ہے کہ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے خدا نہیں، بڑے بڑے آدمی ہیں، یعنی بچے ہونے کے باوجود ہم جیسے آدمی، بکلنے بھی، اوچھے بھی، کوتاہ بھی، اور اپنی تمام کوتاہیوں کے باوصف یہ اُسے عزیز ہیں کیوں کہ ان میں کوئی بڑی بات بھی ہے۔

منٹو کے نقطے میں محمد طفیل نے لکھا ہے کہ افیون کھا کر ایک آدمی مر رہا تھا اور دوا پینے سے انکار کر رہا تھا۔ منٹو نے کہا، بھئی پی لو۔ اُس نے کہا، تم کون ہو؟ جواب دیا، منٹو۔ اور بقول منٹو، وہ آدمی اُس کا نام سُن کر مرنا بھول گیا اور کہنے لگا، بڑا اچھا ہوا کہ مرنے سے پہلے میں نے آپ کو دیکھ لیا۔

منٹو اپنے نام کی مالا جپتا رہتا ہے، اپنے دوستوں کو ایکسپلائٹ کرتا ہے اور نشے میں دُھت ہو کر واہی تباہی بکتا ہے مگر یہ منٹو وہی ہے جس کی کہانی پڑھتے ہوئے، بقول محمد طفیل، دماغ کی بجائے

دل میں درد ہونے لگتا ہے، اس لیے محمد طفیل کو منٹو عزیز ہے۔

فراق کی بدمستی بھی محمد طفیل کے لیے عشق آفریں ہے:۔

"اس وقت فراق کا نشہ وقتی تھا لیکن اُن کے شعروں میں جو نشہ تھا اور ہے، وہ وقتی نہ تھا، اس لیے سامعین کی حالت فراق صاحب سے زیادہ خراب تھی۔"

سوانح کا ایک اور حسن یہ بھی ہوتا ہے کہ مصنف کو اپنی ذات پر بھروسا ہو، اتنا بھروسا، کہ وہ کسی بے ساختہ بات کو اپنے بیان سے محض اس لیے حذف نہ کرے کہ اس سے اُس کی اپنی سبکی کا امکان ہے۔

"میرا نام طفیل ہے۔"

"بس اتنی سی بات تھی۔" فراق طفیل سے کہتا ہے۔

محمد طفیل کے خاکے اکثر افسانوں کا مزہ بھی دے جاتے ہیں۔ اُردو ادب کے بہت سے نقاد یا تو سرے سے نقاد ہی نہیں، یا اگر ہیں، تو اتنے ہارڈ کور، کہ ادب کی ایک صنف کو دوسری اصناف کا لباس پہننے کی سخت ممانعت کا حکم صادر فرما دیتے ہیں، مثلاً کوئی ہندوستانی لڑکی ہو تو صرف ساڑھی میں نظر آئے، پاکستانی ہو تو قمیص شلوار ہی اُس کا لباس ہو، اور یورپی یا امریکی ہو تو گھٹنوں سے نیچے تک پرانی کٹ کی اسکرٹ پہنے ہوئے ہو۔ طفیل کے خاکے اس لیے بھی جاذب معلوم ہوتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات پر زندہ پھیر پھیر کر، اُن کے بڑے خوبصورت افسانچے بنا بنا کر اُنھیں بڑی احتیاط سے اپنے خاکوں میں فٹ کر دیتا ہے۔

فراق طفیل سے کہہ رہا ہے: "میں نے اُسی وقت جواب دیا تھا کہ الہ آباد ضرور آنا اور میزبانی کی سعادت مجھے بخشنا، لیکن تم آئے اور بلونت سنگھ کے پاس ٹھہر گئے۔ ہاں بھئی، پنجابی ہر حال میں پنجابی ہوتا ہے"۔۔۔۔ اور پھر ۔۔۔۔ "مجھ سے ایک سکھ بھی اچھا ہے"۔

طفیل نے جواب دیا ہے: "بات تو ایک ہی ہے، آپ اچھے شاعر ہیں اور بلونت سنگھ اچھے آدمی"۔

"لیجیے ہو گیا فیصلہ۔ میں ہوں تو بدمعاش مگر شاعر اچھا ہوں، بلونت سنگھ افسانہ نگار نہیں ہے مگر آدمی اچھا ہے"۔

بلونت سنگھ: "میں طفیل جی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری ایک حیثیت کو تو تسلیم کیا"۔

فراق: "جی ہاں، خوب تسلیم کیا۔ لیکن اچھا انسان وہ ہے جس میں برائیاں بھی موجود ہوں"۔

"جی؟"

"ہاں، مثلاً فراق!"

یہ واقعہ ایک انشائیہ بن کر فراق کے کتنے قریب لے آتا ہے۔

طفیل کی شوخی کا منہ بعض اوقات اتنا پکا ہوتا ہے کہ اس پر شوخی کا گمان ہی نہیں گزرتا، گویا کوئی رسمی سا، زائد سا فقرہ تھا، بس یونہی قلم سے نکل گیا:۔

"آج اُردو شاعری میں احسان کا جو مرتبہ ہے اس میں ناجو مرحوم کا بڑا ہاتھ ہے۔"

پورا شیطان یہاں فرشتے کی بے اظہار صورت بنائے بیٹھا ہے۔

اکثر خاکہ نگار اپنی محبوب شخصیتوں کو بیک قلم بیان کر دینا چاہتے ہیں، جس سے شخصیتیں لازوال ہونے کی بجائے ناقابلِ یقین ہو کر اُسی وقت مر جاتی ہیں، بھاری بھر کم، قیمتی اور بازاری کھلونے سے، جنھیں آپ ہلا دیں تو ہل پڑیں گے، ورنہ اپنے ساکن وجود میں بے دم پڑے رہیں گے۔ بس انہیں مندروں میں سجا کر، ان کے گلے میں کاغذی ہار لٹکا کر، آنکھیں بند کر کے ان کی آرتی اتارتے رہیئے اور ان کے آس پاس ناچتے رہیئے۔

جب خدا کی حمد بھی جملہ بہ جملہ ممکن ہو تو ان چھوٹے چھوٹے خداؤں کی توصیف بیک جملہ کیونکر ممکن ہو سکتی ہے؟

اچھا سوانح نگار بے صبری سے کام نہیں لیتا اور کسی شخصیت کی ہمہ پہلوی شکل پیش کرنے کی بجائے اُسے پہلو بہ پہلو پیش کرتا ہے، جیسے ایک پوز، یہ اور اب ایک یہ —— اور یوں وہ شخصیت قابلِ یقین ہو ہو کر اپنی طرف متوجہ کرنے لگتی ہے، تحریر میں سانس بھرتی ہوئی نظر آتی ہے، از خود ہلنے لگتی ہے۔ محمد طفیل کے خاکوں کے پوز بھی اسی کیفیت کے حامل ہونے کی وجہ سے متحرک معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے خاکے دیکھ دیکھ کر تماشائی کی نظر ایک جگہ پر نہیں ٹکتی بلکہ کسی چلتے پھرتے انسان کی طرح یہاں سے وہاں تک گھوم جاتی ہے اور جب وہ آدمی وہاں پہنچ کر اوجھل ہو جاتا ہے تو قاری کے ذہن میں چلنا پھرنا شروع کر دیتا ہے۔ "آپ" میں جوش کی تصویریں اُس کے بیسیوں پوز ہیں اور ایک سو سولہ صفحات پر کھینچی ہوئی یہ سالم تصویر ہم بیک نظر نہیں دیکھ سکتے، اسے صفحہ بہ صفحہ پڑھ کر، اس کے علیحدہ علیحدہ پروفائل دیکھ دیکھ کر آخر میں جوش کی شخصیت ہمارے باطن میں جڑنے لگتی ہے جیسے ہم کسی زندہ انسان کو براہِ راست دیکھ

رہے ہوں۔

اُردو اَدب میں شخصیت نگاری کا میدان تقریباً اُجاڑ پڑا تھا۔ محمد طفیل نے اینٹ اینٹ جوڑ کر یہاں اِکا دکا نوآبادکاروں کے ساتھ ساتھ اپنی رہائش گاہ بنالی ہے اور اپنے گھر آنے جانے کے لیے جنگل کاٹ کاٹ کر راستہ وضع کر لیا ہے۔ یہ امر باعث تعجب نہ ہوگا کہ ان نوآبادکاروں کی کوششوں سے دو ایک نسل میں ہمارے اَدب کا یہ نیم آباد علاقہ شاہراہوں کے مناظر پیش کرنے لگے۔

نقوش کے نقّاش

شوکت تھانوی

کہتے ہیں کہ اس دُنیا کے جب سب جاندار مر چکیں گے اور ملک الموت سب کو مارنے کے بعد اکیلے رہ جائیں گے تو ان کو بھی موت آئے گی اور ان کو بھی مرنا پڑے گا۔ خیر یہ تو جب کبھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ مگر اسی قسم کا ایک واقعہ حال ہی میں پیش آیا ہے کہ ادارہ فروغِ اُردو کے مالک۔ رسالہ نقوش کے ایڈیٹر اور اپنے وقت کے لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے ناشر محمد طفیل صاحب کی بھی ایک کتاب چھپ کر بازار میں آئی ہے اور دوسرے مصنّفوں کو چھاپنے والے یہ حضرت خود بھی چھپ کر رہ گئے ہیں۔ کسی گمنام شاعر نے اسی قسم کے مواقع کے لیے کتنا ناموزوں مصرعہ کہا ہے کہ۔ ؎

پھانس کر دو چار بلبل پھنس گیا صیاد بھی

طفیل صاحب کی اس تصنیف کا نام ہے "صاحب" اور اس میں ان کے وہ سات مضامین ہیں جو سات صاحبان کی شخصیت پر لکھے گئے ہیں اور ان ساتوں میں جو ایک شخصیت دوسروں کی نقاب کشائی کی کوشش میں خود برافگندہ نقاب ہوئی ہے وہ خود طفیل صاحب کی شخصیت ہے۔ ان سات مضامین میں سے کچھ نقوش کے پچھلے شماروں میں نکل چکے ہیں صرف ایک ایسا مضمون ہے جو اسی مجموعے میں چھپا ہے۔ یہ ساتوں مضامین طفیل صاحب کے اُس ذاتی مطالعے اور مشاہدے کے آئینہ دار ہیں جو وہ ان ساتوں ملنے والوں کے متعلق کر سکے ہیں اور نہایت سادگی اور صفائی کے ساتھ اپنے ان ساتوں کرمفرماؤں کے سامنے طفیل صاحب کا آئینہ پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ خود بھی اپنے کو طفیل صاحب کی نظر سے دیکھ لیں۔ اس ہفت پیکر کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:

۱۔ سعادت حسن منٹو ۔ ۲۔ احمد ندیم قاسمی ۔ ۳۔ شوکت تھانوی ۔ ۴۔ جگر مراد آبادی ۔ ۵۔ فراق گورکھپوری ۔ ۶۔ عابد علی عابد ۔ اور ۷۔ احسان دانش ۔

باقی چھ حضرات کے متعلق تو میں وثوق سے کچھ عرض نہ کر سکوں گا مگر جہاں تک اُس مضمون کا تعلق ہے جو خود میرے متعلق لکھا گیا ہے مجھ کو ایمانداری کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں نے اپنی اتنی جامع تصویر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ تصویر وہ نہیں ہے جو ہونے والے سسرال بھیجنے کے لیے

لوگ خاص طور پر کھنچوانے کے بعد بنواتے بھی ہیں کہ گال اگر پچکے ہوئے ہیں تو ذرا ابھر دیئے جائیں آنکھیں اگر چندھی ہیں تو ذرا روشن کر دی جائیں رنگ اگر کالا ہے تو ذرا گورا کر دیا جائے۔ بلکہ یہ تصویر اصل خدوخال کے ساتھ جوں کی توں پیش کر دی گئی ہے۔

خود اپنے متعلق اس قسم کا منہ پھٹ سچ اس مضمون سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک آدھ مقام پر اگر مجھے شبہ بھی ہوا تو مجھ کو مجھ سے زیادہ سمجھنے والوں نے یہ کہہ کر اس شبہ کو دُور کر دیا کہ آپ مانیں یا نہ مانیں بات سچی لکھی ہے۔ ایک مقام پر مجھے شدید اختلاف تھا جہاں طفیل صاحب نے لکھا ہے:

"میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام ان کے ترنم سمیت سُن چکا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہُوٹ ہوئے۔"

میں یہ کہہ رہا تھا کہ صرف دو مشاعروں میں ہُوٹ ہوا ہوں۔ ایک میں اس لیے کہ سخن فہم متعصب تھے اور ہوٹنگ کرنے والے تیاطی، اور دوسرے میں اس لیے کہ تحسین ناشناس وسکوتِ سخن شناس دونوں شباب پر تھے مگر یہ تو ایک ہی بات ہوئی۔ بہر حال میں صرف دو مرتبہ ہُوٹ ہوا ہوں مگر بیگم صاحبہ نے طفیل صاحب کی گواہی دی کہ خود آپ کو اندازہ نہیں ہے میں بڑے شوق سے مشاعروں میں جایا کرتی تھی مگر محض آپ کی غزل سرائی نے مجھ سے مشاعرے ترک کرائے ہیں۔ کاش آپ اپنی آواز خویش پروری سے باہر ہو کر کبھی سُن سکتے۔ پھر مجھ کو اس مضمون کے اس مقام پر غصہ آتے آتے رہا۔ جہاں طفیل صاحب نے مجھے خبطی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے:

"ان کی طبیعت کی ایک اچھائی یہ ہے کہ بیٹھے بٹھلائے ناراض ہو جاتے ہیں۔ نہ ناراض ہونے کا پلاٹ بناتے ہیں نہ کوئی اسکیم۔ نہ ہی دوسرے کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ بے چارہ مدافعت میں کچھ کہہ سکے۔"

میں نے جھنجلا کر کہا "یہ غلط ہے۔ متہم کرتے ہیں۔ تہمت لگاتے ہیں۔ اتہام ہے سراسر۔"

وہ بولیں "حرف بہ حرف صحیح ہے۔"

میں نے کہا "صحیح کیسے ہے یہ تو پاگل پن ہوا کہ بے وجہ کوئی ناراض ہو جائے میں بغیر کسی وجہ کے کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوا۔"

وہ بولیں "کبھی شاید نہ ہوئے ہوں مگر اکثر ہو جاتے ہیں۔"

میں نے واقعی مشتعل ہو کر کہا " مثلاً - مثلاً کب ناراض ہُوا ہوں میں ؟"

وہ بولیں - " مثلاً اسی وقت ہو رہے ہیں ؟"

اور مجھ کو واقعی اندازہ ہُوا کہ میں خود اس دعوے کی دلیل پیش کر رہا ہوں - میں نے جلدی سے یہ صفحہ اُلٹ دیا اور ایک مقام پر بے ساختہ داد دی -

" ذرا بادل گرجے ، بجلی چمکے پھر دیکھئے آپ کا مزا - نادری حکم کے ماتحت تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرا دیں گے - اس کے بعد خود اُٹھیں گے - چٹخنیاں دیکھیں گے کہ کہیں کوئی چٹخنی کھُلی تو نہیں رہ گئی - پہلے خود اُٹھنے کے بجائے دوسروں کو اس لیے حکم دیں گے کہ مبادا بجلی اندر گھُس کر تبادلۂ خیالات کر ڈالے ۔"

میں اس " تبادلۂ خیالات " کر ڈالنے کی داد ہی دے رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے یہ فقرے پڑھ کر سُنا دیئے :

" بات کہنے والی تو نہیں لیکن آپ سُن لیں کہ یہ خُدا کے بنائے ہوئے بتوں کی بڑی پوجا کرتے ہیں - کامیابوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں ۔"

اور یہ سُنا کر بولیں ۔ " دیکھ لیا آپ نے - میں نہ کہتی تھی کہ یہ بات ہے ضرور ۔"

میں نے یہ سطریں خود پڑھ کر کہا ۔ " مگر یہ حضرت خود اپنے اس شُبہ کی تردید کر گئے ہیں اسی کے آگے مابدولت کا ایک اقتباس دینے کے بعد یہ بھی تو لکھا ہے :

" یہ جھوٹے تقدس کے قائل نہیں نہ اپنی لغزشوں پر نازاں ہیں بلکہ وہ سادہ سے الفاظ میں کہتے ہیں کہ بھئی میں آپ جیسا ایک انسان ہوں آپ میں اور مجھ میں فرق اتنا ہے کہ آپ جھوٹے تقدس کی آڑ میں وہ کچھ نہیں کہتے جو آپ ہیں میں تو ایک کھُلی ہوئی کتاب ہوں جہاں سے چاہو پڑھ لو ۔"

اور پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ اپنی اس قسم کی لغزشوں کو جب میں خود ڈنکے کی چوٹ بیان کر کے دُنیا کے سامنے پیش کر چکا ہوں تو اب ان کو یا کسی کو یہ نہ کہنا چاہیئے کہ کامیابوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں - شوکت صاحب تو جو کچھ جانتے تھے اُس سے سب ہی کو آگاہ کر چکے ہیں - اس خطرناک اعتراف کے بعد یہ شک اور یہ شُبہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے اس پر وہ کہنے لگیں کہ " بس رہنے بھی دیجئے ایک مقدمے میں سرکاری گواہ بن جانے کے معنی یہ کہاں ہو گئے کہ چور چوری سے بھی گیا اور ہیرا پھیری

سے بھی۔ یہ چالاکی بھی تو ہو سکتی ہے کہ اس طرح اپنا بھرم قائم کر کے پھر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے کہ جو چاہیں کریں۔"

میں نے کہا کہ خیر آپ کا اور میرا رشتہ تو ہے ہی ایسا کہ اس میں اگر بدگمانی نہ ہو محبت ہی مفلوج ہو کر رہ جائے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل صاحب کس رشتے سے اس قدر بدگمان ہوئے۔"

خیر چھوڑیے اس ذکر کو میں تو اپنے ہی مضمون میں اُلجھ کر رہ گیا اس کتاب میں اور مضامین بھی تو ہیں اور جس طرح اور مضامین کو پڑھ کر میرا یہ حال ہوا ہے کہ: ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی طرح میرے متعلق جو مضمون ہے اس کو پڑھ کر دوسروں نے بھی یہی کہا ہو گا۔ اور یہی طفیل صاحب کی سیرت نگاری کا کمال ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون جو منٹو کے متعلق ہے اس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں منٹو اپنی زندگی کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ چلتا پھرتا سامنے آ جاتا ہے اور اس کو مُردہ سمجھ کر کوسنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی منٹو کی بہکی بہکی حرکتیں وہی اس کی سرشادیاں اور وہی اس کے لغزیدہ قدم۔ وہی اس کا اندازِ بیان کہ مضمون پڑھتے جائیے اور منٹو کو سامنے بٹھا کر باتیں کرتے جائیے مگر دوسرے حصے میں منٹو کی طرف سے جو خط طفیل صاحب نے لکھا ہے وہ منٹو کے اسلوبِ تحریر کا ایسا جامع چربہ ہے کہ منٹو کی موت بھی ذی روح نظر آتی ہے۔ اگر یہ خط منٹو کے نام سے نہ بھی ہوتا تو بجائے خود ایک اہم ادبی دستاویز کی حیثیت اس کو حاصل ہوتی۔ طفیل صاحب نے اگر اپنی اس صلاحیت کو اب تک چھپایا ہے تو خیانت سے کام لیا ہے اور اب اگر اس میں بخل برتا تو مزید خیانت ہو گی۔

دوسرا مضمون جو احمد ندیم قاسمی کے متعلق ہے ندیم صاحب کو رفتہ رفتہ میرے قریب لا رہا تھا کہ یہ حصہ آ گیا:۔

"اگر یہ چارپائی پر بیٹھے ہوں، تکیے سے ٹیک بھی لگا رکھی ہو اور یہ ایک دم اکڑوں بیٹھ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ افسانہ لکھنے والے ہیں۔ اس وقت یہ سگریٹ پہ سگریٹ پئیں گے، خوبصورت سا کاغذ لیں گے۔ پنسل کو باریک بنائیں گے اور مہین مہین خط میں افسانہ شروع کر دیں گے۔ آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے۔"

میں نے کہا۔ حیرت ہے ندیم صاحب کی یہ ادائیں مجھ سے کس قدر ملتی جلتی ہیں۔

بیگم نے کہا "مگر آپ اکڑوں نہیں بیٹھتے۔"

میں نے کہا "خوبصورت سا کاغذ تو لیتا ہوں۔"

وہ بولیں "جی ہاں مگر آپ چارپائی پر کب بیٹھتے ہیں۔"

میں نے کہا "چلو نہ سہی مگر پنسل تو باریک بناتا ہوں۔"

وہ بولیں "عموماً قلم کا باریک نب تلاش کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "مطلب یہ ہے کہ ہمیں ہمیں خط میں تو مضمون شروع کرتا ہوں۔"

وہ اگلی سطریں پڑھوانا چاہتی تھیں۔ "آگے تو پڑھیے۔"

میں نے پڑھنا شروع کیا:۔

"آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے البتہ شعر کہنے کے لیے تنہائی چاہتے ہیں اس لیے کہ انھیں ہلکا ہلکا گنگنانا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ اپنے ترنم کا مرتبہ جانتے ہیں اس لیے اس خداداد دین کا سب پر اظہار کرنا نہیں چاہتے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "دیکھئے اس کو کہتے ہیں غیرت داری۔"

میں نے جل کر کہا "پھر آپ کا روئے سخن میرے ترنم کی طرف ہے۔ یہ تعصب کی عجیب گھریلو قسم آپ نے نکالی ہے۔"

احمد ندیم صاحب قاسمی والے مضمون میں طفیل صاحب اپنے اس احترام کو باوجود کوشش کے نہیں چھپا سکے جو ندیم صاحب کے لیے اُن کے دل میں موجود ہے۔ جب خود طفیل صاحب نے ندیم صاحب پر مضمون لکھنے کے لیے ہاجرہ بہن سے درخواست کی تھی تو اُن بیچاری نے بڑی سچی بات کہی تھی کہ:۔

"اگر میں سچ سچ لکھ دوں تو یہ مضمون کتنے صفحوں پر پھیلے گا اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اتنی سچائی کا ادب میں کیا درجہ ہوگا۔ لوگ تو اسے بہن کی پیار والی بات کہہ کر ٹال دیں گے۔"

مگر خود طفیل صاحب نے بھی بھائی کی پیار والی بات سے کام لیا ہے اور صرف طفیل صاحب ہی نہیں اگر میں خود بھی ندیم صاحب کے متعلق لکھتا تو وہ بھی پیار والی بات ہی ہوتی اس لیے کہ اس شخص میں سوائے پیار کے اور ہے ہی کیا۔

جگر صاحب کے متعلق طفیل صاحب کا جو مضمون ہے وہ ایک حد تک خود میرے متعلق بھی ہے اس لیے کہ طفیل صاحب اور جگر صاحب کے مراسم کی ابتدا میرے ہی گھر پر ہوئی تھی مگر جب یہ مضمون

آگے چل کر صرف جگر صاحب کے متعلق رہ گیا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ طفیل صاحب نے بھی اتنے ہی دنوں میں جگر صاحب کو اتنا ہی سمجھا ہے جتنا میں ساری زندگی کے مراسم کے بعد سمجھ سکا ہوں۔ اس مضمون میں جہاں کہیں طفیل صاحب نے جگر صاحب کے اندازِ گفتگو کا چربہ اتارا ہے داد دینے کو جی چاہتا ہے واقعی معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب کے یہ الفاظ ان کے ذہن میں محفوظ نہ تھے بلکہ دستاویزی صورت میں موجود تھے مثلاً کہتے ہیں کہ جگر صاحب کی باتیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں :-

"اگر میں آپ کے کہنے کے مطابق یہ مان لوں اور مجھے اس کا بھی یقین کامل ہو جائے کہ فلاں صاحب شعر اچھے کہتے ہیں، پھر بھی کہوں گا کہ ان میں وہی ایک چیز نہیں ہے اور وہ چیز پیدا تو ہوتی نہیں وہ تو انسانِ کامل اور مردِ خود آگاہ میں خود ہی ہوتی ہے۔ میری مراد خلوصِ باصفا ہے۔ وہ شعر بڑے بداعمال ہوتے ہیں جو ایسے ذہنی نابالغوں پر وارد ہو جاتے ہیں"

میں جانتا ہوں کہ یہ جگر صاحب کا اندازِ بیان ہے۔ یہی الفاظ یہی ترکیبیں یہی بندشیں اس مضمون کا کون سا حصہ ایسا ہے جہاں جگر صاحب مع اپنی اصلی شخصیت کے متحرک نظر نہ آتے ہوں۔

فراق والا مضمون شخصیاتی بھی ہے اور دستاویزی بھی۔ اس مضمون میں فراق کے چند نہایت اہم خطوط دیکر طفیل صاحب نے ہر ایک سے فراق کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ ملا دیا ہے بلکہ یوں فراق سے ملنے والا شاید فراق کو نہ پا سکتا البتہ ان خطوط کے آئینے میں اور پھر طفیل صاحب کی حاشیہ آرائیوں نے فراق کو اس مضمون کے پڑھنے والوں کے بالکل قریب کر دیا ہے۔ اسی مضمون میں ایک جگہ طفیل صاحب لکھتے ہیں :

"الٰہ آباد تین چیزوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ان میں سے ایک جواہر لال نہرو، دوسرے فراق، تیسرے امرود"

یہ بات اکبر الٰہ آبادی بہت پہلے بڑے مزے میں کہہ گئے ہیں ؎

کچھ الٰہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے\
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

مگر یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب پنڈت نہرو اور فراق نہ تھے صرف اکبر اور امرود تھے اور طفیل صاحب نے آج کل کا ذکر کیا ہے جب اکبر نہیں ہیں پنڈت نہرو۔ فراق اور امرود ہیں۔

سید عابد علی عابد کے متعلق مضمون لکھتے لکھتے طفیل صاحب کے ان فقروں نے چونکا دیا۔

"مجھے ان سے یہ شکایت رہی ہے کہ اتنی ٹھوس علمی شخصیت ہونے کے باوجود انہوں نے کوئی قابلِ ذکر ادبی کام نہیں کیا یہ "فضیلت" صرف ان ہی میں نہیں ہے بلکہ یہاں کی کئی اور بڑی بڑی شخصیتوں میں بھی اور ہے۔ اگر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر (بعض زندہ کرم فرماؤں کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کا نام لوں تو میرے کرم فرما مجھے معاف فرمائیں۔"

طفیل صاحب زندہ کرم فرماؤں سے ڈر جائیں مگر میں ان کا نام لیتا ہوں۔ ابھی چند ہی دن ہوئے کہ صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم کے گھر سید ذوالفقار علی بخاری نے یہی بحث چھیڑی تھی سید احمد شاہ بخاری پطرس کا علم و تبحر دیکھیے اور ایک کتابچہ دیکھیے "پطرس کے مضامین" اس قابلیت اس ذہانت اور اس تبحر کے اہلِ قلم سے اُمید تھی کہ نہ جانے ادب اُردو کو کیا کچھ دے گا۔ ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرت اپنی صلاحیتیں لیے اس دُنیا سے رخصت ہو گئے صوفی تبسم ہیں خدا کرے وہ اب بھی کوئی ادبی کارنامہ پیش کر دیں۔ سید عابد علی عابد کی صحت اگر اجازت دے تو ان میں عزم بھی ہے ہمت بھی اور ان کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ خود اب تک کی غفلتوں کی تلافی کے لیے بے قرار ہیں۔ اس موقع پر ان کی صحت کے لیے دل سے دُعا نکلتی ہے۔ عابد کے پاس بہت کچھ ہے اور ان کی نیت بھی بخل کی نہیں۔ دیر ہی سہی مگر ان کی توجہ اس طرف ضرور ہوئی ہے اور اُمید ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر دکھائیں گے۔

آخری مضمون احسان دانش پر ہے اور بہت ہی کامیاب مصوّری ہے۔ احسان اپنی تمام بیساختگی اور تمام سادہ پرکاری اور تمام پرکارِ سادگی کے ساتھ اس مضمون میں سمٹ آئے ہیں۔ ان کا بینک کی عمارت پر قبضہ کرنا۔ ان کا کبوتروں سے شغف۔ ان کی موت کے متعلق وہ اسکیم جو تقسیم ملک کی وجہ سے ناکام ہو گئی ان کا مشاعروں سے شیخوپورے کی طرف فرار، ان کے تاجور مرحوم سے مراسم کی داستانیں اس حسن سے بیان ہوئی ہیں کہ طفیل صاحب پر محمد حسین آزاد کی افسانہ طرازی کا شبہ ہونے لگتا ہے یہ مضمون بقول طفیل صاحب کے نامکمل بھی ہے اور نا کام بھی مگر احسان صاحب کا تو کام تمام کر ہی گیا ہے۔

رہ گئی اس کتاب کی زبان، اندازِ بیان اور باقی ادبی نزاکتیں ان کے متعلق خود مصنف کا دیباچہ پڑھ لینا کافی ہوگا جو "اعترافِ جرم" کے نام سے کتاب کے شروع میں دیا گیا ہے۔

طفیلِ نقوش

سیّد ضمیر جعفری

"نقوش" اردو کے ان مجلّوں میں سے ہے جو گھٹنوں چل چل کر جوان نہیں ہوئے بلکہ براہِ راست عالمِ شباب میں پیدا ہوئے اور غالباً اپنی عمر کے معاصرین میں تنہا مجلّہ ہے کہ کچھ مدّت ہسپتال میں رہنے کے باوجود اس کی صحت اور جوانی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا بلکہ اس کی چھب اور بھبن میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا —— طفیل اس کے روحِ رواں ہیں اور روحِ رواں کی طرح اندر ہی اندر کہیں گردش کرتے رہتے ہیں۔ ابتدا میں ایک خاصی مدّت تک وہ "مکتبۂ فروغِ اردو" زیادہ، "نقوش" کم تھے! "نقوش" کا غلغلہ عام تھا مگر طفیل کا نام خواص تک ہی محدود تھا۔

طفیل کے کارناموں کی تو میرے دل میں بے حد قدر ہے لیکن اُن سے ذاتی ملاقاتوں کی پونجی بہت ہی قلیل ہے۔ گنتی کی دو تین ملاقاتیں۔ وہ بھی ایسی شوگھتی دوڑتی ہوئی کہ صورت نظر آجائے مگر صورتِ حالات نظر نہ آئے۔

میری اُن سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ ہم لوگ یعنی کرنل مسعود احمد، کیپٹن انعام اللہ قاضی اور میں اُن دنوں راولپنڈی سے "بادِ شمال" کے نام سے ایک روزنامہ نکالتے تھے جس کے قدم جنرل چودھری کی فوج کی طرح جمنے سے پیشتر اُکھڑ چکے تھے۔ انعام قاضی ہمارے شعبۂ انتظامیہ کے "باس" تھے۔ طفیل، اُن کے چھوٹے بھائی عطاءُ اللہ قاضی کے ساتھ دیوارِ دبستان پر لام، الف لکھتے رہے تھے، سو ایک روز انھیں عطاءُ اللہ کے طفیل، طفیل صاحب ہمارے دفتر میں آنکلے، مگر بس چھوٹے مشرقی بھائیوں کی طرح بڑے بھائیوں کے سامنے مراقبے میں بیٹھ کر چلے گئے۔ انعام قاضی چونکہ ان سے زیادہ ان کے بزرگوں کو جانتے تھے۔ لہٰذا تعارف پر بزرگانہ شفقت کی دُودھ ملائی چھڑکتے ہوئے، بولے،

"طفیل بہت ہی شریف لڑکا ہے ....."

طفیل اس وقت واقعی ایک پتلا دُبلا، نوخیز، شرمیلا سا لڑکا ہی معلوم ہوتے تھے۔

طفیل گئے تو مسعود آ گئے۔ مسعود ہم دونوں کے "باس" تھے۔ اپنے اندر جھانک کر، اپنی کوتاہیوں کو ڈھونڈ کر اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے کے عمل میں، خود اپنی ذات کا ان سے زیادہ سخت گیر دشمن کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ اخبار کے معاملات میں ہماری تن آسانی اور بے تدبیری پر، وہ اپنے سمیت ہم تینوں کو اکثر لعنت ملامت کرتے رہتے تھے۔ اب اخبار کے "تین بڑوں" کی کانفرنس شروع ہوئی۔ مگر انعام نے انتظامی امور کی تمہید بھی طفیل ہی کے نام سے اٹھائی۔ بقول شخصے:

موضوعِ گفتگو تو مری جاں کچھ اور تھا
دورانِ گفتگو میں تری بات آ گئی

کہنے لگے:

"ابھی ابھی طفیل اُٹھ کر گئے ہیں۔"

"اچھا، وُہ اپنے آرڈیننس والے طفیل راجہ" مسعود بولے: "سُنا ہے اب لیفٹیننٹ کرنل ہو گئے ہیں۔"

"ارے بھئی! وہ تمھارا طفیل نہیں، ہمارا طفیل"۔ انعام نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: "مکتبۂ فروغِ اردو والا طفیل۔ بھئی! اس لڑکے نے کمال کر دیا۔ سوچتا ہُوں ہم بھی اخبار بند کر کے مکتبہ کھول لیں۔"

مسعود نے تجویز کو یک قلم ردّ کر دیا، بولے: "اخبار تو خود بخود بند ہو جائے گا۔ لیکن ہم سے مکتبہ بھی نہیں چل سکتا۔ کوئی سا بھی کام ہو، اگر اس کے پیچھے بھرپور لگن نہ ہو، بے پناہ محنت نہ ہو، مکمل منصوبہ بندی نہ ہو تو کام آگے نہیں بڑھتا۔"

مسعود نے یہ بات طفیل کے حوالے سے نہیں کہی تھی لیکن طفیل نے زندگی میں عزّت و اہمیت کا جو مقام حاصل کیا ہے، میں سمجھتا ہُوں، یہ بڑی حد تک اُن کی اپنے کام میں سچی لگن، بے پناہ مشقت اور جامع منصوبہ بندی کا ثمرہ ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد لگاتار اٹھارہ برس تک اُن سے کسی باقاعدہ ملاقات کا کوئی موقع نہ آیا۔ طفیل صاحب اس عرصے میں پیچھے ناشر کی مسند سے اُٹھ کر آگے ایڈیٹر کی کرسی پر دراز آ بیٹھے تھے اور ترتیب کے علاوہ تخلیق کے مراحل میں بھی بڑی تیزی سے نقش آرائی کر رہے تھے۔ آپ نے کچھ اس دَھج اور دُھوم، شان اور شکوہ قامت اور جسامت کے

خاص نمبر شائع کیے کہ بابائے اردو کے لیے نقوش کا خاص شمارہ " رسالہ کاہے کو تھا توپ خانہ تھا"۔ پطرس نمبر دیکھ کر، علامہ نیاز فتحپوری نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر طفیل میری موت پر اسی ڈیل ڈول کا نمبر شائع کرنے کا وعدہ کریں تو میں ابھی مرنے کو تیار ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ خاص شمارے نکالنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں جسامت ہی نہیں " نقوش" کی صحت بھی قابلِ رشک ہوتی ہے۔ وہ محنت، ذہانت اور نفاست سے اپنے خاص شماروں کو علم و ادب کی تاریخی دستاویز بنا دیتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ وہ ادب و تہذیب کی حفاظت و سربلندی کے واسطے عظیم الشان قلعے تعمیر کرتے ہیں اور ان کی شہ نشینوں اور شیش محلوں، درباروں اور دالانوں میں دُور دراز کی دشوار گزار کانوں سے ایسے ایسے موتی اور ہیرے کاٹ کر، ڈھونڈ کر سجا دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے نقوش کے ہر خاص نمبر پر حرفِ آخر نہ سہی حدِ آخر کا گمان ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ادبیات کا یہ" کولمبس" ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی نیا "برِاعظم" "ڈھونڈ لاتا ہے"۔ "نقوش" طفیل کی محبت کا سودا ہے۔ یہ الگ بات ہے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ محبت انھیں راس بھی آگئی ہے۔

جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں۔ اس عرصے میں میری ان سے کوئی باقاعدہ ملاقات نہ ہو سکی البتہ ایک بے قاعدہ سی ملاقات مسلسل جاری رہی۔ میں جب کبھی لاہور جاتا ایبک روڈ پر چودھری عبدالمجید کے مکتبۂ کارواں پر عموماً ضرور جاتا۔ طفیل صاحب کا مکتبہ ان کی بغل میں واقع تھا، سو اس کوچے میں آتے جاتے ان کو ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ کبھی پروف پڑھ رہے ہیں، کبھی کتابیں بیچ رہے ہیں، کبھی ادیبوں کے سامنے چائے رکھ کر خود ان کی صورت تک رہے ہیں، کبھی لکھنے میں مصروف، کبھی کاغذوں سے گتھے ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھتے ہوں گے، اور جیسا کہ بعد میں خود انھیں سے معلوم ہوا واقعی دیکھتے تھے۔ لیکن دونوں طرف سے بس وہی نگاہ استعمال ہو رہی تھی جو بظاہر نگہ سے بھی کم ہوتی ہے۔ خدانخواستہ ہم میں کوئی کھنچاؤ نہ تھا، البتہ ملاقات برائے ملاقات کے لیے بے دست و پا کر دینے والا کوئی ذاتی لگاؤ بھی موجود نہ تھا۔ نہ اِس طرف تمنا تھی نہ اس طرف طلب۔ آخر میں جب بھید کھلا تو بیچ میں سے غالب کا مصرع نکلا:

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

طفیل اس مغالطے میں تھے کہ میں ان کو پہچان نہیں رہا، میں اس غلط فہمی میں تھا کہ وہ مجھے

نہیں پہچان رہے۔ واقعہ یہ تھا کہ خواہ کوئی کتنا ہی رانی خان ہو، خواہ مخواہ تعلقات پیدا کرنے کے شوق میں راستہ روک کر کسی سے ملاقات کرنے کے نہ وہ قائل تھے نہ میں۔ مجھے طفیل کی یہ ادا پسند آئی۔

مئی ۱۹۶۸ء میں ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" کے نامور مدیر جناب الطاف حسن قریشی نے میرے محترم دوست اور اردو کے صاحبِ طرز مزاح نگار کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" کی رونمائی کے لیے لاہور میں ایک تقریب خاص کا اہتمام کیا تو وہاں طفیل صاحب سے بھی ملاقات ہوگئی اور نہ معلوم کیوں انہوں نے کرنل محمد خان، کیپٹن صدیق سالک اور مجھے اگلی دوپہر کو ایک ہوٹل میں کھانے کی دعوت دے دی اور نہ معلوم کیوں ہم نے یہ دعوت قبول کر لی۔ دعوت میں جا کر محسوس ہوا کہ انہوں نے دعوت کا تردّد غالباً یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ ہم لوگ کھانا کتنا کھاتے ہیں اور کس طرح کھاتے ہیں؟ وہ کھانے میں تو شریک ہوئے لیکن گفتگو کا صرف ایک آدھ لقمہ ہی لیا یا دیا ادھر کرنل محمد خاں اور میں بھی ٹیبل ٹاک کے دھنی نہیں، نتیجہ یہ کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا لمبا چوڑا کورس تیس چالیس منٹ میں ختم ہو گیا۔ ہوٹل سے آپ ہمیں اپنے ادارے میں لے گئے اور ازرہِ محبت نقوش کے تازہ تین منزلہ خطوط نمبر کے گرانڈیل مگر دلنواز پیکٹوں کا تحفہ عطا فرمایا۔ ان سے رخصت ہوئے تو "خطوط نمبر" ہمارے ہاتھ میں تھا، بلکہ ہم اس کے ہاتھ میں تھے۔ "نمبر" کیا تھا نمبروں کا بریگیڈ تھا جس کے ساتھ مسلسل کئی روز تک پُر لطف نبرد آزمائی جاری رہی۔ اب بھی ہمیں محاذ چھوڑ گئے ہیں ورنہ وہ بدستور راستہ روکے کھڑا ہے۔ بعض اوقات خاموشی ہی خاموشی میں جو مسافت طے ہو جاتی ہے وہ گفتگو میں نہیں ہوتی۔ اب جو ملاقاتوں کا دروازہ کھلا تو دو تین ماہ بعد راولپنڈی میں ایک ہی دن میں اُن سے دو ملاقاتیں ہوگئیں، جن میں ہم نے اُن کے منہ سے چند ایسے چمکتے ہوئے فقرے سُنے کہ بس لطف ہی آگیا۔ ع

سنگ یوں تَرشا کہ رخسارِ بُتاں بننے لگا

محاورے کی رُو سے لوگ عموماً دو چار ملاقاتوں میں کُھل جاتے ہیں۔ طفیل صاحب کے بارے میں فی الحال یہ اندازہ تو ہو گیا ہے کہ دو چار ملاقاتوں میں کھلنے نہیں پاتے۔ لیکن یہ اندازہ ابھی نہیں ہو سکا کہ کتنی ملاقاتوں میں کھل سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگوں سے وہ پہلی ملاقات ہی میں کُھل جاتے ہوں اور بعضوں سے کھلتے ہی نہ ہوں۔ یعنی ع

اُو بود من نہ بودم و من بودم او نہ بود

البتہ ان ملاقاتوں میں یہ احساس ضرور ہُوا کہ آپ بولتے کم ہیں دیکھتے، سُنتے اور سمیٹتے زیادہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس میں احتیاط سے زیادہ ان کے انکسار کا اقتضا بھی شامل ہے۔ پھر ان کی مسلسل اور گراں بار مصروفیت ؛ ع

کہ اپنے سائے سے سر پانوں سے ہے دو قدم آگے

نقوش کا کوئی ایک خاص نمبر ہی پوری زندگی کی مصروفیت کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس حالت میں ان جیسے معروف شخص کے لیے ضروری ہے کہ وُہ بولنے پر لکھنے کو اور کام کرنے کو ترجیح دیں۔ شاندار اور دیرپا کارنامے سرانجام دینے والے افراد میں یہ خوبی عموماً موجود ہوتی ہے۔ بہرحال یہ سب میرے ذاتی قیافے ہیں جو قبل از وقت بھی ہوسکتے ہیں ع

نہیں زنجیر بھی محرم کہ دیوانوں پہ کیا گزری

طفیل صاحب کی ذات کو جب میں ان کی تحریروں، ان کے کارناموں اور ان کی زندگی کے آئینے میں دیکھتا ہوں تو ایک ایسے شخص کا امیج (IMAGE) اُبھر کر سامنے آتا ہے جو کسی بلند، دشوار گزار پہاڑ کی تلہٹی میں پیدا ہوا ہو۔ بے وسیلہ بے سروسامان لیکن فیضانِ قدرت سے فیضیاب ہے۔ اس نے چوٹی کی طرف دیکھا اور پہاڑ کو سر کرنے کی اُمنگ اس کے دل میں پیدا ہوگئی۔ لوگ مسکرائے کہ میاں ــــ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے ؛ نہ تیشہ، نہ رسّی، نہ آکسیجن۔ بعضوں نے برملا ٹوکا کہ پہلے اس پہاڑ کا جغرافیہ تو پڑھ لو، تم اس کے پیچ و خم سے ناواقف ہو۔ چوٹی کی ہوا میں تمہاری سانس رُک جائے گی۔ تمہارے لیے بس یہی کافی ہے کہ اوپر جانے والے لوگوں کے لیے نیچے ترائی سے راشن پانی سپلائی کرتے رہو۔ یہ اندیشے بے بنیاد بھی نہ تھے۔ مگر یہ شخص اپنی دھن کا پکا تھا۔ وہ سفر پر روانہ ہو گیا اور دُنیا دیکھ رہی ہے کہ وہ کس طرح قدم قدم پر اپنے ہاتھوں سے پتھر اور چٹانوں کو تراشتا ہُوا چوٹی کی طرف برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ نقوش کے مختلف خاص شمارے، اس طویل کٹھن سفر کے مختلف مرحلوں پر طفیل کے آباد کردہ وسیع و شاداب کیمپ ہیں، وسیع سے وسیع تر، خُوب سے خوب تر۔ کیمپ نہیں، قصبے اور شہر، وہ انجنیئر ہی نہیں "آرکی ٹیکٹ" یعنی خلّاق بھی ہے۔ دنیائے ادب کے ان شہروں میں اس کے اپنے ذہن سے نکلے ہوئے خیابانوں کا حُسن بھی دیدنی ہوتا ہے۔ شخصیت نگاری میں اس کا ٹُبک، میٹھا، بے تکلف

اور شگفتہ اسلوب اپنی ایک الگ چھل بل اور کشش رکھتا ہے۔ طفیل میرے نزدیک لگن، خلوص اور دریافت کے اسی فاتح جذبے کا نام ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ طفیل پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس پہاڑ کی کوئی چوٹی نہیں ہوتی۔ اس کی چوٹی افق کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔

چند تبصرے، چند تقریریں:

"آپ" پر چند تبصرے
مرتبہ، محمد طفیل:

حکیم یوسف حسن، مولانا عبدالماجد دریا بادی، ڈاکٹر آغا افتخار حسین، مولانا نعیم صدیقی، آلِ احمد سرور، ڈاکٹر خلیق انجم، عبدالمغنی، ڈاکٹر محمد عقیل، احمد جمال پاشا، جوگندر پال، حجاب امتیاز علی، رام لعل، ممتاز مفتی، ستیش بترا، سید مسعود حسن رضوی ادیب، سید علی عباس حسینی، ڈاکٹر قاضی عبدالستار، ہرچرن چاولہ۔

ریڈیو تقریریں:

محمد طفیل، ڈاکٹر وحید قریشی، مرزا ادیب، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صادق حسین۔

تبصروں پر تبصرہ

ترتیب: محمد طفیل

مدیر نقوش کی تیسری کتاب "آپ" پر
بڑے ادیبوں کی آرا: تفصیل بھی، مختصر بھی

جن میں — مولانا عبدالماجد دریابادی، سیّد مسعود حسن رضوی، علی عباس حسینی، آل احمد سرور، حکیم یوسف حسن، ممتاز مفتی، حجاب امتیاز علی، عبدالمغنی، سیّد افتخار حسین، ڈاکٹر محمد عقیل، ڈاکٹر خلیق انجم، نعیم صدیقی، رام لال، جوگندر پال، ستیش بترا، ہرچرن چاولہ اور احمد جمال پاشا — نے حصّہ لیا۔

یہ مضمون، مضمونوں پہ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے یا خطوں پر خط کی حیثیت! ہوا یہ کہ میں کبھی کبھار لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ یہ ایک لَت ہے۔ کیا کیا جائے! نتیجے میں کچھ مضمون ہو جاتے ہیں۔ پھر یار دوست ورغلاتے ہیں کہ تُو تو بڑا لکھنے والا ہے۔ لہٰذا ان مضمونوں کو جلدی سے چھپوا دے ورنہ ہوگا یہ کہ ادب یتیم ہو کے رہ جائے گا۔

کہنے والے بھی خوب کہتے ہیں۔ سُننے والے بھی خُوب کان دھر کے سنتے ہیں۔ قصّہ کوتاہ، صاحب! میں نے اپنی تیسری کتاب چھپوائی۔ کسی اَل بل کے بغیر، نام اس کا رکھا "آپ"! دوست مجھے روز مضمون بھیجا کرتے تھے۔ مَیں نے سوچا آج موقع ہے کہ مَیں بھی اُنھیں "نواز" سکوں چنانچہ مَیں نے بھی کتاب کا ایک ایک نسخہ یاروں کو بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ دوست، دوست ہی ہوتے ہیں۔ جھوٹ موٹ بھی تعریف کریں گے۔ لہٰذا آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔

پہلے میں حکیم یوسف حسن کی رائے درج کرتا ہوں۔ مدیر ٹائپ کے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ کسی کی تعریف ذرا کم ہی کرتے ہیں۔ معاصرانہ چشمک بھی تو ایک چیز ہوتی ہے۔ مگر نہیں صاحب، اُنھوں

نے بڑے حوصلے سے لکھا۔ جھوٹ نکلے، غلط لکھا یہ الگ بات ہے۔

صاحب، جناب اور آپ، یہ تین مجموعوں کے نام ہیں جو محمد طفیل نے لکھے ہیں۔ اگر میں یہ لکھوں کہ اُردو ادب میں یہ تین کتابیں منفرد ہیں اور محمد طفیل شخصیت نگاری میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے۔

بعض اصحاب نے اسے طنز سمجھا اور بعض نے مزاح کا لیبل لگایا۔ کسی نے خاکہ نویسی اور کسی نے اسکیچ نگاری کی مہر ثبت کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ خاکے ہیں نہ اسکیچ، نہ طنز نہ مزاح بلکہ یہ ایک علٰحدہ حقیقت ہیں اور جداگانہ مضمون ہیں۔ ان کا عنوان بھی جُدا ہے۔ ہم اُنھیں "شخصیت نگاری" کہہ سکتے ہیں۔ اور اس موضوع پر اُردو ادب میں پیشتر کوئی کتاب نہیں چھپی۔ یہ ادب کی حسین و دل کش نزاکتوں کا مرقع ہیں۔ مصنف شخصیت نگاری کے میدان میں ایک تنہا شہسوار ہے جس کا کوئی مدِّ مقابل نہیں۔

محمد طفیل کی تحریروں میں بے ساختہ پن، صداقت، رواداری، اخلاص، محبت، جرأت، بے باکی اور حق گوئی پائی جاتی ہے۔ ہم نے محمد طفیل کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ان کے بھولپن کے اندر ایک گہرا سائنسی ذہن کار فرما ہے جو جذبات اور خیالات کی گہرائیوں کو ایک حسابی مقیاس سے جانچ تول لیتا ہے اور پھر آپ کا ایک مقام مقرر کر لیتا ہے۔ جو مقام وہ آپ کو دے دیتے ہیں، میرا خیال ہے کہ مدت العمر اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس منتخب شدہ مقام سے وہ اپنی رواداری اور اخلاص کی بدولت نہ اپنے دوست کو گراتے ہیں نہ بڑھاتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ اپنوں اور بیگانوں سے یکساں سلوک کرتے ہیں۔ ان کے الجبرے کا یہ فیصلہ بچوں، بیوی، بھائیوں اور عزیزوں سے یکساں سلوک کرتا ہے۔ جب وہ اپنوں سے ایسی مقررہ جچی تُلی پالیسی پر کار فرما ہیں تو دوست احباب کو وہ کب بخشنے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تینوں کتابوں میں ملک کے چالیس پچاس اہلِ قلم کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کی کسرِ نفسی اور بے باکی کا بیّن ثبوت ہے۔

طفیل صاحب کا انداز انوکھا، تحریر دل نشیں اور اتنی جچی تُلی کہ ایک لفظ ایک نکتہ بھی زائد یا کم معلوم نہ ہوگا۔ طفیل کی تحریر طنز و مزاح کے محوروں سے بہت بلند ہے جو اپنا جداگانہ اسلوب رکھتی ہے اور اپنی انفرادیت کی مظہر ہے۔

بعض کتابوں کے پڑھنے پر طبیعت کو مائل کرنا پڑتا ہے لیکن محمد طفیل کی تین کتابیں اس نظریہ سے مستثنیٰ ہیں، کوئی کتاب آپ ختم کیے بغیر چھوڑ نہیں سکتے، اور کسی نہ کسی کتاب

کے بعض حصّے آپ دوستوں کو سنانے پر مجبور ہوں گے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے جب آپ کتاب کے ورق اُلٹنے لگیں تو پھر ساری کتاب خود دوبارہ پڑھنے پر مجبور ہوں گے۔

"آپ" اس سلسلہ کی تیسری تصنیف ہے، اس میں جوش ملیح آبادی، نیاز فتحپوری، اختر اورینوی اور کرشن چندر کا ذکر ہے۔ جوش اور نیاز فتحپوری پر بڑے مبسوط مضامین ہیں۔ زمین بڑی سنگلاخ تھی مگر محمدؐ طفیل کو اس میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ بلکہ یہ تحریریں گذشتہ مضامین سے زیادہ وقیع اور موثر ہیں اور بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔

شخصیت نگاری ایک مشکل ترین مضمون ہے جسے محمدؐ طفیل جیسا جی نی اس (GENIUS) ہی خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتا تھا۔ طفیل کو اپنے دماغ، اپنے قلب، اپنے جذبات اور اپنے قلم پر جو کنٹرول حاصل ہے اس کی وجہ سے وہ ان کتابوں میں کہیں ایک جگہ بھی اپنے مسلک سے نہیں پھسلے اور یہ ایک لامثال کامیابی ہے۔ طفیل صاحب کی ان تینوں کتابوں پر طویل مقالے لکھنے کی ضرورت ہے۔

یوسف حسن

(ایڈیٹر "نیرنگِ خیال")

حکیم صاحب کی رائے آپ نے پڑھ لی۔ اب ادیبوں کے ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کی بھی باتیں سُن لیں۔ اُنھوں نے میری خبر لی۔ اچھا کیا۔ مَیں خوش ہوا۔ بات یہ ہے کہ مذہبی معاملے میں جو رائے مولانا ماجد کی ہو سکتی ہے، اس خاکسار کی تو نہیں ہو سکتی۔ کوتاہی میری رسائی اُن کی، گنہگار مَیں، اللہ والے وہ۔ بہرحال اِدھر اُدھر کی باتوں کے ساتھ مولانا نے کتاب کے مندرجات پر بھی بات کی۔ فرمایا:

برادرم، وعلیکم السلام

"آپ" پہنچ گئی تھی۔ سرسری نظر کر ہی گیا۔ طرز آپ کا اپنا مخصوص ہے، اس رنگ کی بھی چیز آپ کی دیکھی۔ دوسری کتابوں کا تو دیکھنا یاد نہیں پڑتا۔

اکبرؔ پر ایک "ٹاک" آپ کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ بھیجنے کو سوچ ہی رہا تھا۔

"خطوط" کا بیشتر حصہ یا تو خود چھاپ چکا ہوں یا دوسروں کو دے چکا ہوں۔ شبلیؔ، ابوالکلامؔ، اقبالؔ، سید سلیمان، اکبرؔ، محمد علی، عبدالحق، مہدی افادی، شوکت تھانوی، مناظر احسن گیلانی،

حضرت تھانوی، مولانا مدنی دیوبندی سب ہاتھ سے نکل چکے۔ اب ممکن ہے کہ عبدالسلام ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، شرر، ریاض خیرآبادی، عزیز لکھنوی، صاحبزادے آفتاب احمد خاں کے باقی رہ گئے ہوں۔ ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد اور راس مسعود کے بھی خطوط کا ایک ذخیرہ تھا، مگر انگریزی میں، ان کا محفوظ رکھنا بھی بے کار تھا۔

آپ بحمداللہ مسلمان ہیں، لیکن کفر نوازی کو بھی شاید جزو رواداری سمجھتے ہیں، جو شخص بار بار اور اعلانیہ کہے کہ قرآن کلام اللہ کا نہیں، محمدؐ کا ہے، اسے آپ اس علم کے باوجود مسلمان اور مظلوم سمجھے جا رہے ہیں۔ اس رائے پر آپ کو اصرار ہے اور جارح آپ سلیمان ندوی اور دریابادی کو قرار دیے جا رہے ہیں۔ مجھے شکایت نیاز کی ذات سے مطلق نہیں۔ دوستانہ مراسلت بعد کو بھی برسوں رہی اور ملاقات بھی گاہے ماہے ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن مدیر نگار کی مسلم آزار دریدہ دہنی پر صبر و سکوت ایمانی بے غیرتی اور بے حسی کے مترادف تھا۔

یہ عریضہ ۱۲ر جولائی کو روانۂ خدمت ہوا تھا۔ اگرچہ خاص طور پر جواب طلب نہ تھا۔ پھر یہی خیال گزرتا ہے کہ کہیں ڈاک تلف نہ ہوئی ہو۔ اس لیے احتیاطاً مکرر ارسال خدمت ہے۔ والسلام

عبدالماجد

۱۵ر اگست ۱۹۶۷ء

مولانا کی رائے آپ نے پڑھ لی۔ اب آگے چلیے۔ ایک صاحب ہیں سیّد افتخار حسین۔ یوں تو یہ ایک بڑے افسر ہیں، مگر صاحب ہیں بہت گنی، بڑی محبت والے، بڑے خلوص والے، پھر مطالعہ بھی "علی الحساب"! علی الحساب نہ کہیے، بے حساب کہہ لیجیے۔ ویسے میرے لیے لطف علی الحساب میں ہے میرے نزدیک تو بو علی سینا، ابن رشد اور امام غزالی کا علم بھی علی الحساب تھا بے باق نہ تھا، یعنی مکمل نہ تھا۔ معاف کیجیے میں دُور نکل گیا، پھر لوٹتا ہوں! اسی شمارے میں افتخار صاحب کا ایک مضمون ہے "عہدِ حاضر اور پس ماندہ اقوام" وہ پڑھ لیجیے، جھوٹا ثابت نہ ہوں گا۔ جب ان کی بھی رائے مجھ تک پہنچی تو میں نے سوچا۔ لو بھئی یہ بھی گئے!

خاکوں کے پہلے مجموعے "صاحب" کے دیباچے میں جسے انہوں نے "اعترافِ جرم" کا

نام دیا ہے۔ طفیل صاحب لکھتے ہیں کہ اُنھیں شخصیت نگاری کا میدان قریب قریب سنسان نظر آیا، اس لیے اُنھوں نے شخصی مضامین لکھے۔

علم و ادب ہی میں کیا زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں جہاں میدان خالی نظر آئے وہاں کام کرنا مفید بھی ہوتا ہے اور اکثر اوقات آسان بھی۔ اُردو ادب میں ابھی کئی میدان خالی یا سنسان ہیں.. بلکہ غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ابھی تک زیادہ اہم کارنامے شاعری ہی کے میدان میں انجام دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد افسانوں کا نمبر آتا ہے۔ چند ناول بھی اچھے لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ادب کے باقی اصناف میں اکثر جگہ ویرانی کا احساس ہوتا ہے۔ خصوصاً اس دَور میں جب کہ ترقی یافتہ اقوام کا ادب ہر صنف میں (سوائے شاعری کے) بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اس منزل تک جا پہنچا ہے جہاں علم اور ادب مل جاتے ہیں۔

شخصیت نگاری ادب کی بہت پہلو دار صنف ہے۔ اس کی سرحدیں اور کئی سرحدوں سے ملتی ہیں۔ مثلاً تاریخ، تذکرہ، قصیدہ، ہجو، سوانح، رپورتاژ، سفرنامہ، صحافتی انٹرویو حتیٰ کہ پولیس کی رپورٹ بھی اُن تحریروں میں شامل ہے جن کے ڈانڈے شخصیت نگاری سے مل سکتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ ذرا سی لغزش سے شخصیت نگار اپنی سرحد پار کر کے ان حدود میں داخل ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر کبھی کبھی ارادی یا غیر ارادی طور پر ان سرحدوں کی خلاف ورزی بھی ہو جائے تو یہ کوئی ایسا جُرم نہیں جسے معاف نہ کیا جا سکے اور بعض گناہ خوب صورت بھی تو ہوتے ہیں!!

شخصیت نگاری کے لیے عموماً اس تبحّرِ علمی کی ضرورت نہیں ہوتی جو اس ترقی یافتہ دور کے ادب کے بعض شعبوں کے لیے ضروری ہے (یوں اگر یہ سرمایہ بھی موجود ہو تو کیا کہنا) ایک عظیم اہلِ قلم کا دل آویز اندازِ بیان غیر معروف شخصیتوں کو بھی دلچسپ بنا دیتا ہے۔ لیکن اگر شخصیتیں خود مشہور و معروف ہوں تو ان کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا جائے وہ عموماً دلچسپی ہی سے پڑھا جاتا ہے۔ شخصیت نگار کو بعض اوقات زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی۔ لیکن شخصیت نگاری ایک آسان فن نہیں ہے۔ ؎

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

ان "مقامات" میں سے چند حسبِ ذیل ہیں:

شخصیت نگاری کا مقصد کسی دوسری شخصیت کو پیش کرنا ہوتا ہے لیکن بعض تحریریں

ایسی بھی دیکھنے میں آتی ہیں جہاں شخصیت نگار خود اپنی شخصیت کی اہمیت کو واضح کرنے پر زیادہ زورِ قلم صرف کرتا ہے اس کمزوری پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔

اب قصیدہ گوئی اور ہجوگوئی دونوں کا زمانہ نہیں رہا لیکن ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو قصیدہ گوئی ہجوگوئی سے بہتر ہے۔ اس لیے اگر شخصیت نگار کسی کی تعریف کرتا ہے، تو اس سے کسی دوسرے کو بُرا ماننے کی ضرورت نہیں۔ اس امر کی وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعض ایسے افراد ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جو کسی دوسرے کی بُرائی تو سُن لیتے ہیں بلکہ سُن کر خوش ہوتے ہیں لیکن کسی کی اچھائی نہیں سُن سکتے۔ کسی ادیب پر "تبرائی" قسم کی تنقید لکھ کر یا پڑھ کر بہت خوش ہوتے ہیں لیکن کسی اہلِ قلم کی تعریف پڑھ کر انھیں غصّہ آتا ہے۔ (ممکن ہے بعض صورتوں میں اس کی وجہ وہ حسد ہو کہ تعریف ہماری کیوں نہیں چھپی) چنانچہ وہ شخصیت اور شخصیت نگار دونوں سے خفا ہو جاتے ہیں۔ اب شخصیت نگار آخر انسان ہے اسے اسی معاشرے میں رہنا ہے۔ چنانچہ بعض شخصیت نگار اور نقاد محض اس لیے بعض اہلِ قلم کے بارے میں مخالفانہ تحریریں شائع کراتے ہیں کہ وہ اس قسم کی "خفگیوں" کا ازالہ کر سکیں۔ بعض "نقاد" حضرات ضروری سمجھتے ہیں کہ شخصیت نگار اپنے ممدوح کی "کمزوریاں" ضرور بیان کرے یعنی اس میں کیڑے ضرور نکالے۔ اور تو اور رشید احمد صدیقی کے بعض مضامین کے بارے میں نقّادانِ کرام کو یہی اعتراض رہا ہے۔ اس لیے بعض شخصیت نگار انہی تحریروں کو "منصفانہ" ثابت کرنے کے لیے شخصیتوں کے کچھ کمزور پہلو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

کمزوریاں ہر شخص میں ہوتی ہیں یہ صحیح ہے لیکن سوال یہ کہ شخصیت نگار یا نقّاد کو یہ حق یا اختیار کس ذریعے سے حاصل ہو گیا کہ وہ کسی ادبی شخصیت کی ذاتی یا نجی زندگی کا محاکمہ کرے؟ ایک ادیب کی تحریریں قومی سرمایہ ہیں۔ اس کی ذاتی زندگی قومی سرمایہ یا پبلک پراپرٹی نہیں ہے۔ اس کی تحریروں کے حسن و قبح پر اظہارِ رائے کی آزادی ہر شخص کو ہے لیکن اس کی شخصیت کو مطعون کرنا ایک اخلاقی جُرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں ایک ادیب کو وہی حقوق یا اخلاقی تحفظ حاصل ہونا چاہیے جو ایک عام شہری کو حاصل ہے۔ ادیب اپنی تخلیقات سے تہذیب تمدّن میں بہ حدِ علم کچھ اضافہ ہی کرتا ہے۔ یہ خدمت اس کے لیے ایک مصیبت نہیں بننی چاہیے۔ اس لیے شخصیت نگاری کے لیے تنقیص نگاری ضروری نہیں۔

ایک اور مشکل مقام وہاں آتا ہے جب شخصیت نگار محض فقرہ بازی کے سہارے اپنی تحریر

کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ فقرہ بازی شعر میں اکثر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بے تکلّف صحبت کے لیے بھی اچھی چیز ہے۔ دوسرے درجے کی مزاح نگاری میں بھی کام آتی ہے لیکن اگر اس کی عادت پڑ جائے تو پھر مشکل سے چھوٹتی ہے۔ اکثر اچھے پڑھے لکھے اہلِ قلم کو فقرہ بازی کی عادت ہوئی اور بہت جلد ان کی نگارشات کی نمو، اس عادت کی نذر ہوگئی۔ یہ دور افکارِ تازہ کا دور ہے محض خوبصورت الفاظ کا دور نہیں۔ اس دور کے اہلِ نظر آسکر وائیلڈ کی فقرہ بازی کو (اس کے علمی تبحر اور اعلیٰ درجہ کی تہذیبی تربیت کے باوجود) زیادہ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اچھے الفاظ اور فقرے تازہ خوبصورت افکار کے اظہار میں مدد دیں تو مناسب ہے۔ خوبصورت الفاظ اور خوبصورت فقروں کی بذاتِ خود زیادہ قدر و قیمت نہیں رہی۔

طفیل صاحب کی تحریریں پڑھ کر (اور ان سے مل کر) سب سے پہلا تاثر جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ انھیں اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے، ان کی طبیعت میں انکسار ہے۔ وہ ہر شخص سے سیکھنا جانتے ہیں، سکھانا نہیں چاہتے۔ یہ انداز حقیقی طالبِ علم کا انداز ہے۔ یہ وہ انداز ہے جو بعض اوقات تحصیلِ علم کی کئی منازل طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ طفیل صاحب سے کوئی اختلاف کرے تو یہ سُن کر اپنے نظریے پر نظرِ ثانی کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کسی واہمہ (COMPLEX) کا شکار نہ ہو کوئی ان کی کامیابی سے جل کر بدتمیزی بھی کرے تو یہ جواب میں بدتمیزی نہیں کرتے (یوں میرا خیال ہے کہ اگر چاہیں تو خاصی "بدتمیزی" کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں) طفیل صاحب کی منکسر مزاجی نے انھیں شخصیت نگاری کے کئی سخت مقامات سے آسان گزرنے میں مدد دی ہے۔

ایک مؤقر اور مقبول ادبی پرچے کی ادارت کی وجہ سے طفیل صاحب کو اُردو کی کئی مشہور شخصیتوں سے مراسلت اور ملاقات کا موقع ملا۔ یہ بذاتِ خود ایک اعزاز ہے۔ طفیل صاحب ان شخصیتوں کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے متاثر ہوئے۔ ان تاثرات کو انھوں نے مضامین کے تین مجموعوں "صاحب"، "جناب" اور "آپ" میں بیان کیا ہے۔ "صاحب" میں اُردو ادب کی سات بڑی شخصیتوں منٹو، احمد ندیم قاسمی، شوکت تھانوی، جگر، فراق اور احسان دانش پر مضامین شامل ہیں۔ "جناب" میں اکیس ادیبوں پر مضامین اور خاکے ہیں۔ ان میں مولوی عبدالحق، پطرس، قاضی عبدالغفار، حمید احمد خاں، قدرت اللہ شہاب اور خود مصنّف پر ایک مضمون شامل ہے۔ "آپ"۔ نیاز، اختر، جوش اور کرشن چندر پر مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان تینوں کتابوں میں بعض مضامین مفصّل ہیں اور

بیس پچیس صفحوں پر محیط ہیں، اور بعض دو تین صفحوں کے خاکے ہیں لیکن ہر مضمون اور خاکے میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ دلچسپ ہیں اور معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ تحریروں میں انتہائی سادگی اور پرکاری نظر آتی ہے، جسے ظرافت اور شوخی نے اور دل آویز اور دلنشیں بنا دیا ہے۔ تحریر میں بلا کی روانی ہے کہیں ابہام یا اشکال نہیں۔

بعض مقامات پر ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جن سے مصنف کی دُور بینی اور وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً "آپ" میں طفیل صاحب اور شاہد احمد دہلوی مرحوم کے درمیان خط و کتابت بہت اہم ہے۔ اس سے موجودہ دور کی ادبی فضا کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور جوش نمبر کے ناخوش گوار واقعہ میں طفیل صاحب نے جو کردار ادا کیا ہے اُن حضرات کے لیے قابل تقلید ہے جو ادبی زندگی میں اعلیٰ روایات قائم کرنے کے حق میں ہیں۔

طفیل صاحب نے جن شخصیتوں پر قلم اُٹھایا، اُن کی عظمت کے بیان میں اُنھوں نے ان شخصیتوں کو فوٹو گرافر کی نظر سے نہیں مصوّر کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس لیے ان کی تصویروں میں ان شخصیتوں کے خد و خال نظر آتے ہیں جو فن کے نقطۂ نظر سے خوب صورت اور اہم ہیں۔ وہ کبھی شخصیت کے بارے میں خود اظہارِ خیال کرتے ہیں اور کبھی محض ایسے واقعات بیان کر دیتے ہیں جو خود انسان کے کردار کی نہایت جامع تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ شخصیت نگاری کے لیے یہ دونوں انداز بیان ضروری ہیں، مگر یہ انداز اس سے پہلے کسی نے اختیار نہیں کیا تھا۔ یہ اختراع انھی کی ہے۔

طفیل صاحب کے مضامین اور خاکے محض تفنّنِ طبع کی ضرورت کو پورا نہیں کرتے، یہ ادبی تاریخ کا وہ مواد پیش کرتے ہیں جو کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس نقطۂ نظر سے شخصیت نگاری ادبی تاریخ کا نہایت اہم اساس بن سکتی ہے۔ ہم اس قدر تساہل پسند واقع ہوئے ہیں کہ ابھی تک اُردو ادب کی کوئی ایسی جامع تاریخ شائع نہیں ہو سکی جس میں بیسویں صدی کی اہم ادبی شخصیتوں کے حالات اور افادات کا بیان بھی شامل ہو۔ جب بھی یہ تاریخ لکھی جائے گی تو شخصیتوں سے متعلق مضامین اور خاکے اس تاریخ کا اہم مواد ہوں گے۔"

> افتخار صاحب، ضابطۂ اخلاق کی باتیں کرتے ہیں۔ کیا بھولے آدمی ہیں اس دَور میں تو بیٹا باپ کی عزت نہیں کرتا، لہٰذا ایک ہمعصر دوسرے کی عزت کیوں کرے؟ کلجگ ہے صاحب کلجگ، لیجیے اس ذکر کو ہیں چھوڑا۔ تفصیل میں قباحت ہے۔ قباحتوں سے دامن بچانا ہی چاہیے۔

یہاں اُس مردِ معقول کی رائے درج کرتا ہوں، جو اخلاقی قدروں کے علمبردار ہیں اور اسلام کا بھی جھنڈا تھامے ہوئے ہیں۔ میری مراد مولانا نعیم صدیقی سے ہے۔

"سچ مچ اس مرتبہ اپنی شامت "آپ" ہی آئی۔ جو کتابیں میں نے اپنے اظہارِ تاثر (نہ کہ تنقید) کے لیے رکھیں، ان میں سے تین[1] تو اوپر گذر چکی ہیں۔ اب چوتھی کتاب سامنے ہے "میرے لیے سب امتحان کے پرچے ہیں۔ اس چوتھی کتاب کا نام ہے "آپ" اور مصنف کا نام ہے محمد طفیل۔ پہلے کتاب پڑھی تو لطف اٹھایا۔ اب اظہارِ رائے کرنے کے لیے اسے لیا تو کبھی اِدھر سے اُلٹتا ہوں کبھی اُدھر سے، ایک صفحہ یہاں سے پرکھتا ہوں، ایک وہاں سے۔ ابھی نظر اس فقرے پر تھی، ابھی اُس پیراگراف پر۔

اصل مشکل یہ ہے کہ طفیل صاحب نے اسٹائل ہی ایسا اُلٹا نکالا ہے کہ کوئی سیدھی سی بات بنتی ہی نہیں، پہلے ذرا نام ہی ملاحظہ فرمائیے .... ایک نام تھا "جناب" ایک "صاحب" اب یہ "آپ" ہے۔ آگے چلیے تو اُوپر کی جانب "حضرت" اور "حضور" آئے گا اور نشیبی سمت میں "تم" اور "تُو"۔ دیکھیے، اب طفیل صاحب آئندہ کدھر کا رُخ کرتے ہیں؟

اس کتاب کا اصل زور نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی اور ضمناً شاہد احمد دہلوی پر صرف ہوا ہے۔ اختر اورینوی اور کرشن چندر کے مختصر خاکے تبدیلیٔ ذائقہ کے لیے ہیں۔ اوپر کے تینوں بزرگ جو اپنی منزل طے کر چکے، نہایت دلچسپ قسم کی شخصیتوں سے عبارت تھے۔ ان کی خوبیاں بھی عجب اور کمزوریاں بھی نرالی ...... اور ان کے لیے طفیل صاحب کا اندازِ بیاں بھی نادر قسم کا۔ یہ اندازِ بیاں نہ ہوتا تو ان حضرات پر لکھنا کوئی آسان کام تھا؟ اور کوئی کچھ لکھ بھی دیتا تو پڑھنا کارے دارد ہوتا۔" اور پڑھنے کے کچھ مریض پڑھ بھی لیتے تو تاثر خراب ہوتا اور حقائق نہ جانے کیا شکل اختیار کر جاتے۔ یہ بھی تو طفیل صاحب ہی کا کمال ہے کہ ان حضرات کے متعلق کفر و ایمان کی بحثیں تک چھیڑی ہیں، مگر کیا مجال کہ کفر و ایمان میں کوئی کھینچا تانی پیدا ہو کبھی کفر ایمان بن جاتا ہے اور کبھی ایمان کفر دکھائی دینے لگتا ہے۔ کیا تماشہ ہے کہ جوش منکرِ خدا بھی تھے اور خدا کے قائل بھی۔ نیاز مذہب کے علمبردار بھی تھے اور مخالفِ مذہب بھی۔ جوش

---

[1] اس سے پہلے تین اور کتابوں پر تبصرہ درج تھا۔

اور نیاز میں اختلاف بھی شدید تھا، پھر ذہنی یکسانی بھی کمال درجے کی۔ لیکن شخصیتوں کا رنگ اپنا اپنا، جوش اور نیاز اور شاہد تو بہر حال جو کچھ تھے، تھے ہی۔ خود طفیل صاحب یہاں ایڈیٹر "نقوش" نہیں لگتے، اچھے خاصے ادبی شعبدہ باز دکھائی دیتے ہیں۔ ابھی رومال ہلایا تو وہ پھر سے کبوتر بن کے اڑ گیا۔ کبوتر کو تھیلے میں ڈالا تو چمگادڑ نکلی، چمگادڑ نے پرواز کی تو چھنا چھن روپے گرنے لگے۔ روپے سمیٹ کر جھولی بھر لی گئی تو دوتانیئے میں وہ گلاب کے پھول تھے۔ ہلکے پھلکے لطیف ادب کی شان یہی ہوتی ہے اور اس شان کو شخصیتوں کے خاکوں یا ان کی باتوں میں برقرار رکھنا جادو کے قلم کے بغیر ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے کہ طفیل صاحب کا قلم جادو کا قلم ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ طفیل صاحب قاری کو ساتھ ساتھ لے کر چل رہے ہیں اور ان محفلوں اور گفتگوؤں میں شریک کر دیتے ہیں جن کے تذکرے پر کتاب مشتمل ہے۔"

نعیم صدیقی

ایسی کتابیں کبھی تبصروں کی متحمل ہوا کرتی ہیں! بس یہی فقرہ میرا تبصرہ ہے۔
میں نیاز صاحب اور جوش صاحب کے مذہبی عقائد پر نہ لکھتا، مگر لکھنا پڑا۔
اس لیے کہ ان کے مذہبی عقائد پر کچھ کہے بغیر گزرنا مشکل تھا۔ یہ مرحلے میرے
لیے کتنے مشکل تھے، میں جانتا ہوں۔ مولانا ماجد جز بز ہوئے، مولانا صدیقی
لطف اندوز ہوئے۔ میری تحریر سے نہیں، پینترے بازی سے!
اب میں یہاں آل احمد صاحب سرور کا ایک خط درج کرتا ہوں۔

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

وہ بھی وضع دار، میں بھی وضع دار:۔

مجتبیٰ طفیل صاحب!

آپ کا شکایت نامہ "نقوش" کا تازہ شمارہ اور آپ کی نئی کتاب "آپ" تینوں ملے۔ چنانچہ تینوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

"آپ" کے متعلق علحدہ تبصرہ لکھوں گا۔ اس میں دو مضمون آمد اور دو آورد کے تحت آتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ دونوں بھی آپ کی اس کوچے میں پختگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مجھے واقعی اس کا احساس ہے کہ آپ کو اب تک کوئی مضمون نہیں بھیج سکا۔ اب وعدہ نہ کروں گا۔ ہاں مضمون پہنچے گا۔

آپ کی وضع داری کا قائل ہوں کہ میری غفلت کے باوجود آپ کی محبت بدستور ہے۔ ایسے

ہی لوگوں کی وجہ سے دُنیا اب بھی رہنے کے قابل ہے۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

مخلص

پروفیسر آل احمد سرور

سرور صاحب مضمون لکھ کر نہیں دیتے۔ سرٹیفکیٹ دیتے ہیں۔ وہ بے شک مجھے سرٹیفکیٹ نہ دیں، مضمون لکھ کر دیں۔ میں خوش ہو جاؤں۔ سرٹیفکیٹ سے میری انا کو تسکین ملے گی، مضمون سے دوسروں کو فائدہ پہنچے گا۔

اب میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا مضمونچہ درج کرتا ہوں۔ ویسے یہ ہے تو خط، مگر "فنی نقطۂ نظر" سے خط کی حدود سے نکل گیا ہے۔ بہر حال ہے خوب!

طفیل صاحب! مجھ پر ایک انکشاف ہوا ہے جی چاہتا ہے کہ آپ کو بھی اُس سے مطلع کر دوں۔ اُردو میں اوّل درجہ کے خاکوں کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی ہے لیکن فنِ خاکہ نگاری میں صرف دو حضرات ایسے ہیں۔ جن کا اپنا اسٹائیل ہے اور جو صرف اندازِ قدسے پہچانے جاتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی اور آپ ۔ شاہد صاحب کو دلّی کے روزمرہ، محاوروں اور کہاوتوں پر قدرت حاصل ہے۔ اس میدان میں اُن کے حریف تو ہیں لیکن مقابلے کا کوئی نہیں۔ آپ کے اندازِ بیان کی اگر خصوصیات بیان کرنی پڑیں تو مشکل ہو جائے۔ اس میں حسینوں کی وہ سینکڑوں ادائیں ہیں جن میں بیشتر بے نام ہوتی ہیں۔ سادگی ایسی جس پر سینکڑوں بناوٹیں اور ہنرمندیاں قربان۔ شاہد صاحب لڑتے ہیں تو تلوار ہاتھ میں لے کر لیکن آپ کی تو سادگی ہی جان پہ بنا دیتی ہے۔ کہیں کہیں بے تکلف اور انتہائی برجستہ محاورے چھوٹے چھوٹے فقرے، کبھی گفتگو اور کبھی خود کلامی کا سا انداز اور باقی تمام وہ خصوصیات جن کو نام دینا مشکل ہے۔ سب مل کر ایسا جادو جگاتے ہیں کہ قاری اپنے دل و دماغ کی باگیں آپ کے ہاتھ میں دیے رہتا ہے۔

اگر مصنف اپنی کتاب بھیجتا ہے تو لوگ کئی طریقے اپناتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دو چار صفحے اِدھر اُدھر سے دیکھے اور مخصوص عبارت میں تعریفوں کا پشتارہ باندھ کے بھیج دیا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کتاب کا شکریہ ادا کر دیا اور لکھ دیا کہ کتاب کے پڑھنے پر اپنی رائے سے مطلع کروں گا۔ اور چونکہ کتاب پڑھنے کی کبھی نوبت نہیں آتی اس لیے "قیمتی رائے" بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور تیسرا طریقہ وہ ہے جو میں آج اپنانا چاہتا ہوں۔ یعنی ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ کے بارے میں جو میرے تاثرات

ہیں، اُن سے آپ کو بھی آگاہ کر دوں۔ میں آپ کا خورد ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک اعلیٰ ظرف بزرگ کی حیثیت سے آپ میری گستاخی کی حد تک بے تکلفی کو معاف کر دیں گے۔

آپ نے شاہد صاحب کے نام خط میں خاکوں کی جو تقسیم کی ہے وہ انتہائی معقول ہے اور مجھے بہت پسند آئی۔ آپ ہی کی تقسیم کے مطابق جوش اور نیاز کے خاکے فن کارانہ، اختر اور رینوی کا خاکہ سوانحی، توصیفی، اور دوستانہ اور کرشن چندر کا محض توصیفی ہے۔ نیاز اور جوش کے خاکوں میں اُن کی پوری شخصیت اُبھر آئی ہے۔ یہ دونوں انسان اور عظیم انسان نظر آتے ہیں۔ آپ نے ان دونوں کی خوبیاں اور انسانی کمزوریاں بہت ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہیں۔ بعض انتہائی نازک مسئلوں کی تلخی کو محض اندازِ بیان سے دور کر دیا ہے۔ مثلاً نیاز کے خاکے میں عائشہ خان کا معاملہ۔ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اب تصویر کے ذرا دوسرے رُخ پر آئیے۔ میری سمجھ میں ایک بات بالکل نہیں آتی کہ اگر کوئی شخص خدا کے وجود سے منکر ہے تو ہم کیوں کھینچ تان کر اُس کی تحریر و گفتگو کے بعض حصّوں سے یہ ثابت کریں کہ ؎

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

نیاز صاحب جب پاکستان جانے کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے تھے، مَیں نے انھیں اور چند دوستوں کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ اس موقع پر ہمارے ایک دوست نے جان بوجھ کر نیاز صاحب سے خدا کے وجود پر سوال کیا۔ نیاز صاحب اس موضوع پر آدھ گھنٹہ بولے تھے۔ اور تمام گفتگو کا نچوڑ یہ تھا کہ خدا انسان کی تخلیق ہے۔ یہی حال جوش کا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمام شیعہ دہریے امام حسن و حسین اور میر انیس مرثیہ گو کی مدح کرتے ہیں تو اس سے اُن کا مسلمان ہونا ثابت نہیں۔ خدا اس کے رسولؐ اور قرآن پر ایمان لانا بنیادی چیز ہے۔ میں جب اتنی گستاخی کر چکا ہوں تو تھوڑی سی اور۔ نیاز اور جوش دونوں نے صرف پیسے کی خاطر ہم کو یعنی ۶ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو دھوکا دیا ہے اور ہندوستان کے باقی مذاہب کے لوگوں کی نظر میں ہمیں ذلیل و خوار کیا ہے۔ جوش پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد پھر ہندوستان تشریف لائے تھے، یہاں آکر اُنھوں نے کوشش کی تھی کہ اُنھیں ہندوستانی شہری کی حیثیت سے پھر قبول کر لیا جائے۔ چونکہ ان کا اعتبار اُٹھ چکا تھا، اس لیے اب یہ ممکن نہیں تھا۔ ان حضرات کی شخصیت کا کمزور ترین پہلو یہی ہے۔ آپ نیاز صاحب کے خاکے میں یہ بات صاف اُڑا گئے۔ اور جوش صاحب کے متعلق بیان کیا تو ہاتھ پاؤں بچا کر۔ مستقبل کا ادبی مورخ اس معاملے میں ان دونوں کو معاف نہیں کرے گا۔

بعد کے دونوں خاکوں میں مولوی مدن جیسی بات نہیں۔ اگر آپ خود اعتراف نہ کرتے تب بھی معلوم ہو جاتا کہ زبردستی لکھوائے گئے ہیں۔ اختر صاحب کے خاکے کے بارے میں ایک خاص بات ضرور ہے۔ عام طور پر سوانحی خاکے غیر دلچسپ ہوتے ہیں، لیکن آپ نے جہاں کہیں اختر صاحب کی زندگی سے متعلق حقائق بیان کیے ہیں اتنے دلچسپ اور پُر لطف طریقے سے کہ ہرگز طبیعت پر بار نہیں ہوتے۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے جشنِ فراقؔ منایا تھا۔ اس موقع پر فراقؔ پر مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا تھا۔ وہ مجموعہ اور اپنی ایک کتاب "مرزا محمد رفیع سودا" آج ڈاک سے ارسالِ خدمت کر چکا ہوں۔ وصولیابی سے ضرور مطلع فرما دیجئے۔

اگر میری کوئی بات ناگوار گزری ہو، تو معاف کر دیجیے۔

آپ کا

خلیق انجم ۲۲/۷/۶۷

"ڈاکٹر خلیق انجم نے کچھ ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں، جو نہ لکھتے تو اچھا تھا۔ اس لیے کہ میں بھی تو بعض اوقات اپنے سرکش قلم کو روکتا ہوں۔ میں مصلحت کا تو قائل نہیں، مگر "فسادِ خلق" کا لحاظ ضرور رکھتا ہوں۔ میرے نزدیک بعض باتیں دانستہ نظر انداز کر دینے والی ہوتی ہیں، "ڈاکٹر صاحب اس کے قائل نہیں۔ باتیں ڈاکٹر صاحب کی بھی معقول ہیں اور قابلِ توجہ!

اب میں عبدالمغنی صاحب کی رائے درج کرتا ہوں۔ میں ان کی تحریروں سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ کئی دفعہ میں نے اُن کے نام کے ساتھ لفظ "ڈاکٹر" کا بھی اضافہ کر دیا۔ یہ بیچارے ہیں "ڈاکٹر" نہیں ہوں، میں لکھتا پینترے تو آپ کے سارے ڈاکٹروں والے ہیں، بہرحال:-

محترم و مکرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

معاف کیجیے گا کہ "آپ" کی رسید بہت تاخیر سے دے رہا ہوں۔ ادھر کچھ ایسے مشاغل رہے کہ برابر یاد کرنے کے باوجود آپ کو لکھنے کا موقع نہیں نکال سکا۔ بہرحال، "آپ" کے لیے واقعی مشکور ہوں۔ "آپ" (اور اس سے پہلے "صاحب" اور "جناب") کا عنوان ہی ایک جدت اور تازہ کاری ہے اس سے ہی آپ کی انشا کے مخصوص بے تکلفانہ انداز کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ طرزِ بیان بالکل آپ کا اپنا ہے اور اس سے ایک منفرد اندازِ نظر بھی مترشح ہوتا ہے۔ کہنے کو تو آپ کے یہ مضامین شخصی خاکے ہیں، لیکن خاکوں کی عام ہیئت کی بہ نسبت ان کے اندر زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔ آپ ایک شخص کی خاکہ نگاری کرتے ہوئے اس کے فن اور فکر پر تنقید بھی کر دیتے ہیں۔ اس طرح خاکہ مقابلے کے بعض اطوار کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے، اور شخصیت کی بھرپور جسمانی و روحانی تصویر اُبھر آتی ہے۔

ان خاکوں کے متعلق مجھے ایک ایسی بات بھی کہنی ہے جو شاید آپ کے لیے انکشاف ہو۔ وہ یہ کہ گرچہ آپ اپنے کو بہت سادہ سمجھتے ہیں، لیکن درحقیقت نہایت پُرکار ہیں۔ "آپ" میں شامل تمام ہی خاکوں میں مجھے محسوس ہوا کہ آپ جب ایک شخص کے ایک پہلو کے متعلق کچھ کھری کھری باتیں کہہ چکتے ہیں تو فوراً ہی بات پلٹنے کے لیے اس کے بالکل دوسرے پہلو کا ذکر اسی کھرے انداز میں شروع کر دیتے ہیں اور یہ تبدیلی کچھ ایسی معصومیت سے ہوتی ہے کہ بات بالکل برابر ہو کر پورا معاملہ گول ہو جاتا ہے۔ شاید آپ کو اپنے کھرے پن سے خود ہی ڈر لگتا ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے "پتہ نہیں لوگ کیا سمجھیں، خواہ مخواہ کیوں کسی کو ناراض کیا جائے؟"

بہرحال، آپ کی اس بے خودی و ہشیاری نے آپ کے خاکوں کو بہت ہی دلچسپ بنا دیا ہے بلکہ ان کے اندر ایک ادائے محبوبی، ایک عشوہ طرازی پیدا کر دی ہے۔

رسید سے مطلع کر سکیں تو اچھا ہو۔ والسلام

عبدالمغنی

عبدالمغنی صاحب کی رائے آپ نے پڑھ لی۔ اب ڈاکٹر محمد عقیل صاحب کی تفصیلی رائے درج کرتا ہوں۔ اس میں بھی دو چار سخت مقام آتے ہیں۔

یہ لوگ اگر دن کو دن کہتے ہیں تو میں کیسے دن کو رات بنا دوں؟ یہ جادو تو محمد حسین آزاد کے پاس تھا، اپن کے پاس نہیں!

جس نے بھی "نقوش" لاہور کے موٹے تازے نمبروں کی کبھی بھی ایک جھلک دیکھی ہوگی، وہ محمد طفیل صاحب اور اُن کی ادبی صلاحیتوں سے ضرور باخبر ہوگا۔ اس کتاب "آپ" کے مصنف بھی محمد طفیل صاحب ہیں۔ "آپ" چار ادبی شخصیتوں کا مطالعہ ہے۔ (۱) نیاز فتح پوری (۲) جوش ملیح آبادی (۳) اختر اورینوی (۴) کرشن چندر۔

شخصیتوں کا مطالعہ کرنا اور اُن کو انھی کی زندگی میں ضبطِ تحریر میں لانا "آ بیل مجھے مار"

سے کم نہیں ہوا کرتا۔ مصنف اگر واقعی اُن تاثرات کو قلم بند کرتا ہے جن کا مطالعہ اُس نے شخص مذکور میں، اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے اپنی پہنچ اور سمجھ کے مطابق کیا ہے، تو یہ ہرگز ممکن نہیں کہ مصنف کے شخصی تاثرات کی جھلک اس مطالعے میں نہ ملے۔ پھر آخر سب انسان ایک ہی طرح تو نہیں سوچ سکتے۔ کچھ صرف ظاہری شکل و صورت سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ کچھ دروں بیں اکس رے کی نظریں ڈال کر شخصیتوں کے ضمیر کو کھنگال کر اُس جوہر قابل کو باہر لانا چاہتے ہیں جس پر عام نظریں نہیں پڑتیں۔ بس یہی کوشش خطرناک ہوتی ہے۔ جھگڑوں اور اختلافات کے دروازے یہیں سے کھلتے ہیں کیونکہ شخصیتیں وہ سب کچھ ہرگز نہیں ہوا کرتیں جو باہر سے دکھائی پڑتی ہیں۔ پھر سب کو فرشتہ سیرت سمجھنا اور ثابت کرنا مکمل شخصی مطالعہ نہیں ہو سکتا۔ اور دُنیا میں ایسے کھرے لوگ کم ہوتے ہیں جو اپنی خوبیوں اور خرابیوں سب سے آگاہ ہوں۔ شاید انسان کا اصلی روپ وہی ہے جس سے اس کے گرد و پیش کے انسان آگاہ ہوں۔ دُور رہنے والے بھی اور قریب رہتے والے بھی۔ اس کا وہ روپ ہرگز نہیں جو وہ اپنی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لیے جب یہ نزدیک و دور رہنے والے کسی شخصیت کو اپنے ذاتی تاثرات سے آگاہ کرتے ہیں تو حقیقت بڑی کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ خوش خیالی اور غلط فہمی کا پردہ چاک ہو جایا کرتا ہے اور نتیجے کے طور پر شخصیت کا مطالعہ کرنے والا دوست کم رہ جاتا ہے اور دشمن زیادہ نظر آنے لگتا ہے۔ پھر یہیں سے کانا پھوسی کی سرحدیں بھی شروع ہوتی ہیں کہ فلاں خاکہ جان بوجھ کر ایسا لکھوایا گیا ہے یا فلاں مصنف نے فلاں واقعے کا یوں بدلا نکالا ہے۔ غرض کہ ہمارے یہاں شخصیتوں کا مطالعہ بڑی جان جوکھم کا کام ہے۔ بقول جوش صاحب

اس راہ میں جو سر سے کفن باندھ لے وہ آئے

'آپ' میں جو مطالعہ طفیل صاحب نے پیش کیا ہے وہ ان تمام نزاکتوں سے باخبر ہو کر۔ نیاز صاحب، جوش صاحب اور مرحوم شاہد احمد دہلوی کو ایک مرکز پر لے آنا اور پھر اُن تینوں کو اُلٹ ڈالنا جو ان عظیم ادبی شخصیتوں کے اندرون پر پردہ ڈالے ہیں کوئی آسان کام نہیں۔ طفیل صاحب نے سب کی خوبیاں بھی بیان کر دیں اور اُن کے مطالعے میں جو لغزشیں آئیں، اُن کا بھی ذکر کر دیا۔ اور اُن کی دیانت داری اسی سے ثابت ہوتی ہے کہ کہیں بکر و ریا یا معاندانہ انداز کی جھلک عام پڑھنے والے کو نہیں ملتی۔ گویا اُن کا قلم کیمرہ کی آنکھ ہے کہ جو کچھ دیکھتا ہے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے لیکن بعد کو اپنی تحریر کا جادو جگا کر ان فلموں کو ٹیکنی کلر کے رنگوں میں ڈبو کر آپ کے

سامنے پیش کر دیتا ہے تاکہ مطالعے میں رنگوں کے سبب سے دلچسپی اور بڑھ جائے۔ ان کا حُسن اور نکھر جائے اور جو کچھ ندی نالے اور کھاپچے ہیں وہ نظر تو آتے رہیں لیکن رنگ آمیزی کے سبب تکدّر پیدا نہ ہو سکے۔ یہی بات ایمانداری اور دیانت بھی بنتی ہے اور بد بیں کی نظر میں بے ایمانی بھی۔

"آپ" کے تمام مطالعوں میں نیاز صاحب کا مطالعہ سب سے بھرپور ہے۔ ان کا ادبی مزاج، ان کی ہمہ جہتی صلاحیتیں، ان کی پٹھانیت، انگریزی تعلیم کے نامکمل ہونے کے باعث احساس کمتری سے احساس برتری کا اُبھرنا اور پھر ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا، کو افسانہ، ناول، تنقید، مذہبیات، جنسیات، فراست الید، تاریخ اور دوسرے علوم پر محاکمہ کرکے صحیح ثابت کرنے کی کوشش۔ جوش صاحب پر درویش میرٹھی کے نام سے تنقید کرنا (حالانکہ طفیل صاحب نے یہ نام کہیں نہیں لیا) نجی اختلافات کو ادبی میدان میں گھسیٹ لانے کی مہارت، قمر زمانی کے قصّے، نئے ادیبوں کو آگے بڑھنے کی ترغیب دینا ان باتوں کا دلچسپ بیان اس کتاب میں موجود ہے۔ واقعی میں جب کبھی نیاز صاحب کو سوچتا ہوں تو میرے سامنے ان کی شخصیت میتھو آرنلڈ اور ٹی۔ ایس ایلیٹ بن کر اُبھرتی ہے جو ایک ہی وقت میں شاعر، تنقید نگار، ڈرامہ نگار اور بہت سی صلاحیتوں کے مالک تھے، اُردو ادب کی تاریخ میں ایسے باکمال کم ہوں گے۔ نیاز میں بہت سی خامیاں بھی تھیں۔ "نگار" کے خدا نمبر اور محمد اسحاق صدیقی کا قضیہ اگر قارئین کی نظر میں ہو تو شاید وہ نیاز صاحب کا ایک اور ادبی رُخ دیکھ سکتے ہیں۔ "ترغیبات جنسی" بھی ایسی پرچھائیوں سے خالی نہیں۔ لیکن ان باتوں کو نیاز صاحب کی مجبوری پر دلیل نہیں بنایا جا سکتا بلکہ اسے صرف اُن کا تساہل سمجھنا چاہیئے۔ جوش صاحب پر حملے، چاند پر خاک ڈالنے، سے زیادہ دقیع نہ تھے۔ نیاز صاحب خود بھی اس بات سے باخبر تھے لیکن یہ سب اس لیے تھا کہ جوش صاحب یہ نہ سمجھیں کہ اُن سے زبان و بیان کی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لیے وہ جوش صاحب کی ایسی غلطیاں، محاوروں کا توڑ مروڑ، عروض کے نکات، ان سب چیزوں کو ڈھونڈ کر نکالتے اور 'نگار' میں فرضی ناموں سے چھاپتے۔ پھر زبان و بیان، تاریخ اور وقت کے سماجی تقاضوں کے ساتھ بدلتے بھی تو رہتے ہیں۔ آج جوش صاحب "پان لگانا" غلط سمجھتے ہیں کیوں کہ اُن کے ابا جان نے ایک مرتبہ "پان لگاؤں" کہنے پر انگارہ ہاتھ پر رکھ دیا تھا لیکن نواب مرزا شوق نے جب ۱۸۶۲ء میں زہرِ عشق لکھی تو شعر کہا ہے

یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں
پان کل کے لیے لگاتے جائیں

اور ظاہر ہے کہ نواب مرزا شوقؔ زبان اور لکھنؤ کے محاورات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے!

جوشؔ صاحب کا مطالعہ اگر شاہد احمد دہلوی کے قضیے کے وقت نہ کیا گیا ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ شاخسانہ ایک وقتی سی چیز تھا لیکن طفیل صاحب کے اس مطالعے میں یہی شاخسانہ پورے بیان پر حاوی ہو جاتا ہے اور چوں کہ طفیل صاحب بھی اس لپیٹ میں آ گئے تھے، اس لیے توازن قائم نہیں رہ جاتا، خطوط کا مثلث، ہی آخری تاثر چھوڑتا ہے، جس میں شاہد احمد دہلوی کی تصویر بہت مکروہ ہو کر ابھرتی ہے۔ میں نے شاہد احمد کا وہ مضمون پڑھا تھا جو انھوں نے جوشؔ صاحب پر لکھا تھا جس میں واقعی جوشؔ صاحب پر کیچڑ اچھالنے کی نامناسب کوشش کی گئی تھی اور جوشؔ صاحب کا جواب بھی "بہ فرقِ شاہد باز"۔ مگر ان واقعات کو میں بالکل وقتی سمجھتا ہوں جنھیں شاید نہ معرکۂ شررؔ و چکبستؔ کی اہمیت حاصل ہو گی اور نہ انشاؔ و مصحفیؔ کے جھگڑوں کی۔ "آپ" میں شاہد احمد دہلوی کا مطالعہ الگ سے نہیں کیا گیا لیکن طفیل صاحب نے اُن کے جو خطوط جوشؔ صاحب کے سلسلے کے پیش کیے ہیں ان سے تصویر کے اندر ایک اور تصویر بن گئی ہے[1]

کرشن چندر کا مطالعہ اس کتاب میں بہت سرسری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی عجلت کے باعث ایسا ہو گیا ہو۔ اس میں کرشن چندر کی تصویر کا کوئی رُخ اچھی طرح واضح نہیں ہو پاتا اور جس کا اعتراف خود مصنف نے "تمہیدیہ" میں کر لیا ہے۔

اب اس کتاب کے بارے میں زبان و بیان کی ایک منزل اور رہ جاتی ہے طفیل صاحب کا قلم واقعی جادو بیان ہے اور سیرتوں کے مطالعے کا انھیں ڈھنگ آتا ہے جس میں شخصی مخاصمت یا موانست ہرگز حاوی نہیں ہو پاتی۔ بیانات ایسے دلچسپ کہ بس پڑھتے رہیے۔

کتابت کی غلطیوں سے اُردو کو چھٹکارا کم ہی مل پاتا ہے چنانچہ "آپ" میں بھی چند ایک غلطیاں موجود ہیں مگر ایسی دلچسپ لکھی ہوئی کتاب میں ایسی فروگذاشتیں اس طرح بہہ جاتی

---

[1] یہ خطوط خود شاہد صاحب نے ساقی کے جوش نمبر میں پیش کیے تھے

ہیں جیسے تیز دھارے کے ساتھ خس و خاشاک اور آخر میں طفیل، نقوش اور آپ، ایک سنگِ میل کی طرح اپنی جگہ پر جمے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سید محمد عقیل

ڈاکٹر خلیق انجم کو بھی یہ غصّہ تھا کہ نیاز صاحب اور جوش صاحب نے ہندوستان کے باسیوں سے زیادتی کی۔ ڈاکٹر محمد عقیل صاحب کا بھی خیال یہی ہے جہاں تک نیاز صاحب اور جوش صاحب کے پاکستان آنے کا تعلق ہے، میرا بھی خیال ہے کہ اُنھوں نے زیادتی کی تھی، اپنے ساتھ بھی، اوروں کے ساتھ بھی۔ مگر ڈاکٹر محمد عقیل صاحب نے، نیاز صاحب کے بارے میں وہ باتیں زیادہ وضاحت سے کہہ دی ہیں، جنھیں میں نے اشارۃً بیان کیا تھا۔

اب میں احمد جمال پاشا کی رائے درج کرتا ہوں۔ صاحب، یہ بھی بڑے مزاح نگار ہیں، کم از کم ہم چشموں میں تو بڑا رعب گانٹھ رکھا ہے رُعب تو مجھ پر بھی ہے، مگر گھگھیانے کی حد تک نہیں۔

محمد نقوش!

حضرت سلامت، عرصہ بعد آپ کا "نقوش" ملا۔ پاکر خوشی اور دیکھ کر افسوس ہوا۔ خوشی اس لیے کہ آپ نے خیریت نہ بھیجی تھی۔ اس کو دیکھ کر کم از کم آپ کی خیریت کے بارے میں اطمینان سا ہو گیا۔ اور افسوس اس بات پر ہوا کہ اس کی بعض تخلیقات دوسرے رسائل و اخبارات میں پڑھ چکا تھا[1]۔ "نقوش" کی کم از کم اس روایت کو زندہ رہنا چاہیے کہ اس میں غیر مطبوعہ مواد ہو مشاہیر کو اگر آپ بھی قابو میں نہ کر سکے تو پھر کون ان جنّات کو تابع رکھ سکے گا، کیونکہ ہر حال میں "نقوش" "نقوش" ہی ہے اور رہنا بھی چاہیے۔ بہت عرصہ بعد ایک معرکے کی مزاحیہ (پیروڈی) لکھی ہے۔ "نقوش" کی نذر کا ارادہ ہے۔ آپ کو "مطبوعہ" بھیجوں یا غیر مطبوعہ۔؟ چھوٹتے ہی آمدم بر سرِ مطلب۔ دراصل میں آپ کو گلے لگانا چاہتا ہوں مگر افسوس کہ آپ

---

[1] گزارش کے باوجود بھارت کے بعض ادیب، اپنی وہی تخلیقات اپنے ہاں کے رسائل کو بھی بھیج دیتے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ وہ ایسا نہ کیا کریں، تاکہ اس قسم کی شکائتیں پیدا نہ ہوں۔ (ادارہ)

بہت دُور ہیں۔ آپ کی محبت کا تحفہ "آپ" ملی۔ بہت لُطف لے لے کر پڑھی، بے اختیار بار بار آپ کا ہاتھ چوم لینے کو جی چاہا۔ "صاحب" اور "جناب" کے بعد "آپ" لکھ کر آپ نے خاکہ نگاری کا فن بہت مشکل کر دیا۔ نیاز فتح پوری اور جوش ملیح آبادی پر آپ کے خاکے کس قدر پُرشکوہ، لازوال، عظیم اور دقیع ہیں۔ اس کے بیان کے لیے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ شاید ہی اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں اس سے بلند اور بہتر خاکے ملیں۔ کم از کم میری نظر میں نہیں۔ آپ نے شخصیت کے پیچ وخم کو جس طرح اُبھارا ہے، اپنے کرداروں کو شیطان، اللہ، فرشتے سے جتنا دُور رکھا اور انسانی خدوخال جس طور پر نمایاں کیے ہیں ان کی فن کارانہ چابکدستی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مگر آپ کھال ادھیڑنے کے فن میں بھی کم ماہر نہیں "کرشن چند" اور "اختر اورینوی" کے خاکے جس طور پر "آپ" نے پیش کر دیے ہیں شاید ان کی کوئی جھلک بھی نہ پیش کر سکے۔

"آپ" کو پڑھنے کے بعد مجھ پر ایک عجیب سرشاری کی کیفیت طاری ہوئی اور یقین ہو گیا کہ آپ مجھ سے بڑے طنز و مزاح نگار ہیں، مشتاق احمد یوسفی سے بھی بڑے ظرافت نگار ہیں۔ میں نے آپ کا نام مزاح نگاروں کی فہرست میں اس کے بعد بلا تکلف شامل کر لیا۔

بتائیے ان جملوں پر کون مزاح نگار نہ ہنسے گا:۔

"...... اور پھر سونے سے پہلے بیوی کو یقین دلاتے ہیں کہ میں صرف تیرا ہوں"۔
("آپ" ص ۴۶)

"ٹھیک! آپ کی شاگرد جو ہوئیں۔ مگر ایسے شاگرد کتنے خوش قسمت ہیں اور کتنے ہیں جو شاگرد ہو کر بالکل اُستاد نظر آتے ہوں"۔ ("آپ" ص ۵۴)

"...... اور بعض شخصیتیں تو بالکل پیاز ہوتی ہیں۔ چاہے جتنے غلاف اُتار ڈالیں، ہاتھ کچھ بھی نہ آئے گا"۔ ("آپ" ص ۶۱)

"یہ جو ایک رسالے کا جوش نمبر نکل رہا ہے وہ ان کے اسی شوق کے صدقے میں تو نکل رہا ہے"۔ ... ("آپ" ص ۶۴)

"اپنے اپنے ظرف کے مطابق سبھی نے ہاتھ بڑھا لیے جو میری طرح کے ازلی بزدل تھے وہ تشنہ لب رہے"۔ ("آپ" ص ۶۹)

"...... اللہ والے ہوں تو دو ایک ورق اُلٹ کر آگے چل دیں"۔ ("آپ" ص ۸۷)

"...... اس لیے ان کی کتنی ڈبنی رہتی ہے اور وہ شیرینی سے شیرینی تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔"
("آپ" ص ۹۲)

"...... نیاز صاحب نے جوش صاحب کے خلاف جتنے بھی حصار باندھے وہ ان کی شہرت کے سفینے کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔" ("آپ" ص ۱۱۱)

(کھوپڑیوں میں بچنہ عقل کا اکھوا پھوٹا۔ قلمی بندوق۔ ماتھے پہ تیوریاں ڈال کے سوچنوں گا۔ لیجیے صفحہ ختم ہو گیا۔ اُسترو ں کی مالا۔)

"اسی لیے تو آپ کو خطوں سے بہلا رہا ہوں تاکہ آپ کو میرے خلاف نمبر نکالنے کی ضرورت نہ پڑے اور یاد اللہ بھی باقی رہے۔" ("آپ" ص ۱۴۵)

"کہیں کہیں ایسا بھی معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ باتیں آپ نے دانت پیس کے لکھی ہوں۔"
(ص ۱۵۸)

"تاکہ اس گرمی کی وجہ سے میں کڑاہی میں دالنے کا کام دے سکوں۔" (ص ۱۶۵)

"آخر سالیوں نے منا لیا۔ جنوں کا سایہ تھا پریوں نے دُور کیا۔" (ص ۱۹۹)

غرض کہاں تک لطف لے لے کر بیان کیا جائے اور خط کو کہاں تک طول دیا جائے۔

جس جسارت، بے باکی، تہور اور ذہانت کا آپ نے خاکہ نگاری میں ثبوت دیا، اس کی اُردو خاکہ نگاری میں کوئی روایت نہیں ملتی۔ فنی نزاکتوں کو جس طور پر آپ نے برتا ہے شاید دوسرے اس کے بعد بھی نہ برت سکیں۔ "نقوش" ہی آپ کو ETERNAL بنانے کے لیے کیا کم تھا کہ آپ نے خاکہ نگاری کا بیڑہ اُٹھا کر اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں بھی مستقل ممتاز مقام حاصل کر لیا۔

خاکوں میں شگفتگی، مزاح، طنز اور رمز سے آپ نے جس طرح کام لیا ہے، غالباً یہ اپنی قسم کی پہلی مثال ہے مجھے اب یقین ہو گیا کہ آپ ادب اور زندگی کے جس کوچے میں بھی قدم رکھیں گے ضرور قیامت ڈھا دیں گے، اور زبان میں تو آپ نے لکھنو اور دہلی کے بھی کان کاٹ لیے قبلہ۔

بیگم سرور جمال سلام عرض کرتی ہیں۔

خاکسار
احمد جمال پاشا

۱؎ ص ۱۱۰ ۲؎ ص ۱۴۴ ۳؎ ص ۱۴۹ ۴؎ ص ۱۴۹ ۵؎ ص ۱۵۶

احمد جمال پاشا کی رائے آپ نے پڑھ لی۔ وفورِ شوق میں یہ بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ چونکہ یہ بنیادی طور پر مخلص آدمی ہیں۔ اس لیے "نعرے لگانے والوں" میں ان کی آواز سب سے بلند ہوگی۔ خدا انھیں خوش رکھے اور مجھے بھی اچھا لکھنے کی توفیق دے تاکہ ان کی کہی ہوئی باتیں کچھ تو سچ نکلیں۔

اب میں یہاں جوگندر پال صاحب کی رائے درج کرتا ہوں۔ یہ ایک کالج کے پرنسپل ہیں۔ مجھے ان کے افسانے بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں، (فن اور زبان کے اعتبار سے) شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں بھی میرے اسکیچ اچھے لگے۔ کوئی نہ کوئی قدرِ مشترک ضرور ہے، ورنہ میں آسانی سے ایمان والوں میں سے نہیں ہوں۔

برادرم، آداب و خلوص، آپ کی "آپ" ملی، پڑھی اور پڑھ کر نہایت محظوظ ہوا۔ آپ کی چٹھیوں کے مانند یہاں بھی آپ کا طرزِ تحریر یوں ہے کہ پانچ لفظوں سے بات بنتی ہے تو چھٹے کو مداخلت کی اجازت نہ دیں گے، اور کہ آپ کے چھوٹے چھوٹے جملے یوں صف آرا ہوتے ہیں کہ الفاظ ہجوم بن کر نظر نہیں آتے بلکہ مخصوص کیفیات کی تھاپ پر بڑے وقار و توق سے اپنی معنوی منزلوں کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اردو زبان کو حالیہ زندگی کی پہچان کی خاطر اپنے کردار کی یہی سائنسی شخصیت درکار ہے۔

آپ کے خاکوں کا یہ بھی ایک خاصہ ہے کہ انھیں پڑھ کر شخصیات سے جی بھر کے مل لینے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ آپ فل سائز فرنٹ پورٹریٹ پیش نہیں کرتے بلکہ اٹھتے بیٹھتے پروفائیل کے متحرک خطوط بناتے ہیں جن سے قاری کو آپ کے ماڈل کا قرب نصیب ہونے لگتا ہے۔ لہجے کی یہ غیر رسمی ادا بڑی پیاری ہے اور جدید خاکہ نویسی کی نشاندہی کرتی ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ اپنے ماڈل کو دیکھنے کے لیے آپ اپنا سر اوپر اٹھا اٹھا کر اپنی گردن ٹیڑھی نہیں کرتے، بلکہ اسی سطح پر اس کے عین سامنے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں اور آپ کے اس عمل سے ماڈل "بت" بننے سے بچ جاتا ہے۔

"آپ" میں نے اپنے کالج کی لائبریری میں رجسٹر کروا لی ہے تاکہ اور لوگ بھی پڑھ سکیں۔

بہترین خواہشات کے ساتھ، آپ کا: جوگندر پال

جوگندر پال صاحب نے اپنے خط میں، جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ بڑی حد تک، میرے سوچنے کا انداز ہے۔ مگر میں ابھی تک ایسی مشکلوں پر قابو نہیں پا سکا۔ کوشش ضرور جاری ہے۔ ہمالہ میرے سامنے ہے، سفر کا آغاز کر چکا ہوں۔ منزل نصیب میں ہے یا نہیں، کون جانے!

اب محترمہ حجاب امتیاز علی کا بھی ایک رقعہ ملاحظہ فرما لیجیے:۔

محترمی طفیل صاحب!

آپ کا آدمی ابھی پہنچا۔ کیونکہ عمر خیام کی طرح آپ کل کے تو قائل ہی نہیں۔ جو کچھ ہے آج ہے۔ تو حسب الحکم ایک کہانی اس آدمی کے ہاتھ بھیج رہی ہوں۔ اُمید تو یہی ہے کہ وہ آپ کے پاس پہنچا دے گا۔ یہ افسانہ موسمی ہے۔ آسمان کی طرف دیکھیے گھنگھور گھٹائیں، زمین کی طرف دیکھیے سہانا اندھیرا۔ ہاں دوسرا افسانہ بھیجنا تو بھول ہی گئی جو غیر موسمی ہے، ویسے غیر موسمی چیز ہمیشہ اہم سمجھی گئی ہے۔ اسے برف خانے میں رکھ رہی ہوں۔

میری تو آنکھیں کھل گئیں۔ اب معلوم ہوا کہ آپ واقعی بہت بڑے ادیب ہیں اور عظیم خاکہ نگار۔ کل شام مجھے آپ کی کتاب "آپ" ملی۔ آج صبح ارادہ تھا سرسری نظر ڈالوں گی۔ مگر کہاں۔ اسے ختم کر کے اُٹھنا پڑا۔ اب کہیں اپنی دوسری کتاب نہ بھیجیے، سارے ضروری کام رہ جائیں گے۔ واقعی آج مجھے بہت ضروری کام انجام دینے تھے مگر آپ کی کتاب نے بیکار بنا دیا۔ خاکہ نگاری ہو تو ایسی ہو۔

حجاب امتیاز علی

محترمہ حجاب امتیاز علی صاحبہ کی رائے پر آپ زیادہ دھیان نہ دیں۔ اس لیے کہ یہ میں نے زبردستی لکھوائی ہے۔ ٹیلی فون پر اُنھوں نے بتایا تھا کہ کتاب مجھے بہت پسند ہے۔ اس پر میں نے کہا، اپنی رائے لکھ کر دیجیے تاکہ بہ وقتِ ضرورت کام آئے۔ ان کی خدمت میں میری یہ فرمائش بالکل ویسی ہے جیسی کہ یہ "مجھے آم کھلائیے۔ مجھے کھانا کھلائیے!"

اب رام لعل صاحب کی باتیں سنیں، غور سے سنیے گا۔

برادرم طفیل صاحب، آداب

کل 'آپ' سے ملاقات ہوئی۔ 'آپ' کی وساطت سے نیاز، جوش اور کرشن چندر سے بھی ملاقات ہوگئی (اختر صاحب سے ملاقات آج کروں گا) نیاز اور جوش کو قریب سے دیکھنے کا مجھے بہت کم موقع ملا۔ ان کے بارے میں اوروں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن آپ نے جس بے ساختہ انداز میں لکھا ہے اس کی بات کچھ اور ہی ہے! پڑھنے والا کہیں رُکتا نہیں، مَیں نے کئی بار چاہا کہ اب کتاب ہاتھ سے رکھ دوں اور اطمینان سے کھانا کھا لوں یا سو جاؤں لیکن ایسا نہ کرسکا۔ راتوں کی نیند حرام کرنے والی 'کتاب' دراصل یہی ہے وہ نہیں ہیں جن کے بارے میں کبھی (کئی سال پہلے) اشتہار چھپا کرتے تھے۔ آپ کے ان خاکوں کو خاکے ہی کہا جا سکتا ہے۔ جو انشائیوں کے بہت قریب پہنچتے ہیں۔ شخصیت کی کئی گرہیں دھیرے دھیرے کھولتے ہیں، ساتھ ساتھ مصنف کو بھی بے نقاب (شاید روشناس!) کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں کہیں بھی خود پسندی نہیں ہے طفیل صاحب کی جگہ جگہ موجودگی (یا دخل اندازی) کے باوجود ایسا سوچنے کو جی نہیں چاہتا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ نقوش کی وجہ سے طفیل صاحب کی اپنی شخصیت بھی اتنی بھاری بھرکم، ہو چکی ہے کہ اب اُسے بھی قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کو جی چاہتا ہے۔

کرشن چندر سے میری کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں، خط و کتابت بھی رہتی ہے۔ اتنے بڑے (اُردو ادب میں تاریخی) فن کار کو بہت قریب سے ہر زاویئے سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ آپ نے جو کچھ خاکے کی صورت میں پیش کیا ہے وہ اپنے علم کے مقابلے میں بہت تشنہ معلوم ہوا۔ جیسے میں اس کے بارے میں اور بھی کچھ جانتا ہوں۔ یہ آواز بے اختیار دل سے اُٹھتی رہی ہے۔

کرشن چندر کے بارے میں آپ نے ایک ایسی بات بھی لکھی ہے جس سے میرے دل میں اختلاف پیدا ہوا ہے "کرشن چندر اپنے سابقہ دَور میں بھی افسانوی ادب کی قیادت کر رہے تھے اور موجودہ دَور میں بھی سب سے آگے آگے چل رہے ہیں!"

اس بات کے پہلے حصّے سے مجھے، رتی بھر اختلاف نہیں ہے لیکن دوسرے حصّے سے یقیناً ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے آپ ہی کا ایک اور جملہ پیش کرتا ہوں (کرشن چندر)۔ "وہ کسی ہمن اچھا نہیں لکھ دے!"

جب وہ اچھا نہیں لکھ رہے ہیں تو کیا دوسرے بالکل گھاس کاٹ رہے ہیں؟ کہ انکی

معمولی تحریریں بھی دوسرے لکھنے والوں سے بہتر معلوم ہوتی ہیں؟ یہ بات مَیں غصّے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ بہت سنجیدگی سے اور نرمی سے کہہ رہا ہوں (گھاس کاٹنے والی بات یقیناً بہت دیر سے بھی پوچھی جا سکتی ہے) آج ادب کے تقاضے بہت حد تک بدلے ہوئے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ آج نثر کو شاعری سے سجانے کا اِتنا رواج نہیں رہا۔ (خود آپ کی تحریر!) بات کو بس ایک سلیقے سے پیش کر دینے کا نام ہی افسانہ نگاری ہے (منٹو یہی کچھ کرتے رہے۔ وہ نادر قسم کی تشبیہہ (عورت اور کھنگار) پیش نہ کرتے تب بھی اتنے ہی پاپولر ہوتے جتنے کہ ہوئے)

اپنی بات کو طویل نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے اپنی بات منوانا نہیں ہے اس کی طرف دھیان دلانا ہی مقصود ہے۔

تو جناب، آپ نے یہ نئی کتاب بھیج کر مجھ پر بڑا کرم کیا۔ سچ! اس لیے کہ میں آپ کی بے ساختہ ہلکی پھلکی تحریر کا 'لوَر' ہوں۔ (یہاں میں نے لفظ عاشق کا استعمال کرنے سے عمداً گریز کیا ہے) نقوش (۱۰۷) بھی مل گیا تھا۔ حسبِ معمول 'وزنی' ہے۔ ہر دو لحاظ سے۔

میں گذشتہ ماہ سے بستر پر ہوں۔ بس کے ایک حادثے میں سر پر شدید چوٹ لگ گئی تھی۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر کو دعا دیتا ہوں کہ اُس نے مزید پندرہ دن پڑھنے کے لیے دے دیے ہیں۔ اس عرصے میں بہت کچھ مسلسل پڑھا ہے (نقوش کے کئی پرانے نمبر بھی) اور سوچا ہے اور اب لکھنا شروع کیا ہے۔ آپ کو بھی ایک کہانی بھیجنے کا پروگرام (یا یوجنا!) ہے۔ کوشش کروں گا کہ جلدی۔

گھٹیا اور اچھے ناولوں کے دَور میں پبلشرز نے میرے تین مجموعے افسانوں کے بھی شائع کر دیے ہیں۔ چراغوں کا سفر (مکتبہ جامعہ) انتظار کے قیدی (اسٹار پاکٹ بکس) اور کل کی بات (کتاب) اب یہ تینوں کتابیں ایک ساتھ بھجواؤں گا۔ میرے پاس بھی پہنچیں تو! کرشن چندر کے افسانوی مجموعے بھی بِک جاتے ہیں، بیدی کے بھی۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ میرے بھی (ورنہ ناشر کیوں چھاپتے ؟) اور مجھے یوں لگتا ہے افسانے کا دَور (زرّیں دَور۔ مولانا صلاح الدین احمد) پھر پلٹنے والا ہے۔ صرف ایک دو سال افسانوں پر جگہ جگہ مضامین شائع کرنے کی — ہے۔ (یہاں میں لفظ ضرورت نہیں لکھنا چاہتا۔ بہت ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی اور اچھا اور CONVINCING لفظ سوجھ نہیں رہا ہے)

ہر چرن چاولہ میرے پاس میری لائبریری میں میری ساری کتابیں الٹ پلٹ کرنے

میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کو سلام لکھنے کے لیے بار بار کہہ رہے ہیں (کہیں بھول نہ جاؤں!)
دہلی سے میرے حادثے کی خبر سُن کر لکھنو آئے ہیں۔

ہاں ۔ وہ ہمارے دوست شہاب سرمدی کہہ رہے تھے (پرسوں!) اُنھوں نے آپ کو کوئی مضمون رجسٹری سے بھجوایا تھا۔ اُس کی رسید آپ نے اُنھیں (ابھی تک) نہیں بھیجی۔ منتظر ہیں۔

اور کیا لکھوں؟

اچھا جناب، اب رُخصت۔ آداب

آپ کا مخلص رام لعل

رام لعل صاحب کی باتیں غور ہی سے سننے والی تھیں۔ بے شک کچھ نئے افسانہ نگاروں نے بات آگے چلائی ہے مگر پرانے لکھنے والوں پر چھا جانے والی بات نہیں ہے۔ آج بھی اُردو کے اچھے افسانوں کی تلاش میں نکلیں گے تو پرانے لکھنے والوں ہی کے افسانے متوجہ کریں گے۔ ابھی تک ان کے معیار کو نئے لکھنے والوں نے شرمایا نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں نئے لکھنے والوں کی صلاحیتوں کا منکر ہوں، میں تو ان سے بڑی توقعات رکھتا ہوں۔ مگر پریشانی یہ ہے کہ توقعات ہی توقعات میں بوڑھا ہو چلا ہوں۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ رام لعل فن کارانہ قلم لے کر آگے بڑھے تاکہ محسوس ہو کرشن چندر رہ گئے، جوگندر پال آگے بڑھے تاکہ احساس ہو راجندر سنگھ بیدی رہ گئے، جیلانی بانو آگے بڑھے تاکہ سوچیں عصمت چغتائی رہ گئیں، مسعود مفتی آگے بڑھے تاکہ خوش ہو لیں کہ ممتاز مفتی رہ گئے۔

ممتاز مفتی سے یاد آیا کہ اس ضمن میں ایک خط مجھے ممتاز مفتی نے بھی تو لکھا تھا۔ پہلے اُسے ڈھونڈ لوں۔ لیجیے مل گیا:-

طفیل۔ سلام علیکم!

دونوں کتابیں مل گئیں۔

"آپ" پڑھنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ جہاں تک میرا تعلق ہے "آپ" پر ایک چیز لکھ سکتا ہوں۔ وہ یہ "طفیل آپ کے آئینے میں بار روشنی میں"

ہم میں دو بنیادی اختلافات ہیں۔

طفیل اور آپ' دونوں، نیکی بدی، اچھائی برائی، مناسب نامناسب، درست غلط - کے چکر میں پڑے ہیں - وہ بھی شدت سے -

دوسرے - صاحب کردار کا مفہوم، طفیل کے نزدیک نیک کردار کا ہے، مفتی کے نزدیک صرف کردار کا ہے - مفتی کے نزدیک کردار کا مفہوم ہے ASSESMENT OF PERSONALITY اور شخصیت کی جاذبیت کردار کی ہم آہنگی میں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے رنگین تضادات میں ہے یا گدڑی میں پیوند یا پیوندوں میں گدڑی -

بہرحال - دقت یہ ہے کہ میں طفیل کی گدڑی سے واقف ہوں - اس کے پیوندوں سے واقف نہیں -

مختصر یہ کہ ستمبر کے اندر اندر مضمون بھیج دوں گا - اسے چھاپو نہ چھاپو - اجازت ہوگی کہ اس میں سے جو چاہو حذف کر دو -

دقت یہ ہے کہ شخصیت پر لکھو تو ادب، پراپیگنڈہ کی حدوں میں گھس جاتا ہے چاہے مثبت ہو یا منفی ——— میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پراپیگنڈہ کبھی منفی نہیں ہو سکتا - لیکن میری رائے کی کیا حیثیت ہے -

میں ۲۰ اگست کو لاہور پہنچوں گا، ۲۱ کو تم سے ملوں گا غالباً بعد دوپہر -

ممتاز مفتی

مفصل مضمون لکھنے کا ایک وعدہ آل احمد سرور نے کیا تھا - ایک وعدہ ممتاز مفتی کر رہے ہیں - میرا خیال ہے یہ دونوں معقول آدمی ہیں' اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے - لکھنے والے کو اور کچھ نہیں چاہیے، سوائے اس کے کہ اس کی تحریروں کا نوٹس لیا جائے - مفتی صاحب کے سوچنے کا انداز منفرد ہے، یہ ضرور میرا جلوس نکالیں گے، جس کے لیے میں تیار ہوں - محبت سے، کوئی کھال بھی اُتارے تو سی نہ کروں گا - دلی کدورت کے ساتھ، کوئی آنکھ اُٹھا کے بھی دیکھتا ہے تو دکھ ہوتا ہے -

اور باتیں ہیں چھوڑتے ہیں موضوع پہ آتے ہیں - ستیش بترا کے افسانے آپ نے پڑھے ہوں گے، اب اُن کا خط بھی پڑھیے -

محمد نقوش صاحب، سلام مسنون!

ماہ مئی اور جون میں امریکہ اور کینیڈا گھومتا رہا۔ جولائی کے وسط میں جب بھارت لوٹا تو "آپ" کو منتظر پایا اور نقوش کے اس دوران چھپے ہوئے شمارے کو غائب۔ سوچا اطلاع کر دوں لیکن اس دوران میں افتادہ مصیبتوں سے فراغت پاتے اور سوچتے سوچتے اگست کا مہینہ بھی نصف ختم ہونے کو آیا ہے۔ آج اچانک خیال آیا کہ میں بھی کتنا بد ذوق اور بے مروت ہوں کہ "آپ" کے بارے میں رسید ہی نہیں بھجوا سکا۔

میں نے کہا حضور، یہ "صاحب" اور "جناب" کے بعد "آپ" نے تو واقعی جھنڈے گاڑ دیے لطف آ گیا۔ "جوش" اور "نیاز" کے بارے میں خاکے پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور دل ہی دل میں صد آفریں کہہ چکا تھا۔ دیگر مضامین بھی من کو بھائے۔ آپ کے "معصوم" چہرہ کا بھی پہلی بار اتنے قریب سے دیدار کا موقع ملا اور اب بخوبی کھل چکا ہے کہ ان ذہین، معصوم آنکھوں کے پیچھے کس قدر شوخی اور شرارت کے کوندے لپک رہے ہیں۔

مرحوم شاہد احمد دہلوی کی طرح ہی آپ کے خاکے بھی دہلی کی نکھری، دھلی زبان میں اسی طرح چٹخارے دیتے ہیں۔ خاکوں میں توازن کی اہمیت کو جس طرح آپ نے شاہد سے اپنے خطوط میں منوالیا ہے، وہ آپ کے اپنے خاکوں پر نمایاں طور پر مسلط ہے۔ "آپ" میں سب سے کمزور مضمون اختر صاحب کے بارے میں اور سب سے پسندیدہ آپ کا "خطبہ حجابت" ہے۔

زیادہ کیا کہوں۔ اب "صاحب"، "جناب" اور "آپ" کے بعد "قبلہ"، "حضور" اور "پیر و مرشد" کا انتظار رہے گا۔

پرسوں کرشن چندر، ساحر ہوشیارپوری، عباس، فراق، نذیر بنارسی، سجاد ظہیر اور لکھنؤ کے دیگر ادیب میرے ہاں موجود تھے۔ سارے کا سارا گروہ بہار ریلیف فنڈ کے سلسلے میں جگہ جگہ "شامِ ادب" منعقد کر کر کے بہار کے مصیبت زدگان کے لیے رقم جمع کر رہا ہے۔ اچھا خاصا ہنگامہ رہا، آپ کا بھی ذکر رہا۔

بہت سے فوٹو کھینچے گئے۔ دو ایک آپ کو بھی بھجوانے کی کوشش کروں گا۔

نیاز مند ستیش بترا

ستیش بترا کا خط آپ نے پڑھ لیا۔ خوشی ہوئی کہ جو لوگ امریکہ اور کینیڈا سے ہو آتے ہیں، انھیں بھی اپنے ادب میں، کوئی بات نظر آ جاتی ہے

ورنہ ہوتا یہ ہے کہ امریکہ پلٹ اور لندن پلٹ قسم کے لوگ ناک بھوں چڑھاتے چڑھاتے مرجاتے ہیں اور انھیں اپنے ادب میں کوئی بات نظر نہیں آتی۔

اُفوہ! کتنی غلطی ہوئی۔ دو بزرگ ادیبوں کے خط، نیچے دبے رہے۔ اصولاً انھیں شروع میں کہیں آنا چاہیئے تھا۔ آپ کسی کو بتائیں نہیں، چپکے سے پڑھ لیں۔ پہلا خط سیّد مسعود حسن رضوی کا ہے:

برادرِ عزیز!

۹ اگست کو آپ کا ایک قرض ادا کر چکا ہوں، یعنی ناٹک "بزمِ سلیمان" کا متن مع ایک مضمون کے رجسٹری ڈاک سے بھیج چکا ہوں۔ رسید سے مطلع کیجیے۔ مرسلہ مضمون کو "بزمِ سلیمان" کا دیباچہ، مقدمہ جو چاہے سمجھ لیجیے۔

ایک چھوٹا سا قرض اور واجب الادا ہے، یعنی آپ کی نئی تصنیف "آپ" کی رسید اور شکریہ۔ کیا باغ و بہار کتاب ہے! اس گلستانِ ادب میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ مگر کانٹوں کو پھول بنا کر ناگوار کو خوش گوار بنا دینے کا فن کوئی آپ سے سیکھے۔ ماشآءاللہ! سبحان اللہ!

"بزمِ سلیمان" کب تک شائع ہوگی؟ کتاب مع مقدمہ کی دو تین فاضل مطبوعہ نقلیں ضرور عنایت کیجیے گا۔ والسّلام

خیر اندیش: سیّد مسعود حسن رضوی

دوسرا خط سیّد علی عباس حسینی کا ہے۔ وہ بھی کنکھیوں سے پڑھ ڈالیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی نامعقولیت سے ناک میں دم رہتا ہے، ان کی معقولیت سے ناک میں دم رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان میں تھوڑا سا گھٹیا پن ضرور ہونا چاہیئے۔ اگر آپ کو گھٹیا پن کا لفظ کھلے تو اس جگہ "انسانی پن" کا لفظ رکھ لیجیے:

مجتبیٰ طفیل صاحب۔ تسلیم!

آپ کے ذریعے کئی "آپ" سے ملاقات ہوئی۔ زہے قسمت ان حضرات کی، جن کی آپ کا قلمِ مرصع کار، مرقع کشی کرے! بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے کہ کاش آپ سے جسمانی حیثیت سے نیاز کا موقع مجھے بھی ملا ہوتا کہ میں بھی ان زندۂ جاوید ہستیوں کی فہرست میں شرکت کا فخر حاصل کر لیتا۔ مگر اب تو عمر و علالت نے مجھے بالکل ہی پابہ زنجیر بنا دیا ہے۔ اس لیے بہ ظاہر یہ

خوابِ شیریں محتاجِ تعبیر ہی رہے گا۔ البتہ اگر کنواں خود ہی پیاسوں کے پاس آجانے کی غیر متوقع زحمت کرے تو ہم جیسے بہت سے لب تشنہ سیراب ہو سکتے ہیں۔

بہر حال، اس نئی تصنیف پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

اُمید کہ آپ ہمہ وجوہ بخیر ہوں گے۔

بندہ اخلاص

علی عباس حسینی

دونوں بزرگوں کے خط آپ نے پڑھ ڈالے، ان پر میں کوئی تبصرہ نہ کروں گا خرد ادب والی بات ہے۔ زمانے کی روش کے مطابق، ابھی میرے دیدوں کا پانی مرا نہیں۔ میری تو ابھی تک، بزرگوں کے نام پر سٹی گم ہو جاتی ہے۔ الہذا تبصرہ کیسا!

اب یہاں قاضی عبدالستار کا خط پیش کرتا ہوں۔ یوں یہ کوئی بزرگ قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ صرف اپنے نام کے ساتھ قاضی ایسا بڑا لفظ لگا کر مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے ان "نوجوان نما بزرگ" افسانہ نگار نے کئی اچھی چیزیں اُردو ادب کو دی ہیں۔ ان کا نام ذہن میں آتے ہی مجھے خوشی اس امر کی ہوتی ہے کہ ان کا پہلا افسانہ نقوش نے چھاپا تھا اور اب تو یہ کافی معتبر قسم کے افسانہ نگار ہیں۔

مکرمی! تسلیم

آپ کی تصنیف موصول ہوئی۔ فوراً رسید اس لیے نہ دی کہ پڑھ کر لکھنا چاہتا تھا۔ ایک مضمون پڑھا ہوا تھا لیکن وہ بھی لطف دے گیا۔

آپ کو شاید پتہ بھی نہ ہو۔ آپ نے اپنا اسلوب تلاش کر لیا ہے جس کے پاس آپ کے خط آتے رہے ہوں اس کو اگر نہ بھی معلوم ہو تو بھی وہ کتاب کے مصنّف کا نام بتا دے گا۔ ناچیز رائے میں یہ معمولی کامرانی نہیں ہے۔ کتنے جغادری اور "پیشہ ور" لکھنے والے ایسے ہیں جو آج تک اس منزل پر باریاب نہ ہو سکے۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ جوش والا مضمون تو بہت ہی خوبصورت ہے۔ خدا کرے آپ اس سے اچھی بہت سی کتابیں لکھیں۔

خاکسار قاضی عبدالستار

اوروں نے تو میری کتاب کی بات کی۔ اُنھوں نے میرے خطوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ خط لکھنا ایک فن ہے جس میں غالب اور ابوالکلام نے نام پیدا کیا، باقی تو بس میری طرح آئے وقت کو ٹال دیتے ہیں لیکن بھکانے والے بھی بہت سے لوگ ہوتے ہیں جیسے ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر محمد حسن۔ انھوں نے بھی مجھے لکھ رکھا ہے کہ "آپ بڑے پیارے خط لکھتے ہیں"۔ مجھے ابھی تک تو اس "جھوٹ" پر یقین نہیں۔ فرصت عنقا، خیالات منتشر، ان حالات میں خط خاک لکھے جائیں گے۔ مافی الضمیر کا اظہار ہو جائے، وہی غنیمت، وہی سہل!

اب ہر چرن چاولہ کا خط ملاحظہ فرمائیں۔ یہ بھی ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں۔ ایڈیٹر سے ابتدا کی تھی، ایڈیٹر پر خاتمۂ کلام کرتا ہوں۔

برادرِ محترم۔ تسلیمات

بہت دن پہلے "نقوش" ملا۔ اُس میں "بادشاہ" بھی تھا۔ ابھی اُس کا ہی شکریہ ادا نہ کر پایا تھا کہ "آپ" نازل ہو گیا۔ اب کہاں جاؤں؟ آپ کو گھیرنا خوب آتا ہے۔ میں کس زمرے میں آتا ہوں آپ نے تو بڑے بڑوں کو گھیر رکھا ہے۔ خود میاں طفیل بھی آپ کی زد سے بچ کر نہیں نکل سکے۔ آپ نے تمہید میں چار مضامین کا ذکر کیا ہے مگر مجھے یہ پانچ مضمون نظر آتے ہیں۔ نیاز، جوش، اختر، کرشن چندر اور محمد طفیل پر۔ محمد طفیل پر مضمون صفحہ اوّل سے آخر تک موجود ہے جبکہ دوسرے کچھ کچھ صفحات تک ہی ساتھ نبھا سکے ہیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ یو۔ پی والوں کو "پہلے آپ، پہلے آپ" کہتے کہتے آپ خود (پنجابیوں کی طرح) مسندِ مضمون پر براجمان ہو گئے ہیں۔ مضامین میں مندرجہ شخصیتوں کے بارے میں اُن پہلوؤں سے پردہ کشی کی گئی ہے جو مجھ جیسے کئی لوگوں سے پوشیدہ تھے۔ مضامین پڑھ کر مجھے ایسے لگا جیسے مجھے دُلہن کے جہیز کے کمرے میں لے جایا گیا ہے جہاں دُلہن کے خوبصورت کپڑے۔ ساڑھیاں، سُوٹ، زیور، گھریلو سامان، دوسرا سامانِ آرائش، صوفہ سیٹ، ریڈیو، پنکھا وغیرہ سب اشیا قرینے سے سجی ہیں اور قریب ہی دُلہن کی کوئی خوبصورت اور جوان سہیلی اُن اشیاء کی تفصیل بیان کر رہی ہے۔ دُلہن خوبصورت ہوگی مگر میری نظروں سے تو اوجھل ہے اس لیے میرے ذہن نے یہ سب سُوٹ، ساڑھیاں زیور سامنے بیٹھی اُس کی گائیڈ، سہیلی کے سانچے میں ڈھلے خوب صورت جسم پر سجانے شروع کر دیے ہیں۔ معاف کرنا۔ وہ خوب صورت سہیلی آپ ہیں۔

آپ نے مجھے ان لوگوں سے ایک نئے ڈھنگ سے متعارف کرایا ہے۔ نیا ڈھنگ ہی کہوں کیونکہ ان لوگوں کو میں پہلے سے ہی تھوڑا بہت جانتا ہوں مگر آپ نے مجھے خود اپنے آپ سے جس ڈھنگ سے ملایا ہے وہ اور بھی دلپذیر ہے جس کے لیے میں آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں۔ اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

نیاز کیش

ہرچرن چاولہ

اتنے بہت سے مضمون اور اتنے بہت سے خطوط، میں نے یہاں نقل کر دیے ہیں۔ آگا پیچھا کچھ نہیں دیکھا، ابھی کچھ مضمون اور کچھ خطوط "آئندہ سہی" کا وعدہ کرتا ہوں۔ اس طرح میری کتاب پر تبصروں کے علاوہ اور بھی تو کام کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ کہ ایک ہی کتاب پر مختلف احباب، مختلف انداز میں سوچتے ہیں، یہ امر بذاتِ خود دلچسپی کا باعث ہے۔

میں نے کئی دن، اس سوچ میں گزار دیے کہ ان آرا کو درج کروں یا نہ کروں! درج کیا ہے تو بعض لوگ یہ کہیں گے، خود ستائی کی حد کر دی۔ درج نہ کرتا تو اُن دوستوں سے شرمندگی ہوتی جنہوں نے ازرہِ محبت مجھے اپنی رائے سے نوازا تھا۔ مشکل دونوں طرح تھی۔

بہر حال دوستوں نے مجھے اور میری تحریر کو اچھے لفظوں سے یاد کیا۔ اس پر خوش ہوں، ورنہ یہ دور ہے تو بڑا "ناقدرا"!

اطمینان ہے تو یہ کہ جب خدا بھی اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہو تو میں اور آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔

جہاں تک میری کتاب پر، میری رائے کا تعلق ہے، وہ فقط اتنی ہے۔۔۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

جوش صاحب کا قطعہ یاد بھی آیا تو کس وقت؟ بڑے ہی نامناسب وقت!

زندگی کے ابتدائی دور میں بھی کم سے کم
آدمی کو عرش تک پرواز کرنی چاہیے
اور اگر جنبش میں آ جائیں پَر و بالِ حیات
عرش سے پرواز کا آغاز کرنا چاہیے

عابد دولت

مورخہ ۹ رمئی ۱۹۷۴ء

ہر شخص قدم قدم پر دھوکا کھاتا ہے۔ اس کے باوجود اپنے آپ کو عاقل سمجھتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے چھپاتا ہے لیکن وہ اپنے آپ سے نہیں چھپ سکتا۔ اسی طرح ضمیر اور خواہش کی آواز بہت ملتی جلتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب خواہش آواز بدل کر بولتی ہے تو گنہگار انسان اُسے اپنے ضمیر کی آواز سمجھ لیتا ہے یوں زندگی فریب نفس کا تسلسل بن جاتی ہے۔

انسان کی زندگی ہے تو صرف اتنی کہ پیدا ہوئے۔ حالات کی چکّی میں پسے اور چل دیئے ـ یہ کہانی نہ صرف میری ہے بلکہ ہر اُس شخص کی ہے جسے قدرت نے اُس جہان سے اس جہان میں دھکیل دیا۔ قرار اور اطمینان کسی شخص کو نصیب نہ ۔ پھر لُطف کی بات یہ ہے جو دُنیاوی طور پر جتنا بڑا ہے اُس کا خُدا کی ذات پر ایمان اُتنا ہی کم ہے۔

ہم اپنی زندگی میں سوائے حقیقت کے کچھ نہیں جانتے۔ مگر جب وہ سامنے آتی ہے تو ہم اُس کے علاوہ ہر چیز میں محو ہو جاتے ہیں۔ حقیقت کو ڈھونڈتے ہیں اور حقیقت سے کتراتے ہیں۔ پھر کوئی زمین کو تولتا ہے اور کوئی آسمان کو ناپنا شروع کر دیتا ہے۔

میری ایک حیثیت تو ایک عام آدمی کی ہے۔ عام آدمی جو نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو فائدہ، کیونکہ وہ ایک فعل پر قدرت نہیں رکھتا۔ دوسرے فعل کا حوصلہ نہیں رکھتا۔

۱۹۴۴ء میں مَیں نے ادارہ فروغ اُردو کے نام سے ایک پبلشنگ ہاؤس کی بنیاد رکھی۔ یہ عارضہ مجھے اس لیے لاحق ہوا کہ میری ادیبوں اور شاعروں سے دوستی تھی۔ چنانچہ دوستی کے اس بکھیڑے میں، میرا دامن ایسا اُلجھا کہ پھر چھٹکارا مشکل ہو گیا۔

ہمارے ادارہ سے کئی بڑے بڑے مصنّفین کی کتابیں شائع ہوئیں۔ مثلاً جگر مرادآبادی، شوکت تھانوی، عابد علی عابد، ڈاکٹر تاثیر، سعادت حسن منٹو اور نیاز فتحپوری! زندہ ادیبوں کا نام جان بوجھ کر نہیں لیتا کیونکہ خطرہ کم سے کم مول لینا چاہیئے۔

دوسری یا تیسری حیثیت، میری ایک مصنّف کی ہے۔ میری پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں۔

مصنف بننے کا شوق، کوئی سنجیدہ شوق نہ تھا۔ بلکہ ایک جبر کے ماحول میں، طبیعت کو ورغلانے کے لیے، میں نے قلم پکڑ کر ایک مضمون بعنوان "منٹو صاحب" لکھ ڈالا تھا۔ اتفاق کی بات کہ وہ مضمون سب کو پسند آگیا اور اتفاق ہی کی بات کہ میں مصنف بن گیا۔ ورنہ حاشا وکلا، اس پھڈے میں ٹانگ اڑانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

۱۹۵۰ء میں، مَیں نے نقوش کی ادارت سنبھالی۔ وہ دن اور آج کا دن، مغفرت کی صورت پھر نہ نکلی۔ میں نے مغفرت کا لفظ، بخشا جانے کے معنی میں استعمال نہیں کیا بلکہ رہائی اور چھٹکارا کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ لہٰذا کوئی بلاوجہ بھی خوش نہ ہو۔

رسالے کا ایک ایک ورق بلکہ اُس کی ایک ایک سطر، مدیر کے مزاج اور اس کی سوچوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ 'مخزن' کی پالیسی اس لیے متوازن تھی کہ اُس کی پشت پر سر عبدالقادر ایسا مدیر تھا۔ 'معارف' کی پالیسی اس لیے مذہبی نوعیت کی تھی کہ اُس کے مدیر سید سلیمان ندوی تھے ——— اسی طرح ہفت روزہ اخبارات کی طرف نگاہ اُٹھائیے۔ 'الہلال' کی پالیسی اس لیے سیاسی نوعیت کی تھی کہ اُس کے مدیر ابوالکلام آزاد تھے۔ 'اودھ پنچ' کی پالیسی اس لیے طنز و مزاح کی حامل تھی کہ اس کے مدیر منشی سجاد حسین تھے۔ جو کہ خود اعلیٰ درجے کے مزاح نگار تھے۔

میری سوچ یہ رہی ہے کہ قدرت نے انسان کو بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ جو کچھ چاہے بن سکتا ہے۔ چنانچہ مَیں اپنے ماحول میں نئی راہوں کا متلاشی رہا۔ میری چپک اُتنی نمایاں ہونے کو نہ تھی جتنی کہ چپ چاپ خدمت کی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہر دلعزیزی کی خواہش سب سے بڑا شیطان ہے جس کی ایک نگاہِ کرم کے ساتھ ہی استقامتوں کی چٹانیں پانی ہو کے بہہ جاتی ہیں۔ چنانچہ جب ۱۹۵۰ء میں نقوش، کچھ اپنی پالیسی کی وجہ سے اور کچھ مالی الجھیڑوں کی وجہ سے بند ہونے لگا تو میں نے ڈوبتی ہوئی کشتی کی ملاحی قبول کر لی۔ میرا یہ فیصلہ بڑا ہی جرأت مندانہ تھا۔ اس لیے کہ قبل ازیں نقوش احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور اور سید وقار عظیم ایسی شخصیتوں کے تعاون سے منصۂ شہود پر آیا تھا اور پبلک سے میر التعارف اس نوع کا تھا ہی نہیں، چنانچہ اللہ کا نام لے کر، جھجکتے ہوئے قلم اُٹھایا تھا اور آرزوؤں اور ارمانوں کے جلو میں، اپنے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔

سمت کے تعین میں، مَیں نے جلدی جلدی، رسائل کے اوراق کو پلٹنا شروع کر دیا۔ ابتداء سے لے کر اُس وقت تک کے رسائل کو گھبراہٹ مجھ پہ ویسی ہی طاری تھی جیسی کہ چور کو چوری کا سامان باندھتے وقت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ میں بھی تو کچھ چوری کرنے کے لیے ہی، اوراق کو الٹ پلٹ

رہا تھا۔ چنانچہ جب میں اس مرحلے سے فارغ ہو گیا تو بڑا مایوس ہوا۔ اس لیے کہ وہاں میرے لیے چوری کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔

چنانچہ میں نے ادب کی بنیادی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر، ایک منصوبہ بنایا نشیب و فراز کا جائزہ لیا۔ معلوم ہوا کہ جو کام میں کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کے لیے قارون کا خزانہ، خضر کی عمر اور ایوبؑ کا صبر چاہیئے۔ لے دے کے میرے پاس صرف ماں کی دعائیں تھیں۔ چنانچہ اُسی پونجی کے ساتھ، ادب کی وادیوں میں داخل ہو گیا۔

میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ جو لوگ بڑے کام نہیں کر سکتے اور چھوٹے کام کرنا خلافِ شان سمجھتے ہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں کرتے۔ صرف باتیں کرتے ہیں۔ انہی باتوں کو سامنے رکھ کر یہ بھی سوچا کہ اگر میں نے ایکدم اپنے منصوبوں پر عمل شروع کر دیا تو ہو سکتا ہے کہ میرا اجتہادی قدم ہی، راہ کی رکاوٹ بن جائے۔ چنانچہ ابتداء میں، پرانی ڈگر پر ہی، چلنے میں عافیت جانی۔ پھر بھی اتنا ضرور سوچا کہ میرے ذہن کی رَو اور میری کاوشوں کی ضو، نقوش کے صفحات میں جھلکنی چاہیئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرا مرتب کردہ پہلا شمارہ جب بازار میں آیا تو وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اُس کا دوسرا ایڈیشن چھاپنا پڑا۔ چنانچہ اپنی ذات پر اعتماد بڑھ گیا۔ ادب کے وہ قصر جو میں تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ وجود میں آتے دکھائی دینے لگے۔

آہستہ آہستہ میں اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ اپنے منصوبوں کو عملی صورت دینے لگا۔ چنانچہ جب میں نے اپنے پروگرام کے مطابق، نقوش کا غزل نمبر چھاپنے کا ڈول ڈالا تو اُس وقت کے اُردو رسائل کے باوا آدم، چودھری نذیر احمد مرحوم، جو رسالہ "ادبِ لطیف" کے بعد "سویرا" کے مالک و مدیر تھے۔ میرے پاس تشریف لائے۔ کچھ اُنھوں نے اپنی کہی، کچھ میری سُنی۔ ٹیپ کا بند اُن کا یہ تھا "میرے تجربے سے فائدہ اٹھائیے اور اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کیجئے۔ ورنہ اتنا نقصان ہوگا۔ جو آپ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔"

مجھے یہ نصیحت جو کی گئی تھی وہ میرے نہ تو کسی بدخواہ کی تھی اور نہ کسی ناتجربہ کار دوست کی۔ اس کے باوجود میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا تھا "آپ کے مشورے کا شکریہ۔ مگر میں یہ تجربہ ضرور کروں گا۔" اس پر چودھری نذیر احمد نے غصے میں آ کر یہ کہا تھا "کیا تیرے پاس بڑی دولت ہے؟" اس پر میں نے جواب یہ دیا "ہاں میرے پاس بڑی دولت ہے۔ کیونکہ میری ایک جیب میں خلوص ہے اور دوسری جیب میں استقامت!"

چنانچہ وہ غزل نمبر، جس کی اشاعت پر مجھے چودھری نذیر احمد نے ٹوکا تھا، متعدد بار چھپا ہے۔ اس کے باوجود مانگ جوں کی توں ہے اور کسی قیمت پر نہیں ملتا۔ غزل نمبر کی کامیابی کے بعد، پھر تو مجھے اپنی منزل قریب دکھائی دینے لگی۔ چنانچہ میں نے ایک کے بعد دوسرے پڑاؤ پہ ڈیرے ڈالے۔ آج اگر میں منزل پر نہیں پہنچا تو بھی میں نے راہ کی دشواریوں کو اس حد تک پاٹ دیا ہے کہ میرے بعد آنے والے منزل تک ضرور پہنچیں گے اور انہیں دُور تک، میرے جلائے ہوئے دیوں کی روشنی ملے گی۔

کچھ کرنے کا ارمان تو بہت ہے۔ جو کچھ کیا ہے۔ وہ آپ کے سامنے ہے۔ میرے نمایاں کام غزل نمبر، افسانہ نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، مکاتیب نمبر، لاہور نمبر اور آپ بیتی نمبر ہیں۔ ان نمبروں پر میں نے اتنی محنت کی ہے کہ اس کا اندازہ کوئی شخص نہیں لگا سکتا۔ صبح آٹھ بجے سے لے کر رات کے بارہ ایک بجے تک کام، میرا معمول رہا ہے۔ اس لیے کہ میرے نزدیک آسائش جسم وہ چور ہے۔ جو پہلے ہمارے گھروں میں مہمان بن کر آتا ہے۔ پھر گھر کا مالک بن جاتا ہے۔

ایک بار میرے کرم فرما شیخ منظور الٰہی کو یہ شبہ ہوا تھا کہ طفیل یونہی اپنی مصروفیات کا ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے دو ایک بار، رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے چیک کیا اور مجھے دفتر میں موجود پایا۔ بعد میں انہیں مجھ پر ترس آنے لگا۔ چنانچہ پھر وہ مجھے کبھی پیار سے اور کبھی ڈانٹ کے کہتے رہے: "اُٹھو گھر جاؤ" اس طرح میں نے نقوش کی رفاقت میں پچیس چھبیس برس نہیں بلکہ پورے پچاس ساٹھ برس گزارے ہیں۔

دن رات کام کرنا، یوں تو محاورے کے طور پر استعمال ہوتا ہے مگر میں نے اس محاورے کو عملی صورت دی ہے۔ جن نمبروں کا ابھی میں نے ذکر ہے۔ اُن کے علاوہ میں نے غالب نمبر بھی چھاپے ہیں۔ اکٹھے تین نمبر، یہ کیوں چھاپے؟ اس کی روئیداد شاید دلچسپی کا باعث ہو۔ ایک پروفیسر صاحب ملتان سے تشریف لائے۔ نام نامی لطیف الزمان خاں، کہنے لگے "آج کل غالب کی سو سالہ برسی منائی جا رہی ہے۔ غالب نمبر نکل رہے ہیں۔ کیا نقوش کا بھی غالب نمبر نکلے گا؟" میں نے جواب دیا "جی نہیں!" پھر استفسار "کیوں نہیں؟" میرا پھر جواب یہ تھا "جو کام سب کر رہے ہوں وہ کام میں نہیں کیا کرتا۔" وہ دیر تک بیٹھے اپنی میٹھی باتوں سے جادو کرتے رہے۔ تان یہاں پہ توڑی "اگر نقوش کا غالب نمبر نکلا تو ہم بھی کہہ سکتے کہ پاکستان کسی معاملے میں ہندوستان سے آگے ہے۔" یہ جملہ اُن کا ادا کرنا تھا کہ وطنیت کے جذبے نے چاروں شانے چت گرا دیا۔ چنانچہ جو کام

یاروں نے برسوں اور مہینوں سے شروع کر رکھا تھا۔ اُسے میں نے دو ڈھائی مہینے میں انجام دیا اور جب نقوش کا غالب نمبر بازار میں آیا تو ہندوستان سے خط، اس مضمون کا بھی آیا تھا: "ہندوستان نے غالب کے بارے میں بہت کچھ کیا۔ ہزاروں لاکھوں خرچ کیے مگر وہ نقوش جیسا غالب نمبر نہ چھاپ سکا۔"

ہاں تو میں جس غالب نمبر کی بات کرنی چاہتا تھا۔ وہ قصہ تو غالب نمبر کی دوسری جلد کا ہے۔ یعنی بیاضِ غالب کا۔ ایک دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ امروہے کے ایک شخص کو غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ملا ہے اور اُس میں بہت سا کلام غیر مطبوعہ بھی ہے۔ اس خبر کا پڑھنا تھا کہ طبیعت بیقرار ہو گئی۔ اللہ میاں سے التجا کی کہ آج تک تُو نے میری ہر آرزو پوری کی ہے اس آرزو کو بھی پورا کر دے کہ وہ نسخہ پہلے پہل نقوش میں چھپے —— چنانچہ دعا مستجاب ہوئی!

جس وقت مجھے وہ گوہرِ نایاب ملا تھا۔ اُس وقت مجھے شادی مرگ کا بھی مرحلہ درپیش آسکتا تھا۔ کیوں کہ ادب کے رشتے سے، میں خدا سے جو بڑی سے بڑی چیز مانگ سکتا تھا۔ وہ مجھے بخش دی گئی تھی۔ اب مجھے یہ دُھن سوار کہ کسی طرح اس نسخے کی اوّلین اشاعت پاکستان کے حصے میں آئے اور نقوش کے کھاتے میں پڑے۔ چنانچہ صاحب! اُن دنوں میں کئی دنوں تک گھر نہیں گیا تھا۔ دن اور رات دفتر ہی میں ڈیرا!

اِدھر میں نسخے کو مکمل کر رہا تھا۔ اُدھر میں نے اُس وقت کے مرکزی وزیر جنرل شیر علی سے بھی سلسلہ جُنبانی کر رکھا تھا کہ ایک بہت بڑے منصوبے کے سلسلے میں، آپ کی بھی اعانت کی ضرورت ہوگی۔ وہ مجھ سے پوچھتے منصوبہ کیا ہے؟ میرا جواب یہ ہوتا، چند دنوں تک عرض کر دوں گا۔ چنانچہ جس دن میرا نمبر مکمل ہوتا تھا اُس سے صرف ایک دن پہلے، میں نے وزیرِ موصوف کو بتایا کہ قصہ یہ ہے اور اُس کی اہمیت یہ ہے اور اُونچ نیچ یہ، اور یہ بھی عرض کیا کہ کسی نہ کسی طرح "اس نمبر کا افتتاح کل تک ہو جانا چاہیئے۔ اُنھوں نے کہا۔ کل کے لیے تو، یہاں پہ میرے کئی پروگرام پہلے سے طے ہیں۔ اس پر میں نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں ہی راولپنڈی پہنچ جاتا ہوں۔"

اب جلسے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ مضمون نگار ہوں۔ سامعین ہوں۔ سامعین کا معاملہ تو میں نے راولپنڈی کے ایک دوست پر چھوڑ دیا اور مضمون نگار لاہور سے لے کر چل دیا۔ لاہور سے جو کرم فرما میرے ساتھ چلے تھے۔ اُن میں ایک تو مرحوم حمید اللہ خاں تھے دوسرے سید وقار عظیم۔ جلسہ ایک بڑے ہوٹل میں ہوا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔

مزہ یہ کہ قبل ازیں بیاض کا طبع شدہ نسخہ میں نے اپنے مضمون نگاروں کو بھی نہیں دکھایا تھا جو کہ میرے ساتھ لاہور سے چلے تھے اور تو کوئی بات نہ تھی۔ محض میری طبیعت کی احتیاط کا تقاضا یہ تھا جب ہمارا جہاز اُڑا اور مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ اب ہم واپس نہیں جا سکتے تو میں نے بڑے اطمینان سے، اپنے بیگ سے نسخہ نکالا اور کہا تھا وہ نسخہ دیکھ لیجئے۔ جس کے بارے میں آپ کو کچھ کہنا ہے ۔ تقریب میں جب پہلے مقرر نے یہ کہا کہ غالب کی وہ بیاض جو دریافت تو ہندوستان میں ہوئی تھی مگر وہ پہلے چھپی پاکستان میں ہے تو میری ساری کلفتیں دُور ہو گئیں ۔

بعد میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں ۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں سوالات ہوئے کہ وہ بیاض جو ہندوستان میں دستیاب ہوئی تھی اور جس کا افتتاح وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کرنا تھا۔ وہ کیسے پہلے پاکستان پہنچ گئی۔ ایک بقراط نے جان چھڑانے کے لیے یہ کہا۔" وہ ہماری بیاض سے فوٹو لے کر چھاپی گئی ہے۔" بھلا ہو اُن مقدمہ بازوں کا، جو اس بیاض کے سلسلے میں، آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اُن میں سے ایک فریق نے راز اُگل دیا کہ پاکستان میں جو بیاض چھپی ہے وہ ہماری بیاض کی فوٹو کاپی نہیں۔ کیوں کہ ہم نے جو نسخہ چھاپا ہے اُس کے آخری صفحہ پر کوئی دھبہ نہیں اور پاکستان میں جو نسخہ چھپا ہے اُس کے آخری صفحے پر دھبّہ ہے اور وہ دھبہ اصل نسخے میں بھی موجود ہے۔

اگر میں اپنی ادبی مہم جوئیوں کی تفصیل میں چلا گیا تو یہ قصہ بڑا طول کھینچ لے گا۔ ایک ایک نمبر کے پیچھے ایک ایک کہانی ہے۔ اس کے باوجود میں " آپ بیتی نمبر" کے بارے میں مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ لاہور کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا آپ کا یہ نیاز مند دنیا بھر کی بڑی شخصیتوں سے مخاطب تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنی آپ بیتیاں بھجوائیں اور وہ "نقوش" کی زینت بنیں۔ امریکہ کے صدر آئزن ہاور ہوں یا برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل، سبھی نے میری درخواست پر غور کیا۔ مصر کے جمال عبدالناصر ہوں یا ایران کے شہنشاہ سبھی نے اپنی آپ بیتیاں بھجوائیں۔ جہاں یہ اعزاز میرے اور نقوش کے لیے وجہ عزت ہے۔ وہاں یہ اعزاز اہل پاکستان کے لیے بھی کچھ کم نہ تھا۔

ایک بار مجھے " تاریخ ادب اُردو" کے خالق ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے لکھا تھا کہ نقوش کے نمبر اُردو صحافت کے درخشاں باب ہیں اور یہ سارا کام ایک معجزانہ حیثیت رکھتا ہے۔" تو میں نے ذرا اطمینان کا سانس ضرور لیا تھا۔ غرور اور تکبر نے مجھے ورغلایا نہ تھا۔

اسی طرح بابائے اُردو مولوی عبدالحق بھی "نقوش" کے کام سے بے حد متاثر تھے۔ متعدد مرتبہ اُنہوں نے تعریف کی۔ اُس تعریف کو بھی میں نے اُن کی طرف سے حوصلہ افزائی ہی کے کھاتے

میں ڈالا۔ اگر میں ایسی ہستیوں کی طرف سے تعریف و توصیف ہی کو سب کچھ جان لیتا تو پھر میرا مشن ادھورا رہ جاتا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ تھوڑا ہے، جو کچھ ابھی کرنا ہے وہ زیادہ ہے۔

بابائے اُردو مجھے محمد طفیل کی بجائے محمد نقوش کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بابائے اُردو کا انتقال ہوا تو میں اُن کی یاد میں نقوش کا ایک صفحہ محمد نقوش کے نام سے لکھتا ہوں۔ میرے نزدیک بزرگوں کا احترام کرنا اُتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ نماز پڑھنا، روزہ رکھنا!

مختار مسعود جو کبھی لاہور کے کمشنر تھے۔ ایک دن وہ اور میں، مال روڈ سے گزر رہے تھے۔ مسجد شہداء کے پاس رُکے۔ اُنھوں نے مجھ سے پوچھا: "کیا آپ نے مسجد کو اندر جاکر دیکھا ہے؟" میرا جواب یہ تھا: "ابھی تک نہیں دیکھا۔" اس پر انھوں نے کہا: "آؤ چلتے ہیں۔" چنانچہ وہاں جاکر انھوں نے مسجد کی تکمیل کے ہر ہر مرحلے کی تفصیل بتائی۔ یعنی مسجد کے ڈیزائن کا یہ حصّہ فلاں ملک کی مسجد کا ہے اور وہ والا حصّہ فلاں ملک کی مسجد کا، پتھر فلاں جگہ سے منگوایا گیا۔ فانوس فلاں ملک کا ہے۔ انھوں نے جس لگن سے یہ مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اس سے میں بڑا متاثر ہوا۔ پھر جب ہم واپس سیڑھیوں پہ پہنچے تو اُنھوں نے رُک کر کہا: "جب تک یہ مسجد باقی ہے مسلمان قوم آپ کو سجدہ کرتی رہے گی۔"

میں نے کہا: "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

مختار مسعود نے بتایا: "جب اس مسجد کی نیو رکھنے کا مرحلہ درپیش تھا تو میں کئی دنوں تک یہ سوچتا رہا تھا کہ اس کی نیو میں کیا رکھا جائے؟ چنانچہ میں نے لوہے کا ایک بکس بنوایا۔ لندن سے چیزوں کو صدیوں تک محفوظ رکھنے والی ادویات منگوائیں ۔ پھر میں نے اُس میں اس دَور کے سکّے اور نقوش کا "لاہور نمبر" رکھ کر مسجد کی بنیادیں اٹھوا دیں۔"

ہر مسلمان کے نزدیک مسجد کی جو حُرمت ہے وہ کسی سے ڈھکی چھُپی نہیں۔ پھر مسجد شہداء، اُس کی شان تو مزید بالا ہے۔ اس انعام کے بعد، اب میرے لیے دُنیا کا ہر اعزاز ہیچ ہے۔

ہمارے ادبی رسائل

مجلّہ نقوش

ریڈیو والوں نے لاہور سے "ہمارے ادبی رسائل" کے عنوان سے، مختلف اہم رسائل پر فیچر نشر کیے تھے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۷۲ء کو نو بجے کر پندرہ منٹ پر، نقوش کے بارے میں بھی ایک پروگرام نشر ہوا تھا۔ جس میں میرزا ادیب بہ طور "پروگرامی" (پروگرام آرگنائزر) کے تھے اور شرکائے محفل تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر وحید قریشی، صادق حسین اور مدیرِ نقوش! وہ روئیداد قارئینِ نقوش کی بھی نذر ہے۔

(ادارہ)

میرزا ادیب: محترم سامعین! میرزا ادیب آپ کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے۔ اس وقت آپ ہمارے پندرہ روزہ پروگرام "ہمارے ادبی رسائل" کے سلسلے میں اُردو کے ممتاز و مؤقر ادبی مجلّے نقوش پر ایک فیچر ملاحظہ فرمائیں گے، اس فیچر کے مصنف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید آپ سے مخاطب ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید!

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید :۔ "نقوش" ایک حسین و جمیل، علمی و ادبی مجلّہ ہے۔ زندگی آمیز زندگی آموز ادب کا نمائندہ اور مجلّاتی صحافت میں ایک طرحِ نو کا بانی اور واحد نقیب! ایک مجلّہ جو بیک وقت علمی بھی ہے اور ادبی بھی، ایک طرف بہترین ادب پارے پیش کرتا ہے۔ دوسری طرف علم کے ہر شعبے پر سیر حاصل مواد پیش کرتا ہے۔ ایک طرف ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے، دوسری طرف ذہنی ضروریات کی تکمیل میں مدد دیتا ہے۔ گویا ہماری مجلّاتی صحافت کی کلاسیکی روایت کا علمبردار ہے لیکن یہ نہ سمجھئے کہ نقوش ماضی پرست ہے، یہ درست ہے کہ نقوش کو کلاسیکی روایات عزیز ہیں لیکن یہ تجدّد کا مخالف نہیں۔ لہٰذا یہ کلاسیکی اور جدید روایات

کے درمیان ایک پُل کا کام دیتا ہے۔ یہی وہ کردار ہے۔ جس نے نقوش کو مجبور کیا کہ وہ کسی ایک دبستان ادب یا دبستانِ خیال سے وابستہ نہ ہو۔ بلکہ ہر دبستانِ خیال کے فن کاروں اور دانشوروں کے اظہارِ خیال کا وسیلہ بن جائے۔

"نقوش" نے پاکستان بننے کے چھ مہینے بعد جنم لیا۔ یہ وہ دَور تھا جہاں ایک طرف صبح آزادی کے طلوع نے سینوں کو منوّر کر رکھا تھا۔ ہر شخص میں کام کی لگن تھی۔ ایک تڑپ تھی۔ ایک جذبہ تھا۔ ہر شخص کچھ کر گزرنے کا متمنی تھا۔ دوسری طرف سرحد پار سے آنے والے لاکھوں انسانوں کے لُٹے پٹے قافلے خونیں غسل سے گزر کر ایک نئی زندگی کی تلاش میں تھے، ارضِ لاہور میں ایسے نعرے بلند ہو رہے تھے، کہ معاشی نظام میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں تاکہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آسکے جس میں انسان، انسان کو نہ لُوٹ سکے۔ ادب میں ترقی پسند تحریک کا بڑا غلغلہ تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سرگرمِ کار تھی۔ ایسے میں نقوش کی ادارت محترمہ ہاجرہ مسرور اور جناب احمد ندیم قاسمی کے سپرد ہوئی۔ دونوں اس تحریک سے منسلک تھے۔ چنانچہ نقوش ترقی پسند تحریک کا ترجمان بن گیا۔ تیسرا پرچہ نکلا تو حکومت نے اسے چھ مہینے کے لیے بند کر دیا۔ وجہ یہ بیان کی کہ اس میں سعادت حسن منٹو کا ایک ایسا افسانہ چھپا ہے جو فحاشی کے دائرے میں آتا ہے۔ بندش کی میعاد ختم ہوئی تو پرچے کا احیاء ہوا لیکن چند مہینے بعد ناسازگار حالات کی بنا پر اسے بند کرنا پڑا۔ یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو یہ پرچہ پھر اُبھرا۔ اس مرتبہ ادارت جناب وقار عظیم کے سپرد ہوئی۔ انھوں نے پرانی پالیسی بدل ڈالی اور پہلے پرچے میں لکھا :-

> "نقوش ماضی کا امین اور حال کے تقاضوں کا پاسبان ہے لیکن جو کچھ زندگی سے دُور ہے اور جس نے زندگی کی اعلیٰ قدروں کو داغدار بنایا ہے اُس کا ہرگز طرفدار نہیں۔ حال کے ہر نئے تجربے کا خیر مقدم کرتا ہے بشرطیکہ وہ ادب کی بنیادی اقدار کے منافی نہ ہو۔ یہی نقوش کی آیندہ پالیسی ہوگی اور اسی قسم کے مضامین دیے جائیں گے جن سے اس پالیسی کی وضاحت ہوتی ہو۔"

پانچ شمارے نکلے تھے کہ جناب وقار عظیم اپنی نجی مجبوریوں کی بنا پر ادارت سے الگ ہو گئے اور یکم مئی ۱۹۵۱ء کو جناب محمد طفیل نے ادارت سنبھال لی۔ وہ دن اور آج کا

دن، وہی اس پرچے کی ترتیب و تزئین کے ذمہ دار ہیں۔ ادارت سنبھالنے سے پہلے جناب محمد طفیل "نقوش" کے مالک تو تھے لیکن مدیر نہیں تھے۔ ناشر تو تھے لیکن ادیب نہیں تھے، اور اگر تھے تو کسی کو اس بات کی خبر نہیں تھی۔ محترمہ خدیجہ مستور لکھتی ہیں:-

"وقار صاحب کے جانے کے بعد میں سوچ رہی تھی کہ طفیل بھائی ضرور، کوئی بہتر نام تجویز کریں گے۔ مگر اطلاع ملی کہ موصوف اب خود ہی "نقوش" کے ایڈیٹر بن گئے ہیں۔ دوسروں کی بات نہیں کرتی اپنی کہتی ہوں کہ اس اطلاع نے مجھے سخت مایوس کیا۔ نقوش جس آن بان کیساتھ سامنے آیا تھا اُس کی اتنی ہی عبرت ناک موت میری نظروں کے سامنے گھوم گئی اور ساتھ ہی بھائی طفیل کی صورت بھی۔ مجھ سے قسم لے لیجیے جو اُس زمانے میں اُن کی زبان سے کبھی کوئی ادبی قسم کی بات سُنی ہو۔ اب بھلا بتلائیے کہ مَیں اِس کے سوا اور کیا سوچتی کہ یہ ہمارے بھائی طفیل اپنا سرمایہ بھی ڈبوئیں گے اور بے چارے نقوش کو جانے کیسی کیسی اذیتیں دے دے کر ماریں گے اس سے تو اچھا تھا کہ حکومت اِس غریب رسالے کو پھانسی کی سزا ہی دے دیتی!"

چند برسوں کے اندر اندر، محمد طفیل کے اندر جو ادیب چھپا بیٹھا تھا۔ وہ اس شان و شوکت اور تمکنت کے ساتھ منظرِ عام پر آگیا کہ ایک عالم چونک اُٹھا۔ اُس نے خاکہ نگاری کو اپنایا۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس سے اُردو ادب بڑی حد تک تہی دامن رہا ہے۔ اس لیے محمد طفیل کے سامنے کوئی ایسا نمونہ نہیں تھا جس کی تقلید ممکن ہوتی۔ پس اُس نے اپنی راہ خود دریافت کی۔ اُن کے تخصیاتی خاکوں کے پانچ مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں "صاحب"، "جناب" "آپ"، "محترم اور مکرم" اُن کے اندازِ بیان میں کمال کی سلاست اور بلا کی روانی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے فقرے لکھتے ہیں۔ کبھی معانی سے بھرپور، کبھی طنز کے حامل، کبھی جامعیت کے مظہر، ایک سے ایک منسلک اور تاثر کا یہ عالم ہے کہ دل میں ترازو ہوتے جاتے ہیں۔ وہ شخصیتوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں، خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں لیکن اس حُسن و خوبی کے ساتھ کہ تعریف پر خوشامد کا گمان نہیں ہوتا تعریض سے مذمت کا پہلو نہیں نکلتا۔ پھر شخصیات کا مطالعہ سطحی طور پر نہیں کرتے اُن کے اندر جھانک کر دیکھتے ہیں شاہد کی حیثیت سے، دوست کی حیثیت سے، ناقد کے انداز میں، ہمدردی کے ساتھ، ان تمام حیثیتوں کے امتزاج اور

لیلے انداز تحریر کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کتابوں کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شخصیتوں کے ساتھ بھرپور ملاقاتیں ہوگئی ہیں۔

سوچنا یہ ہے کہ جب محمد طفیل نے نقوش کی ادارت سنبھالی تو اُن کے ذہن میں کیا چیز کارفرما تھی حُسنِ اتفاق سے اُن کا ایک اداریہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

اس وقت طفیل صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔ اس لیے اپنا اداریہ وہ خود پڑھ دیں تو زیادہ اچھا ہو۔

محمد طفیل:۔ میں پڑھوں؟

عبدالسلام خورشید:۔ جی ہاں!

محمد طفیل:۔ "میرے گرد انبار ہے رسائل کا، جو صدیوں پہلے نکلے تھے، مگر ہیں وہ آج تک زندہ۔ زیادہ نہیں تو یہ قصہ دو صدیوں کا تو ہے ہی۔

جب بھی کوئی سرپھرا کسی ادبی کام کا ڈول ڈالتا ہے تو اُسے ماضی کے ادبی کارناموں اور اُس کے خالقوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے نہ صرف دیکھنا ہی پڑتا ہے بلکہ انھیں اور اُن کے کارناموں کو تولنا بھی پڑتا ہے۔

اس وقت میرے سامنے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے رسائل بکھرے پڑے ہیں۔ آپ بھی ذرا ہمت کریں اور ان میں سے چند ایک کو اُٹھا کر دیکھیں پہلے انیسویں صدی کے رسائل پر نظر ڈالتے ہیں۔

محبِ ہند۔ انجمن پنجاب۔ دہلی سوسائٹی۔ تہذیب الاخلاق، فتنہ پنجاب ریویو دلگداز۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین۔ دبدبۂ آصفی۔ معارف (علی گڑھ) تہذیب النسواں (اور اب بیسویں صدی کے) مخزن۔ عصرِ جدید۔ زمانہ۔ دکن ریویو۔ اُردوئے معلّٰی۔ الندوہ۔ فصیح الملک۔ تمدن۔ الناظر۔ ادیب۔ الہلال۔ العصر۔ معارف۔ اُردو۔ جامعہ۔ اورینٹل کالج میگزین۔ مجلّہ عثمانیہ نساہکار۔ عالمگیر۔ شیرازہ!

ان کے خالقوں سے تو آپ کا تعارف ہوگا ہی۔

لہ کیوں کہ یہ فیصلہ ڈاکٹر صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے کیا تھا۔

ماسٹر رام چندر، محمد حسین آزاد، پیارے لال آشوب، سر سید احمد خاں، ریاض خیرآبادی رجب علی، عبدالحلیم شرر، شبلی نعمانی، رتن ناتھ سرشار، وحید الدین سلیم پانی پتی، سید ممتاز علی! ـــ سر عبدالقادر، خواجہ غلام الثقلین، دیا نارائن نگم، مولانا ظفر علیخاں، حسرت موہانی، حبیب الرحمٰن شیروانی، احسن مارہروی، راشد الخیری، ظفر الملک علوی نوبت رائے نظر، ابوالکلام آزاد، پیارے لال شاکر، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، اسلم جے راج پوری، ڈاکٹر محمد شفیع، محی الدین زور، تاجور نجیب آبادی حافظ محمد عالم، چراغ حسن حسرت۔

اللہ اللہ کیا کیا ادیب تھے اور کیا کیا مدیر۔ ادیب ایسے کہ ان کے ایک ایک لفظ پر مرحبا کہنے کو جی چاہے اور مدیر ایسے کہ اگر ان کے کارناموں کو ذہن میں رکھ لیں تو صلِّ علیٰ کہنے پر مجبور ہوں۔

ان میں سے بہتوں کو میں نے نہیں دیکھا۔ ان کے عہد میں پیدا نہیں ہوا مگر ان کے حسب نسب، ان کے افعال و کردار اور ان کے علم و فضل سے واقف ہوں۔ اس لیے کہ تحریریں تجربوں کے ساتھ آنکھیں بھی دیتی ہیں اور دماغ بھی ـــ اور ہاں صدیوں کی زندگی بھی۔

وقت بڑا بے مروّت واقع ہوا ہے وہ کسی طرح کی غلط بخشیوں کو سینے سے نہیں لگا سکتا۔ یہ لوگ اور یہ رسالے اگر صدیوں کی مار کھا کے بھی زندہ ہیں تو ان میں ضرور "زرامرِ ابن" کا کوئی نہ کوئی قرینہ ہے جبھی تو یہ ادب کے میدانوں میں پہاڑ بن کر کھڑے ہیں۔

اور میں! ـــ پہاڑوں کی اوٹ میں کھڑا ہوں۔" (شمارہ نمبر ۱۰۵)

محمد طفیل واقعی پہاڑوں کی اوٹ میں کھڑے تھے، لیکن بائیس سال کی ادارت کے دوران میں انھوں نے "نقوش" کے ایک سو دو[1] ضخیم نمبروں میں ماضی و حال کے علمی اور ادبی ورثے کو محفوظ کر کے ایک نیا پربت تعمیر کر دیا ہے، اب وہ پہاڑوں کی اوٹ میں نہیں، پہاڑوں کی قطار میں شامل ہیں، اب "تہذیب الاخلاق" اور "مخزن" کی طرح "نقوش" بھی ایک تحریک کی حیثیت رکھتا ہے، ایک ہمہ گیر تحریک، گروہ بندیوں سے آزاد، ماضی کے ورثے کا امین، حال کے ادب کا سب سے بڑا اور متنوع ذخیرہ پیدا کرنے کا داعی، زندگی آموز اور زندگی آمیز

---

[1] جب یہ کتاب چھپ رہی ہے تو ۱۳۱ شمارے چھپ چکے ہیں۔

ادب کا علمبردار، حریتِ خیال کا ضامن۔

کسی زمانے میں ہمارے ادبی رسائل خاص نمبر چھاپتے تھے، مثلاً "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" قیامِ پاکستان سے چند سال پہلے تک سالنامے نکالتے تھے۔ عید نمبر چھاپتے تھے۔ "نیرنگِ خیال" نے اقبال نمبر بھی چھاپا، کرنل مجید ملک اور ڈاکٹر تاثیر نے "کاروان" کے سالنامے مرتب کیے۔ یہ خاص شمارے اپنی جگہ پر بہت اہمیت کے حامل تھے۔ لیکن نقوش کا ہر شمارہ خاص نمبر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کم از کم ضخامت چار سو صفحے رہی ہے لیکن ایسے نمبر بھی نکلے ہیں جن کی ضخامت دو ہزار صفحات کے لگ بھگ ہے۔

"نقوش" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جو کام پہلے اِکّا دکّا رسالہ کبھی کبھی اُدھورا نامکمل اور غیر جامع انداز میں کرتا تھا، وہ اس نے ایک بہت بڑے پیمانے پر، ایک منظم انداز میں اور جامعیت کے تمام تقاضوں کے ساتھ کر کے مجلاتی صحافت کو ایک انسائیکلوپیڈیائی رنگ بخش دیا۔ اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

غزل نمبر میں اُردو غزل کی پونے دو سو سالہ تاریخ پیش کر دی۔

ایک افسانہ نمبر میں اُردو افسانہ نگاری کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ قلمبند کر دی، دوسرے افسانہ نمبر میں عہدِ حاضر کے ممتاز افسانہ نگاروں کی تخلیقات جمع کر دیں۔

طنز و مزاح نمبر میں طنزیہ اور مزاحیہ ادب کی ایک سو پچیس سالہ داستان مرتب کر دی۔

پونے تین ہزار صفحات پر مشتمل دو خاص نمبروں میں گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے علمی، ادبی اور سیاسی خطوط اور مکاتیب اکٹھے کر دیے۔

پچھلے چار سو سال کے دوران میں ہماری بے شمار شخصیتوں نے جو خود نوشت سوانح لکھے۔ اُن کا ایک مجموعہ "آپ بیتی" نمبر کے روپ میں پیش کر دیا۔ یہ مجموعہ کم و بیش دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اس پر مستزاد ڈیڑھ ہزار صفحات کے شخصیات نمبر میں مشاہیرِ ادب کی سوا سو سالہ شخصی تاریخ جمع کر دی۔

پطرس، سعادت حسن منٹو اور شوکت تھانوی کے فن اور شخصیت پر الگ الگ نمبر چھاپ دیے، جن میں ان کی تخلیقات بھی شامل ہیں۔

یکے بعد دیگرے تین ضخیم غالب نمبر چھاپے گئے۔ ایک نمبر میں نو دریافت، بیاضِ غالب

یہ خطِ غالب کے پہلو بہ پہلو دوسری نادر دستاویزات بھی شامل ہیں۔

بارہ سو صفحات پر پھیلے ہوئے "لاہور نمبر" میں شہر لاہور کی نو سو سالہ مستند اور جامع تاریخ مرتب کر دی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ پر مستند مواد جنگ نمبر میں یکجا کر دیا گیا، یہ نمبر ایک ہزار آٹھ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ بہت سے اور نمبر پیش کیے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ نقوش کا ہر عام نمبر بھی خاص نمبر ہی ہوتا ہے۔

ان نمبروں میں ایسا اہم اور نادر مواد دیا گیا ہے جو اکٹھا نہ ہوتا تو اُردو ادب کا بہت بڑا زیاں ہوتا۔ ان نمبروں کی ترتیب میں جس ریاض سے کام لیا گیا ہے، مجلاتی صحافت میں اس کی مثال نہیں ملتی اور اس کا ایک خوش گوار پہلو یہ ہے کہ محققین کا کام آسان ہو گیا ہے۔ کیونکہ انھیں جتنا ماخذی مواد "نقوش" کے خصوصی نمبروں میں ایک جگہ اور اچھی اور مستند صورت میں مل جاتا ہے۔ اتنا بے شمار کتابوں، فائلوں اور مخطوطات میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔ "نقوش" نے جن موضوعات پر خاص نمبر چھاپے ہیں اُن پر مزید تحقیق کا کام سہل ہو گیا ہے اور اس کے لیے محققین یقیناً نقوش کے احسان مند ہیں۔ یہ نمبر اپنے اپنے موضوع پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں ضخامت کو محدود کرنے کی کوئی شعوری کوشش کی جاتی تو اُن کی جامعیت میں فرق آجاتا، ضخامت اور مواد کے اعتبار سے یہ مستقل تصانیف اور تالیفات کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو کام نقوش نے کر دکھایا ہے، وہ ایک معجزے سے کم نہیں، کتاب انسائیکلوپیڈیا اور مجلے کو ایک جگہ سمو کر اور اُسے حُسن بخش کر نقوش نے مجلاتی صحافت میں ایک نئے اور درخشاں باب کا اضافہ کیا ہے۔ سچ پوچھیے۔ تو "نقوش" دُنیا بھر میں اپنی قسم کا پہلا مجلہ ہے۔ کیونکہ ترقی یافتہ ممالک ۔ امریکہ، برطانیہ، سوویت یونین، فرانس، عوامی جمہوریہ چین اور جرمنی میں بھی اتنی جامعیت، اتنی خصوصیت کا حامل اور اتنی ضخامت کا کوئی رسالہ موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب کے سب سے بڑے مؤرخ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ بھی یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ:

"نقوش نے اُردو صحافت میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے، یہ معلومات کی سچ مچ کی کان ہے، اپنے تنوع، مفید اور عظیم الشان نمبروں کی مثال

نہ اُردو میں ملتی ہے نہ ہندوستان کی دوسری بیشتر زبانوں میں ہیں۔"

یہ بتانا بے سُود ہے کہ نقوش کے مضمون نگاروں اور شاعروں میں کون کون سی شخصیتیں شامل ہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ برِعظیم پاک و ہند کی کوئی ایسی علمی و ادبی شخصیت نہیں جس نے نقوش میں کچھ نہ لکھا ہو۔

نقوش کی ایک اور بڑی خصوصیت وہ شذرہ ہے جو ہر نمبر کے آغاز میں درج ہوتا ہے اسے طلوع کا نام دیا گیا ہے اور اسے جناب محمد طفیل لکھتے ہیں "طلوع" کا صفحہ مختصر نگاری اور جامعیت کا ایک امتزاج لطیف سادہ اور سلیس زبان میں پیش کرتا ہے۔ ہم نمونے کے طور پر ایسے تین شذرے اہل نظر کی خدمت میں حاضر کرتے ہیں۔ ایک آپ بیتی ہے، دوسرا شذرہ ادبی ہے تیسرا جگ بیتی ہے۔ پہلے آپ بیتی ملاحظہ ہو[1]

"ادب کی براتیں اس سے پہلے بھی چڑھی ہیں اور بڑے دھوم دھڑکوں کے ساتھ چڑھی ہیں۔ ماضی کی یادوں میں گُم ہو جائیے گا تو شہنائیوں کی آوازیں آج بھی سنائی دیں گی۔

اور لاڈلوں کی طرح نقوش بھی اس دنیا میں آیا۔ پہلے اس کی پرورش کے فرائض میرے بڑے بھائی احمد ندیم قاسمی اور چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور کے سُپرد ہوئے۔ سیانے کہتے ہیں بچپن کی تربیت ہی مستقبل کی نشان دہی کیا کرتی ہے۔

پھر نقوش میرے سب سے بڑے بھائی سیّد وقار عظیم کی آغوش میں پلتا رہا۔ کسر کسی نے بھی اُٹھا نہ رکھی۔ سب ہی نے لاڈ پیار سے رکھا۔ ابھی نقوش تین ہی ماہ کا ہوا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ شرارتی بچّوں کو اس کی بہن بھائی نہ بھی۔ اُنھوں نے ایسی چال چلی کہ یہ بےچارا چھ ماہ تک بے سُدھ پڑا رہا۔

---

[1] یہاں پہنچ کر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے مجھے ٹھوکا دیا۔ چنانچہ میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ کیوں کہ مسودہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے کیا معلوم ہے مجھے کب اور کیا پڑھنا چاہیے۔ باقی دو اداریے بھی مجھے اُن کی آنکھوں کے حکم سے پڑھنے پڑے۔ (م۔ط)

جب نقوش بھکنے اور ٹوں ٹاں کرنے لگ گیا تو اس کی پرورش میرے سپرد ہوئی۔ بیماری بہت اُس وقت اس کی عمر کوئی ڈھائی برس ہوگی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ میری راتوں کی نیند اُچٹ گئی۔ میں سوچتا تھا اتنا خوبصورت اور ہونہار بچہ، اگر میری نگرانی میں پنپ نہ سکا تو کتنی جگ ہنسائی ہوگی، ایں تو لاجوں مرتا رہا۔

میرے مالی حالات بھی زیادہ اچھے نہ تھے مگر میں چاہتا تھا اسے ولایت تک بھیجوں۔ حوصلے اتنے، وسائل محدود، اللہ کی بارگاہ میں دن رات دعائیں مانگیں۔ پھر تو کرنا خدا کا یہ ہوا۔ نقوش نے اپنے پرائے کا من موہ لیا۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے کے لیے اتنی محنت کی اور اتنے خلوص سے کی کہ اُس نے ایک ایک سال میں دو دو تین تین امتحان دینے شروع کر دیے اور اللہ کی مہربانی سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔ اس کے کیے ہوئے پرچے آج پاکستان اور ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں رکھ کر دیکھ لیں۔ اس شان سے کوئی بھی پاس نہ ہوا ہوگا[1]

ماشاء اللہ نقوش اب جوانی میں قدم رکھ رہا ہے۔ کوئی اس کا بانکپن تو دیکھے۔ ڈرتا ہوں کہیں اسے میری ہی نظر نہ لگ جائے۔

واللہ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اسے میری نظروں سے نہ دیکھیں میں تو دیوانہ ہوں۔ دیوانہ نہ ہوتا تو آج نقوش کو یہ مرتبہ نصیب نہ ہوتا مگر مجھے اتنا ہوش ضرور ہے۔ آج میرے بھی لاڈلے کی بارات چڑھی ہے"۔ (شمارہ نمبر ۷۶، ۸۰)

اب ایک ادبی شذرہ ملاحظہ ہو جو نو دریافت بیاض غالب بہ خطِ غالب کے آغاز میں درج ہے:۔

"غالب شناسوں سے غالب کی روح نے چلا چلا کے کہا۔ کم از کم آپ تو میرے اشعار غلط نہ پڑھیں مگر علمیت کے زعم میں کسی نے بات نہ سُنی۔ یوں فریاد فضاؤں میں ڈولتی رہی۔

غالب نے اپنی زندگی میں ایک شعر پر اتنا داد بیلا کیا تھا کہ اپنا نہیں کہا۔

---

[1] یہاں سے ایک پیرا محض احتیاط کے طور پر نشر نہ کیا گیا

"اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر ہزار لعنت" اس کے بعد یہاں تک ظلم ہوا کہ یاروں نے غالب کے نام پر خود غزلیں کہہ ڈالیں (جیسے عبدالباری آسی) غالب کی رُوح گیا کیا نہ تلملائی ہوگی۔ غالب نے اپنے شارحین سے بھی التجا کی کہ میرے جو اشعار کچھ کا کچھ لکھ کر مہمل بنا دیے گئے ہیں، اُنھیں بامعنی بنانے کے لیے اپنی اپنی لیاقت نہ چھانٹیں۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔

جب غالب کا تڑپنا قدرت سے دیکھا نہ گیا تو اس نے یہ انتظام کر دیا کہ غالب کی جو بیاض ادھر اُدھر ہوگئی تھی اسے سب پہ ظاہر کر دیا۔ شعر آئینہ ہو گئے۔ اب اس آئینے میں اہلِ علم کے چہرے فق ہیں اور غالب ہے کہ اُس کی ہنسی ہی نہیں رُک رہی۔

قطرہ شادی مرگ گل ہے" غالب کے لیے بھی" اور ان کے لیے بھی جو غالب شناس ہیں!" (شمارہ نمبر ۱۱۳)

اب تازہ ترین شمارے کا شذرہ ملاحظہ فرمائیے۔ جو سیاست اور ادب کے امتزاج کا مظہر ہے:۔

"میں پریشان ہوں۔

میں پریشان ہوں۔ کیونکہ ہم نے یہ سوچنا شروع کر دیا ہے کہ میں پنجابی ہوں، میں سندھی ہوں۔ میں بلوچی ہوں۔ میں پٹھان ہوں۔

ہم پاکستانی نہیں ہیں۔ کیوں کہ ہم نے رویہ یہ اختیار کر رکھا ہے کہ قومی زبان پنجابی ہونی چاہیے، سندھی ہونی چاہیے، بلوچی ہونی چاہیے۔ پشتو ہونی چاہیے۔

اگر آپ کے مطالبے یہی کچھ تھے تو پھر پاکستان کیوں بنوایا تھا؟ کیوں خوار ہوئے؟ کیوں ذلیل ہوئے؟

پاکستان کا مطالبہ تو اس لیے تھا کہ اس میں جان، زبان اور ایمان محفوظ رہے گا۔

اگر یہ کچھ بیچ دینے کا ارادہ تھا تو پھر کیوں عصمتیں لٹوائیں؟ کیوں بچے کٹوائے؟

اگر اب بھی عقل سے کام نہ لیا گیا تو وہ دن آنے ہی والا ہے جس میں آپ کی ماؤں اور بہنوں کی عصمتیں پھر لٹیں گی اور آپ کے بچے پھر آپ کے سامنے ذبح ہوں گے۔ کیوں کہ زبان کا جھگڑا وہ جھگڑا ہے جس نے مشرقی پاکستان

ہم سے چھنوایا جس دن ہم نے دو قومی زبانوں کو تسلیم کر لیا تھا۔ وہ حصّہ تو اُسی دن ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ باقی جو دن گزرے وہ قدرت کی طرف سے صرف ایک مہلت تھی۔

اب ہم پھر۔

اب ہم پھر اُسی — میں کیا کہوں؟ میں کیسے کہوں؟ میرے قلم میں اتنا بُوتا نہیں کہ وہ آپ کو آپ کی بربادی کا حال سنا سکے۔

مجھے معلوم ہے کہ میری آواز میں اتنی سکت نہیں کہ وہ آپ کو ہوش میں لا سکے۔ کیونکہ آپ نادانی میں جنوں کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اب تو میرے پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان بھائیو! صرف اتنا بتلا دو کہ حشر کی گھڑی کتنی دُور ہے؟

اے رب العالمین۔ اھدنا الصراط المستقیم، اھدنا الصراط المستقیم ؕ"

(شمارہ نمبر ۱۱۷)

میرزا ادیب:۔ ڈاکٹر خورشید صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے اپنی جان دار تحریر میں مجلّہ نقوش کی پوری تاریخ اور اس کی وقیع ادبی خدمات واضح کر دی ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ہمارے سننے والے اس فیچر سے ضرور محظوظ ہوئے ہوں گے۔ حُسنِ اتفاق سے اس وقت ہمارے اسٹوڈیو میں اُردو کے نامور نقّاد و محقق ڈاکٹر وحید قریشی اور بلند پایہ افسانہ نگار صادق حسین صاحب کے علاوہ خود مدیر نقوش جناب محمد طفیل بھی موجود ہیں۔ موقعہ ملا ہے تو نقوش کے متعلق کچھ باتیں ان سے بھی ہو جانی چاہییں۔

صادق حسین صاحب! آپ کس زمانے سے نقوش میں لکھ رہے ہیں؟"

صادق حسین: "میں ۱۹۵۴ء سے لکھ رہا ہوں۔"

میرزا ادیب: "نقوش میں جو آپ کا پہلا افسانہ چھپا تھا۔ اس کا عنوان کیا ہے؟"

صادق حسین: "میرا پہلا افسانہ 'لوفر' تھا۔ جو نقوش کے افسانہ نمبر میں چھپا تھا۔"

میرزا ادیب: "نقوش نے ادب کے مختلف موضوعات پر بڑے متنوع قسم کے خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ افسانہ نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ ان افسانہ نمبروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

صادق حسین :- تقسیم کے بعد میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مشرقی پاکستان کے مختلف دُور افتادہ علاقوں میں رہا۔ میں جہاں بھی گیا وہاں نقوش کے مداح پائے۔ پڑھنے والے نقوش کے نئے شمارے کے منتظر رہتے تھے۔ میں نے اپنا پہلا افسانہ "بوفے" چاٹگام سے بھیجا تھا۔ آپ نے افسانہ نمبروں کے بارے میں میری رائے دریافت کی ہے۔ نقوش نے تو ہر صنفِ ادب پر احسان کیا ہے۔ آپ نے مجھ سے شاید افسانہ نگار کی حیثیت سے افسانہ نمبروں کے بارے میں سوال کیا ہے۔ میں یہ بات کہنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں کہ نقوش سے بہتر کسی نے افسانہ نمبر نہیں چھاپے۔ اس کی وجہ غالباً مدیر نقوش کی پرکھ ہے۔ میری رائے میں نقوش ایک INSTITUTION کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔"

میرزا ادیب :- ڈاکٹر وحید قریشی صاحب! آپ کا تعلق نقد و نظر سے ہے۔ آپ فرمائیے تنقید و تحقیق کے سلسلے میں نقوش نے کیا رول ادا کیا ہے؟

ڈاکٹر وحید قریشی :- ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنی تقریر میں، نقوش کے بعض محاسن کی طرف توجہ کرائی ہے۔ خصوصاً نقوش کے خاص نمبروں اور طفیل صاحب کے اداریوں کے بارے میں اُنھوں نے اپنا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس سے تحقیق اور تنقید کے سلسلے میں نقوش کی اہمیت پر بھی بالواسطہ روشنی پڑی ہے۔ طفیل صاحب نے اپنی مدیرہٹی بیان کرتے ہوئے اپنے بہن بھائیوں کا ذکر بہت کیا ہے۔ اس سے ان کی نیکی اور شرافت پر خواہ مخواہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ سارے بہن بھائیوں کی ادارت میں نقوش کے کل سترہ اٹھارہ پرچے نکلے۔ اصل نقوش جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، وہ محمد نقوش ہی کی ادارت کے پرچے ہیں۔

میرزا ادیب :- ڈاکٹر صاحب، نقوش کے خاص نمبروں کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟

ڈاکٹر وحید قریشی :- ادبی پرچوں میں نقوش واحد مجلّہ ہے جس میں تحقیق اور تنقید کی ہم آہنگی پر زور دیا گیا ہے۔ اور ادب کی دیگر اصناف کے ساتھ ادق قسم کے تحقیقی مقالوں، ادب کے تنقیدی رجحانات اور بعض ہلکی پھلکی اصناف کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل ہی سے تحقیق اور تنقید کے رشتے ٹوٹ گئے اور دونوں اصناف نے ایک دوسرے سے الگ ہو کر نشو و نما شروع کر دی جس کے نتیجے میں ادبی پرچوں میں تنقید تو موجود رہی لیکن تحقیق کو "مجلّہ بدر" کر دیا گیا۔ اب تحقیق معارف، اورنٹیل کالج میگزین، برہان،

اُردو اور صحیفے کے حصے میں آئی اور محققین نے اس طرح اپنی الگ بستیاں بسانی شروع کر دیں۔ نقوش کی یہ "بدعت" آج بھی جاری ہے کہ انھوں نے تنقید کے فلک بوس عبد بعد محلات کے عین درمیان تحقیق کی جھگیاں ڈال رکھی ہیں۔ نقوش اُن معدودے چند رسائل میں سے ہے جنھوں نے تحقیق اور تنقید کے رشتوں کو دوبارہ مربوط کرنے کی کوشش کی اور قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی، مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر سید عبداللہ کو نقادوں کے دوش بدوش، نقوش کے صفحات میں جگہ دی اور ادب کو بحیثیت کل دیکھنے کے لیے اُس کے قاری پیدا کیے۔

میرزا ادیب:۔ بے شک!۔ یہ تو ہوئی تنقیدی مضامین اور تحقیقی مضامین کو ایک ساتھ پیش کرنے کی اجتہادی کوشش، بہرحال میری گذارش یہ ہے کہ آپ ذرا تفصیل سے، خاص خاص نمبروں اور نقوش کے غالب نمبروں کے بارے میں کچھ فرمائیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی:۔ نقوش نے تحقیق میں بعض نئے مسائل کو اہمیت دی نقوش کے خاص نمبر اس سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ نمبر ایسی مستقل دستاویزیں ہیں جنھیں تاریخ کا طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا تو بے جا نہ ہوگا، مکاتیب نمبر، آپ بیتی نمبر، طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر اور شخصیات نمبر ایسی ادبی دستاویزیں ہیں جن سے تحقیق و تنقید کے بعض نئے گوشے منور ہوتے ہیں۔ ان نمبروں میں قاری کو ایسا نیا مواد بھی ملتا ہے جس سے تحقیق کے پرانے نظریے اور ادبا کی زندگی کے بارے میں پرانی معلومات رد ہو جاتی ہیں اور ہمیں ادب کو تحقیقی انکشافات کے ذریعے نئے سرے سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ضخیم نمبروں میں یقیناً بعض کمزور مضمون بھی آگئے ہوں گے بعض لکھنے والوں کی آرا سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ تاریخ ادب کا کوئی طالب علم بھی ان نمبروں کو پڑھے بغیر اپنے مطالعے کی تکمیل کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

میرزا ادیب:۔ ڈاکٹر صاحب غالب نمبر۔

ڈاکٹر وحید قریشی:۔ غالب کے سلسلے میں نقوش کے نمبر امتیازی حیثیت رکھتے ہیں خصوصاً بیاضِ غالب کی دریافت وہ عظیم کارنامہ ہے جس نے مطالعۂ غالب کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا ہے۔ باقی نمبروں کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بیاضِ غالب کی اشاعت

ایک ایسا عہد آفریں کارنامہ ہے جس نے اُردو تحقیق میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ طفیل صاحب نادر چیزوں کی جمع آوری میں بڑے مشتاق ہیں۔ مکاتیب نمبر میں کئی نادر چیزیں سامنے آئیں۔ غالبؔ کے بارے میں بھی ان کی تگ و دو ایسا مواد ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب ہوئی ہے کہ غالبؔ پر اب تک جو کام ہوا تھا اس کا نئے سرے سے جائزہ لینا ناگزیر ہو گیا ہے۔ اب اگر "اقبال" کے بارے میں اور "تاریخ ادب اُردو" کے بارے میں اُنھوں نے اپنے عزائم کو عملی صورت دے دی تو اس سے بھی کئی نئے راستے کھلنے کا امکان ہے۔

میرزا ادیب:۔ "ڈاکٹر صاحب، نقوش کے ادارتی پہلو کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

ڈاکٹر وحید قریشی: طفیل صاحب ایک اچھے ادیب اور ہنرمند مدیر کے طور پر خاص سلیقہ رکھتے ہیں، مختلف مزاج اور مختلف درجہ حرارت رکھنے والے ادیبوں سے اپنے ڈھب کی چیزیں نکال لاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی شخصی بصیرت ان کی تنقیدی بصیرت کا لازمی جزو بن جاتی ہے۔ بہ طور ادیب یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ مختلف ادبی اور غیر ادبی گروہوں سے تعلق رکھنے والے ادیب نقوش کی محفل میں اکٹھے بیٹھنے پر معترض نہیں ہوتے۔

میرزا ادیب:۔ "واقعی یہ ان کی بڑی کامیابی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی:۔ ہر پرچہ اپنے مزاج سے پہچانا جاتا ہے۔ نقوش کا مزاج تحقیق اور تنقید کے تال میل سے پیدا ہوا ہے۔ بظاہر نقوش کے عام نمبر اور خاص نمبر ادب کے گلدستے معلوم ہوتے ہیں جس میں ہر طرح کا مال موجود ہے لیکن بغور دیکھا جائے تو ایسی صورت نہیں۔ ہر شمارے کے مختلف مضامین اپنی جگہ الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک معنوی ربط رکھتے ہیں۔ مدیر مجلوں میں لکھنے والوں کی نگارشات کو محض یکجا نہیں کرتے بلکہ ان کے درمیان ربط پیدا کرنا بھی ایک اچھے مدیر کا شیوہ ہے۔ نقوش کے مختلف شماروں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ اس کا مدیر محض متفرق چیزوں کو پیش نہیں کرتا بلکہ ان میں ربط و تسلسل قائم کرکے پرچے کی ایک TONE بناتا ہے۔ نقوش کی ٹون کچھ ایسی منفرد تھی کہ بعد میں آنے والے پرچے بھی اس کی تقلید سے پوری طرح آزاد نہ ہو سکے۔ مگر۔

میرزا ادیب:۔ ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ! اب میں آخر میں محمد طفیل صاحب

مدیر نقوش سے بھی یہ جاننا چاہوں گا کہ ہمیں بتائیں کہ مستقبل پر کیا کچھ کرنے کی ٹھان رکھی ہے؟

محمد طفیل:۔ میرزا صاحب! یہ قصے سانس کی آمد و رفت کے ہیں۔ اگر قدرت نے مہلت دی تو میں یہ چاہوں گا کہ پہلے اپنے تمام نمبروں پر نظرِ ثانی کروں۔ اُن کی کوتاہیوں کو دُور کروں ضروری اضافے کروں۔ کیوں کہ مَیں نے اپنے کسی بھی کام کو حرفِ آخر نہیں سمجھا بلکہ صرف آغازِ کار جانا! پھر یہ بھی خواہش ہے کہ ڈراما، تنقید اور مثنوی پر بھی اپنے نمبر پیش کروں تاکہ تمام اصنافِ ادب کا احاطہ ہو سکے۔ اِن کے علاوہ میں تاریخِ ادبِ اُردو نمبر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ایک تاریخ علی گڑھ والوں نے چھاپی تھی۔ ایک تاریخ پنجاب یونیورسٹی والوں نے چھاپی ہے۔ یہ دونوں تاریخیں مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ تُو بھی طبع آزمائی کر، ان اداروں نے لاکھوں کے سرمایہ سے یہ تاریخیں چھاپی ہیں، مَیں کروڑوں کے خلوص سے اس کام کو انجام دوں گا، اور انشاءاللہ...... اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں کہ آپ کو اپنے کس کام یا کس نمبر سے زیادہ خوشی ملی تو میں یہ عرض کروں گا کہ وہ کام یا وہ نمبر ابھی میں نے پیش ہی نہیں کیا۔ یعنی ابھی میرا سیرۃِ رسولؐ پر نمبر مکمل نہیں ہوا۔ میرا جذبہ یہ کہتا ہے کہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ کے ساتھ ساتھ، اگر اُردو ادب کے پاس کوئی اثاثہ ہو تو وہ نقوش کا رسولؐ نمبر ہو۔

جلسے ہی جلسے

محمد طفیل

جنابِ صدر، جنابِ مہمانِ خصوصی، خواتین و حضرات!

میری اس تحریر کے آپ ہی مخاطب نہیں، میں بھی اُسی زُمرے میں آتا ہوں کہ کوئی محمد طفیل، محمد نقوش کے بارے میں بھی باتیں کرتا ہے۔

میری یہ تقریر عجیب سی تقریر ہے، میری کسی تقریر سے لگّا نہیں کھاتی، میری کسی تحریر سے مماثلت نہیں رکھتی۔ جب میں نے سوچا کہ مجھے یہ تقریر کرنل محمد خان، جنرل شفیق الرحمٰن، سیّد ضمیر جعفری اور کرنل صدیق سالک کے شہر میں پڑھنی ہے تو میری یہ تحریر میرے ہاتھ سے نکل گئی۔

آپ سوچ رہے ہونگے کہ شاید میں نے مزاحیہ تحریر لکھی ہے۔ حاشا وکلّا ایسا بھی نہیں، اسی لیے تو میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ عجیب سی تقریر ہے۔

یہ تقریر نہ تو محمد طفیل کے بارے میں ہے نہ نقوش کے بارے میں، نہ انیس نمبر کے بارے میں، اس کے باوجود یہ تحریر، محمد طفیل، نقوش اور انیس نمبر کے بارے میں ہے۔ ویسے کوشش یہ کی ہے کہ یہ تحریر اُن تقریبات کے بارے میں ہو جو کہ پچھلے ایک ماہ کے دوران ہوئیں اور نقوش کے بارے میں ہوئیں۔

میں لاہور سے آپ کا فقط شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ ساری زندگی میں اپنے رب کے حضور سربسجود رہا ہوں، اس لیے کہ اُس نے مجھے اس دُنیا میں، ایک کے بدلے ستّر نیکیوں کا اجر دیا۔ ستّر گنا نوازا۔ میرا خیال ہے کہ اللہ نے مجھے اس دُنیا میں اتنا کچھ دیا ہے کہ آخرت کا کوٹا بھی خرچ ہو گیا ہوگا۔ یہی وہ خوف ہے جو مجھے اچھے کام کرنے پر اُکساتا رہتا ہے۔

باقی جو تھوڑی بہت زندگی ہے اس میں مزید احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ حقوق العباد بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کا بھی بہ صمیمِ قلب شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کیونکہ آپ نے بھی مجھے ایک کام کے بدلے دس تعریفوں سے نوازا۔

سوال یہ ہے کہ آپ کی محبّتوں کے بدلے' میں نے آپ کو کیا دیا؟ سوچتا ہوں تو میرا ضمیر مجھ سے کہتا ہے ـــــ کہہ دے! تُو نے اپنی زندگی اپنی خاطر نہیں گزاری، دوسروں کی خاطر گزاری!

میں جتنا تقریبات سے بچتا تھا اتنا ہی اب کے ملوث ہو گیا۔ ایک جلسہ لاہور میں ہوا، ایک کراچی میں اور ایک یہ اسلام آباد میں!

میں کیا ہوں؟ میری ادبی خدمات کچھ ہیں یا نہیں؟ اُن کے بارے میں ماضی میں بھی باتیں ہوتیں، آج بھی ہو رہیں، آئندہ بھی ہوں گی، کیونکہ میں نے ماضی کو حال سے مربوط کر دیا ہے۔ اور میرا یہ جُرم ناقابلِ معافی ہو گا، کیونکہ لوگ تو بھائی کو بھائی سے جُدا کرتے ہیں!

مجھے اپنی اہلیت پر کوئی ناز نہیں، مجھے اپنی قابلیت پر کوئی گھمنڈ نہیں، اگر کوئی گھمنڈ ہے تو اس بات پر کہ اردو کا کوئی قابلِ ذکر ادیب ایسا نہیں کہ جس نے نقوش کو آسمانِ ادب پر بٹھانے میں میرا ساتھ نہ دیا ہو، میں نے زندہ تحریریں چھاپی ہیں ـــــ چاند ہو گا تو روشنی بھی ہو گی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے اس موقع پر اتنی سینہ زوری والا انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ آپ کا خیال صد فی صد درست بھی ہے مگر میں کیا کروں؟ پہلے پہل میں نے بھی اپنی تحریروں کا انداز فدویانہ اور خاکسارانہ رکھا۔ یاروں نے یہ سمجھا کہ جب یہ خود لکھتا ہے کہ میں ناچیز ہوں، فدوی ہوں، کمترین ہوں۔ لہٰذا یہ شخص "او وہی ای" ہو گا۔

اس کے بعد مجھے وہ لطیفہ بھی یاد آ گیا کہ ایک شخص مارے انکسار کے اپنے نام سے پہلے ننگِ اسلاف لکھا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک وقت وہ آیا کہ لوگوں نے ننگِ اسلاف کا لفظ اس کے نام کا لازمی جزو بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ناچیز محمد طفیل' سے محمد طفیل بننا پڑا۔ کیونکہ ہم روح میں سچی نیکی کو نہیں دیکھ سکتے، ماتھے پر آویزاں بورڈ کو پڑھتے ہیں۔

مجھے کئی شوق ہو سکتے ہیں، اچھے بھی بُرے بھی، مگر یہ شوق کبھی نہیں رہا کہ میرے بارے میں تقریبات ہوں۔ کیونکہ میں تو اصولاً ہنگاموں سے دُور رہنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس طرح عبادت میں خلل پڑتا ہے، مجھے پیکا صرف کام کا ہے۔ یقین کیجیے کہ اگر کوئی میری تعریف کرتا ہے تو میری حالت ویسی ہوتی ہے کہ جیسے کسی عورت کو کسی مرد نے تفریحی فقرہ کہہ دیا ہو۔

یہاں یقیناً یہ سوال آپ کے ذہن میں اُبھرا ہو گا کہ جب جلسے جلوسوں سے دلچسپی نہیں تو پھر یہ اور ایسے ہنگامے کیوں؟ وجہ عرض کرتا ہوں۔ اپنا بھرم کھلتا ہے تو کُھل جائے۔

میں چاہتا ہوں کہ ادب سے میرا تعلق قائم رہے ۔ یعنی میں نے تو چھاپنے کو تو ادبی معرکے نمبر چھاپ دیا ، میر انیس نمبر بھی چھاپ دیا ۔ مگر ادبی منڈی میں مانگ حسبِ سابق نہ ہوئی ۔ دکانداروں نے لکھا ۔ مارے گئے ۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو بہت بُرا بھلا کہا ۔

ادھر اپنے اسٹاک پر نظر ڈالی تو وہاں بھی ایک لاکھ کے پرچے موجود ۔ جب گھر کو آگ لگتی ہے تو لوگ شور مچاتے ہی ہیں ۔ میں نے بھی شور مچایا ۔ لاہور میں جلسہ کر ڈالا ۔ اگر میرے نمبر حسبِ سابق ٹھیک ٹھاک انداز میں فروخت ہو رہے ہوتے تو کوئی جلسہ نہ ہوتا ۔ کیونکہ میں ڈھنڈورا پیٹ کر اپنے کاموں کی توہین کرنا نہیں چاہتا ، اور نہ ہی اس قوم کا بھرم کھولنا چاہتا ہوں کہ اسے ادب کی بجائے " فنونِ لطیفہ " سے دلچسپی ہے ۔

آپ مایوس نہ ہوں کہ ادب کے قدر دان یکسر ناپید ہیں ۔ قدر دان ہیں ۔ میں قدر دانوں کے ایک طبقہ سے آپ کا تعارف کراتا ہوں ۔ ایک ٹیلیفون آتا ہے " اب کے آپ نے غالب نمبر کی صورت میں ، غالب کی بیاض خوب چھاپی ۔"

میرا جواب : " بس اللہ کا کرم ! "

قدر دان صاحب : " پہلے آپ مجھے ایک پرچہ مفت دیا کرتے تھے اب کے دو پرچے لوں گا ۔"

چنانچہ اپنے قدر دانوں کو میں نے ادبی معرکے نمبر ۲۲ ہزار کے مفت بانٹے ، اور میر انیس نمبر ۱۴ ہزار کے ۔ کون کہتا ہے کہ ادب کی قدر نہیں ہوتی ؟

نقوش کی بات چھڑی ہے تو دو چار باتیں اور نقوش کے سلسلے میں کرلی جائیں ۔ یہ باتیں تصنیف کے سلسلے میں نہ ہوں گی بلکہ بیانِ صفائی کے طور پر ، عموماً اس خاکسار پر اس قسم کے الزامات لگائے جاتے ہیں ۔ مثلاً سال میں دو تین پرچے کیوں نکالتے ہو ؟ یعنی اس خادم سے مطالبہ یہ ہے کہ جلدی جلدی روپیہ ضائع کیوں نہیں کرتے ؟

دوسرا اعتراض ، یہ پرچہ جانبداری برتتا ہے ، یا یہ کہ سی ۔ ایس ۔ پی افسروں کو چھاپتا ہے ——— اگر اتنے سی ۔ ایس ۔ پی افسر ہیں تو باقی کا عملہ کدھر گیا ؟

تیسرا اعتراض ، مُردہ ادیبوں کی تخلیقات کیوں چھاپتے ہو ، اور کیوں زندوں کو مُردہ بنا رہے ہو ؟ ——— چونکہ یہ دَور اپنے اسلاف سے ناراض ہے ، بزرگوں سے بھی ناراض ، اس لیے مجھ سے بھی ناراض ، کیونکہ میں بھی ادب میں بزرگ ہو گیا ہوں ۔

یہاں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ ادب کی ترویج و ترقی میں ، میں ماضی کے ادب کو

نہیں بھلا سکتا۔ اُس کی مثال ایسی ہے جیسے وہ عمارت کی پہلی منزل ہو اور آپ دوسری یا تیسری منزل۔ اگر آپ پہلی منزل کے ڈھا دینے کے چکر میں ہوں گے، تو پھر دُوسری یا تیسری منزل قایم نہ رہ سکے گی۔

لہٰذا دوستو! (دوستوں میں خواتین شامل نہیں) میں نے آج تک جتنا بھی بُرا بھلا کام کیا ـــــ اس کی ایک وجہ ہے۔ وجہ یہ کہ آپ مجھے مسلسل 'چڑھ جا بیٹا! سُولی پر' نہ کہتے رہتے تو میں اتنی بار کبھی سُولی پہ نہ چڑھتا۔

آج جب میں نے قلم اُٹھایا تو یہ طے کر لیا تھا کہ نہ تو میں اپنے بارے میں کچھ کہوں گا۔ اور نہ نقوش کے بارے میں، بلکہ اُن دو تین تقریبات کا ذکر کروں گا جو ایک ماہ کے اندر لاہور' کراچی اور اسلام آباد میں ہو گئیں، مگر ستیا ناس ہو اُس اَنا کا کہ جو ہر ہر موڑ پر میرے سامنے آ جاتی ہے اور کہتی ہے' میں بڑی بیلی ہوں، میں بڑی البیلی ہوں۔

لہٰذا سامعین کرام! میرے سارے اد ارتی گناہ اس لیے معاف کر دیجیے گا کہ خود کو فریب میں مبتلا رکھنا، سکون بخش سودا ہے ـــــ ہاں تو کراچی کی تقریب کا ذکر ہو جائے۔

کراچی کے دوستوں نے اطلاع بھجوائی، 'دوڑے آؤ، ہنگامہ ہونے والا ہے۔ میں نے جواب بھجوایا 'نیک بختو! میں تو پہلے ہی دوڑ دوڑ کے تھک چکا ہوں، اب اور نہ دوڑاؤ، مگر وُہ اپنی ضد پہ اڑے رہے' آؤ آؤ!

ادھر اپنا حال یہ ہے، جو فیصلہ کر لیا، بس کر لیا، ترمیم کیا معنی، اگر میری خُو ایسی نہ ہوتی تو آدھی عمر سوچنے میں اور آدھی ترمیم میں گزر جاتی۔

بہرحال میں کراچی نہ گیا اور وہ تقریب میری عدم موجودگی میں ہوئی۔ یہ تو آپ نے سن رکھا ہے کہ پیٹھ پیچھے لوگ تو بادشاہ کو بھی بُرا بھلا کہہ دیتے ہیں، مگر کراچی کے دوستوں نے اپنے محاورے سے بھی کوئی فائدہ نہ اُٹھایا۔

میں کراچی کے "کراچی پن" کا بہت قائل ہوں کہ وہ اِدھر کے رہنے والوں کو بہت مشفقانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اب یہ ہے کہ اس مشفقی میں کبھی مشفقی زیادہ ہو جاتی ہے اور کبھی کم! بہرحال میں اپنے دوستوں کے اُس بے پایاں کرم کو کبھی بھلا نہ سکوں گا۔ اگر بُھلاؤں گا تو بعد مشورہ!

یہ تیسری تقریب جناب غضنفر مہدی کی کوششوں سے اور ناصر زیدی کی ناکوششوں سے برپا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں ناصر زیدی کا زیادہ اور غضنفر مہدی کا کم ممنون ہوں ـــــ اور جناب

عنایت کبریا صاحب کا تو میں صدقی صد شکر گزار ہوں اس لیے کہ زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے ، کون کہتا ہے کہ دنیا بھلے آدمیوں سے خالی ہو رہی ہے ؟

یقین کیجیے کہ میں اس تقریب کے زیادہ حق میں نہ تھا۔ جب بھی بات ہوئی میں نے جواب میں کہا چھوڑو یار ـــــ یا پھر یہ کہا ـــــ جلدی کیا ہے ہو جائے گی ، پھر جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ غضنفر مہدی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے تو میں نے کہا اللہ تیرا شکر۔

شکر کا پہلو صرف اتنا تھا کہ تقریب ملتوی ہو گی ، ورنہ ایک انسان کی تکلیف پر ، سب سے زیادہ میں روتا ہوں۔ ایک بار میرے چلتے پنکھے سے لگ کر ایک چڑیا زخمی ہو گئی تھی اور اُس دن میں کوئی کام نہیں کر سکا تھا۔

بہر حال یہ تقریب برپا ہونا تھی ، ہو گئی۔ دوستوں نے مجھے ممنونِ احسان بنانا تھا ، بنا لیا مگر یہاں ایک لطیفہ تو کہتا چلوں ، اول تو میرا 'انیس نمبر' چھاپنا ایک واقعہ بنا۔ پھر جب انیس نمبر کا کراچی میں جلسہ ہوا۔ دوبارہ جب یہاں ہونے لگا تو مجھے ایک دوست نے بہت رازدارانہ پوچھا ـــــ "شیعہ ہو گئے ہو ؟"

میرا جواب یہ تھا : لوگ کٹر سُنی ہوتے ہیں ، کٹر شیعہ ہوتے ہیں ، میں "کٹر ادبی" ہوں میرا مذہب اسلام کے بعد ادب ہے !

میں نے کراچی اور اسلام آباد کی تقریبات کے بارے میں دو دو چار چار جملے کہے مگر لاہور کی تقریب کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں کی تقریب کے بارے میں ، اخباروں میں اتنا کچھ چھپ چکا ہے کہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس کے باوجود ایک دو باتیں سُن ہی لیجیے۔ وہ یہ کہ جناب میر علی احمد تالپور ، لاہور کی محفل کے صدر تھے ، عین واردات کے دوران صدرِ مملکت تشریف لے آئے۔ میں جو بدحواسیوں کا بادشاہ ہوں بھلا اُس محفل میں کیوں نہ اپنی کارگزاری دکھاتا۔ مثلاً اسٹیج سے اعلان ہوا کہ طفیل صاحب صدرِ مملکت کی خدمت میں ، اپنا نیا نمبر ، یعنی انیس نمبر پیش کریں گے۔ تو صورت یہ تھی کہ میں اسٹیج پر کھڑا تھا اور صدرِ مملکت اسٹیج کے نیچے۔ بعد میں مجھے لوگوں نے بتایا کہ یہ حرکت تو پروٹوکول کے خلاف ہو گئی۔

جواب میں ، میں نے کہا ، آپ کس پروٹوکول کی بات کرتے ہیں ، میں تو اُس پروٹوکول کو جانتا ہوں جس میں دُنیاوی رکھ رکھاؤ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

یہی بات میں میر علی احمد تالپور سے بھی کہتا ہوں کہ اُس ہنگامے میں کوئی بات حفظِ مراتب کے خلاف ہوگئی ہو تو اس سے کوئی اثر نہ لیں، کیونکہ میرے نزدیک جو لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں، اصل میں وہ سب کچھ نہیں دیکھتے۔

سامعینِ کرام! میری باتیں بہت اُڑانوں والی ہوتی ہیں، اُڑان کے لیے پَر ضروری ہوتے ہیں، اور میرے پر آپ ہیں، اہلِ قلم ہیں، تنہا میں کچھ نہیں، فضیلت کے جتنے پھندنے میری دستار میں لگے ہیں، وہ سب سجاوٹیں آپ کے قلم کی ہیں۔

لیجیے مضمون ختم ہوگیا۔ خدا آپ کو زندہ سلامت رکھے تاکہ آپ کی اس قسم کی واہ وا پر ادب کا یہ منصور، ایک بار پھر سُولی پر چڑھ سکے۔

"بڑے بڑے ادیبوں کے میرے نام ہزاروں خط آئے ہوں گے، جن میں کچھ ضائع ہو گئے، کچھ کو دیمک چاٹ گئی، کچھ ہیں ـــــ مگر مجھے ان کی اشاعت کا کبھی خیال نہ آیا ـــــ"

محمد طفیل:

[نقوش، پطرس نمبر، صفحہ ۷]

چند خطوط

۱۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۲۔ رام بابو سکسینہ
۳۔ رشید احمد صدیقی
۴۔ نیاز فتح پوری
۵۔ پطرس بخاری
۶۔ وحشت کلکتوی
۷۔ عبدالرحمٰن چغتائی
۸۔ چودھری محمد علی ردولوی
۹۔ ل۔ احمد اکبرآبادی
۱۰۔ نصیرالدین ہاشمی
۱۱۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور
۱۲۔ مولانا حامد حسن قادری
۱۳۔ مولانا امتیاز علی عرشی
۱۴۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں
۱۵۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب
۱۶۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین
۱۷۔ معین الدین احمد ندوی
۱۸۔ مولانا عبدالمجید سالک
۱۹۔ آغا محمد اشرف
۲۰۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
۲۱۔ جیلانی بانو
۲۲۔ ابن انشا
۲۳۔ غلام عباس
۲۴۔ دیوندر ستیارتھی
۲۵۔ شوکت تھانوی
۲۶۔ ن۔ م۔ راشد
۲۷۔ شاہد احمد دہلوی
۲۸۔ حکیم احمد شجاع
۲۹۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری
۳۰۔ ڈاکٹر گیان چند
۳۱۔ عبدالقوی دسنوی
۳۲۔ مختار صدیقی
۳۳۔ قیوم نظر
۳۴۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

(۱)

بابائے اردو مولوی عبدالحق:

مکرمی محمد نقوش صاحب سلمہٗ! آپ نے مجھے "نقوش" کا نمبر عنایت فرمایا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر دنگ رہ گیا اور ہاتھ لگاتے ہُوئے ڈرتا تھا۔ اتنا ضخیم اور جیم —— رسالہ کیا پُورا توپ خانہ ہے پھر مختلف اور متنوع مضامین سے بھرپور، لکھنے والوں میں ایک سے ایک بڑھیا، باوجود ان تمام خوبیوں کے مجھے کبھی پُورا پڑھنا نصیب نہ ہوا۔ جب باوجود شوق کے پُورا نہیں پڑھ سکتا تو حیرت ہے کہ آپ اتنے سارے اور اتنے اچھے مضمون کیوں کر لکھواتے اور انہیں مرتّب کرتے اور چھاپتے ہیں اور شائع کرتے ہیں اور اس زمانے میں جب کہ ہر شئے کی گرانی کے ساتھ کاغذ بھی گراں ہو گیا ہے آپ کو اپنے صاحبزادے نقوش سلمہٗ کی پانچویں سالگرہ مبارک ہو۔ یہ ایسا خوبصورت، ہونہار، موٹا تازہ، گبھرو سا ہے کہ دیکھے سے نظر لگتی ہے۔ خدا اس کو نظرِ بد سے اور مجھے آپ کے تقاضوں سے بچائے۔

○

"نقوش" (شخصیات نمبر): یہ پوٹ کی پوٹ، اکٹھے سات سو صفحے، خدا کی پناہ! اسے رسالہ کون مسخرہ کہتا ہے، یہ تو ابوالرسائل ہے۔ اس پر اظہارِ رائے آسان نہیں۔ اتنی ساری شخصیتیں اور ان پر لکھنے والوں کی شخصیتیں، اور ان پر مقالے ایک طومار ہے۔ یہ نمبر دراصل قاموس شخصیات ہے جو مدتوں یادگار رہے گا اور لوگ حوالے اور استناد کے لیے اسے ڈھونڈا کریں گے آپ کا ہر نمبر کسی خاص موضوع پر ہوتا ہے اور یہ آپ کا کمال ہے کہ ہر موضوع پر اچھے اچھے لکھنے والے آپ کو مل جاتے ہیں مگر تازہ شخصیات نمبر سب پر بازی لے گیا۔ اب صرف ایک شخصیت رہ گئی ہے جو عجیب و غریب ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک نہیں ہو سکتا، کئی ہوں گے۔ عجب نہیں کسی روز پورا نمبر آپ ہی کی شخصیت پر نکلے۔

(۲)

رام بابو سکسینہ:

"The Nuqoosh has made history for Urdu Journalism. It is a veritable mine of information. There is no parallel in Urdu, or in most of the languages of India for such varied, useful and monumental numbers. Only the genius of the compiler and organiser, Mohammad Tufail, could achieve the miracle. The "MAKATIB NUMBER" is a veritable feast and offers variegated fare of high quality. I congratulate all concerned on the splendid achievement. All lovers of Urdu owe a debt of gratitude to this master spirit."

Dr. RAM BABU SAKSENA
Member Sahitya Academy India.
(مصنف تاریخ ادب اُردو)

مصنف تاریخ ادب اردو۔

(۳)

رشید احمد صدّیقی:

"نقوش" بڑا اچھا رسالہ ہے۔ اسے دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوجاتی ہے۔ اس کی سلامتی اور کامیابی کا خواہشمند ہوں۔"

○

"نقوش" کا ہر پرچہ بڑا دیدہ زیب اور اتنا ہی قابلِ قدر ہوتا ہے۔ یہ میری ہی رائے نہیں ہے، مجھ سے بہتر لوگ بھی یہی رائے رکھتے ہیں"۔

○

"نقوش" کا شخصیات نمبر بہت اچھا نکلا۔ اس نمبر کے گراں بہا ہونے میں شبہ نہیں۔ اردو کے خدمت گزاروں کے بارے میں بڑی مفید، دلچسپ اور مستند باتیں اکٹھی کر دی گئی ہیں اور آپ اس خدمت اور کارنامے پر مبارک باد کے مستحق ہیں"۔

○

طنز و مزاح نمبر بھی اپنے پیش روؤں کی طرح حسبِ توقع خاطر خواہ نکلا۔ خاص نمبر شائع کرنے میں آج شاید آپ کا کوئی ہمسر نہیں۔ آپ یقیناً اپنے کارناموں پر فخر کر سکتے ہیں"۔

(۴)

نیاز فتح پوری:

"تازہ "نقوش" مل گیا اور تازہ باسی پر کیا موقوف ہے۔ نقوش جب بھی ملتا ہے میں اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ آپ اتنا اچھا، اتنا ضخیم، اس قدر خوب صورت و دل کش پرچہ نکالنے میں کیونکر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کے خریدار اتنے ہیں کہ تمام مصارف پورے ہو جاتے ہیں تو یہ یقیناً نقوش کا معجزہ ہے۔ اگر یہ نتیجہ ہے صرف آپ کی باطنی قوت و ہمت کا تو آپ کے ولی ہونے میں شک نہیں اور اگر آپ محض ایثار سے کام لے کر یہ سب کچھ کر رہے ہیں تو پھر آپ اپنے وقت کے حاتم بھی ہیں اور غالباً دولت کے لحاظ سے قارون بھی! پھر ایسے پرچے کے متعلق جو بجائے خود ایک معجزہ ہو اور جس کے نکالنے والے قطب و ابدال کی حیثیت رکھتے ہوں، آپ میری رائے کیا پوچھتے ہیں:

ایں قدر آئینہ نتواں شد کہ حیرانیم ما

○

لاہور نمبر، تاریخِ مستقبل کی وہ گرانقدر دستاویز ہے جو آپ نے صدیوں پہلے مرتب کر دی۔

○

جس وقت میں سوچتا ہوں کہ آپ نے اپنے سالنامے "شخصیات نمبر" کی ترتیب میں کتنی روحانی اور ذہنی کوفت برداشت کی ہوگی تو سالنامے سے زیادہ آپ کے صبر و تحمل کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔"

○

"طفیل صاحب، لارڈ کرزن جب تاج محل دیکھنے آگرہ گئے تو ان کی بیوی بھی ساتھ تھیں انہوں نے تاج دیکھ کر اپنے شوہر سے کہا "اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ میں یہاں دفن ہو سکتی ہوں تو اسی وقت مرنے کے لیے تیار ہوں"۔ پطرس نمبر دیکھ کر میں نے بھی دل میں کہا کہ اگر طفیل صاحب میرے لیے بھی کوئی ایسا ہی خصوصی نمبر نکالنے پر آمادہ ہو جائیں تو میں اسی وقت مرنے کے لیے آمادہ ہوں!"

(۵)

پطرس بخاری:

ارادہ تھا کہ چند دن کے لیے لاہور ضرور آؤں گا اور منجملہ اور احباب کے آپ سے بھی تجدید نیاز کروں گا لیکن افسوس کہ بوجوہ یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ آج شام واپس یورپ جا رہا ہوں اور وہاں سے امریکہ، انشاء اللہ آپ کے کرم اور بخشش سے آپ کا رسالہ "نقوش" اکثر مل جایا کرتا تھا اور امید ہے کہ آپ کا یہ فیض اب بھی جاری رہے گا....

○

(.... آپ کی کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لیے) ہاں کرتا ہوں تو یہ ڈر ہے کہ میری تحریر کی کسی جنبش سے اگر آپ کی دلآزاری ہوئی تو مجھے کتنے نفل کا ثواب ملے گا۔ انکار کرتا ہوں تو نہ یہ خوش مذاقی کی ذیل میں آتا ہے اور نہ شرافت کی ذیل میں۔ اگر آپ دل کو کڑا کریں اور میں جو کچھ آپ کی کتاب پر لکھ دوں اُسے قبول کر لیں تو بے شک پروف بھیج دیں میں بخوشی مقدمہ لکھ دوں گا۔ ویسے مقدمہ نویسی میرے لیے ہمیشہ آزمائش کا وقت ثابت ہوئی ہے۔ میں اس سے اس طرح بھاگتا ہوں جس طرح عورت بچہ جننے سے۔ مگر کبھی احباب کے کام سے متاثر ہو کر مقدمہ لکھا، کبھی احباب کی دوستی کے ڈر سے۔ آپ کس خانے میں جائیں گے، یہ کتاب پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا۔ ویسے میں نے آپ کے دو تین مضمون اس سے پہلے پڑھے ہیں اس لیے

جرأت کر کے لکھ رہا ہوں کہ شاید آپ بدمزہ نہ ہوں ـــــ میرا یہاں قیام دس پندرہ روز کا ہے، اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو پروف بھیج دیجئے ورنہ پھر فرصت کے دن نصیب نہ ہوں گے۔

○

آپ کے پروف اب تک نہ ملے مگر میرے جانے کا وقت آ گیا۔ میں آج ہی ایک لمبے دورے پر جا رہا ہوں، نہ جانے امریکہ کب پہنچوں۔ مجھے اس کا افسوس رہے گا کہ میں آپ کی کتاب پر کچھ نہ لکھ سکا۔

(۶)

وحشت کلکتوی:

"نقوش" کی نیرنگیاں اتنی جاذبِ نظر ہیں کہ میں ان میں کھو سا گیا۔ اگر اس پائے کے جرائد شائع ہوتے رہے تو اردو کا مستقبل روشن ہی نظر آتا ہے۔ "نقوش" کے معیار کی بلندی اردو ادب کے ارتقاع کی ضامن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا کارنامہ محیر العقول ہے۔ آدمی دیکھ کے حیران رہ جائے۔ تحسین کے لیے لفظ نہیں ملتے۔ جدھر نظر ڈالتا ہوں:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

(۷)

عبدالرحمٰن چغتائی:

اردو زبان کی کوئی اچھی تصنیف یا کسی رسالے کا کوئی خاص نمبر اہتمام سے شائع کیا گیا ہو تو اسے دیکھ کر ایک اطمینان سا محسوس ہوتا ہے۔ "نقوش" کا افسانہ نمبر سامنے ہے یہ نمبر ہماری فنی اور ادبی صلاحیتوں کی تعبیر ہے اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے راہِ عمل پیش کرتا ہے یہ حُسنِ ترتیب کے لحاظ سے، لکھنے والوں کی شخصیتوں سے اور معیارِ ادب اور معیارِ ذوق سے قابلِ قدر ہے۔

○

"نقوش" برسوں سے خاص نمبر نکال رہا ہے اور خاص نمبر نکالنے میں بڑے بڑوں پر سبقت لے گیا ہے ہمارے لیے آپ کے رسالے ادبی سرمایہ ہیں جو ہم حاصل کرتے ہیں۔"

(۸)

چودھری محمد علی ردولوی:

"نقوش" کے افسانہ نمبر کا شکریہ قبول کیجئے۔ میں نے اس سے بہتر افسانوں کا مجموعہ اُردو میں نہیں دیکھا تھا۔ کہانیاں وغیرہ قابلِ وجد ہیں اور سب پر بالا آپ کی عالی ہمتی اور وسعتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔"

(۹)

ل۔ احمد اکبر آبادی:

افسانہ نمبر کی ترتیب اور اس کے پیچھے جو جاں کاہی ہے، تحسین سے بے نیاز ہے۔ مضامین سب معیاری ہیں۔ لکھنے والے اپنی جگہ، مگر اتنا ضخیم رسالہ معیاری مضامین سے سجا دینا اپنی جگہ ایک تحقیق ہے۔ اسے مدح سرائی نہ سمجھیے بلکہ میرا احساس ہے اور حقیقت کا اعتراف ہے۔"

(۱۰)

نصیر الدین ہاشمی:

"نقوش" افسانہ نمبر وصول ہوا۔ نقوش کی ظاہری شان تو اب یورپ اور امریکہ کے رسالوں کے مقابل ہو گئی ہے اور یہ نہ صرف میرا خیال ہے بلکہ ایک امریکن خاتون کا خیال ہے۔ معنوی لحاظ سے جو ترقی کی ہے وہ بھی قابلِ داد ہے۔ یہ رسالہ آپ کی ہمت کا کرشمہ ہے۔"

(۱۱)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور:

"نقوش" صحیح معنوں میں اردو کا ایک معیاری پرچہ ہے۔ آپ کی کامیابی پر آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ آپ کی کاوشیں لائقِ تحسین ہیں اور یقین ہے کہ حقیقی قدر و منزلت حاصل کر کے رہیں گی۔"

(۱۲)

مولانا حامد حسن قادری:

"غزل نمبر" کا بڑا اشتیاق و انتظار تھا۔ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ پانسو صفحے کا کیسا اچھا پرچہ آپ نے شائع کر دیا ہے۔ بے ساختہ دل سے داد نکلتی ہے۔ اگرچہ صرف انتخابِ کلام ہیں پڑھنے کا سامان کم ہوتا ہے، سیر کا زیادہ، لیکن "نقوش" کے غزل نمبر کی بڑی افادیت یہ ہے کہ اتنی ضخیم و عظیم "اینتھالوجی" کہیں موجود نہ تھی۔ اس انتخاب میں اردو غزل کے چار سو سال کی "خاموش تاریخ" مدون و مجلد ہے۔ کوئی شخص اردو غزل کی تاریخ لکھنی چاہے تو اس انتخاب سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔"

(۱۳)

مولانا امتیاز علی عرشی:

"نقوش" کا شخصیات نمبر ملا۔ میں نے اس نمبر کو پہلی بار دیکھا تو حیرت میں رہ گیا اور جب اسے پڑھ لیا تو دہشت طاری ہوگئی۔ اللہ اکبر! اتنی شخصیتوں کے متعلق ایسی دل چسپ اور مفید معلومات اتنی کم مدت میں آپ نے جمع کر کے پیش کر دیں کہ ہیں، اسے ادبی کرامت یا معجزہ تو کہہ سکتا ہوں سعی و کوشش کا نتیجہ کہہ کر اس کی غیر معمولی اہمیت کو کم کرنا پسند نہیں کرتا۔ ان ادبی و علمی شخصیتوں میں سے جن جن سے شرفِ ملاقات حاصل ہے، اُن کے بارے میں بھی

یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں انہیں اب تک زیادہ نہیں جانتا تھا اور جو کچھ جانتا تھا وہ اس سے رتبے میں کہیں کم تھا، جواب معلوم ہوا ہے۔ میں نے اپنے بچوں سے کہا ہے کہ اس رسالے کو محفوظ کر لو اور وقتاً فوقتاً اس کے مضامین پڑھا کرو، مجھ بوڑھے سے زیادہ تمہارے لیے یہ کار آمد ہے۔ یہ ادبی و سیرتی ہر دو لحاظ سے بڑی کامیاب اور مفید کوشش ہے اور جتنا زمانہ آگے بڑھتا جائے گا، اس مجموعے کی اہمیت برابر بڑھتی چلی جائے گی۔ یہ مضامین، سبحان اللہ! کتنے سنجیدہ، کیسے علم افزا، کس درجہ عقل آفریں اور کس قدر تجربہ آموز ہیں!

(۱۴)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں:

"نقوش" کو معیاری بنانے میں آپ کامیاب ہیں جس کے لیے میری مبارکباد قبول فرمائیے۔

(۱۵)

سید مسعود حسن رضوی ادیب:

"رسالوں کے خاص نمبر نکلا ہی کرتے ہیں۔ آپ بھی نکال چکے ہیں لیکن مجھے افسانوی ادب سے زیادہ معلوماتی ادب سے دل چسپی ہے اور آپ نے شخصیات نمبر میں مفید اور مستند معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ اگر اپنی حالت پر قیاس کرنا درست ہو تو کہہ سکتا ہوں کہ اردو کا ہر خادم آپ کا احسان مند ہوگا اور اس قابلِ قدر تذکرۂ ادبا کو سینے سے لگا کر رکھے گا۔"

(۱۶)

ڈاکٹر سید اعجاز حسین:

"نقوش" کا شخصیات نمبر کئی لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور آپ مستحقِ مبارکباد ہیں۔ اس

شمارے میں ماضی و حال کے ادیبوں کے نجی حالات و ذاتی خصوصیات سے مستقبل کے ادبی مورخ کو ایسا مواد بھی مل جائیگا جو ابھی تک دستیاب نہ تھا اور جو نفسیاتی مطالعے کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ ان ادیبوں پر قلم اٹھانے والوں کے لیے یہ شمارہ چھوٹا موٹا کتب خانہ ہے جس کی وجہ سے آئندہ مضمون لکھنے والوں کو در بدر نہ پھرنا پڑے گا، ایک ہی جگہ بہت کچھ حالات مل جائیں گے۔"

(۱۰۷)

مُعین الدین احمد ندوی:

"نقوش" کا شخصیات نمبر دیکھنے سے پہلے یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنا کامیاب ہوگا۔ آپ نے ایک بڑا کام انجام دیا۔ طبقات و تراجم مسلمانوں کا خاص فن ہے جس کے ذریعے انہوں نے مختلف اصنافِ علوم کے ہزاروں اصحابِ کمال کے حالات محفوظ کر دیے، مگر اردو میں اس کی بڑی کمی تھی، آپ نے یہ نمبر نکال کر ایک بڑی کمی پوری کی اور نہایت مفید علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔ یہ نمبر آئندہ مورخین کے لیے بڑا کارآمد ہوگا۔"

(۱۰۸)

مولانا عبد المجید سالک:

"نقوش" کا شخصیات نمبر اُردو کے ادبی رسالوں کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ شخصیات کی تعداد، ان کی بوقلمونی، رسالے کی ضخامت، اس کی حسین طباعت، غرض ہر چیز آپ کی خوش ذوقی، بے پناہ محنت اور اولوالعزمی کا پتہ دیتی ہے۔ یہ نمبر اردو زبان کے آئندہ مورخین کے لیے قابلِ قدر ماخذ کا کام دے گا۔ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کی قدر نہ کرنا پرلے درجے کی سنگدلی ہے۔"

(۱۹)

آغا محمد اشرف :

شخصیات نمبر کی کامیابی پر مبارکباد قبول کیجیے۔ آج تک اردو زبان میں اس شان سے کسی رسالے نے خاص نمبر نہیں نکالا تھا۔ مضامین کے اعتبار سے یہ نمبر اردو ادب کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔

(۲۰)

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی :

"نقوش" کو آپ نے جس محنت سے مرتب کیا ہے، اُس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نے قابلِ ذکر ادبی حلقوں میں بڑی دلآویز جگہ پیدا کر لی ہے۔ اگر ایسے پرچے بھی زندہ نہیں رہ سکتے تو پھر ہمیں اُردو کے مستقبل سے مایوس ہو جانا چاہیے۔"

○

طفیل بھائی! لائیے آپ کا مُنہ چُوم لوں۔ سبحان اللہ! کیا خوب صورت افسانہ نمبر نکالا ہے۔ دل و نظر دونوں جذب ہو کر رہ گئے ہیں۔ کون کہتا ہے اردو میں جمود ہے! آپ نے تو حرکت و عمل کی عجیب و غریب مثال پیش کی ہے۔"

○

شخصیات نمبر دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ یہ آپ نے بڑا کام کیا جو بغیر فرہاد کے سے عزم و استقلال کے ممکن نہ تھا۔ یہ خشک مضامین کا مجموعہ نہیں۔ اس میں وہ لطف ہے جو افسانے میں ہوتا ہے اور وہ بھی:

افسانۂ آں شب کہ با یار گزشت!

یہ مواد اردو کے مورخ کے لیے بہت مفید ہو گا۔"

(۲۱)

جیلانی بانو :

"نقوش" کا شخصیات نمبر ملا۔ آپ کے حوصلوں کی داد دینا تو چھوٹا منہ بڑی بات لگتی ہے۔ یہ نمبر اتنا بڑا ادبی سرمایہ ہے جو ہمیشہ نقادوں کے پیشِ نظر رہے گا۔ ادھر چند برسوں میں نقوش نے اردو ادب میں وہ کام کیا ہے جس نے اسے "نقشِ جاوداں" بنا دیا ہے۔ ترتیب اور خوب صورتی بھی بے مثال ہے۔"

(۲۲)

ابنِ انشا :

"شخصیات نمبر" کے متعلق میں نے مخدومی مولوی عبدالحق سے پوچھا تھا کہ آپ کے زمانے میں یا اب سے پہلے اس زبان میں ایسی چیزیں شائع ہوتی تھیں؟ انہوں نے اس پر آپ کی محنت اور سلیقے کی داد دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہے بھی بڑا کام —— اور آپ ہی کے کرنے کا —— واقعی حیرت انگیز کارنامہ ہے۔"

(۲۳)

غلام عباس :

"نقوش" کا افسانہ نمبر آپ نے ایسا ترتیب دیا ہے کہ اس سے آنکھوں کو طراوت اور دل کو شادابی حاصل ہوتی ہے اور جب یہ خیال آتا ہے کہ آپ تنِ تنہا یہ نہایت اہم اور مشکل خدمت ایسے احسن طریق اور اعلیٰ معیار پر انجام دے رہے ہیں تو بے اختیار دل سے مبارک باد نکلتی ہے۔"

(۲۴)

دیوندر ستیارتھی:

"نقوش" کا افسانہ نمبر موصول ہوتے پر فوراً آپ کو مبارکباد کا خط نہ لکھ سکا۔ میں اسے پڑھنے کے بعد ہی لکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اب میں اپنے دل کی بات صحیح صحیح لکھ سکتا ہوں اور یہ محض دل کی ہی بات ہو، یہ بھی نہیں ــــ اسے دماغ کی بات بھی سمجھیے، بس دل کی زیادہ، دماغ کی کم ـــــ کیا افسانے، کیا مقالے ـــــ سبھی خوب ہیں۔ تراجم بھی خوب نمائندگی کرتے ہیں۔ "نقوش" کا افسانہ نمبر ایک بہت بڑا سنگِ میل ہے، یہاں سے ایک نئی منزل شروع ہوتی ہے۔ ایک مدت تک لوگوں کو جب بھی پیچھے پلٹ کر اب تک کی ادبی منزلوں کا جائزہ لینے کا موقع ملے گا، "نقوش" کا افسانہ نمبر اپنی معیاری کہانیوں کے لیے بطور سند پیش کیا جائے گا۔"

(۲۵)

شوکت تھانوی:

طفیل صاحب ــــ "نقوش" کے افسانہ نمبر کا تفصیلی مطالعہ کر کے بیٹھا ہوا ایک بات پر غور کر رہا ہوں کہ میں اس نمبر کو کیا سمجھوں!؟ ــــ طفیل صاحب میں اکثر غور کیا کرتا تھا کہ آخر میں سرکاری، نجی اور نیم نجی قسم کی ملازمتیں کر کے عمرِ عزیز کو جو مسلسل گنوا رہا ہوں آخر ایک مرتبہ ہمت کر کے ایڈیٹر کیوں نہیں بن جاتا؟ آپ کا یہ نمبر دیکھ کر آج یہ مصلحت خداوندی سمجھ میں آئی ہے کہ اگر خدانخواستہ میں ایڈیٹر بن چکا ہوتا تو آج آپ اس میدان میں اس نمبر سے وہ شکست دیتے مجھ کو کہ گھر کا راستہ نہ ملتا! آپ نے یہ نمبر کچھ اس طرح نکال دیا ہے کہ میں تو خیر واقف ہوں، ناواقف دنیا کو یقیناً حیرت ہو گی کہ یہ آپ کا کارنامہ ہے، ایک شخصِ واحد کی کوشش!

طفیل صاحب ــــ خدا کی قسم آپ نے شعر کہا ہے، ایسا شعر جو شاعر ارادةً

نہیں کہنا بلکہ الہامی طور پر ہو جاتا ہے اور پھر شاعر آئینہ دیکھتا ہے کہ یہ شعر کیا واقعی میں نے کہا ہے؟ میں اس افسانہ نمبر کو ادب کے موجودہ دور کی الہامی کتاب مانتا ہوں۔"

(۲۶)

ن ۔ م ۔ راشد :

آپ کی عالی ہمتی کا ہمیشہ قائل رہا ہوں کیوں کہ "نقوش" جیسا رسالہ اس باقاعدگی سے شائع کرتے رہنا اپنے آپ پر ہزار جبر کے مترادف ہے۔"

(۲۷)

شاہد احمد دہلوی :

"نقوش" کا قدردان تو "نقوش" ہی خریدے گا۔" "نقوش" اپنی جگہ پر ایک بھاری پتھر ہے بلکہ پہاڑ ہے جسے کوئی نہیں ہلا سکتا۔

(۲۸)

حکیم احمد شجاع :

"نقوش" ایک ادبی رسالہ ہے۔۔۔۔ جناب طفیل صاحب ایک پرانی رشتہ داری کے لحاظ سے میرے محلے دار بھی ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں محلے داری بھی ایک رشتہ ہوتا تھا۔ بازار حکیماں (لاہور) میں ایک گلی ہے جسے جوگی محلہ کہتے ہیں۔ طفیل صاحب وہاں کے رہنے والے ہیں۔ اس لیے میری ان سے قرابت داری یہ ہے کہ یہ میرے محلے دار ہیں۔ ان کا حوصلہ کچھ بڑا ہی حوصلہ ہے کہ انہوں نے اس رسالے کو اس طرح اور اس شان سے چلایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انھیں بھی کوئی مالی فائدہ نہ ہوا ہو گا۔ یا تو انہوں نے اپنی کوئی جائیداد بیچی ہو گی یا کچھ اور کاروبار کرتے ہیں جس سے روپیہ لاتے ہوں گے

اور رسالے میں لگاتے ہوں گے۔

اب رسائل پر ایک اور آفت آئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے روزانہ اخبار بھی زیادہ تر رسائل بن گئے ہیں۔ اخبار ہمارے زمانے میں اخبار ہوا کرتے تھے جو صرف خبروں سے متعلق ہوتے تھے۔ اب ہر اخبار خواہ وہ روزانہ ہو یا ہفتہ وار یا پندرہ روزہ، وہ حقیقت میں ایک رسالہ ہوتا ہے کیونکہ ان میں خبریں کم ہوتی ہیں باقی مواد زیادہ ہوتا ہے۔ کچھ عورتوں کے متعلق، کچھ مردوں کے متعلق، کچھ گھروں کی بربادی کے متعلق، کچھ گھروں کی آبادی کے متعلق، کچھ پاؤڈر کے متعلق، کچھ سُرخی کے متعلق، کچھ ترکاریوں کے متعلق، کچھ سالن کے متعلق۔ غرض یہ سب کچھ اخباروں میں چھپے گا تو پھر آپ ہی فرمائیں کہ وہ اخبار کہاں رہے گا — ان حالات میں "نقوش" کا برسوں تک چلنا (اور چلے آنا) ایک معجزہ ہے، اور وہ معجزہ صرف یہ ہے کہ جناب طفیل صاحب کا حوصلہ اور استقامت اور ادب سے کلیتاً وابستگی!

ایسے حوصلہ شکن حالات میں طفیل صاحب کا دل گردہ ایکس رے میں دیکھنے کے قابل ہے کہ اتنا بڑا رسالہ یہ کس طرح چلا رہے ہیں جس کو دیکھ کر دل ڈر جاتا ہے۔ پڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ —— اب میں عمر کے جس حصّے میں پہنچا ہوا ہوں، اُس میں مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں اپنی عمر کے باقی حصے میں اس کو ختم بھی کر سکوں گا یا نہیں —— ایسا عظیم الشان اور معیاری رسالہ شائع کرنا اور پھر اس اہتمام سے شائع کرنا جو حُسنِ طباعت کے اعتبار سے بھی مثالی ہو، یقیناً ایک معجزہ ہے اور ایسے معجزوں کا ظہور روز روز نہیں ہُوا کرتا۔ اس لیے میں اپنے تجربے کی بنا پر رسالہ "نقوش" کے ساتھ جناب طفیل صاحب کی جس قدر بھی تعریف کروں کم ہے کہ انہوں نے بڑے ہی سخت وقت میں کام شروع کیا اور اب تک مسلسل کیے جا رہے ہیں۔ ان کے قدم پیچھے نہیں ہٹ رہے بلکہ آگے ہی بڑھ رہے ہیں —— اور یہ ادب کے لیے بڑی نیک فال ہے جو انھیں بھی زندہ رکھے گی اور ادب کو بھی مالا مال کرے گی۔

(۲۹)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

"غالب صدی" کے سلسلے میں غالب اور غالبیات کے متعلق بہت سی نئی باتیں اور

بہت سی نئی چیزیں سامنے آئی ہیں لیکن اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی دیوانِ غالب بخطِ غالب کا قیمتی اور قلمی نسخہ ہے جو ہم پاکستانیوں کو محمد طفیل مدیر "نقوش" کے طفیل دیکھنے کو ملا ہے۔ یہ صرف تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی نہایت اہم دستاویز ہے۔

(۳۰)

ڈاکٹر گیان چند:

پاکستان کا تو ذکر کیا، ہندوستان میں بھی ہر شخص محض "نقوش" ہی کے طفیل "بیاضِ غالب" کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس مخطوطے کو شائع کر کے "نقوش" نے اردو دنیا پر بڑا احسان کیا ہے۔ "نقوش" کے اس نمبر میں مخطوطۂ غالب کے علاوہ غالبیات پر اور بھی کچھ مفید مواد ہے۔

(۳۱)

پروفیسر عبد القوی دسنوی:

"نقوش" کا غالب نمبر تو آپ کا اردو پر اور غالب پر بھی احسان ہے کہ اس خوبصورتی کے ساتھ بہت کم قیمت میں شائع کر دیا کہ لوگ کہہ اُٹھے: اس طرح کا شباب ہو، ایسا جمال ہو! لیکن میرے بھائی! آپ کی ذات تو تعریف سے بہت بلند ہے۔ آپ کی کن کن چیزوں کی تعریف کی جائے۔ نقوش اور محمد طفیل یا محمد نقوش کی خدمات تو اُردو دنیا بھلا ہی نہیں سکتی۔"

(۳۲)

مختار صدیقی:

"نقوش" اُردو کے پڑھنے والوں کے لیے کوئی اجنبی یا نیا نام نہیں۔ اردو کا پڑھنے والا یا اُردو کا کوئی اسکالر یا اُردو سے دلچسپی رکھنے والا کوئی شخص "نقوش" کے نام سے نا آشنا

نہیں ہوسکتا۔ ایک تو اس کے عام نمبروں کی وہ کیفیت کہ اس نے پچھلے دس بارہ برسوں میں غزلوں، افسانوں اور مضامین کے اندر ایک خاص طرح کا معیار پیش کیا اور اس کے ساتھ ایک خاص طرح کا حُسن بھی پیدا کیا۔

اس کے بعد "نقوش" کے وُہ خاص نمبر آتے ہیں کہ جو اپنی ضخامت کے اور اہمیت کے اور اس کے علاوہ اپنے قیمتی ہونے کے اعتبار سے ہمارے ادب کی تاریخ میں اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور پھر انہوں نے نہ صرف افسانے اور غزل کی خدمت کی بلکہ شخصیات، مکاتیب، طنز و مزاح سے لے کر آپ بیتی تک حتّٰی کہ لاہور کی تاریخ بلکہ یُوں کہنا چاہیے کہ لاہور کی ایک ایک اینٹ کے بارے میں جو بھی دستاویز ان کو ملی، وہ ان کی وساطت سے چھپ چکی ہے۔ ان میں سے ہر نمبر اپنی جگہ زندہ رہنے والا ہے۔

(۴۳)

قیوم نظر:

"نقوش" نے گزشتہ بیس برس میں دنیائے ادب میں جو بلند مقام حاصل کیا ہے اور اس سلسلے میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دئے ہیں وہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم باب بن چکے ہیں۔ ایک ایسا اہم باب جس پر جہاں بھی اردو بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے وہاں کے خواص اور عوام اس پر فخر کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کی دو عالمگیر جنگوں کی درمیانی مدت میں مولانا ظفر علی خاں اور روزنامہ "زمیندار" پنجاب کے عوام کی زندگی کا ایک حصّہ بن گئے تھے۔ اس اخبار نے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اس ضمن میں بے حساب قربانیاں دیں اور لاتعداد نقصانات اٹھائے۔ مولانا ظفر علی خاں بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے لیکن عوام میں ان کا اخبار ان کی شخصیت پر چھا گیا تھا اور لوگ ظفر علی خاں سے زیادہ "زمیندار" کو جاننے پہچاننے لگے تھے بلکہ عوام میں ظفر علی خاں کا نام ہی "زمیندار" ہو گیا تھا۔

آج دنیائے ادب میں یہی صورت "نقوش" کی ہے۔ "نقوش" کی گراں قدر خدمات نے محمد طفیل کی قربانیوں کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور اس ہنگامے میں محمد طفیل، محمد نقوش

بن گیا ہے۔ اس معرکے میں کس کی جیت ہوتی ہے اس کا فیصلہ بارہا ہو چکا ہے لیکن یہ ایک ایسا معرکہ ہے جسے ہمیشہ دُہرانے کو جی چاہے گا ـــــ وہ یہ کہ محمد نقوش آج "بیاضِ غالب" کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے تو آج آپ ایک بار پھر فیصلہ کریں گے کہ طفیل کہاں غوطہ زن ہوا ہے اور "نقوش" کہاں اُبھرا ہے۔

(۳۴)

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن:

بے اختیار جی یہ چاہتا ہے کہ رشید صاحب کی زبانی امام حنبلؒ کا واقعہ سناؤں: "ان کو زنجیروں میں جکڑے بازار میں لیے جاتے تھے۔ ایک شخص جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے، آگے بڑھا اور امام کو مخاطب کر کے کہنے لگا: دیکھو میرے دونوں ہاتھ چوریوں میں کاٹے گئے ہیں لیکن میں نے چوری نہیں چھوڑی ـــ ایک بُرے کام میں جب اتنی استقامت دکھائی جا سکتی ہے تو تم تو حق پر ہو، دیکھو! کبھی اپنے مقام اور اپنی بات سے نہ ہٹنا۔"

اپنے مقام اور اپنی بات اور اپنے منفرد و مخصوص مزاج اور معیارِ کار سے ہٹنا اور نہ بڑھنا خود آپ کے بس میں رہ کہاں گیا ہے!؟ اثباتِ تازہ "نقوش" کے دوسرے "میر نمبر" کی صورت میں پایا! اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی "اس" کی! اس "دعائے بد" کے ساتھ کہ سدا جی میں آپ کے یہی آثار رہیں ..... کچھ اور بھی موزوں کیجیے!!

حاصلِ حیات، رسولؐ نمبر:

محمد طفیل
اسد اللہ غالب
جسٹس شیخ آفتاب حسین
مولانا سعید احمد اکبر آبادی
مولانا نعیم صدیقی
مولانا سید محمد متین ہاشمی
مولانا محمد مالک کاندھلوی
سید صباح الدین عبد الرحمٰن
مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
خالد احمد
محمد علی صدیقی

میرا ملتھا

محمد طفیل

"مجھ سے ایک دن 'رسول ﷺ نمبر' کے خوشنویس نے کہا: میں نے "نقوش" کے اس نمبر کی کتابت ۱۹۷۲ء میں شروع کی تھی اور آج ۱۹۸۲ء ہے کہ 'سیرت نمبر' ہی لکھ رہا ہوں۔"

اس نمبر کی اشاعت 'میرے لیے وہ سعادت ہے کہ جس کی تڑپ ایک عرصے سے میرے دل میں تھی۔ میں نے اس نمبر کے لیے بڑی محنت کی اور محنت سے زیادہ اللہ کی بارگاہ میں دعائیں مانگیں۔ جذبۂ اول (محنت) کا ثمر محدود ہو سکتا ہے اور جذبہ دوم (دعاؤں) کا ثمر لامحدود تھا یہی وجہ ہے کہ آج میں کسی قابل ہوا ہوں۔

یہ اور ایسے کام جو بڑے اہتمام اور سرمائے سے شروع کیے جاتے ہیں اسے اس ہیچ مدان نے اپنے جذبے ہی کو ساری پونجی سمجھ کر شروع کر دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کام کس پایہ کا ہے۔ میں نے آج تک جتنے نمبر پیش کیے، وہ سب فخریہ انداز میں پیش کیے، مگر یہ نمبر انتہائی عاجزی کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ یہ معاملات دل کے ہیں! کبھی اُس طرح خوش کبھی اِس طرح خوش! [نقوش، رسول ﷺ نمبر، جلد اول، ص ۸]

پہلی جلد (سیرت کی) تکنیک اور مصادر کے بارے میں تھی۔ دوسری جلد بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس جلد میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ واقعات کو چھُوا اور چھوڑ دیا والا قصہ نہیں بلکہ حق ادا کرنے والا معاملہ ہے۔

رسول ﷺ نمبر کی دوسری جلد میں مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ پر 'تفصیلی مضامین ہیں جو بڑی عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں۔ سیرت کی دُوسری کتابوں میں اتنی تفصیل نہ ملے گی اسی طرح "سیرۃ النبی ﷺ" کی ساتویں جلد (سید سلیمان ندوی) کے بھی تین اہم مضامین پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس نمبر میں ایک اور اہم مضمون سیرۃ النبی ﷺ میں توقیتی تضادات اور ان کے

حل پر ہے۔ ایسے مضامین کہ جن کی افادیت دائمی ہو، خال خال نظر آتے ہیں۔ اس دوسرے نمبر میں ڈاکٹر حمید اللہ کی انگریزی کتاب "محمد رسول اللہؐ" کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے کہ مربوط حالات بھی سامنے آ سکیں۔

"الرسالات" پر جو مضمون ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے یا مولانا امین احسن اصلاحی کا جو مضمون 'توحید' پر ہے یا شیخ الہند مولانا محمود حسن کا جو مضمون 'وحی' پر ہے یہ سب ایسے مضامین ہیں جو ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دیتے رہیں گے اور لکھنے والوں کے لیے خیر و برکت کا باعث بنیں گے۔ [رسولؐ نمبر، جلد دوم، ص ٦]

جلد اول، جلد دوم میں سیرت کے بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ بھی پوری تفصیل کے ساتھ! جلد سوم کا انداز ہی اور ہے۔ اس میں قبل از بعثت سے لے کر آخری دنوں تک کے حالات 'محققانہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس نمبر میں چھ عنوانات قائم کر کے ان چھ موضوعات کے تحت چونسٹھ مضامین چھاپے گئے ہیں۔ [رسولؐ نمبر، جلد سوم، ص ٦]

چوتھی جلد میں چھ مزید عنوانات کے تحت مضامین چھاپے گئے ہیں ——— تین جلدیں پہلے پیش کی جا چکی ہیں، ایک جلد اور پیش کروں گا، وہ اس لیے کہ جو ضروری عنوانات رہ گئے ہیں یا جو ضروری کام بہ سلسلہ سیرت رہ گیا ہے، اُسے پُورا کیا جا سکے۔ پانچویں جلد بھی میں اپنے شوق سے پیش کروں گا، باقی پانچ جلدیں آپ کے شوق کی پذیرائی میں پیش کروں گا تب میرا منصوبہ مکمل ہوگا، مگر ایسا ہونا آپ کی حوصلہ افزائی پر بھی منحصر ہوگا۔ اپنی بساط اسی حد تک تھی وہ بھی اپنے پریس کی ایک مشین بیچ کر! مگر اس پر ملول نہیں 'نازاں ہوں! [رسولؐ نمبر، جلد چہارم، ص ٦]

مجھے 'رسولؐ نمبر' کے سلسلے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، محمد اجمل اصلاحی، مولانا نعیم صدیقی، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا عبدالمتین ہاشمی، جناب رفیع اللہ شہاب اور جناب محمد عالم مختار حق کا بھی تعاون حاصل رہا۔ کسی نے مشوروں سے نوازا، کسی نے مواد کی فراہمی میں مدد دی، جس نے جس حد تک مدد کی خدا اُن کے اُتنے ہی درجات بلند کرے گا، اور میں تو شکر گزار ہوں ہی ——— تہہ دل سے شکر گزار! [رسولؐ نمبر،

جلد اوّل، ص ٦]

"رسولؐ نمبر" کی چاروں جلدوں میں تین ہزار سے زائد صفحات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کام کا آغاز ہوا ہے۔ یہ سلسلہ تو اب چلے گا۔ نہ حضورؐ کی صفات گنوائی جا سکیں گی اور نہ "نقوش" کے صفحات بہ آسانی گنے جا سکیں گے۔ میرا کام تو جب تک سانس ہے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ اگر وقت رسولؐ کے دربار میں گزرے تو میری خوش بختی پر کون رشک نہ کرے گا؟ [رسولؐ نمبر، جلد چہارم، ص ٦]

"میں ادبی گنہگار ہُوں، دربارِ رسولؐ تک کون ساجذبہ لے آیا۔ یہ مَیں نہیں جانتا، مجھے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں! میں نے آج تک جو کچھ بھی کیا، اُس کی بھی توفیق نہ تھی، اس لئے کہ اہلِ نظر نے جو کچھ دیکھا وُہ بھی میری سعی کا نہیں، تائید کا نتیجہ ہے۔ میرے حصّے میں کیا آیا؟ حیرانی اور صرف حیرانی!

آج بھی جو کچھ لے کر حاضر ہو رہا ہُوں یہ توفیق نہیں انعام ہے کیونکہ مجھے اپنے گناہوں کا حال اوروں سے زیادہ معلوم ہے۔ مجھ سے جو کام مولا نے لینا ہے وہ لے رہا ہے کیونکہ میں تو اپنی ذات میں نارسائیوں کی پوٹ ہُوں، اور کچھ بھی نہیں ہوں! میری گنہگاری اپنی جگہ، توفیقِ ایزدی اپنی جگہ، مگر سوال یہ ہے کہ میرے اِس سفرِ شوق کا حال کچھ میرے رسولؐ کو بھی معلوم ہے؟

میں حاضر ہُوں یارسولؐ اللہ! میں حاضر ہوں! میں حاضر!" [رسولؐ نمبر جلد اوّل ص ۷]

مجھے سیر و تفریح کا قطعاً شوق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے خاصا پریشان ہونا پڑتا ہے۔ مُلکوں مُلکوں کی سیر تو دُور کی بات ہے۔ مگر اب کے میں سعودی عرب گیا۔ بڑے شوق سے گیا، کیونکہ یہ ملک میرے محبوبؐ کا ملک ہے جہاں کہ وہ پلے بڑھے تھے جہاں کہ اُنہوں نے اپنے پیغام سے دنیا کو متوجہ کیا تھا۔

پہلے میں جدہ گیا۔ اس کے بعد مکہ گیا۔ خانۂ خدا کو دیکھا، حجرِ اسود کو دیکھا کہ جسے رسولؐ اللہ نے خانۂ کعبہ میں رکھا تھا۔ پھر میں مکّے کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا، یہ جان کر کہ شاید اِدھر سے میرے رسولؐ گزرے ہوں!

اس کے بعد مدینے گیا، روضۂ اقدس کو دیکھا، منبر کی جگہ کو دیکھا کہ جہاں رسولؐ اللہ

کھڑے ہو کر خدا کا پیغام اُس کے بندوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ منبر کے سامنے کھڑے ہو کر نمازیں پڑھیں، یہ سوچ کر کہ شاید یہیں حضورؐ کھڑے ہو کر خدا کی بارگاہ میں سجدے کرتے ہوں! پھر مسجد قبا گیا جو رسولِ حق نے بنائی تھی جو دنیا کی پہلی مسجد تھی۔ اُس جگہ کو بھی دیکھا کہ جہاں سرورِ دو عالمؐ کھڑے ہو کر خدا کی وحدانیت کا اعلان کیا کرتے تھے ـــــ خواہش صرف اتنی تھی کہ اُس جگہ آنکھیں بچھاؤں جہاں کہ رسولِ اکرمؐ نے قدم رکھا ہو۔ اُس جگہ سجدہ کروں کہ جہاں حضورؐ نے سجدہ کیا ہو! بالآخر میں نے روضۂ (اقدس) کے سامنے بیٹھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے ـــــ دل پر جو کچھ اُترا، وہ میں آپ کو بتا نہ سکوں گا! [رسولؐ نمبر، جلد سوم، ص ۵]

میں نے متعدد دن اور راتیں اِس انتظار میں گزاریں کہ وہ لمحۂ عالیہ آتے کہ میں اپنے تئیں سیرتِ سرورِ کونینؐ پیش کر سکوں۔ وُہ لمحہ آیا۔ میرے جذبات و احساسات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خدا نے مجھے لکھنے کی صلاحیت دی ہے۔ ہزاروں صفحات کالے کیے ہیں مگر آج لکھنے بیٹھا ہوں تو قلم رُک رہا ہے۔ یا الٰہی! ماجرا؟ ذہن نے بات سُجھائی جس کی تعریف خدائے ذوالجلال نے کی ہو، اُن کے بارے میں تیرا قلم کیا لکھے گا؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔ مقابلہ عشق اور قلم کے درمیان آن ٹھہرا۔ دونوں امتحان سخت اور میں ناتواں۔ حواس بے ٹھکانہ ہونے لگے۔ قدرے سنبھلا تو ہاتف نے کہا: "حدِ ادب کا مقام ہے۔" (میں نے التجا کی): "یا الٰہی! میں کیا کروں؟ حضورؐ! میں کیا کروں؟" میری التجا پر دوبارہ غیبی آواز آئی: "آج تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہُوا جس نے رسولِ خدا کے بارے میں لکھا ہو اور ان کا حق ادا کیا ہو۔"

میں ایک بار پھر سناٹے میں آ گیا۔ جُھرجُھری لی تو میں کہہ رہا تھا: "میں حضورؐ کا اُمتی ہوں۔ میں اس کام کے لیے خود حضورؐ سے اجازت لے کر آیا ہوں۔" اس پر ہاتف نے کہا: "تو پھر لکھ!" جسم تھر تھر کانپنے لگا ـــــ تب میں نے گھر والوں سے کہا: "مجھے چادر اُڑھا دو کہ یہ سنّت میرے رسولؐ کی ہے۔" [رسول نمبر، جلد دوم، ص ۵]

میں نے ۱۹۶۴ء میں "آپ بیتی نمبر" چھاپا تھا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور اپنی ضخامت کے اعتبار سے میرا سب سے قیمتی اور ضخیم پرچہ تھا جو ۱۹۶۴ء کی رعایت سے ۱۹۶۴ صفحات کا تھا۔ اس نمبر میں دُنیا کی تقریباً تمام بڑی بڑی شخصیتوں کی

آپ بیتیاں تھیں جو مجھے اُن موجود شخصیتوں نے خود بھجوائی تھیں یا ان کے سیکرٹریوں نے مثلاً امریکہ کے صدر آئزن ہاور نے، ہندوستان کے صدر رادھا کرشنن نے، پاکستان کے صدر جنرل محمد ایوب خاں نے۔ ان کے علاوہ آغا خان، جواہر لعل نہرو، برٹرینڈ رسل، طٰہٰ حسین نے ـــــ اور سرونسٹن چرچل نے، جمال عبدالناصر نے، رضا شاہ پہلوی نے، ملکہ ایلزبتھ نے ـــــ غرض اس نمبر میں تمام دنیاوی بادشاہوں کے مضامین تھے۔

جب (" نقوش " کا) وہ (آپ بیتی) نمبر شائع ہوا تو دنیا بھر سے توصیفی خطوط آئے اور مجھے باور کرایا گیا کہ اس سے بہتر پرچہ چھاپنا ناممکن ہے ـــــ مگر میرے دل میں کوئی اور ہی ارمان تھا، کوئی اور ہی خاکہ تھا ـــــ آج ۱۹۸۲ء میں پورے اٹھارہ برس کے بعد، اپنی محنت کے اعتبار سے، اپنی لگن کے اعتبار سے، وہ حاصلِ زندگی نمبر پیش کر رہا ہوں کہ جو میرا منتہا تھا!

۱۹۶۴ء میں چھپنے والا نمبر دُنیاوی شخصیتوں کے بارے میں تھا ـــــ ۱۹۸۲ء میں چھپنے والا یہ نمبر صرف ایک ہستی کے بارے میں ہے جو دنیا کی تمام موجود اور مرحوم شخصیتوں سے اتم ہے، افضل ہے ـــــ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے جس سے دین اور دنیا کا ٹانکا جڑا ہوا ہے۔

آج میری وہ آرزو پُوری ہوئی جس کے لیے برسوں سے بے کل رہا۔ آج میں کہہ سکتا ہوں کہ حُضورؐ سے میری بھی کوئی نسبت ہے۔ اس اعزاز پر خدا کی بارگاہ میں جتنے بھی سجدے کروں وہ کم ہوں گے، کیونکہ آج میں بھی کسی شمار قطار میں ہوں! [رسولؐ نمبر، جلد چہارم، ص ۵]

"نقوش" کا رسولؐ نمبر

اسد اللہ غالب

۱۹۸۲ء ختم ہو رہا ہے۔ روایتی میزانیے ترتیب دیے جا رہے ہیں کہ سال میں کیا کھویا، گیا پایا؟ کھونے کا ذکر حاوی ہے۔ محرومیوں کے تذکرے ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ یاس کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سامنے ہیں اہلِ درد تڑپ اُٹھتے ہیں لیکن یہ اچانک روشنی کا ایک نقطہ وسعت اختیار کر کے کون و مکان پر پھیل سا گیا —— سارے دھڑکے دُور ہو گئے، سارے غم کافور ہو گئے۔ سال کے اختتامی دنوں میں یہ روشنی ہے "نقوش" کے 'رسولؐ نمبر' کی!

اس رسالے کے مُدیر کو لوگ ایک عرصے سے "محمد نقوش" کہتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ اظہار تھا محمد طفیل کی "نقوش" سے شدید وابستگی کا —— لیکن آج 'رسولؐ نمبر' نے "نقوش" کو "محمدؐ" سے وابستہ کر کے "محمد نقوش" کے معنی ہی بدل دیے ہیں اور "محمدؐ" کے طفیل مدیرِ "نقوش" بھی برگزیدہ ہستیوں میں شامل ہو گیا —— اللہ اللہ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!

میں اُن کے سادہ سے دفتر میں ہمہ تن گوش تھا: "یہ میری بارہ سالہ محنت کا نتیجہ ہے۔ دس سال سے تو کتابت شروع ہے۔"

○ "آپ، سیرت کی طرف کب اور کیسے مائل ہوئے؟"

"میری تو سوچ کی ابتدا ہی کی منصوبہ بندی سے ہوئی تھی۔ میری فکر کی راہیں اس سے منوّر ہوئیں۔ میں نے جو کچھ کیا اس منزل کے سفر میں کیا۔ میری خواہش تھی کہ سیرت پر ایسا کام کر جاؤں جو پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔ میں ہر کام اسی فلسفے کے تحت کرتا ہوں کہ پہلے سے بہتر کر سکتے ہو تو اس کا فائدہ ہو گا، ورنہ سعیِ لاحاصل میں آدمی کیوں پڑے —— سیرت کا موضوع نازک بھی تھا، مقدّس بھی۔ میں نے اپنی ساری صلاحیتیں اس پر صرف کی ہیں۔ میں نے وقت اور سرمائے کی پروا کیے بغیر تن من دھن اس کی خاطر لُٹا دیا۔"

○ "کیا آپ کے سامنے اس طرح کی کوئی مثال موجود تھی؟"

"میں علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی "سیرۃ النبیؐ" اور قاضی محمد سلیمان کی "رحمۃ

للعالمین" سے بےحد متاثر تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ان پر اضافہ کروں۔"

"آپ نے کسی سے مشورہ لیا؟"

"میں نے شروع میں ایک خاکہ بنایا تھا اور دوستوں اور بزرگوں کو دکھا کر رائے مانگی تھی ان کے مشوروں کی روشنی میں ضروری ترامیم بھی کیں۔ میں ان کے پُرخلوص تعاون کا شکرگزار ہوں اور ان کے بلند درجات کی دُعا کرتا ہوں۔"

○ "کیا طریقِ کار رہا آپ کا ان دس برسوں میں؟"

"میں نے اپنے خاکے کی روشنی میں مواد اکٹھا کرنا شروع کیا۔ جس موضوع پر پہلے سے مطبوعہ مضمون نہ ملا، اس پر خود لکھوایا۔ پھر یہ ہے کہ میں نے خاص طور پر آج کے ذہن اور اس میں پیدا ہونے والے سوالات کو بھی مدِّنظر رکھا۔ آج کے معاشرے کے مسائل تیزی سے بدل رہے ہیں، اخلاقیات کے معیار تبدیل ہو رہے ہیں۔ معاشرتی ڈھانچہ شکست و ریخت کا شکار ہے "سیرۃ النبیؐ" اور "رحمۃ للعالمین" دونوں کتابیں پچھلی نسل کے لیے تھیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی اہمیت ختم ہو گئی یا وہ وقتی کام تھا ——— میں صرف زور دے رہا ہوں آج کے ذہن کے شکوک و شبہات کا۔ بیک وقت تیزی سے سمٹتی ہوئی اور پھیلتی ہوئی دنیا، ایک دوسرے کے لیے سمٹ رہی ہے۔ دُوسری دنیاؤں کی طرف وسعت اختیار کر رہی ہے۔ میں نے موجودہ صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھا۔"

○ "سیرت نگاروں کی صف میں شامل ہوتے ہوئے آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟"

"سیرت نگاری کا تو میں دعویٰ نہیں کرتا۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ کوئی دعویٰ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ انسان کے بس میں کوشش ہے، وہ میں نے کی ہے۔ میرے اندر ایک شدید جذبہ تھا جس کے تحت میں برسوں سے اس مقدس فریضے کو نبھا رہا ہوں۔ اگر کوئی ضعیف الاعتقاد نہ سمجھے تو میں یہ کہوں گا کہ اس سال (۱۹۸۲ء) روضۂ رسولؐ پر حاضری سے پہلے میرے ذہن میں 'رسولؐ نمبر' کا کوئی اور ہی انداز تھا، یہ ایک روایتی سا خاکہ تھا، لیکن درِ رسولؐ پر حاضری کے بعد اس کا نقشہ ہی ذہن میں اُبھر آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فیضان ہے اس مقامِ مقدس پر حاضری کا ———"

○ "کیا آپ اس فرق کو واضح کریں گے؟"

"پہلے میرا خیال تھا کہ عام سی ڈگر پر ایک ضخیم دستاویز تیار کروں۔ اس میں عنوانات

کا تنوع اور مسائل کے اعتبار سے تقسیم شامل نہیں تھی ۔ اب میں نے مسائل کو ترجیح دی ہے میں جو مضامین ابتدائی جلدوں میں دینا چاہتا تھا اب وہ بعد کی جلدوں میں آئیں گے ۔ ارضِ مقدس سے واپسی کے بعد میں نے ایک کام یہ کیا کہ ہر عنوان کے تحت قرآن کی ایک آیت تلاش کی اور اسے ہر باب کی زینت بنایا ۔"

○ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے احیاء کی جو تحریک اس وقت زوروں پر ہے، آپ نے 'رسولؐ نمبر' کی اشاعت کی صورت میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے؟"

"میں تو اپنے آپ کو اس قدر بڑے اعزاز کا مستحق نہیں سمجھتا ۔ میں نے کبھی اس طرح سوچا ہی نہیں ۔ میں نے تو ایک فرض ادا کیا ہے جو ہر انسان کو بساط بھر ادا کرنا چاہیے ۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ جب میں کوئی کام کرتا ہوں تو میرے پیشِ نظر ہمیشہ یہ رہا کہ اس کام سے دوسروں کو فائدہ ہو ۔ میرا نظریہ ہے کہ اپنی ذات کو دوسروں کے لیے مفید بناؤ ۔ چنانچہ "نقوش" کا رسولؐ نمبر میرے اس جذبے کی تکمیل ہے ۔

مجھے کس قدر کامیابی حاصل ہوتی ہے اس کا اندازہ اس وقت ہوگا جب دس جلدیں مکمل ہو کر شائع ہو جائیں گی ابھی تو یہ میرا سہ ماہی امتحان ہے ، سالانہ نتیجہ کیا نکلتا ہے' آنے والے کل کی بات ہے !"

○ "آپ سے ایک اجتماع میں صدرِ مملکت نے 'رسولؐ نمبر' کے لیے پیش کش کی تھی ، کیا اس پر عمل ہو رہا ہے ؟"

"میرا انحصار تو ہمیشہ اہلِ علم پر رہا ، وہی میرے کاموں کو پذیرائی بخشتے ہیں ۔ میں نے اب تک "نقوش" کے کئی بڑے بڑے نمبر نکالے ہیں مجھے حکومتوں کا محتاج نہیں ہونا پڑا ۔ آج اگر حکومت کوئی پیش کش کرتی ہے تو یہ ایک سعادت ہوگی جو اسے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی صورت میں میسر آئے گی ۔"

○ "وہ خصوصی برکات جو 'رسولؐ نمبر' کی تیاری اور اشاعت کے سلسلے میں آپ پر نازل ہوئیں ؟"

"مجھے سکون کی دولت ملی قلب و ذہن کا سکون ، اس سے بڑا اجر اور کوئی نہیں ۔"

مدیر "نقوش" سے باتیں ہوئیں ۔ اب "نقوش" کی پذیرائی کرنے والوں کے

خیالات بھی سُنیے:

جسٹس شیخ آفتاب حسین

رسول نمبر کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس نے فرمایا:

مکرمی جناب محمد طفیل صاحب،

سلام مسنون!

مجھے بیحد خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے مجھے سیرت طیبہ پر مشتمل نقوش کا رسول نمبر ارسال فرمایا اس گراں قدر اور علمی تحفہ پر میں آپ کا تہ دل سے شکرگزار ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی تمام انسانیت کے لیے ایسی مکمل اور جامع رہنمائی کی حامل ہے کہ انسانی حُسنِ کردار کی تمام تاریخ اس کے سامنے ایک پر کاہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بالخصوص دورِ جدید کی انسانیت کی فلاح سیرتِ طیبہ کو نمایاں کرنے ہی میں مضمر ہے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے اور خُوب سے خوب تر اسالیب اور پیشکش کے جدید و حسین زاویوں کے ساتھ منظرِ عام پر لایا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس سمت میں نہایت موزوں، بروقت اور صحیح قدم اٹھایا ہے۔

نقوش کا رسول نمبر بلاشبہ بہت قیمتی علمی مواد پر مشتمل ہے ان شاء اللہ یہ نمبر قبولِ دوام کی مسند پر فائز ہوگا۔

والسلام علیکم

آپ کا مخلص

آفتاب حسین چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

متعدد کتابوں کے مصنف اور رسالہ برہان کے ایڈیٹر نے رسول نمبر کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دارالعلوم، دیوبند، انڈیا

محب مکرم و محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ،

چند روز ہوئے، پہلے آپ کے ماہنامہ نقوش کا رسول نمبر دارالعلوم دیوبند کے

نام پہنچا تھا اس کے بعد اس نمبر کا پورا سٹ میرے نام وصول ہوا۔ بڑے ولولہ اور شوق و اشتیاق کے ہاتھوں سے پارسل کھولا تو رسولؐ نمبر پر نظر پڑتے ہی جی باغ باغ ہوگیا، سُبحان اللہ! ستی علیٰ، آپ نے کیا اور کس درجہ عجیب و غریب اور دلکش و دل آفرین نمبر شائع کیا ہے' اسے نمبر کیوں کہیے، یہ سیرت طیبہ کی انسائیکلو پیڈیا اردو زبان کی ہے۔ آپ نے "نقوش" کے بڑے بڑے اور عظیم الشان نمبر شائع کر کے جس عالی حوصلگی، عزم بلند و جرأتِ بے باک کا مظاہرہ کیا ہے، اب اس نمبر کے بعد ان اوصاف و کمالات پر حرارت ایمانی، عشقِ رسولؐ اور سوز و گداز قلب کا بھی اضافہ ہوا۔ اس پر آپ دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ نہ صرف میری اور مسلمانوں کی طرف سے بلکہ ہر محب انسانیت و شرافت کی طرف سے۔ فجزاکم اللہ جزاءً کثیرا۔

برہان میں ان شاء اللہ عنقریب "باب التقریظ والانتقاد" کے زیر عنوان اس پر مفصل تبصرہ شائع ہوگا۔ خدا کرے آپ بہمہ وجوہ بخیریت و عافیت ہوں۔

والسلام مع الاکرام

مخلص سعید احمد اکبر آبادی

مولانا نعیم صدیقی خود بھی سیرت نگاری کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے "نقوش" کے رسولؐ نمبر کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

"کوہکنی اس کا پیشہ ہے، قلم اس کا تیشہ ہے! وہ ہمیشہ شیریں نہر کی سرمستیٔ شوق میں ایک نہ ایک پہاڑ کھودتا ہے اور ایک نئی جوئے علم و ادب بہا نکالتا ہے کہ تشنگانِ معنی صدیوں سیراب ہوتے رہیں —— کون؟ طفیلِ نقوش!

ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اردو بازار سے اُٹھا اور اس انسانِ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آرام گاہ تک جا پہنچا، جس کے دم سے ظلمت کے صحرا میں نور کی ندیاں رواں ہوگئی تھیں، وہاں سے فیضیاب ہو کر لوٹا تو خامۂ مژگاں سے جگر کاوی کر کے ایک چشمۂ زمزم جاری کر دیا —— یہ ہے "نقوش" کا رسولؐ نمبر۔

آج سے دس برس پہلے کوئی یہ تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا کہ جس "نقوش" کا دائرہ شعر و افسانہ اور ادبی تحقیق و تنقید ہے وہ کبھی رسولِ برحق کی سیرت کو بھی موضوع بنائے گا اور بنائے گا بھی اس شان سے کہ قدیم و جدید نامور سیرت نگاروں کی فراموش شدہ اور تازہ تحریروں کو چمن در چمن سمیٹ کر ایک شاندار گلدستۂ معرفتِ رسالت مآب تیار کرے گا جس کے ہفت رنگ

پھولوں سے طرح طرح کی خوشبوئیں نکل کر ضم ہوں گی اور قلب و نظر کی فضاؤں میں پھیلیں گی۔

چار ضخیم جلدیں، اکتیس سو صفحات پر پھیلی ہوئیں، طباعتی و اشاعتی حُسن سے آراستہ سامنے ہیں۔ سرسری طور پر ورق گردانی کے لیے بھی وقت چاہیے، ابھی تو دس جلدیں پوری ہونی ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کے میدان میں ایک سنگِ میل قائم کیا تھا، اب ویسا ہی دوسرا سنگِ میل ــــ شاید کچھ زیادہ بڑا اور اونچا ادارہ "نقوش" نے قایم کیا ہے۔ آج اردو زبان کے ذخیرۂ سیرت پاک میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا۔

مولانا عبدالمتین ہاشمی 'رسولؐ نمبر' کے بارے میں فرماتے ہیں:

"محمد طفیل کو اللہ تعالیٰ نے کام کرنے کا ایک خاص سلیقہ اور ذوق دیا ہے۔ ایک دن جب طفیل صاحب نے مجھ سے سیرت نمبر کا تذکرہ کیا اور اس کا پلان پیش کیا تو میرے وجدان نے باطن سے آواز دی کہ دنیائے ادب کے اس مسافر کو دربارِ نبوتؐ سے طلب کر لیا گیا ہے، اور الحمد للہ کہ ویسا ہی ہوا جیسا میں سمجھ رہا تھا۔

"نقوش" کے 'سیرت نمبر' کی چار ضخیم جلدیں میرے سامنے ہیں، مزید چھ جلدیں متوقع ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سیرتِ پاک سے متعلق مواد کا ایسا گلدستہ اور مجموعہ اردو تو کیا، دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملے گا ــــ ان چار جلدوں کو دیکھ کر بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ محمد طفیل صاحب کو حیاتِ دراز، صحت و عافیت اور ذوق و شوق چند در چند عطا فرمائے کہ یہ اس عظیم کام کو پوری دل جمعی سے پورا کر سکیں۔

شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی نے بھی رسولؐ نمبر کے بارے میں یوں حوصلہ افزائی کی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

برادرِ محترم مولانا محمد طفیل صاحب کی عظیم تالیف نقوش کا رسولؐ نمبر سیرت نبوی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے موضوع پر ایک عظیم ترین خدمت ہے۔ اس کی زیارت و مطالعہ سے یہ ناچیز مشرف ہوا۔ اس پر جو تاثرات قلب میں پیدا ہوئے تعبیر و بیان کی محدود وسعت میں وہ نہیں سما سکتے۔ میں صرف اس قدر کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ تاریخ اسلام

یعنی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر علماءِ ربانیین، محققین و مورخین نے جو کچھ علمی خدمت کی ہے نقوش کا رسولؐ نمبر ان تمام سابقہ خدمات کا مجموعہ ہے۔ اور ساتھ ہی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ مبارکہ، آپؐ کے محاسن اخلاق، علمی و عملی فضائل و کمالات کا صحیح ترجمان ہے۔ آثار نبویؐ کی بلند پایہ مظہر ہے۔ ہر مسلمان کے ذمہ خاتم الانبیاءؑ والمرسلین کی معرفت اور آپ کی ذاتِ اقدس سے تعلق ضروری بلکہ عین مقتضائے ایمان ہے کیونکہ ہر مومن کا ایمان آپ ہی کے آفتاب نبوت کی تجلیات وانوار کا فیض ہے تو جس طرح روشنی کی معرفت آفتاب کی معرفت پر موقوف ہے اسی طرح ہر مومن کو اپنی معرفت بھی بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کے ممکن نہیں۔ وہ اپنے وجودِ ایمانی میں سراپا محتاج پیغمبر ہے۔ تو اس بلند پایہ خدمت نے ہر مسلمان کے واسطے یہ سعادتِ عظمیٰ مہیا کر دی ہے کہ وہ اپنے وجودِ ایمانی کو پہچانے۔ اور ساتھ ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات و محاسن کی معرفت حاصل ہو اور یہ جانے کہ آپؐ کا وجود باجود اُمت کے لیے بلکہ تمام عالم کے لیے کس قدر عظیم اور بلند پایہ نعمت ہے۔ انعام کمال اور محاسن کا علم ذریعہ محبت ہے۔ ہر منعم و محسن اور باکمال کے ساتھ قلب کی وابستگی انسانی فطرت کا تقاضا ہے تو رسولؐ نمبر میں مرتب کردہ مضامین ایک طرف کمالاتِ نبویہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں تو دوسری طرف مومن کے قلب میں محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہونے کا باعث ہیں جو دین و دنیا کی جملہ سعادتوں کا ضامن ہے۔ رسولؐ نمبر میں جمع کردہ مضامین بلند تحقیقی مقالے اور مستند مضامین ہیں سلفِ صالحین اور ائمہ متکلمین کے مسلک اور ان کی تحقیق کے مطابق ہیں۔

دعا ہے کہ خداوند عالم اس علمی گرانقدر سرمایہ سے اُمت کو زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے اور حضرت مؤلف کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم و تب علینا انک انت التواب الرحیم۔

والسلام

ناچیز محمد مالک کاندھلوی غفر اللہ لہٗ

مولانا سید مرتضیٰ حسین نے یوں رائے دی:

"اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر! — صبح صادق کی روشنی پھیل رہی ہے، مؤذنوں کی آوازوں اور اذانوں کی گونج اور سرد ہوا نگاہ اور

دل و دماغ کو نور و سرور کے عالم میں لیے جا رہی ہے ـــــ کل ماہِ بہار عارفین ربیع المیلاد کی پہلی تاریخ تھی اور طفیلِ محمدؐ محمد طفیل کی قسمت کا ستارہ نئے اُفق سے اُبھر رہا تھا۔

دس سال گردن جھکائے، کچھ کریدتے، غوطے لگاتے، قلم چلاتے رہے۔ موتی پرونے پتھر جمع کیے، ان کے رنگ ڈھنگ دیکھے اور پھر انھیں جوڑا، چمن چمن گئے، کیاری کیاری سے پھول توڑے اور بڑے بڑے گلدستے بنائے، رنگین اور مہکتے ہوئے۔

"نقوش" کا رسول نمبر تین ہزار صفحات سے متجاوز یکم ربیع الاول ۱۴۰۳ھ کو طفیل صاحب نے چھاپ کر بارگاہِ پروردگارِ عالم میں پیش کر دیا۔ اللہ ان کی سعی مشکور قرار دے۔ وہ نئے افق میں داخل ہو گئے۔

محمد طفیل صاحب کی عاجزانہ اور منکسرانہ پیش کش کا سلیقہ اور طریقہ اُن کی عقیدت اور حقیقت، ان کا عشق اور جذبہ جو رنگ لایا ہے وہ ان کے چہرے اور لبوں پر بول رہا ہے۔ یہ کامیابی اور بہت بڑی کامیابی، یہ سُرخ رُوئی اور گل فشانی مبارک ہو اور یہ ہدیہ قبول ہو۔"

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جو دارالمصنفین کے مہتمم ہیں اور یہ ادارہ مولانا شبلی، مولانا سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ چھاپنے کا اعزاز حاصل کر چکا ہے۔ انھوں نے فرمایا:

مکرمی والمحترم۔ السلام علیکم

نقوش کے سیرت نمبر کی چار جلدیں موصول ہوئیں۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ کیا عجب کہ یہ آپ کے لیے عاقبت میں زادِ راہِ سفر ہو جائے۔ ظاہری اور معنوی حیثیت سے یہ دیدہ زیب اور راحتِ دل ہے۔ آپ کے اس نمبر کے ساتھ لوگوں کا مطالعہ ہمارے یہاں کی سیرت ہفتم کا بھی ہو جائے گا۔

آپ نے نقوش کے بہت سے نمبر نکالے ہیں۔ یہ سارے نمبر آپ دارالمصنفین کے کتب خانے کے لیے بھیج دیں۔ نقوش کے نمبر ہر کتب خانہ کے لیے باعث زینت ہیں۔

خدا کرے آپ کا مزاج گرامی ہر طرح مع الخیر ہو۔

والسّلام

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

سید ابوالحسن علی ندوی جنھوں نے موجودہ دور میں سیرت پر سب سے زیادہ کام کیا۔ وہ فرماتے ہیں :

مکرمی زید لطفہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے دونوں عنایت نامے نظر نواز ہوئے۔ میں نے پہلے ہی خط کے جواب میں رسولؐ نمبر کی رسید دے دی تھی۔ تعجب ہے کہ میرا خط آپ کو نہیں ملا۔ بہرحال اس مبارک، قیمتی، قابلِ قدر اور تاریخی نمبر کے ذریعے آپ نے سعادت دارین کا اچھا سامان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت بخشے اور آپ کی محنت ٹھکانے لگے۔

خدا کرے آپ ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔ والسّلام

مخلص : ابوالحسن علی

'NAQOOSH: RASOOL NUMBER MONUMENTAL WORK OF HOMAGE

by Khaled Ahmed

FOUR volumes (800 pages average) of 'Rasool Number' have been published by 'Naqoosh', Lahore's prestigious literary journal. At least six more volumes are in preparation to encompass a lifetime's interest of Muhammad Tufail, the Edifor, in the life and work of the Holy Prophet (peace be on him). As an anthology of research and a treasury of sources, these volumes will be a most valuable contribution to the literature of the 15th Centry Hijra.

When Maulana Shibli undertook his gigantic 'Seerat' in 1933, the Begum of Bhopal was among the patrons who gave 50,000 rupees for the great biography. Tufail has had to sell a part of his press to finance the first four volumes, each priced at Rs. 100 (library edition) and Rs. 60 (readers' edition). Calligraphy on them began in 1972 and has been completed in 1982, giving proof of Tufails's steadfastness and devotion to the divine subject. His contribution to the literature of the Prophet's (peace be on him) life is the excellent arrangement of themes and careful selection of rare and high-quality material. Once again 'Naqoosh' will be a collector's delight.

Islamic scholarship follows the trinity of priorities established over hundred of years: Seerat–Hadith–Tafseer. Volume One deals with the entire known sources of the Prophet's (peace be upon him) biographies. Maulana Syed Abdul Hassan Ali Nadvi looks forward to the 15th Century Hijra in the light of our past and lays down a 10-point programme for a successful revival of Muslim for tunes. Qari Muhammad Tayyab raises some basic issues in the 'Seerat' scholarship and explains the main trends in early writings.

Maulana Nadim-ul-Wajidi states that 'Seerat' was traditionally taken to include accounts of the Prophet's (peace be on him) life from birth to demise including accounts of his Companions' lives. A lot of biographical material was produced during the lifetime of the Prophet (peace be on him) and the most authoriative 'life' was the one chronicled by Ibne Ishaq. But a 'life' is different from 'Hadith' as the latter is confirmed in its careful assessment of truth while the former is an inclusive record with aspects not scientifically acceptable as truth. He points to Ibne Ishaq's tendency to record 'week' sources and Waqidi's lack of authority as in 'Hadith'.

Dr. Syed Moeenul Haq's essay on the 'Seerat' literature discusses the challenges of Western orientalism which must be accepted by us and praises Sir Syed Ahmad for establishing a tradition by correcting William Muir's biography of the Prophet (peace be on him) Maulana Syed Abul Hassan Ali Nadvi sets down the minimal obligations of the writer of 'Seerat'.

Dr. Ghulam Mustafa Khan discusses the first source of information on 'Seerat', the Quran. Qari Muhammad Tayyab studies the life of the Prophet (peace be on him) as an exegesis of the Quran and Qari Muhammad Abdullah Saleem examines the personality of the Prophet (peace be on him) as explained by Allah, Maulana Muhammad Haneef Nadvi's essay attempts to discover how the Quran explains prophethood. The same author contributes

insight into the concordance of 'Seerat' and the Quran. A classic research paper by Maulana Abdul Majid Daryabadi studies the life of the Prophet (peace be on him) in the light of the Quran. Dr. Israr Ahmad's paper on the purposes of the Prophethood as explained in the Quran Tammana Ammadi's study of the trinity of 'Muhammad–Quran–Allah', and Syed Badruddin Alvi's dicussion of the compilation of the Quran in the lifetime of the Prophet (peace be on him) complete the introduction to the art of writing the 'Seerat'.

The scholarship on sources is represented by Muhammad Ajmal Islahi (translated by Khalil Ibrahim) who discusses the earliest writer Urwah bin Zubair of Medina. Tehseen Firaqi does an admirable job of translating Guillaume on Ibne Ishaq and also introduces the author, an important detail usually omitted by our scholars. One learns about the extent of Ibne Ishaq's reliability as a source: Iman Hanbel accepted his account but did not rely on it for the adjudication of issues Muhammad Ajmal Islahi writes about Ibne Hisham whose edition of Ibne-Ishaq only has survived. Hisham excised a lot of indecent and defamatory poems from the original and added what he thought was worthy.

Dr. Nisar Ahmad Farooqi has written an interestingessay on Ibn Saad and his 'Tabaqat'; Dr. Muhammad Yasin Siddiqi on Yaqubi is equally engaging. A very modern paper on Ibne Hazm has come from Palestinian scholars Dr. Ahsan Abbas and Dr. Nasiruddin Assad ably translated by Ajmal Islahi The same translator has rendered Dr. Shauqi Zaif on Abdul Barr. The most comprehensive Arab scholar of the 8th Century A.D., Ibne Kathir is satisfactorily examined by Dr. Masoodur Rahman Nadvi. A recent source, Allama Yusuf bin Ismael (1848) is studied by Abdul Hakeem Sharaf Qadiri while Ghulam Jilani Barq

writes informatively about the 13th century A.D. writer of 'Seerat' Ibne Jauzi of Baghdad. The final essay in the volume is the admirable study of early 'life' made by Joseph Horovitz, translated into English by Pickthall and now rendered into Urdu by Dr. Nisar Ahmad Farooqi.

Volume Two takes us from issues of methodology to the actual substance of 'Seerat'. A hundred pages are devoted to the central question of the chronology of the life of Muhammad (peace be on him) and give us an authentic graded glimpse into the internal and external nature of the divine personality. Articles by Maulvi Ishaq-ul-Nabi on the subject enrich this section. Dr. Nisar Ahmad Farooqi has compiled the next section on the correspondence of the Holy Prophet (peace be on him) a most absorbing glimpse into the intellect of the greatest of then.

Three hitherto unpublished articles of Syed Sula-i-man Nadvi are offered in the section on actual niography. Together with Shibli, Maulana Nadvi is the pride of South Asian scholars on the subject closest to the heart of Muslims. Tufail's admiration of a 'life' written in English by Dr. Hamidullah causes it to be included in the next section, another 'first' in Urdu.

Volume Three contains 64 articles of excellent research on the Holy Prophet (peace be on him). This is actual biography, the crux of the whole effort made by Tufail whose uncanny grasp and discrimination in the corpus of literature produced in the 20th century is put to proof. Befittingly, the article on the pre-Islamic World is from Syed Ameer Ali. Half a dozen essays by Abdul Kalam Azad bring out the profound insight into the history and inspiration of Muhammad (peace be on him) which the Maulana possessed. More philosophical and exact is the pen of Khalifa Abdul Hakeem whose share also runs to more than six articles. Tufail's preference about authority is immaculate: it mixes literature with highclass research.

It is a pleasant surprise to see a very able essay penned by the Quaid-i-Azam on the Holy Prophet (peace be on him). There is Maulana Ashraf Ali Thanvi on the duties imposed upon us by our devotion to the Prophet (peace be on him), Dr. Syed Abdullah on the contemporary application of the example of the Prophet's life, the Late Justice S.A. Rahman on the concept of justice as epitomised by the Prophet (peace be on him). Writers include Abdul Majid Daryabadi, Dr. Khursheed Ahmad, Dr. Israr Ahmad, Raees Ahmad Jafri, Mulla Vahidi and many other luminaries.

Volume Four continues the inquiry into the most remarkable personality the world has even known. The discussion is thrown open by the great Arab scholar Syed Qutb Shaheed and is joined by a dozen scholars, of the stature of Dr. Hamidullah and Abdul Rahman Azzam, on the subject of 'Uloom': sciences, social sciences, eduction, medecine and mathematics–all inspired by the personality of Muhammad (peace be on him) Hafiz Mufti Muhammad Anwarul Haq leads the discussion of ethics under the Holy Prophet (peace be on him) with a full-length paper and is followed by Maulana Ashraf Ali Thanvi, Pir Karam Ali Shah and Abdul Haleem Mahmood (rector of Cairo's Al Azhar).

Brig. Gulzar Ahmad and Tahir Farooqi write on the battles fought by Muhammad (peace be on him) as a commander of the faithful. Ghulam Jilani Barq has compiled a comprehensive list, with commentary, of all the 'ghazwaat' which makes very good reading. This is followed by a devotional article by Munshi Ragunath Rao and a collection of quotes about the Holy Prophet (peace be on him) by a number of well-known non-Muslim personalities. Carlyles famous essay on Muhammad Ipeace be on him) as a hero of humanity is included; so is the one by Dr. Allama Iqbal on the importance of the Prophet's birthday.

Tufail had published a number of 'Naqoosh' about world biography in 1964. All the personalities of the world meriting a note were included and the volums comprised 1964 pages. In 1982, Tufail is presenting the life of a single man and the four volumes now published have surpassed 3,000 pages. And that is not even one-third of the material he has on his desk! The institution of 'Naqoosh' has paid a worthy tribute to the last Prophet (peace be upon him) and, in so doing, has reached the fulfilment dreamed of by this one-man literary show, Muhammad Tufail.

A HISTORIC FEAT

By M. A. Siddiqui

NAQOOSH'S RASOOL NUMBER is undoubtedly a document of great importance. Only four volumes of the contemplated 10-volume package have managed to see the light of day so far but it is already being talked about as Mohammad Tufail's labour of love which has added yet another laurel to Mohammad Naqoosh's cap.

Mohammad Tufail and Urdu language could justly pride on the achievement. No other journal – literary or religious – has ever attempted such a tribute to the Prophet of Islam. One feels and not quite unjustly that Michael H. Hart's much-talked-about book "The 100 – A Reading of the Most Influential Persons in History" (A&W Publishers Inc. 1978) is only eminently right in according Prophet Muhammad the first place in the List of Honours.

Mohammad Tufail plans to bring out ten volumes. The first four volumes, so far published, unfold a creative format, and to those who might be justly recalling Allama Shibli's contribution to **Seeratnigari** (which is mainly the work of Allama Syed Sulaiman Nadvi) would be rightly happy to know that the volume II of this Number includes the late Sulaiman Nadvi's mamoth work. We should be grateful to Mohammad Tufail for having procured this document from Dr Salman Nadvi, son of the late Allama Sulaiman Nadvi, who is teaching at Durban University at the moment and is in his own right prominent scholar.

The first volume deals with the holy Quran, books on Seerat (Prophet's life) and the science of Seerat It is a 816-page document and contains the authoritative writings from eminent scholars like Syed Abul Hasan Ali Nadvi, Qari Mohammad Tayyab, Dr Nisar Ahmed Farooqi, Dr. Masood-ur-Rahman Khan Nadvi, Ghulam Jeelani Burq. The exhaustive article **Hama Quran Dar Shan-i-Mohammad** and the translation of Joseph Horovitz's writing about the early books on Prophet Muhammad, besides Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi's **Pandarwhin Sadi Hijri – Mazi Aur Hal Ke Aaine Mein**, are marvellous pieces. One gets the impression that it is not articles but concise books, that one is going through, written with tremendous power of authority.

The second volume (760 pages) deals with Prophet's life. The section on Seerat's **Tauqeet** (chronological account of Prophet's life) is a beautiful summation. Prophet Muhammad's letters are another attraction.

This volume is an important document. It looks like a familiar path often trodden. But a painstaking feat of editing has made the effort so rewarding that we start feeling an affiinity with the whole approach.

The other articles which merit our attention in the second volume deal with the ancient history of Makkah and Medina. The most rewarding exercise is the translation of Dr M. Hameedullah's famous book **Mohammad Rasulullah** which runs from pages 515-760. Dr Hameedullah is a scholar of international repute and it is a good decision to have this book translated into Urdu.

And now we move to the third volume. It deals with the pre-Islamic times, the personality of the Prophet and his role as a human being and Prophet. The 748-page volume is, I believe, a marvellous effort and one is amazed at the painstaking research articles contributed by some of the eminent writers.

The one writer who could be regarded as one of the main contributors of this Number is Dr. Nisar Ahmed Farooqui. He is a well-known Urdu critic and research scholar, teaching Arabic at the University of Delhi. His work on Mir, Ghalib and other classical poets has met with unreserved praise but it is for the first time that he has acquitted himself admirably well in a field which demands complete command over the Arabic language, social dynamics of Islam and the whole field of historiography.

Mohammad Tufail has spotted a scholar which until now was known as an authority on Mir and Ghalib. This is what makes religious topic attain a new dimension. Scholars like Shibli, Maulana Abdul Majid Daryabadi, Abul Hasan Ali Nadvi, Sulaiman Nadvi, Saeed Ahmed Akbarabadi, Ghulam Rasul Mehr, Ghulam Jeelani Burq have become or are in the process of becoming a thing of the past. Nisar Ahmed Farooqi is perhaps the only writer – in his forties – well set on following into the foot steps of those writers whose knowledge of religion and literature was simply marvellous. It is rather surprising that all those scholars who approached religion and literature with equal ease were eminently tolerant persons. Shibli's example is heart-warming. So is Sulaiman Nadvi's loving preface to Jigar Morabadi's Shola-i-Toor,

Saeed Ahmed Akbarabadi's paternalisti treatment of Khyyam, Maulana Ashraf Ali Thanvi's defence of Hallaj, Abdul Hasan Ali Nadvi advocacy of Iqbal besides Sabahuddin Abdur Rahman's work on Ghalib.

Naqoosh's Rasul Number is an important document cementing the bonds between literature and religion and we come across many a literary and religious luminary providing pleasant proofs of their catholicity.

The fourth volume, comprising 752 pages, covers yet another aspect and quite thoroughly. This is the portion on **Aswa-i-Husna.** Many pieces of sound scholarship enchant us. Prophet Muhammad's role as the great revolutionary and his influence on human knowledge and wisdom has been ably discussed. Some of the pieces worth mentioning in particular are : **Uloom-i-Insani Ke Faroogh Per Hamare Rasool Ka Asar, Hamara Rasool Ba Haisiat Sipah Salar** and **Hamare Rasool Ghair Muslimon Ki Nazar Main.** Each section of this volume, like all other volumes, is so exhaustive that the whole effort could be treated as the compendium of some important books and articles grouped together under a well-thought-out scheme. The editing part of the effort is important in that it is the editor who, helped by his advisers, exhibits a rare determination to approach the subject with a feeling that major part of literature on Islam is about the Prophet and there could be no paucity of excellent material. Therefore, the norms of selection have to be exacting.

The humility and sense of pride which courses through Mohammad Tufail's opening lines preceeding each volume are perfectly understandable and justified. It is not without some rhyme and reason that he has most humbly solicited his readers, cooperation in pointing out all lapses which might come to their knowledge. A work of this size and importance could not aspire for being error-free but the way Mohammad Tufail has pain-stakingly tried to do justice to the theme is commendable and he deserves an unreserved commendation for this document of historic importance.

اختتامی حروف :

——ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

(۱)

یہ مجموعہ کچھ نئے اور زیادہ تر پرانے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کا بیشتر حصّہ "نقوش" میں چھپی ہوئی نگارشات پر مبنی ہے۔ ان میں سے بعض مضامین بیس[۲۰] سے پچیس[۲۵] برس پہلے تک کے بھی ہیں۔ اس لیے ان میں احوال و کوائف کا تذکرہ اور حوالہ بھی اُسی زمانے تک کا ملتا ہے۔ انہیں نا تمام یا ناکافی سچائیاں یا جزوی اعترافات کہنا چاہیے۔

پیشِ نظر کتاب کی صورت میں اگرچہ "نقوش" میں چھپی ہوئی کچھ پرانی یادداشتیں اور یادیں تازہ اور یکجا ہو گئی ہیں لیکن مجھے، اُن بہت سی تحریروں تک نارسائی کا غم ستارہا ہے جو لازماً طفیل صاحب کی زنبیل میں گلِ حکمت ہو رہی ہوں گی اور اُن کے کاغذات کے انبار یا سمندر میں گم اپنی جان کو رو چکی ہوں گی یا اپنی بازیافت کے لیے کسی سخت جان غوطہ زن کی منتظر ہوں گی!

بے شمار خطوط اور قیمتی مضامین، کتاب میں شامل ہو سکتے تھے، اگر طفیل صاحب کی "نا ہنجار" مصروفیت اور بے توجہی حائل نہ ہوتی! —— تفصیل کا یہ محل نہیں، آخر آخر یہ ہُوا کہ بوجوہ مجھے طفیل صاحب کو اس کتاب کے بارے میں اعتماد میں لینا پڑا، لیکن انہیں اس کی اشاعت کے بارے میں قائل یا مائل نہیں کیا جا سکا۔ اُن کا رویّہ کم و بیش اُس شخص کا سا رہا جسے اپنے کام پر آج سے زیادہ کل پر بھروسا ہو۔ اُن کے نزدیک صحیح مضامین، اُس وقت لکھے جائیں گے جب ہم میں سے کوئی نہ ہوگا، یعنی آنکھ کی شرم والے قصّے کا درمیان نہ ہوگا!!

"طفیل صاحب کی زندگی آج تک تخلیق و تسوید ادب میں انہماک اور اہلِ قلم کی بہبود و بہتری کے کارہائے نیک و نمایاں میں بسر ہوئی ہے۔" لیکن پیشِ نظر کتاب "محمد نقوش" طفیل صاحب کے بعض اہم اور تاریخ ساز و یادگار دہ ہوں اور کارناموں کے سرسری تذکرے تک سے خالی ہے۔ ان میں

"اہلِ قلم کی بہبود و بہتری اور آباد کاری" کے لیے اُن کے جہاد اور انہماک، پاکستان رائٹرز گلڈ سے اُن کی علمی وابستگی، ان کی تدبیر سازی، پیش بندی اور اس کے برکات و ثمرات اور اُن کی اڑانوں اور منصوبہ بندیوں کی نتیجہ خیزی کی روداد لطیف و طویل ایک الگ اور مفصل کتاب کا تقاضا کرتی ہے۔

پہلے "صدارتی نقوش ایوارڈ" کا اعلان عنقریب ہونے والا ہے۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا منفرد ایوارڈ ہے جو ہم عصروں میں طفیل صاحب کی بڑائی اور یکتائی کے اشارے سے خالی نہیں!

(۲)

ایک دو وضاحتیں یا صراحتیں: طفیل صاحب نے اپنے خود نوشت خاکے مشمولہ "جناب" میں لکھا ہے کہ "مَیں (اپنے آپ کو) ۱۵۔ اگست ۱۹۲۳ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔" یہی بات زیرِ نظر کتاب "محمد نقوش" میں (صفحہ ۱۲۹ پر) طفیل صاحب کے حوالے سے کہی گئی ہے لیکن طفیل صاحب نے میرے ایک استفسار کے جواب میں بتایا کہ تاریخ پیدائش جو ۱۵۔ اگست ۱۹۲۳ء درج ہوئی ہے درست نہیں، صحیح ۱۴۔ اگست ۱۹۲۳ء ہے۔

اس کتاب میں طفیل صاحب کے "نقوش" کی ادارت سنبھالنے کے سلسلے میں ۱۹۵۰ء کا حوالہ بھی دیا ہے: ۱۹۵۱ء کا بھی اور ۱۹۵۲ء کا بھی:

واقعہ یہ ہے کہ "نقوش" کا شمارہ ۱۹۔۲۰ پہلی بار "تنہا محمد طفیل صاحب کی ادارت میں نکلا۔ اس پر کوئی مہینہ یا سال درج نہیں لیکن طفیل صاحب کے مرتّب کردہ دوسرے شمارے (نمبر ۲۱-۲۲) کی دستاویزی شہادت پر انحصار کریں، جس پر مئی ۱۹۵۱ء درج ہے، تو اُن کی زیرِ ادارت چھپنے والے "نقوش" کے شمارۂ اوّل کا زمانۂ اشاعت اپریل ۱۹۵۱ء طے پاتا ہے۔

(۳)

اپریل ۱۹۵۱ء سے اب تک، ایک تہائی صدی میں طفیل صاحب نے "نقوش" یا اپنی تصانیف کی صورت میں ساڑھے سینتالیس ہزار کے لگ بھگ صفحات اہلِ علم کے سامنے پیش کیے ہیں، اس سال کے آخر تک یہ پچاس ہزار سے متجاوز ہو جائیں گے۔ یہ سب ادب پارے ہیں۔ اتنا کچھ چھاپنا قارئین کی پذیرائی ہی پر منحصر تھا۔ اہلِ قلم کے ایسے تعاون کی مثال کوئی دوسرا رسالہ یا مدیر پیش نہیں کر سکے گا۔

طفیل صاحب کے بقول:

"میری باتیں بہت اڑانوں والی ہوتی ہیں۔ اُڑان کے لیے پَر ضروری ہوتے ہیں اور میرے پَر اہلِ قلم ہیں، تنہا میں کچھ نہیں۔ فضیلت کے جتنے پُھندنے میری دستار میں لگے ہیں، وہ سب سجاوٹیں میرے رفیقانِ قلم کی ہیں۔" [محمد نقوش، ص ۴۳۵]

میرے ایک استفسار کے جواب میں طفیل صاحب نے بتایا کہ:

"اہلِ قلم میں، میں خاص طور پر مولانا غلام رسول مہر، جناب سید وقار عظیم، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب حبیب اشعر دہلوی، جناب محمد اسمٰعیل پانی پتی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، جناب اکبر حیدری کاشمیری، جناب کسریٰ منہاس، جناب محمد اجمل اصلاحی، جناب محمد عالم مختار حق، محمد عبداللہ قریشی اور ڈاکٹر وحید قریشی کا ممنون ہوں کہ ان کا تعاون کاموں میں آسانیاں پیدا کرتا رہا۔"

اتنے بڑے پیمانے پر اہلِ قلم کا تعاون حاصل کر پانا، جس کے قریب قریب کی کوئی دوسری مثال تک آسانی سے ذہن میں نہ آتی ہو، بجائے خود طفیل صاحب کی محبوبیت، اُن کی خوئے دل نوازی، سلیقے اور کام لینے کی اُن کی غیر معمولی استعداد پر مظہر ہے۔ لیکن ان کا اختصاص کام لینے ہی میں نہیں۔ اگرچہ طفیل صاحب نے اپنی دستارِ فضیلت کے "سارے" پُھندنوں کو رفیقانِ قلم سے منسوب کیا ہے لیکن بطور صاحبِ قرطاس و قلم اپنی ذات میں طفیل صاحب کا نمایاں ترین امتیاز خود ان کا قابلِ رشک انفرادی اسلوب ہے جس پر ان کی شخصیت کی موہنی اور مہک، اب دُور ہی سے دکھائی اور سنگھائی دے جاتی ہے جس نے اُنہیں قبیلے کی آنکھ کا تارا بنا دیا ہے!

"آپ کو شاید پتہ بھی نہ ہو، آپ نے اپنا اسلوب تلاش کر لیا ہے، جس کے پاس آپ کے خط آتے رہتے ہوں، اُس کو اگر نہ بھی معلوم ہو تو بھی وہ کتاب کے مصنف کا نام بتا دے گا۔ یہ معمولی کامرانی نہیں ہے۔ کتنے جغادری اور "پیشہ ور" لکھنے والے ایسے ہیں جو آج تک اس منزل پر باریاب نہ ہو سکے۔" [محمد نقوش، ص ۴۰۵]

حقیقت یہ ہے کہ ہم عصر اہلِ قلم میں کم ہی مدیر ایسے ہوں گے جو اپنی روشِ تحریر اور اندازِ قدیا قلم سے طفیل صاحب کی طرح پہچانے اور پکڑے جا سکتے ہوں۔ اور یہ کچھ کم امتیاز نہیں ہے، لیکن اس کی طرف خاطر خواہ توجہ ابھی دی نہیں گئی ہے۔ "نقوش" میں اپنے انداز کے جو اداریے "طلوع" کے تحت طفیل صاحب نے لکھے ہیں، اُن کے پیچھے جو فکری رو، بیکرانی اور بیدار مغزی کارفرما ہے وہ بھی توجہ کی متقاضی ہے۔

(۴)

کتاب کی ترتیب و تدوین کے بعد، کتاب سازی کے دوسرے مرحلے یعنی اس کی کتابت، تصحیح اور طباعت وغیرہ کے معاملے سے میرا عمل دخل دُور کا رہا۔ کتاب کا ایک حصّہ طفیل صاحب کی "تصانیف" کے جائزوں کے لیے مخصوص تھا لیکن یہ سب مضامین ضائع ہو گئے اور نہ مل سکے۔ ان میں "صاحب" پر مولانا حامد علی خاں، "جناب" پر علی عباس حسینی، کرشن چندر، نیاز فتحپوری، مولانا عبد الماجد دریابادی، جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی، شاہد احمد دہلوی کے مضامین اور تاثرات، "محترم" پر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور ڈاکٹر وزیر آغا کی نگارشات، "مکرّم" پر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کا مضمون، "معظّم" پر ڈاکٹر مظفر عباس، "مجبّی" پر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور "مخدومی" پر زہرا معین کی تحریریں یاد آتی ہیں، جن میں سے بعض خاص میری فرمائش پر قلم بند کی گئی تھیں۔

جن دُوسرے دوستوں اور بزرگوں کے مضامین موجود ہونے کے باوجود نہ مل سکے یا نہ شامل ہو سکے اُن میں فراق گورکھپوری، مولانا حامد حسن قادری، ل۔ احمد اکبر آبادی، پروفیسر محمد عثمان، قدرت اللہ شہاب اور عطاء الحق قاسمی خاص طور پر ذہن میں آتے ہیں اور احساسِ محرومی کو بڑھاتے ہیں۔

(۵)

یہ کتاب کسی باقاعدہ منصوبے کے تحت نہیں چھپی اس لیے ممکن ہے اسے پڑھنے کے دوران کسی مرحلے پر یہ گمان یا احساس ہو کہ یہ بہت زیادہ مربوط نہیں۔ ترتیبِ مضامین میں حفظِ مراتب کا خیال بھی شاید پُوری طرح نہ رکھا جا سکا ہو۔ جہاں تہاں بعض اہلِ قلم نے کچھ ایسی باتوں کو بھی اپنی نگارشات میں جگہ دے دی ہو تو عجب نہیں، جن سے بچا جا سکتا تو اچھا تھا۔ ان مضامین میں جن آرا کا اظہار ہوا اُن سب سے کُلّی اتفاق بھی ضروری نہیں، بایں ہمہ اگر کسی مضمون نگار کی کسی جنبشِ قلم سے کسی کی دل آزاری کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو اس کے لیے میں صمیمِ قلب کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنّف یا مرتّب ہی، اگر وہ کسی مغالطے کا شکار نہیں، تو، اپنی کتاب کی کمیوں اور کمزوریوں سے بیٹی والوں کی طرح، سب سے زیادہ واقف ہوتا ہے لیکن کوئی شریف آدمی اپنی یا دوسروں کی بیٹی کی کمزوریوں کے برملا اظہار پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس کتاب کے بارے میں میرا معاملہ کچھ یہی ہے۔ ساری کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوصف اور باوجود، ایک بات بڑے وقار اور وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب بڑے اخلاص اور ارادت سے پیش کی جا رہی ہے اور اُمید ہے کہ اسے اسی حوالے سے شرفِ قبول حاصل ہو گا۔

معین

شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج۔ لاہور

۱۲۔ اگست ۱۹۷۳ء

بابائے اُردو نے محمد طفیل صاحب کو "نقوش" سے اُن کے
عشق، اُن کی ادبی اور تعلیمی تعلق اور رجحان کے حوالے سے "محمد نقوش"
کا نام دیا تھا۔ ادبی ذمہ داری کا یہ بار اُٹھائے انھیں اس برس، وہ
ایک تہائی صدی بیت رہی ہے اور وہ عمرِ عزیز کے ساٹھ برس
پورے کر رہے ہیں۔

اس ایک تہائی صدی میں طفیل صاحب نے "نقوش" یا اپنی
تصانیفِ لطیف کی صورت میں پچاس ہزار کے قریب ادبی صفحات
کا سرمایہ اہلِ علم کے سامنے پیش کیا ہے۔ اتنے بڑے پیمانے پر
اس درجہ اعلیٰ معیار اور ناقابلِ فہم تحمل و استقامت کے ساتھ علمی و ادبی
اور تخلیقی و صحافتی سرگرمی کی کوئی دوسری مثال ذہن میں نہیں آتی۔ اس
لیے اگر کسی ایک جلد یا جلدوں میں طفیل صاحب کی ذات و صفات
اور اُن کے ادبی کمالات اور اثرات و خدمات کا خاطر خواہ احاطہ کیا
جانا ممکن نہیں، تو بھی زیرِ نظر ارمغان "مجلہ نقوش" سے
جو طفیل صاحب کی ساٹھویں سالگرہ کی مناسبت سے اُن کی دلچسپ
شخصیت اور علمی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا جا رہا ہے، معاصر
ادبی دنیا کے اعترافِ کمال کی تحریک کو ذرا سی بھی تقویت ملے اور
طفیل صاحب یا اُن کے کسی ایک بھی مداح یا قدردان کا جی بہلے
یا کام نکلے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت بار آور ہوئی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمن